لُمعۃُ الاَنوارُ
فی
عقائدِ الاَبرارُ
مصنف
علامہ حسین بخش جاڑا اعلی اللہ مقامہ

اشاعت اوّل ——— جون ۱۹۷۴ء

اشاعت دوم ——— نومبر ۱۹۸۰ء

مقامِ اشاعت ——— مکتبہ انوار النجف دریاخان

مطبع ——— ثنائی پریس سرگودہا

کتابت ——— محمد شفیق سرگودھا

قیمت ———

اشاعت سوم ——— نومبر ۱۹۹۲ء

ناشر:۔ حکیم محمد باقر جاڑا

مکتبہ انوار النجف دریا خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین

شیعان آل محمد کے لئے نادر و نایاب تحفہ

لمعۃ الانوار

فی

عقائد الابرار

مصنف

حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ حسین بخش صاحب مجتہد العصر مصنف تفسیر انوار النجف

ناشر

مکتبہ انوار النجف دریا خان ضلع بھکر

قیمت روپے صرف

فہرست

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّاہِرِیْنَ۔ اَمَّا بَعْد

اس دورِ پرآشوب میں جب کہ روز افزوں لادینی رجحان ہمہ گیر اتباعِ خواہشِ نفس کا طوفان بن کے بڑی سے بڑی چٹان کو اپنی راہ میں جمنے نہیں دیتا۔ کسی دینی خدمت کی طرف حقائق توجہ کرنا۔ ایک ایسا امر ہے جو کسی صورت میں عوام کی طرف سے قابلِ داد نہیں قرار پاسکتا۔ لیکن باوجود اس کے یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو کسی صورت میں نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اب جبکہ دین کا مجاگردوں سے آگے پھینکنے کے لئے طبائع بے قرار ہیں۔ دین کا علم بلند کرنے والے ہر جائز و ناجائز تنقید کا نشانہ ہیں۔ دین اور اس کی تعلیمات کو قصۂ پارینہ سمجھنے والوں کی سنت بے جا ہی کے لئے ہر رطب و یابس کے اگلنے پر کوئی پابندی نہیں اور اہلِ علم کلمۂ حق کہنے میں ترساں و لرزاں ہیں۔ منبرات کی زمین بیچنے والے عوام کے ہاتھ میں ترونی ہے وہ جس عالم کو چاہیں بے دین کہہ دیں چنانچہ وہ ہر وقت قیودِ دین سے آزادی کی خاطر علمائے اعلام کے عیوب کی تیروں کو کھونا اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ ایسے حالات علماء کے لئے اپنی ضمیر کی آواز بلند کرنا اور قلم کو ہاتھ میں تھام لینا جہادِ عظیم ہے میں اگرچہ اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتا ہوں۔ تاہم ناممکن ہے کہ سیلاب زدوں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جانا اپنے لئے گوارا کروں۔ عقائدِ مذہب حق کو وقتی تقاضوں کی دعوت عمل پر لبیک کہتے ہوئے مدلل و معبر اور آسان و سلیس اردو زبان میں پیش کر کے حتی الامکان اپنے اوپر عائد شدہ فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہوں اور اس مجاہدانہ تحفہ کو بارگاہِ حضرت حجت عجل اللہ فرجہ کی نذر کر کے اللہ سے دعا مانگتا ہوں کہ مومنین کو اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی سعادت بخشے اور اس کو میرے لئے اور میرے اساتذہ و والدین کے لئے صدقہ جاریہ قرار دے۔

حسین بخش عفی عنہ
(مؤلف کتاب)

دورِ حاضر میں مذہب کے مصائب

کون ذی ہوش نہیں جانتا اور کس ذی شعور سے یہ بات مخفی ہے کہ دشمنانِ اسلام ہمیشہ ہمیشہ کبھی چھپ کر اور کبھی کھل کر ہر آن و لمحہ میں اپنی پوری جد و جہد اور انتہائی تگ و دو سے ہدمِ اسلام کے لئے خطرناک اور مہلک ترین حربے استعمال کرتے رہے اور اس کو مٹانے گھٹانے اس کی خوشنما صورت کو مسخ کرنے اور اس کے پاکیزہ چہرہ کو داغدار کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں اور کون کون سے ہتھکنڈے بروئے کار لاتے رہے۔ حتّی کہ اقوامِ عالم کی نگاہوں میں "اسلام اور مشرق" کا عنوان افکار و انکار کی آماجگاہ بن گیا اور اسلام دشمن ذہنیت کی کد و کاوش کا انحصار بلکہ اس کی گردشِ فکر کا یہی ایک مسئلہ محور بن کر رہ گیا اور ان کی ہر خواہش اور نتیجہ کوشش صرف یہ ہے کہ اسلام پر فتح حاصل ہو اور صفحہ ہستی سے اس کے اثرات کا پوری طرح قلع قمع ہو جائے۔ تمام سیاستیں نمائشیں زیبائشیں آرائشیں ترقیاں عیاریاں عیاشیاں حیلہ سازیاں اور قلابازیاں صرف اسلام کے طائرِ قدسی کو اپنی مضبوط گرفت میں لانے کے خوشنما اور دلربا جال ہیں۔ تاکہ رُوحِ اسلام کو اسلامی ڈھانچے سے الگ کر دیا جائے اور لادینیت کو اس مقدس ڈھانچے کی رُوحِ رواں قرار دیا جائے اور اس کا نام رکھ لیا انسان کی فطری آزادی۔ پس اس مقصد کے حصول کے لئے مکر و فریب دھوکا و غدر۔ جبر و تشدد اور استبداد و غلبہ بلکہ ہر ممکن حربہ کو معرضِ استعمال میں لایا گیا۔ اقلام کی روانی۔ مقررین کی زورِ بیانی جاہ و منزلت کی نوید مسرت کتابوں کی بھرمار اخبارات و رسائل میں نشر و اشاعت کا بے پایاں سلسلہ مال و دولت کا طمع حسن عشرت کا لالچ کہیں تعصب کہیں تنفت کبھی اظہارِ خلوص کبھی ادائے خلوص غرضیکہ متعدد طرق و وسائل حتیٰ کہ روحانی قوتیں مذہبی فوجیں اور ان کے ساتھ ساتھ ظاہری طاقتیں بری، بحری اور فضائی سرو سامان نیز اسبابِ قہر و غلبۂ سلطنت کی وسعتیں سازشیں انجمنیں کانفرنسیں محبتیں دوستیاں نرمیاں سہل انگاریاں خیر خواہیاں اور رواداریاں غرضیکہ گوناگوں ذرائع کو بروئے کار لایا جا رہا ہے اور اسی کا نام ہے آج کل کی کامیاب سیاست اور اس سب ہاؤ ہو شور و شغب اور میل و ملاقات کی گردش صرف ایک نقطہ کے گرد ہے اور ان سب مدارات کا محور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اسلام کو ختم کر دیا جائے اور مسلمان کہلانے والے روحِ اسلام سے خالی ہو کر لادینیت کی زندگی

کو انسانیت کا کمال سمجھتے رہیں تاکہ اہلِ مشرق کی انفرادی حیثیت اور بنیادی طاقت مفلوج ہو کر
رہ جائے اور مسلمان ہمیشہ کے لئے اہلِ مغرب کے ہاتھ میں ایک کھلونا اور آلۂ کار بن کر غلامانہ ذہنیت
کو اپنا حق آزادی کہتے ہوئے اتراتے رہیں۔ پس اس طرح وہ اسلام دشمنی کی دلوں میں سلگتی ہوئی
آتشِ غضب کو اسلام حقیقی کے خون سے ٹھنڈا کرنے کے درپے ہیں۔ یقین سمجھئے کہ اہلِ اسلام
کی تعلیمات اسلامیہ سے نفرت و بغاوت اسی قسم کی ناپاک کوششوں اور سازشوں کے نتیجہ
میں ہے حتٰی کہ آج کل اسلام کے دعویدار ظاہر و باطن اور قول و عمل میں اسلام سے برسرِ پیکار
ہیں چنانچہ خود مسلمان اپنی شکل و صورت میں غیر اسلامی رنگ اور اپنی سیرت و کردار میں غیر اسلامی
ڈھنگ اپناتے ہوئے شرماتے نہیں بلکہ اتراتے ہیں اور عملی طور پر اسلامی بنیادوں کو کمزور کرنے
اور اس کے روشن فانوس کو بجھانے کے درپے نظر آتے ہیں۔ یہ مصیبت بلکہ متعدی مرض
ہمہ گیر سرایت کرتی جا رہی ہے اور یہ ایسی پُرخطر ہے کہ بغیر قوتِ ربانی اور امدادِ غیبی کے نہ تو
اس کی ہلاک امراض بلکہ مسلح افواج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے روگردانی کر کے نجات
حاصل کی جا سکتی ہے یقین جانئے کہ مغربیت کی رُوح نے وجودِ مشرق بلکہ پورے عالمِ اسلام
میں سرایت کر کے شعور شرافت احساس غیرت اور رُوحِ حمیت کو پوری طرح ان سے سلب
کر لیا ہے جس کے نتیجہ میں خود اہلِ اسلام اسلامی شعائر کا تمسخر اڑاتے اور دین والے دینی تعلیمات
سے جی چراتے نظر آتے ہیں اور اپنی کتاب (قرآن) کا بلا جھجک مذاق اڑاتے ہوئے اسے فرسودہ
خیالات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ مغربی سیاست کی روح اور اس کی ظاہری رنگینیوں نے اہلِ اسلام
کی عقول و اذہان کو اس طرح مغلوب و مسحور بلکہ ایسا اندھا و بہرہ کیا ہے کہ مغربیت زدہ مسلمان سے
اگر تبادلۂ خیال کا موقعہ ملے تو وہ اپنے تئیں حمایتِ دین اور نصرتِ اسلام کا دیوانہ ظاہر کرے گا
جب وہ اپنے جذباتِ اسلامی کا اظہار کرے گا تو معلوم ہوگا کہ اس کی رگ و پے میں اسلامی تعلیمات
کا بہت گہرا اثر ہے لیکن جب آپ میدانِ عمل میں اس کو دیکھیں گے تو معلوم ہوگا وہ سر سے
پیر تک اسلام سے بالکل بیگانہ بلکہ تعلیماتِ اسلامیہ کا کھلا دشمن ہے اس کے خیالات مغربی نظریات
کا آئینہ اس کی وضع و قطع مغربیت کی پیداوار میلان و رجحان میں مغربیت کا اثر شکل ان جیسی بات
ان جیسا گفتار ان جیسی کردار ان جیسا حتّٰی کہ ڈھونڈنے سے آپ کو اس میں اسلام کا ایک نشان تک نہ ملے
گا اور اس کا پورا وجود مغربیت کا نعرہ لگاتا نظر آئے گا (باطن کو تو صرف اللہ ہی بہتر جانتا ہے)
اور یہ صرف کورانہ تقلید اور جہلِ مرکب کا ہی نتیجہ ہے جو دنیاوی مزخرفات، اور اس کے دل کو زینہ

پھندوں کی بدولت اسے نصیب ہوئی جس کے دھوکے سے وہ حقیقت و واقعیت کو کھو بیٹھا یہ رُوح فرسا واقعات اور ہوشربا حالات مقامِ بحث نہیں کیونکہ سب کا آنکھوں دیکھا معاملہ ہے جو ہر صاحبِ ضمیر انسان کے دل کو خون کے آنسو رُلاتا ہے۔ دورِ سابق کا مسلمان جن واقعات کو پیشین گوئی کی زبان سے سُن کر محوِ حیرت رہ جاتا تھا آج کا مسلمان ان واقعات سے دوچار ہے بلکہ خود اپنی حرکات و عادات کا مرتکب ہے جن سے اسلام سربگریبان ہے اور غالباً دورِ سابق کا مسلمان جو کچھ سن کر برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اگر آج دیکھتا تو یقیناً فرطِ غم سے اس کا دل نیل ہو جاتا یہ ہے وہ دردمند دل کی فریاد جو علامہ محمد حسین مرحوم آل کاشف الغطا نے مقدمہ دین و اسلام میں درج فرمائی ہے۔

شیعہ قوم کی زبوں حالی

یہاں تک تو اسلام کی عمومی حیثیت کا رونا تھا جس کی تعلیم ظاہراً و باطناً عمل و عقیدہ کے لحاظ سے روز بروز مسخ ہوتی چلی جارہی ہے۔ سچ پوچھئے تو اسلام برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ البتہ دنیا کے گوشوں میں اللہ والے بھی موجود ہیں جو باوجود نامساعد حالات کے اسلامی تعلیمات اور قرآنی فرمائشات کو بصد احترام سینے سے لگائے ہوئے اپنے دل میں ایمان و یقین کی شمع فروزاں کئے ہوئے ہر مشکل و مصیبت کا سینہ تن کر مقابلہ کرتے ہوئے اور ہر قسم کے طعن و تشنیع کو برداشت کرتے ہوئے لمحاتِ زندگی کو مرضاتِ خداوندی کے ماتحت پورا کرنے کا عہد کئے ہوئے ہیں، جن کی بدولت عالمِ ہستی زیورِ بقا سے آراستہ ہے اور اہلِ عالم عذابِ خداوندی سے محفوظ ہیں۔ میں اسلام کے اس عمومی ماتم سے آگے بڑھتا ہوں اور منظریہ بیان کے وہ نکات پیش کرتا ہوں جو قطراتِ باراں کی طرح آسمانِ فکر سے لوحِ ضمیر پر برستے ہوئے قلم کو لکھنے پر زباں کو بولنے پر اور انگلیوں کو کاغذی میدان میں دوڑنے پر مجبور کرتے ہیں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے غالباً ہر حساس ذہن کو یہ بات کھٹکتی ہوگی کہ جس طرح اقوامِ عالم میں مسلم قوم مجموعی طور پر گراوٹ اور پستی کی طرف روز افزوں مائل ہے اسی نسبت سے مسلمانانِ عالم میں سے شیعہ قوم اپنی مذہبی خصوصیات سے بیگانگی اختیار کرتے ہوئے روز افزوں روبتنزل ہے جس طرح عام مسلمان مغربیت کی چاشنی میں اسلام سے بیگانہ ہو کر اس کی تعلیمات سے اصولاً و فروعاً متنفر بلکہ باغی ہے اسی طرح شیعہ مسلمان دنیاوی بادگروں اور جذباتی جھکولوں سے متاثر ہو کر شعائرِ امامیہ اور علائمِ شیعہ سے غافل بلکہ بیکسو ہوتا چلا جارہا ہے۔ اب ہر شخص کے ذہن میں یہ بات سمائی ہے کہ مذہب کی حقیقت وہ ہے جس کو میں ہی سمجھتا ہوں اور غضب

بالائے غضب یہ کہ بعض ایسے لوگ جن کو مذہب شیعہ کے معمولی اور چھوٹے سے چھوٹے فرعی مسئلہ تک کی خبر نہیں۔ وہ بڑے بڑے مذہبی اصولی مسائل کو اپنے نزدیک بدیہی کہہ کر بڑے بڑے اعلام مذہب کی تحقیر و تذلیل میں زبان کشائی کرتے نظر آتے ہیں اور طرہ یہ کہ جن لوگوں سے دین کو حاصل کرنا تھا ان کو بے دین کہہ کر اپنی بے دینی کو دین کا نام دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب کسی شیعہ سے آپ ملیں گے اور اس کے جذبات کو سنیں گے تو آپ کو ایسا لگے گا۔ کہ پوری دنیائے شیعیت اس کے سینہ میں سمائی ہے اور مذہبی درد سے اس کا دل بے چین ہے لیکن جب تجزیہ کرکے دیکھیں گے تو شیعیت برائے نام ملے گی۔ اور مذہب کی حقیقت خواہشات نفس کا ایک پلندہ نظر آئے گا اور اصولاً و فروعاً اس کا ذہن مذہب حقیقی سے باغی ہوگا۔ بلکہ صرف اس کے نزدیک وہی واجب التسلیم ہوں گے۔ جن کو اس کے جذبات معتبریت کی سند دیں گے یہ تو ہے تسلیم کا معاملہ باقی رہی عمل والی بات تو سر سے پیر تک اس کے پورے وجود میں شیعیت کا ایک نشان تک نہ ملے گا۔ نہ شکل میں نہ لباس میں نہ وضع قطع میں اور نہ گفتار و کردار میں جیساکہ ایک روایت میں ہے کہ ایک زمانہ آئے گا۔ جس میں معروف منکر اور منکر معروف بن جائے گا۔ ایسے حالات میں جب مذہب آئمہ کی طرف اس کی رہنمائی کی جائے تو وہ فوراً اپنی اصلاح کی بجائے رہنمائی کرنے والے بڑے سے بڑے عالم دین کو دین دشمنی کا خطاب دینے کی جسارت کرکے اسے اپنی دینی بیداری اور مذہب دوستی سمجھتے ہوئے فخر و مباہات کرتا نظر آتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ اہل علم حقائق بیانی سے جھجک محسوس کرتے ہیں اور عیار لوگ کذب بیانی پر اتراتے نظر آتے ہیں اہل علم کی زبانوں کو حق بیانی سے روکا جاتا ہے لیکن اعلان باطل کرنے والے باچھیں کھول کھول کر اتراتے ہیں۔ اہل حق کی حق بات کو غلط انداز سے پیش کیا جاتا ہے اور اہل باطل کی غلط باتوں کی تاویلات کو قبول کرنے میں ذرا بھر تامل نہیں ہوتا۔ قوم کا ناباش طبقہ قوم کی یہ زبوں حالی دیکھ کر خاموش بیٹھ گیا ہے اور اہل درد اپنے اپنے مقام پر دم بخود ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس نے اس کتاب کی تحریک و اشاعت کی طرف حقانی عزم کو موڑنے والی توجہ خاص کو مہمیز کیا ہے تاکہ موعظہ حکمت سے دائرہ تدبر اور آسمان تفکر پر نازل ہونے والے مخطوف رموز و اسرار کو کھلی ہوئی تفسیر کے ساتھ پیش کیا جائے اور حدیث میں ہے کہ جب بدعت عام ہو جائے تو عالم کو اپنا علم ظاہر کرنا چاہیے۔ اگر کوئی عالم عمداً ایسا نہ کرے گا تو اس پر اللہ کی لعنت ہوگی۔

معیارِ مذہب

میں جذبات کے کیچڑ میں اپنے قلم کے دامنے کو لوث کرنا نہیں چاہتا

کی حیرت انگیز تخلیق جس مبداء فیض کی پرازحکمت صنعت اور اس کے احسان و کرم کی رہین منت ہے وہی مبداء فیض باقی تمام عالم علوی و سفلی کی ایجاد و تخلیق کا فاعل حقیقی ہے اور نظام عالم میں محکم اور لازوال حکمتوں کا وجود اس کے جامع صفات کمال ہونے کی بولتی ہوئی زبان ہے اور اسی سے اس کے عدل کے سربستہ رموز بھی عیاں ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہی فکر جوں جوں آگے بڑھتی چلی جاتی ہے معرفت خالق میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے چنانچہ تمام کائنات علوی و سفلی کا پرازحکمت نظام اور اس میں کبھی کسی خامی اور نقص کا نہ ہونا نیز موجودات کا تصادم سے بچا رہنا صاف پتہ دیتا ہے کہ اس نظام کا مالک، خالق اور مدبر صرف ایک ہی ذات ہے پس صفات ثبوتیہ خداوندی اسی طرح آسانی سے ہر ذی شعور انسان ذہن نشین کر لیتا ہے۔

اور معاد کی فکر انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کیا روح و بدن کے افتراق کے بعد کوئی اور مقام بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کیا اس زندگی کا اس پر کچھ اثر ہوگا یا نہ؟ اور اگر ہوگا اور یقیناً ہوگا تو نیکی کا اثر اچھا ہونا چاہیئے جس کو سعادت ابدیہ سے تعبیر کیا جائے اور برائی کا اثر برا ہونا چاہیئے جسے شقاوت سے تعبیر کیا جائے پس سعادت ابدیہ کا نام اسلام کی زبان میں جنّت ہے اور شقاوت کا نام جہنم ہے۔

بنابریں انسان خود بخود سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نیکی ہر وہ عمل ہے جو خالق حکیم مبداء فیض کے منشائے تخلیق کے موافق ہو اور جو اس کے قرب و رضا کا موجب ہو اور برائی ہر وہ عمل ہے جو خالق کی منشائے ایجاد کے خلاف اور اس کی ناراضگی کا باعث ہو۔

ضرورت نبی و رسولؑ

پس خوشنودی خدا کے حاصل کرنے اور شقاوت دائمہ سے بچنے کے لئے انسان کو ضرورت ہے ایسے ہادی کی جو عقائد حقہ کی صحیح تعلیم تفصیل سے دے سکے اور ادلہ و براہین سے ان کی پوری وضاحت کر سکے۔ چونکہ انسانوں میں کلی طور پر دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ایک عقل سلیم اور فہم مستقیم رکھنے والے جو قابل قبول دلائل کو سن کر سر تسلیم خم کر لیا کرتے ہیں اور دوسرے اکھڑ مزاج، ہٹ دھرم ضدی اور کند دماغ لوگ جن پر دلائل و براہین بہت کم اثر انداز ہوتی ہیں۔ لہذا وہ خارق عادت اشیاء کے ظہور کو کسی کی صداقت کا معیار سمجھتے ہیں۔ لہذا نبی و رسول میں ان دونوں صفتوں کا ہونا ضروری ہے یعنی صاحب بیان بھی ہو اور صاحب اعجاز بھی ہو۔ مبداء فیض خالق حکیم چونکہ انسانی کمزوریوں کو جانتا ہے لہذا منشائے تخلیق اور صرار رہتا اگر انسان کی معاد کی کامیابی بلکہ دنیاوی و اخروی فلاح

کے تفصیلی طرق کی تفہیم کا وہ خود انتظام نہ فرماتا۔ پس اس نے اپنے کمالِ لطف و احسان کے پیشِ نظر یہ مرحلہ خود ہی آسان فرما دیا کہ اپنی جانب سے ایسے ہادی بھیجے جو خود انسانی زندگی میں کامل تھے اور عامۃ الناس کو کامل بننے کی دعوت دیتے تھے انہوں نے انسانوں کو معاشی و اقتصادی مسائل کے ساتھ ساتھ منازلِ آخرت کی فلاح کے اصول اور دستور بھی بتائے اخلاقی معاشرتی اور تمدنی تمام طریقے آسان انداز میں بیان کئے تاکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں انسان منصفانہ زندگی گذار کر اپنے خالق کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کر کے سعادتِ ابدیہ حاصل کر سکے اور مرنے کے بعد جنّت کا حقدار ہو۔ پس اللہ خالقِ حکیم نے اپنے انبیاء کو ہر دو صفتوں سے نواز کر بھیجا کہ اصولِ دین کو بیان واضح سے منوا سکیں اور بوقتِ ضرورت معجزہ سے بھی ان کو اپنے مسلک کا قائل کرا سکیں۔

مبداء و معاد کے یقین کے بعد انسان کو نبی کی ضرورت اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے وصی کی ضرورت کا یقین لازمی ہے اور یہی عقائد ہیں جن کو اسلام کی بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے اور انہیں اصولِ دین کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ باقی عقائد سب جزوی حیثیت رکھتے ہیں جو انہی عقائد کی فروع ہیں۔

نتیجۂ فکر یہ عقائد اسلامیہ فلاحِ دنیاوی اور نجاتِ اخروی کے ایسے پائیدار اصول ہیں۔ کہ دل و دماغ کا ان کو قبول کر لینا۔ شرفِ انسانی کے حصول کا مؤثر ترین زینہ ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ اسلام پر جس قدر مصائب آئے اس کی واحد وجہ صرف یہی ہے کہ اہلِ اسلام کے قلوب سے یہ رنگ مٹ گیا اور ان کے عقول ان حقائق سے ناآشنا ہو گئے پس مسلمانوں کی تمام تر کمزوریوں کا واحد سبب ان کے دین کی کمزوری ہے اگر آپ دریافت کریں۔ کہ قوم شیعہ میں دینی کمزوری کو راستہ کہاں سے ملا تو اس کا جواب ایک تو وہی ہے جو بالعموم اسلام کی کمزوری کا سبب ہے یعنی روح مغربیت کا نفاذ اور دنیا کی ظاہری آرائشیں نمائشیں رنگ رلیاں اور عیاشیاں جس کی بدولت نقوشِ مذہب کافی حد تک دلوں سے ہٹ گئے اور روحانی تعلقات کے سلسلے غلاموں کے آقاؤں سے کٹ گئے اور دوسرا سبب شیعہ قوم میں دینی کمزوریوں کا یہ بالخصوص ہے کہ صاحبانِ منبر اور اربابِ علم نے اپنا فریضہ رشد و ہدایت ترک کر دیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقدس فریضہ کی ادائیگی سے غیر معمولی کوتاہی برت لی۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ غفلت شعاریاں کیوں کر معرضِ ظہور میں آئی تو اس کے

جواب میں خاموشی ہی بھلی۔

مصلّٰی اور منبر

عوام میں دینی حس کو بیدار کرنے اور اسے بیدار رکھنے کے لئے اسلام میں دو مرکز مقرر ہیں۔ ایک مصلّٰی اور دوسرا منبر۔ لیکن دوسرے کا دائرہ اثر پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہے کیونکہ پیشنماز جسے مصلّٰی سپرد کیا گیا ہے وہ صرف اسی حلقہ کی اصلاح کی کفالت کر سکتا ہے جو اس کے مصلّٰی کے زیر اثر ہوں یعنی پیشنماز صرف اپنے مقتدی حضرات تک تعلیمات اسلامیہ کی تبلیغ و ترویج کر سکتا ہے لیکن بخلاف اس کے منبر پر آنے والا دور دور تک اطراف مملکت اور اکناف سلطنت کے اندر دینی آواز کو پہنچا سکتا ہے اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ فریضہ انجام دے سکتا ہے پس صاحب منبر پر صاحب مصلّٰی کی بہ نسبت زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ہمارے فرقہ میں بحمداللہ مصلّٰے کا تقدس آج تک باقی ہے اور اس کو آج تک کوئی فرد چیلنج کرنے کی جرأت نہ کر سکا پس شیعہ مذہب میں کسی فاسق و فاجر نیز نا اہل کو مصلّٰی سنبھالنے کی اجازت نہ دی گئی اور تمام اہل مذہب اس قانون شرعی کی پاسداری اور پاسبانی کرتے چلے آئے۔ لیکن منبر کا تقدس جو ذمہ داری کے لحاظ سے مصلّٰی سے کہیں زیادہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ہمارے ہاں بالکل مفقود ہو گیا۔ چنانچہ اہل کی بجائے نا اہل کثرت سے منبر پر آگئے اور عدالت بلکہ شرافت کو پائے تحقیر سے ٹھکرانے والے بعض حضرات بھی منبر کے اجارہ دار بن گئے۔ جس کے نتیجے میں منبر غیر ذمہ دارانہ بیانات خود ساختہ خیالات اور عامیانہ توہمات کی نشر و اشاعت کا اڈا بن گیا اور حد ہو گئی کہ اسلامی ابتدائی اور ضروری مسائل سے تہی دامن لوگ اپنی چرب لسانی کے بل بوتہ پر مذہب کے ٹھیکہ دار متصور ہوئے۔ جو بات دل میں آئی اسے عقیدہ مذہب کہہ کر انہوں نے منبر پر اچھالنے کی ناپاک کوشش کی اور جس بات پر عوام کی جانب سے واہ مل گئی خواہ کتنی بے تکی ہی کیوں نہ ہو۔ اسے مسلمات مذہب میں سے شمار کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ غیر متشرع لوگ جن کا منبر پر قدم رکھنا ہی منبر کی توہین ہے۔ ان کو منبر کی زینت کہا جانے لگا۔ جب مذہب ان مصائب سے دوچار ہوا تو درد دین رکھنے والا گروہ تڑپ اٹھا۔ علماء نے ان دھاندلیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ منبر کی حرمت کی دھائی دی۔ اہل قلم نے قلم ہاتھ میں لیا اور اخبارات و رسائل کے ذریعے سے مذہبی حقائق کی اشاعت کی لیکن لادینیت کا بڑھتا ہوا سیلاب روز افزوں بڑھتا چلا گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ عوام جری ہو گئے اور انہوں نے اپنے خیالات اور جذبات کو حقیقی

مذہب کا نام دینا شروع کر دیا۔ وہ علمائے اعلام جنہوں نے مذہب کے اصول و فروع کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ شب و روز جن کا مشغلہ تحقیق و تدقیق اور تدریس و تصنیف ہے اور جن کی طرف رجوع کرنے کا عوام کو آئمہ نے حکم دیا تھا۔ ایسے علماء پر عوام اپنے خیالات کو مسلط کرنا ضروری سمجھتے ہیں پس ان کے نزدیک وہ عالم گردن زدنی ہے جو ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائے۔

غیر ذمہ دار خطیب حضرات جو عوام میں غلط سلط خیالات کا بیج بو کر ان کو مذہب کے حقائق سے دُور رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے علماء پر زیادہ سے زیادہ کیچڑ اچھالنے میں اپنی بہتری سمجھی کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ اگر منبر کو صرف اہل تک محدود کر دیا گیا تو ہمارے حلوے مانڈے خطرہ میں پڑ جائیں گے۔ پس انہوں نے عقائد مذہب کو زیادہ سے زیادہ زخمی کرنے کے اقدامات شروع کر دیئے تاکہ عوام جذبات کی رَو میں ان کے پیچھے رہیں اور علماء سے ان کا تنفر بڑھتا جائے۔ اب حالت یہ ہے کہ جب ایک غیر شیعہ کو کسی شیعہ مجلس میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہ خلافت اور فدک کے مختلف فیہ مسائل کو سوچنے کی بجائے توحید کے متفقہ مسئلہ میں بھی شش و پنج ہو کر پلٹتا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جو اہل دل پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

روضہ خوانی کا مقدس فریضہ

مجلسوں کا انعقاد اور امام باڑوں کی آبادی روضہ خوانی اور عزاداری کا قوم شیعہ کے ساتھ تعلق جسم و جان اور قالب و روح کا ہے اور قوم شیعہ کے پاس یہ ایک ایسی تبلیغی درس گاہ ہے جو اقوام عالم میں سے کسی قوم کو نصیب نہیں ہوئی اور میرا ایمان ہے کہ حضرت سید الشہداء کی عزاداری نجات اخروی کا بہترین ذریعہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ روضہ خوانی کی آڑ میں ہر قسم کی دھاندلی کو برداشت کر لیا جائے بلکہ روضہ خوان (ذاکر) کے لئے اپنی حدود کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اسے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے گریز کرنا چاہیئے۔ پس اس کا بیان ذاکری تک محدود رہنا چاہیئے۔ علماء کے اختلافی مسائل میں اس کا کود پڑنا دخل در معقولات ہے۔ میں نے ایک اچھے خاصے سمجھدار صاحب منبر سے سُنا ہے کہ ذاکر پر کوئی پابندی عائد نہیں کرنی چاہیئے وہ نیک ہو یا بد اسے عام اجازت ہے جو چاہے بیان کرے آخر وہ ایک دن خود ہی سمجھ جائے گا۔ نیز مصلے کے لئے تو عدالت شرط ہے لیکن منبری کے لئے عدالت کبھی بھی شرط نہیں ہے مجھے ایسے بیانات کو سن کر افسوس ہوتا ہے جبکہ اپنے مطلب کی تائید کے لئے شاطر مزاج لوگ بعض روایات کا سہارا بھی لے لیتے ہیں

لیکن مصالحِ مذہب جو (اتحاد) ثابت ہیں ان کو کچلنے اور مذہب کی توہین کرنے میں یہ لوگ ذرہ برابر جھجک نہیں محسوس کرتے کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضروری واجبات یہ لوگ بھولتے ہیں۔ کیا روضہ خوان ذاکرین کی غیر شرعی دھن و قطع اور غیر شرعی حرکات و سکنات دیکھنے والوں کے لئے مذہب شیعہ کی سبکی کے موجب نہیں ہیں کیا کسی ذاکر کا فسق و فجور مجلس و منبر کے تقدس کے لئے چیلنج نہیں؟ کیا ذاکر کی غلط کاریاں عوام کی بداعمالیوں اور بدعقیدہ رویوں کی محرک و موید نہیں؟

میرے خیال میں جس قدر غیر ذمہ دار افراد منبر پر مسلط ہیں۔ انہیں صرف روضہ خوانی تک محدود رہنا چاہیئے۔ کوئی اہل علم اس طرز عمل کو برا نہیں مانتا لیکن اپنی حدود سے آگے بڑھ کر مقاماتِ مذہب کی دھجیاں اڑانا اور علماء کے خلاف زبان کشائی کرنا نہایت غیر محمود طرزِ عمل ہے جو صرف تخریب ہی تخریب ہے۔ فضائل آلِ محمدؐ کے بہانہ سے توحید باری کے دامن کو تار تار کرنا خدمتِ مذہب نہیں اسی طرح ولائے آلِ محمدؐ کے بیان میں اعمال اور فروعِ مذہب سے دست کش ہونا اور گناہوں پر لوگوں کو جرأت دلانا ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکات ہیں جن کو آلِ محمدؐ کبھی معاف نہیں فرمائیں گے۔ اگر ولائے آلِ محمدؐ کو ایسے رنگ میں بیان کیا جائے کہ نہ توحید و عدل کا پاس رہے نہ اعمال کے حسن و قبح میں فرق رہے اور نہ قیامت کے حساب و کتاب کی عظمت رہے تو یہ دین سے کھلی ہوئی بغاوت ہے حق تو یہ ہے کہ ولائے آلِ محمدؐ اس انداز سے بیان ہو کہ توحید و عدل کا عقیدہ سمجھ میں آجائے اور اعمالِ صالحہ سے محبت پیدا ہو اعمالِ بد سے توبہ کی شوق اور آئندہ ان سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو نیز قیامت کے حساب و کتاب کا خوف دلوں پر طاری ہو تاکہ سننے والے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر اٹھیں لیکن اس قسم کا بیان وہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جو منبر کے اہل ہوں۔

علمائے اعلام کا مقام

جس طرح مبداء فیض کی خوشنودی اور نجاتِ اخروی کے لئے معالم دینیہ حجتِ خدا نبی و رسول یا اس کے صحیح قائم مقام وقت سے حاصل کرنے ضروری تھے۔ اسی طرح چونکہ زمانِ غیبت میں عامۃ الناس کو بے راہ نہیں چھوڑا گیا بلکہ ان کو اپنے دور کے علماء کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ کتاب اکمال الدین میں اسحاق بن یعقوب سے حضرت حجتؑ کا تحریری ارشاد منقول ہے۔ و اما الحوادث الواقعة فارجعوا فیها الی رواة احادیثنا فانهم حجتی علیکم و انا حجة الله

عَلَيْهِمْ۔ یعنی پس آئندہ کے مسائل میں ان لوگوں کی طرف رجوع کرو۔ جو ہماری حدیثوں کے راوی ہیں۔ وہ میری جانب سے تم پر حجت ہیں اور میں اُن پر حجت خدا ہوں اور بروایت احتجاج حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے۔ فَأَمَّا مَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِنًا لِنَفْسِهِ حَافِظًا لِدِينِهِ مُخَالِفًا عَلَى هَوَاهُ مُطِيعًا لِأَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِّ أَنْ يُقَلِّدُوهُ۔ پس جو شخص فقہاء میں سے اپنے نفس پر قابو رکھنے والا، اپنے دین کا محافظ، خواہش نفس کا مخالف اور اپنے مولا کا اطاعت گذار ہو تو عوام کو اس کی تقلید کرنی چاہیئے۔ نیز کافی میں بروایت عمرو بن حنظلہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث طویل میں منقول ہے کہ آپ نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ قَدْ رَوَى حَدِيثَنَا وَنَظَرَ فِي حَلَالِنَا وَحَرَامِنَا وَعَرَفَ أَحْكَامَنَا فَلْيَرْضَوْا بِهِ فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ عَلَيْكُمْ حَاكِمًا فَإِذَا حَكَمَ بِحُكْمِنَا فَلَمْ يَقْبَلْهُ مِنْهُ فَإِنَّمَا اسْتَخَفَّ بِحُكْمِ اللّٰهِ وَعَلَيْنَا رَدَّ وَالرَّادُّ عَلَيْنَا كَالرَّادِّ عَلَى اللّٰهِ وَهُوَ عَلَى حَدِّ الشِّرْكِ بِاللّٰهِ الخ یعنی جو شخص تم میں سے ہماری حدیثوں کا راوی ہو اور ہمارے حلال و حرام میں نظر رکھتا اور ہمارے احکام کو جانتا ہو تو شیعوں کو چاہیئے کہ اس کے فیصلے پر رضامند ہو جائیں کیونکہ ایسے شخص کو میں نے تم پر حاکم مقرر کیا ہے پس جب وہ ہمارے حکم کے مطابق فیصلہ کرے اور کوئی اس کو قبول نہ کرے تو اس نے اللہ کے حکم کی توہین کی۔ اور ہماری بات کی تردید کی اور ہماری تردید اللہ کی تردید جیسی ہے اور وہ شرک کی حد پر ہے۔ الخ اسی طرح بروایت کشی حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے منقول ہے جب کہ آپ سے دو آدمیوں نے بذریعہ خط و کتابت دریافت کیا کہ ہم مسائل دینیہ میں کیسے لوگوں پر اعتماد کریں۔ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ اِعْتَمِدَا فِي دِينِكُمَا عَلَى كُلِّ مُسِنٍّ فِي حُبِّنَا وَكُلِّ كَثِيرِ الْقَدَمِ فِي أَمْرِنَا یعنی تم دینی معاملہ میں ایسے شخص پر اعتماد کرو جو ہماری محبت میں پختہ کار اور ہمارے شرعی امور میں تجربہ کار ہو۔

اس میں شک نہیں کہ جناب رسالتمآبؐ اور اس کے اوصیائے طاہرین علیہم السّلام تمام مسائل کے لحاظ سے مرجع خلق اور ملجائے امت تھے۔ اقتدار ظاہری کے زمانہ میں تو انہیں مسائل دینیہ کے علاوہ مطالب دنیاویہ میں بھی مرجعیت کا درجہ حاصل تھی اور وہ تمام پیش آمدہ مشکلات کو بنفس نفیس خود یا بذریعہ وکلائے خاص و عامہ حل فرمایا کرتے تھے پس جس طرح جناب رسالتمآبؐ

اپنے مقام پر وحی کی ترجمانی فرماتے اور لوگوں کی دینی و دنیاوی امور میں رہبری فرماتے تھے۔ اور اطراف و اکناف میں صحابہ کرام آپ کی نیابت کا فریضہ ادا کرتے ہوئے لوگوں کو حقائق اسلامیہ سے روشناس کرانے کا شرف حاصل کرتے تھے اسی طرح حضرت امیرالمومنین علیہ السلام زمان خلافت ظاہریہ میں خود کوفہ میں ملجاؤ ماوائے خلق تھے اور آپ کے نائبین اطراف مملکت میں فرائض تبلیغ ادا کرنے پر مامور تھے مثلاً بصرہ میں عبداللہ بن عباس مدائن میں سلمان پاک اور مدینہ میں قثم بن عباس وغیرہ

امام حسن علیہ السلام کی صلح کے زمانہ سے لے کر حضرت قائم آل محمد علیہ السلام کی غیبت تک جب کہ اہل بیت اطہار اقتدار ظاہری سے محروم کر دیئے گئے۔ اس دور میں اپنے مقام پر آئمہ طاہرین علیہم السلام یکے بعد دیگرے مسائل دینیہ اور معالم شرعیہ کی تبلیغ کے خود کفیل رہے اور مملکت اسلامیہ کے دور دراز کے علاقوں کے لئے علمائے اعلام ہی فریضہ نیابت خاصہ و عامہ ادا فرماتے رہے اور تمام شیعوں کو اپنے مقامی علماء کی طرف رجوع کرنے کا حکم آئمہ طاہرین نے دے دیا تھا۔ جیسا کہ کتب رجال میں صراحت و وضاحت سے مذکور و مسطور ہے چنانچہ زرارہ بن اعین محمد بن مسلم ابان بن تغلب ابوبصیر زکریا بن آدم یونس بن عبدالرحمٰن اور ان کے علاوہ دیگر چند خواص کی طرف مسائل دینیہ میں رجوع کرنے کا حکم آئمہؑ کی جانب سے اپنے زمانہ کے دور کے بسنے والے شیعوں کے لئے مذکور ہے۔ پس یہ بزرگوار باحسن وجوہ فریضہ نیابت ادا فرماتے رہے اور حضرت قائم آل محمد علیہ السلام کی غیبت کبریٰ کے زمانہ میں معصومینؑ کی جانب سے عمومی حکم کے ماتحت علمائے اعلام تمام دنیائے شیعیت کے لئے مرجعیت کا عہدہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی چند احادیث بیان کی جا چکی ہیں۔ جن کا مضمون علمائے اعلام کی نیابت کی سند ہے پس ان حقائق کے پیش نظر علماء سے روگردانی اور ان کی تردید آئمہ کی تردید اور حکم خدا کی توہین کے برابر ہے جسے معصومؑ نے حد شرک سے تعبیر فرمایا ہے۔

مقتضائے عقل

عقل سلیم کا یہ مسلمہ ہے کہ جو جس مقام کے اہل ہے اسے اسی مقام پر رہنا چاہیئے اور اس کو اس مقام سے بڑھانا افراط اور گھٹانا تفریط ہے پس جو جس فن کا ماہر ہے اسے صرف اسی فن میں مرجعیت کا حق حاصل ہے اور اس کی اس فن میں رائے قابل قبول ہونی چاہیئے مثلاً فن طب کا ماہر اپنے فن میں رائے کا حق رکھتا ہے۔ اور اس فن سے تہی دست لوگ خواہ کسی دوسرے فن میں ماہر ہی کیوں نہ ہوں اس کے قول کا

احترام کرنا ان کا عقلی و فطری فریضہ ہے۔ اسی طرح ریاضی کے ماہر کا اپنا مقام۔ فن منطق کے ماہر کا اپنا مقام سائنس دان کا، جج، وکیل اور مجسٹریٹ کا اپنا اپنا مقام ہے اسی حفظ مراتب کا نام ہے انصاف و عدل اور یہی تمدن صحیح کا پیش خیمہ ہے پس اسی اصول کے ماتحت عالم دین کا مقام اپنی نوعیت کے لحاظ سے دینی مرجعیت ہے اور جو لوگ اس مرتبہ سے پست ہیں خواہ وہ کسی دوسرے فن کے لحاظ سے مرجعیت ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ انہیں دینی مشکلات میں عالم دین کے سامنے اپنی رائے کے پیش کرنے کا کوئی حق نہیں جس طرح کہ ان کے فنون میں عالم دین کو رائے زنی کا حق نہیں پہنچتا۔ مثلاً ایک شخص نے طبیعات میں اپنی عمر کا کافی حصہ خرچ کرکے اس میں کسی حد تک کمال حاصل کیا ہے اور وہ سائنس کی گتھیوں کو سلجھانے کی کسی حد تک صلاحیت رکھتا ہے تو وہ شخص جو عمر بھر علوم دینیہ اور مسائل شرعیہ کی بحث و تمحیص میں مصروف رہا ہے اسے کیا حق ہے ؟ کہ وہ مسائل طبیعہ میں رائے قائم کرے یا سائنس دان کے نظریے کو چیلنج کرے پس اسی طرح دنیاوی علوم کے ماہرین کا علوم دینیہ کے ماہرین کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا عقل کا بدیہی فیصلہ ہے بنا بریں وہ لوگ جو عوام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذہب کے کس قدر دلدادہ کیوں نہ ہوں۔ زہد و تقویٰ خضوع و خشوع کی دولت سے کس قدر سرشار کیوں نہ ہوں اور عبادت و ریاضت میں ہر امکانی بلندی پر کیوں نہ فائز ہوں وہ دینی مشکلات میں رائے زنی کا حق نہیں رکھتے انہیں عقل کے اس فیصلہ کے سامنے سر جھکانا پڑے گا کہ جس شخص نے تحقیق مذہب میں ایک وقت صرف کیا ہے بس اس کا دینی فیصلہ ہی قابل احترام ہے۔

قرآنی فیصلہ

اس سلسلہ میں اولاً کسی ذی ہوش کو مجال انکار نہیں لیکن اگر مزید تسلی کی ضرورت ہو تو قرآن کریم کا حکم ہر ذی شعور مسلمان کے لئے آخری حکم ہے چنانچہ ارشاد پروردگار ہے مَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (پ ۱۱ سورہ توبہ) آیت ۱۲۲)

ترجمہ :- مومنوں کے لئے مناسب نہیں کہ سب کے سب کوچ کریں۔ پس ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہر قوم میں سے ایک ایک گروہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کوچ کرے۔ اور واپس آکر اپنی قوم کو تبلیغ کرے تاکہ وہ مخالفت خدا سے خوف کریں اور آئمہ طاہرین سے متواتر روایات منقول ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ آیت تحصیل علوم دینیہ کے وجوب کو ثابت کرتی ہے چنانچہ

کہ لفظ کا تخصیصی کلمہ بھی اس پر شاہد ہے اور علم دین حاصل کرنے کی غرض جو قرآن نے بتائی ہے وہ ہے انذار یعنی اپنی اپنی قوم کو تبلیغ کرنا اور گناہوں سے ڈرانا تو پس جب علم حاصل کرنے والے پر انذار و تبلیغ واجب ہے تو سامعین جو ان کی قوم ہے ان پر قبول کرنا بھی واجب ہونا چاہیئے پس اس آیت مجیدہ میں تعمق کرنے سے عالم کا مرتبہ صاف معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو اس مرتبہ کا اہل نہیں اس پر قبول کرنا واجب ہے اور اسے اپنی رائے سے فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور اسی کا نام تقلید ہے۔

علم و عمل میں مطابقت

اس میں شک نہیں کہ ناموس حیات میں پہلا واجب اور زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کا اولین فریضہ ہے کہ عمل و علم میں مطابقت ہو اور چونکہ علوم جداگانہ ہیں۔ لہٰذا ان کی مناسبت سے اعمال کی نوعیت الگ الگ ہے لیکن ہر عمل کی صحت کا معیار اس علم کی مطابقت سے ہے جس کا تعلق اس عمل سے ہو ورنہ کوئی عمل بغیر مطابقت علم کے مثل اس مکان کے ہے جو ناموزوں اور ناپائیدار بنیادوں پر کھڑا کیا گیا ہو؟ وہ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں آخرکار منہدم ہو کر رہنے والے کے لئے جان لیوا نہیں تو سوہانِ رُوح ضرور ہی بنے گا۔

اسی طرح علم بغیر عمل کے مثل اس بنیاد کے ہے جس پر تعمیر نہ ہو پس اس کا مالک ہمیشہ زیر آسمان زندگی بسر کر کے مصائب و آلام کا شکار ہی رہے گا اور سرما و گرما کی شدتیں آخرکار اسے صفحۂ ہستی سے ایک دن حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیں گی پس علم و عمل انسان کے لئے دو آنکھیں بھی ہیں اور دست و پا بھی بلکہ انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کامیاب نتیجہ یا اس کی سعادت ابدیہ تک رسائی علم و عمل کی یگانگت کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی بنا پر معصوم نے عوام کو فقہاء میں سے اس کی اطاعت پر مامور کیا ہے جس کے علم و عمل میں یگانگت ہو چنانچہ روایت احتجاج میں صاف صاف مذکور ہو چکا ہے اور سچ پوچھئے تو قوموں کی ترقی کا راز انہی دو قوتوں میں مضمر ہے اور یہ ایسے دو پر ہیں جن کے بغیر کوئی قوم اوج فخر تک نہیں پہنچ سکتی اور ایسے دو بازو ہیں جن کی طاقت و اعتماد کے سوا کوئی امت عروج شرف میں غوطہ زن نہیں ہو سکتی بلکہ ہر مجد و شرف اور سیادت و سعادت کا دارو مدار انہیں پر ہے اور انہیں کی قوت وارتفاع کی مقدار اقوام عالم کے مدارج ارتقاء اور منازل عزم و استقلال کی استواری و پائیداری کا صحیح معیار ہے پس جو قومیں علم و عمل میں پست ہیں وہ اقوام عالم میں کبھی معراج کمال پر فائز نہیں ہو سکتیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ علم

کی رفعت اور عمل کی اس سے موافقت قوم کی عظمت کا ابرتا ہوا ناقوس ہے پس نیک بخت ہے وہ قوم جس میں علم و عمل سے شوق و شغف موجود ہو اور علمائے عاملین کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں پوری سہولتیں میسر ہوں ایسی قوم کو پھلنے پھولنے کا حق حاصل ہے اور بے شک وقار و شرف ایسی قوم کی قدم بوسی کے لئے بے تاب ہے۔

دین کے مصائب اور اب اس کی حالت زار

ایک وقت تھا جب دین حقیقی اور مذہب اہل بیت کا تقدس اقوام عالم میں مسلم تھا اس دین سے وابستہ علماء عاملین کے سامنے اہل خلاف کے اکابر علماء کی گردنیں خم تھیں ان کے وقار علمی اور ضبط عمل کے سامنے جہاں اقوام عالم کے علماء دم بخود نظر آتے تھے وہاں سلاطین دہر اور متکبرین زمانہ کو تاج شہانہ اتار کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا چنانچہ سلاطین عباسیہ کے دور میں سید رضی اور علم الہدیٰ کی داستانیں اب تک زیب قرطاس ہیں اور اس گئے گزرے دور سے ذرا پہلے حکومت ترک کے سربراہ یا اس کے سفیر کا شیخ مرتضیٰ انصاری اعلی اللہ مقامہٗ کے ساتھ مکالمہ معروف و مشہور ہے نیز آغا سید ابوالحسن اصفہانی و شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء کے حکومت وقت کے ساتھ بیتے ہوئے واقعات زبان زد عوام و خواص ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جو مذہب کی صداقت اور دین کی قوت و عظمت کو اقوام عالم سے منوانے کے ناقابل تردید ذرائع ہیں۔ ان کو دیکھ کر غافل ہوش میں آجاتا ہے اور خواب رفتہ جاگ اٹھتا ہے۔ اور اس کو مذہبی حقائق میں تحقیق و تدقیق کرنے کی بے پناہ توفیق مل جاتی ہے پس علم و عمل کی طاقت ہی مذہب شیعہ کے وقار کا بلند مینار تھی اور یہی طاقت تھی جس نے انگریزوں کو نجف اشرف پر حملہ کرنے کی جرأت سے باز رکھا تھا اور یہی قوت تھی جس نے قاچار شاہنشاہوں کے متکبرانہ ارادوں کو توڑ کر انہیں مذہب کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں طائر قدسی مذہب شیعہ اور ہمارے شرف ملت جعفریہ کن کن مصائب کا شکار ہوا اور کیا کہوں کہ اس پر کیا بیتی؟ یہ ایک ایسا اندوہ ہے جس سے جسم لرزتا ہے دل دھڑکتا ہے جگر کانپتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے سانس گلوگیر ہوتا ہے آنکھیں بے ساختہ برستی ہیں اور زبان تھراتی ہے کس منہ سے کہا جائے کہ اس کے اعضاء کچل دیئے گئے اس کے پر نوچ لئے گئے اس کی طاقتیں سلب کر لی گئیں اور اس کو بے دست و پا کر کے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ نہ وہ بول سکتا ہے نہ آواز بلند کر سکتا ہے بس اب وہ ایک جسم بے جان کی مانند ہے جو جنگل میں

کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا ہو اور درندگان صحرا اور وحوش بیابان کو نوچ رہے ہوں نہ اس کے ہاتھ میں کہ ان کو ہٹا سکے اور نہ اس کے پیر ہیں کہ اپنے آپ کو محفوظ مقام تک پہنچا سکے بلکہ اب تمام حشرات الارض کا طعمہ بن چکا ہے۔ خدا کی قسم حسرتوں کا طوفان سینے میں موجزن ہے جس کا اٹھا ہوا دھواں آسمان فکر سے ٹکرا کر معانی و مطالب کے رنگ میں دماغ کی تختی پر اترتا ہے کبھی آنسو بن کر آنکھوں کے رستہ سے پانی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے کبھی فرط رنج و الم کی آہ بن کر نکلتا ہے کبھی داستان غم بن کر زبان سے الفاظ کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی عبارات و نقوش کی شکل میں صفحہ قرطاس پر ذہن بولتا جاتا ہے اور قلم لٹپٹے دہانے سے ہم گھٹتا جاتا ہے۔

اندھیر گردی کی حد

اس سے زیادہ اندھیر اور کیا ہوگا کہ چور چوری کرنے کے باوجود مالک کو کہے کہ تو چور ہے اور دیکھنے والے بیک آواز چور کی دیانت اور صداقت کی داد دیں اور مالک کو کوسنے لگ جائیں۔ خدا کی قسم یہاں دین کی یہی کیفیت ہے۔ وہ علمائے عاملین جنہوں نے تحصیل علوم دینیہ میں اپنے قیمتی متاع زندگی کو قربان کر دیا اور جوانی کی بہاریں اس پر نثار کر کے رکھ دیں اور علوم دینیہ کے شغف کی بدولت ہی انہیں جوانی کے پرکیف دور کو خیرباد کہنے کی توفیق عطا ہوئی۔ ان کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا ہے جو دین کے مبادی سے بھی غافل ہیں۔ انہیں نہیں پتہ کہ دین کس شئے کا نام ہے اور دین کے اصول فروع کی حقیقت کیا ہے نہ دین کا پتہ نہ دین کے لانے والے کی سوانح حیات کا علم اور نہ دین کے محافظین کی فرمائشات سے دلچسپی اور بایں ہمہ ہمچو ما دیگرے نیست کی رٹ ہے دین کے ہر مسئلہ کو مسخ کرنے کے باوجود تسلیم کا دعویٰ ہے۔ اصولاً و عملاً مذہب کے احکام کی مخالفت کے باوجود دیندار اور مذہب پرست ہونے کا اعلان ہے اور اہل بیتؑ کے احکام کو اپنے عمل سے رد کرنے کے باوجود ان کی وکالت کا دعویٰ اور مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ اپنے تئیں عالم کہلوا کر شرماتا نہیں بلکہ علماء کو شرمسار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بدعمل اپنی بدعملی پر نادم نہیں ہوتا بلکہ عمل کرنے والوں کو چیلنج کرتا ہے اور علماء اگر زبان و قلم سے کلمہ حقہ کی تبلیغ کی جرأت کریں اور دین کی دہائی دیں تو دین سے اصولاً و عملاً جو طبقہ باغی ہو چکا ہے۔ بلکہ اعلانیہ فسق و فجور جن کا معمول زندگی ہے وہ کھلے مجمع میں منبروں پر چلا چلا کر علمائے عاملین کا تمسخر اڑا کر اپنی مذہب پرستی کا اعلان کرتے ہیں (الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے)

اس زمانے کے پرسکون انتہائی جہلک وخطرناک ذہنی انقلاب نے اس ضرب المثل کو روزِ روشن کی طرح ایک واضح حقیقت بنا دیا چنانچہ بے دین دین والوں کو ڈانٹ کر کہتے ہیں کہ ہم ہی دین دار ہیں اور تم دین کے دشمن ہو اور سننے والے ان کی بے دینی سے واقف ہونے کے باوجود ان کو داد دیتے ہیں اور ان کی صدا پر واہ واہ کرتے ہیں اور دین والوں کو حق کا پاسبان جاننے کے باوجود ان سے الگ ہیں آج اعلانیہ طور پر جاہل عالم کو سکھانے کے درپے ہیں۔ بے دین متدین کو دین کا درس دینے کے لئے بے تاب ہیں۔ بے عمل صاحب عمل کے لئے اصلاح کی دعوت لئے پھرتے ہیں۔ خدا کی قسم اقوامِ عالم میں کہیں اور کسی دَور میں یہ مثال نہ ملے گی۔ کہ جاہل نے عالم کے علم کا محاسبہ کیا ہو اور جن لوگوں کو عقیدہ کا معنی تک نہیں آتا وہ بھی ببانگ دہل کہتے ہیں کہ علماء کو عقیدہ ہم سے سیکھنا چاہیئے۔

علم کی عظمت

کبھی کسی دَور میں باشعور و بیدار مغز افراد نے علم کے کمال کا انکار نہیں کیا اور ناقص کا اپنے نقص پر ناز کرنا یا مریض کا اپنے مرض پر اترانا اس زمانہ کی نیرنگیوں میں سے سمجھئے چنانچہ جاہل علماء کے سامنے اپنی جہالت کو مایۂ فخر سمجھتے ہیں۔ بلکہ علماء کی توہین وتذلیل کو اپنا قابلِ فخر کارنامہ تصور کرتے ہیں اور اپنی بداعمالیوں پر پشیمان ہونے کے بجائے صاحبانِ عمل کے اعمال کو معرضِ طعن وتشنیع قرار دینے میں ذرا بھر شرم محسوس نہیں کرتے۔ بہرکیف علماء کے لئے اگرچہ یہ مرحلہ انتہائی صبر آزما بلکہ حوصلہ شکن ہے تاہم پامردی سے ان حالات کا مقابلہ کرنا اور اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے نبھانا علماء کی ہی شان ہے کیونکہ انہی کو ہی تبلیغ انبیاء کا صحیح وارث کہا گیا ہے۔ بحارالانوار جلد۱ میں معصوم سے مروی ہے کہ لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ ایسے لوگ جو نہیں جانتے اور اپنے نہ جاننے کو بھی نہیں جانتے۔ یہ جاہل مرکب ہیں۔ ان کے سیکھنے کی امید نہ رکھو۔

۲۔ وہ لوگ جو نہیں جانتے لیکن اپنے نہ جاننے کو جانتے ہیں۔ ایسے لوگ راہ گم گشتہ ہیں۔ ان کو ہدایت کرو۔

۳۔ وہ لوگ جو جانتے ہیں اور اپنے جاننے سے غافل ہیں گویا یہ خواب رفتہ ہیں۔ ان کو بیدار کر دو۔

۴۔ وہ لوگ جو جانتے ہیں اور اپنے جاننے سے باخبر ہیں۔ پس ایسے لوگ ہادی ہیں

اور ان سے ہدایت حاصل کرو۔

عوام میں پہلی قسم اور خواص میں تیسری قسم (یعنی وہ پڑھے لکھے حضرات جو فریضہ علمی کو پس پشت ڈال کر دنیا کے پیچھے پڑ چکے ہیں) کی بہتات ہے پس پہلی قسم ایسے جاہل مرکب لوگوں کی ہے جو علمائے اعلام کی پگڑی اچھالنا اور دوسروں کو بھی آمادہ کرنا اپنی دینی خدمت اور جہاد سمجھتے ہیں اور بہت کم ایسے ہیں جو علمائے عاملین سے میل جول رکھنا اور ان سے معالم دینیہ حاصل کرنا اپنے لئے باعث نجات و فلاح سمجھیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اتنا بھی غنیمت ہے کیونکہ انبیاء سابقین کی تاریخ کا مطالعہ تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ بعض نبیوں کا ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو ان کی بات سنتا ہو۔

علم خداوند قدوس کی جانب سے ایسی لازوال اور پرشکوہ نعمت ہے جس کا کوئی نعمت مقابلہ کر سکتی ہی نہیں اسی لئے تو اپنے حبیب کو دعا بھی یہی تعلیم فرمائی۔ قُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا (اے رب میرے علم کو زیادہ کر) اور آدم کی ملائکہ سے برتری کا معیار بھی قرآن مجید نے علم ہی کو پیش کیا اور طالوت وجالوت کے قصہ میں خلافت ربانیہ کا معیار و مدار بھی علم ہی کو قرار دیا گیا اور قرآن نے اپنے اچھوتے انداز میں علم کی عظمت کو ان جامع کلمات میں ظاہر کیا هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

یعنی کیا علم رکھنے والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں۔ استفہام انکاری کے لہجہ میں عظمت علم کی مسلّم حیثیت کو ظاہر کرنا مقصود ہے اور قرآن مجید میں کئی اور اشیاء کا تقابل بھی بیان کیا گیا ہے مثلاً طیب و خبیث بینا و نابینا نور و ظلمت اور سایہ و دھوپ اور استفہام انکاری کے رنگ میں کہا گیا کہ کیا وہ اور یہ برابر ہیں اور اگر نظر غائر سے تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ وہی علم و جہل ہی نکلتا ہے یعنی طیب بینائی نور اور سایہ علم ہی کی الگ الگ تعبیریں ہیں اور اس کے برعکس خباثت نابینائی ظلمت اور دھوپ جہل کے ترجمے ہیں۔ اور تمام انبیاء کے لئے اپنی اقوام کے سامنے ان کا علم ہی طرۂ امتیاز تھا اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے بھی مقام فخر میں اپنے علم ہی کو پیش فرمایا اور حضورؐ نے مقام تعارف میں اپنی ذات کو علم کا شہر اور علیؑ کو اس کا در قرار دیا۔ شہید ثانی اعلی اللہ مقامہ نے منیۃ المرید میں بہت کچھ حدیثیں علم علماء اور متعلمین کی شان میں جمع فرمائی ہیں۔ چنانچہ حدیث نبوی میں ہے کہ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ سَبْعِينَ دَرَجَةً بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ حُضْرُ الْفَرَسِ سَبْعِينَ عَامًا وَذَالِكَ لِأَنَّ الشَّيْطَانَ

يَضَعُ الْبِدْعَةَ لِلنَّاسِ فَيُبْصِرُهَا الْعَالِمُ فَيُزِيلُهَا وَالْعَابِدُ يُقْبِلُ عَلَى عِبَادَتِهِ ۔

ترجمہ:۔ عالم عابد سے ایسے ستر درجات کی بلندی پر ہے کہ ہر دو درجات کے درمیان تیز رو گھوڑے کا ستر سال کا سفر ہو اور یہ اس لئے کہ شیطان لوگوں میں بدعات کی نشر و اشاعت کرتا ہے اور عالم ان بدعات کو مٹاتا ہے اور عابد تو صرف عبادت کی طرف ہی متوجہ رہتا ہے (یعنی عالم اپنی اصلاح کے ساتھ لوگوں کی اصلاح کا بھی کفیل ہے اور عابد صرف اپنی اصلاح کا ہی ضامن ہے بلکہ عابد کی عبادت بھی عالم کی ہی رہنمائی سے مقام قبولیت تک پہنچ سکتی ہے۔

امالی صدوق سے حدیث نبوی یوں منقول ہے کہ ایک مومن اگر ایک ایسا ورقہ چھوڑ کر مرے جس پر علمی مطالب تحریر ہوں تو وہی ورقہ بروز محشر اس کے اور جہنم کے درمیان حائل ہو جائے گا اور اس کے ہر ہر حرف کے بدلہ میں خدا اس کو ایک ملک عطا فرمائے گا جو پوری دنیا سے سات گنا بڑا ہوگا اور کافی شریف میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ کہ وہ عالم جس کے علم سے فائدہ اٹھایا جائے وہ ستر ہزار عابد سے افضل ہے اور تفسیر برہان میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے مروی ہے کہ آئمہ کے بعد جنت کے بلند ترین مقام پر علماء صالحین ہی فائز ہوں گے اور ہم نے مقدمہ تفسیر انوار النجف میں اس قسم کی احادیث کو مفصلاً تحریر کیا ہے۔

پس علماء عاملین کو عوام کی ہنگامہ آرائی سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ پورے اطمینان سے انہیں چاہیے کہ اپنے فریضہ تبلیغ کو نبھائیں۔ زبان سے یا قلم سے جس قدر ممکن ہو خدمت علم اور اصلاح خلق میں کوتاہی نہ کریں۔ آخر شیطانی جال تار عنکبوت بن کر ٹوٹیں گے اور آخری زمانے کے لوگوں کے حالات کے بارے میں یہ بھی منقول ہے کہ معروف منکر ہوگا اور منکر معروف ہوگا۔ اہل باطل کی زبان دراز ہوگی اور اہل حق کی زبان پر مہر خاموشی ہوگی۔ نااہل منبر پر سوار ہوں گے یہ زمانہ ان تمام خوابوں کی بولتی ہوئی تعبیر ہے اور یہ بھی تو ارشاد ہے کہ بروز قیامت تین چیزیں شکوہ لے کر پیش ہوں گی۔ مسجد قرآن اور عالم۔ مسجد کو اپنے نمازی نہ ملنے کا شکوہ ہوگا قرآن کو قاری نہ ملنے کا اور عالم کو سیکھنے والوں کی کمی کا شکوہ ہوگا اور موجودہ فضا تو اس سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے عالم کو صرف یہ شکوہ نہیں کہ مسئلہ کوئی نہیں پوچھتا بلکہ رونا تو اس بات کا ہے کہ جاہل اس بات پر مصر ہیں کہ علماء ہم سے دین سیکھیں۔ حتیٰ کہ علماء کے لئے جان بچانا مشکل بن گیا ہے دین کی مظلومیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ دین کے اعلانیہ دشمن دین کی

پاسبانی کا دعویٰ کریں۔ طہارت کا مفہوم خود نہ سمجھنے والے علماء سے مسائل طہارت میں انہیں نماز سے خود بے خبر ہونے کے باوجود نماز کا طریقہ علماء کو بتانے پر مصر ہوں عقائد حقہ سے کوسوں دور ہوتے ہوئے علماء کے عقائد کی اصلاح کا علم بلند کریں۔ [illegible]۔

مسئلہ تقلید کی وضاحت

یہ ایک عقلی مسئلہ ہے کہ نہ جاننے والا ناواقف مسائل میں جاننے والے کی طرف رجوع کرے خواہ اس کا تعلق کسی شعبہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ پس دین کو صحیح طور پر نہ جاننے والے پر فریضہ عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ دینی مسائل میں دین کے علماء کی طرف رجوع کرے اور اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ اعمال کی صحت تقلید کے بغیر مشکل ہے اور مرتبہ اجتہاد پر پہنچنے والے پر تقلید واجب نہیں ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ آیا تقلید اصول میں بھی ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہی دیا جاتا ہے کہ اصول میں تقلید واجب تو بجائے خود جائز بھی نہیں یعنی حرام ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عوام اپنے عقائد اپنی مرضی وخواہش سے خود گھڑ لیں اور جس کی جو مرضی ہو عقیدہ رکھے کیونکہ اگر عقیدہ میں ہر شخص خود مختار اور مطلق العنان ہو تو پھر کسی پر کفر و شرک یا ارتداد و ضلالت کا فتویٰ عائد کرنا مشکل ہو جائے گا بلکہ مذاہب کی تفریق سرے سے ختم ہو جائے گی۔

مقصد یہ ہے کہ جہاں تک عقل کی رہبری کا تعلق ہے اور جن جن مسائل کو عقل خود حل کر سکتی ہے وہاں عقل کا فیصلہ ہی آخری اور حتمی فیصلہ ہے کیونکہ عقل خود اپنے مقام پر رسول باطنی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن عقل سے مراد وہ عقل ہے جو خود کسی تقلید میں اندھی نہ ہو چکی ہو اور اسی بناء پر کورانہ تقلید والوں کو قرآن مجید میں کئی مقامات پر سرزنش کی گئی اور قابل قبول سہل ترین ادلہ عقلیہ پیش کرنے کے بعد بطور تنبیہ فرمایا کہ یہ بیان صاحبان عقل و دانش کے لئے ہے۔ کسی مقام پر استفہام انکاری کے لہجہ میں فرمایا کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ یعنی یہ دلائل اس طرح واضح ہیں کہ اگر تمہاری عقلیں کورانہ تقلید سے آزاد ہوتیں تو فوراً بات سمجھ میں آجاتی۔

کرہ زمین پر بسنے والوں کا بنظر تعمق جائزہ لینے کے بعد آپ اچھی طرح محسوس کریں گے کہ اکثر لوگ صرف انسانی نمونے اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ میں صرف مسلمان کہلانے والوں کے متعلق نہیں کہہ رہا بلکہ ربع مسکون کی اکثر انسانی آبادی کا یہی عالم ہے ان کا قالب بدن روح انسانیت سے خارج ان کا ظاہری ڈھانچہ حیات واقعیہ سے بالکل کھوکھلا ان کا خوشنما چہرہ دیدہ حقیقت سے بالکل نا آشنا اور ان کے وحشی نفوس، و افکار نا بالغ دین ایمان کے روابط سے

اور اصول و عقائد کے حقائق اور ہادیانِ دین کی اطاعت سے کوسوں دور ہیں۔ اکثریت تو دہریت و لامذہبیت کے پھندے میں آچکی ہے اور جو لوگ برائے نام مذہب سے ظاہری انس و محبت رکھتے ہیں ان کے ایمان بھی تسلیم و رضا کی منزلوں سے بہت پیچھے ہیں اور ان کے قدم ایسی نازک شاخ پر ہیں کہ شکوک و شبہات کا معمولی سا جھونکا بھی اسے توڑ دینے یا اپنی جگہ سے موڑ دینے کے لئے کافی ہے اور دل کہتا ہے کہ کیوں بہت تھوڑے اللہ کے بندے ایسے خوش نصیب بھی موجود ہیں جو معرفت و ایقان کی دولت اپنے دامن میں رکھتے ہوئے عقائد کی پختگی کے حامل ہیں۔ شاید ہماری قوم میں عقائدِ اسلام اور اصولِ ایمان میں متعدی روحانی امراض کے سیلاب کی تیزی اور شکوک و شبہات کے اثرات کا رسوخ یا دینِ حق اور ملتِ بیضا کی روشنی سے کنارہ کش ہو کر مغربیت لادینیت اور ذہنی آوارگی کی تاریکیوں کی طرف بڑھتے ہوئے میلان کا سب سے بڑا سبب یہ ہو کہ رہنمایانِ ملت نے دعوتِ حق کے لئے کوئی ایسا آسان و سہل طریقہ اختیار نہیں فرمایا جو واضح اور عام فہم طور پر اصول و عقائد حقہ کو دلوں کی گہرائیوں میں بٹھا دے تاکہ نئی پود اسی ماحول میں پروان چڑھے اور بوڑھے انہیں نظریات کی روشنی میں بڑھاپے کی منازل کو کامیابی سے طے کریں۔

بیماری اور اس کا علاج

ہماری قوم مدت سے دو جان لیوا بیماریوں کا ہدف رہی ہے اگر علمائے اعلام پامردی سے جم کر اس کی حفاظت میں قدم آگے نہ بڑھائیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ دو بیماریاں قوم و ملت کی ناؤ کو ڈبو دیں۔ اور وہ یہ ہیں:-

(۱) زعمائے مذہب کی دعوت و ارشاد سے اغماض و چشم پوشی اور بندگانِ خدا کی نسبت سے کوتاہی۔

(۲) دشمنانِ دین کی ہدمِ دین کے لئے ہمہ تن کوشش بیماری کا علاج چار طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

(۱) منبر (۲) مصلیٰ (۳) درس و تدریس (۴) قلم

پہلا طریقہ

ان سب میں سے مؤثر ترین اور آسان ترین طریقہ پہلا ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں یہ ذریعہ تبلیغ کافی عرصہ سے کالعدم ہے کیونکہ منبر پر کاہل افراد کا تسلط ہے اور ایسے لوگ اس منبر پر سوار ہیں جن کی شکل و صورت اور عمل و کردار سب

کا سب دین سے بیگانہ ہے اور ان کے پورے وجود سے ہر وقت دین دشمنی کا دھواں ہی اٹھتا رہتا ہے اور جلوت وخلوت میں دشمنیٔ دین ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اگر کچھ اہل بھی منبر پر جا پہنچے تو اکثر منبر کے ٹھیکہ داروں کے رویّے سے متاثر ہو کر دین کے اصولوں پر ثابت رہنا ان کو بھی نصیب نہ ہوا۔ اور بہت جلد خس و خاشاک کی طرح اسی سیلاب میں بہہ گئے پس کلمۂ حق کی آواز نصیحت و خیر خواہی کی صدا اور تبلیغ احکام دین کا بیان منبر سے رخصت ہوگیا اور منبر ان لوگوں کا کھلونا بن کر رہ گیا جو پیشہ ورانہ طور پر اس کو استعمال کرتے چلے آئے انہیں کلمۂ حق کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے جو خود کلمۂ حق کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے لئے پیغام موت کے مترادف سمجھتے ہوں۔ مدت سے عوام کے کان انہی لوگوں کے بیانات کے عادی بن گئے تو اب ان کے لئے کلمۂ حق ایک تلخ گھونٹ ہے۔ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا منبر کی بے کسی کو رویا جائے یا عوام کے طور و طریقہ پر ماتم کیا جائے یا دین کا لبادہ اوڑھ کر دین کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والوں کی خود فریبی پر آنسو بہائے جائیں؟ ایسے لوگوں کا تذکرہ ہی فضول ہے جو اعلانیہ فسق و فجور کے ارتکاب کو باعث فخر سمجھتے ہیں اور منبر کو عیاشی کا اکھاڑہ سمجھ کر تضحیک دین کا موجب بنتے ہیں۔ یہ درد گننے سے ختم نہیں ہوتے بلکہ طوفان کی صورت میں ان کا سلسلہ ذہن کے لئے ایک مسلسل پریشانی کا موجب بنتا جا رہا ہے پس محافظین دین کو ہمت ہارنے کے بجائے میدان جہاد میں اتر آنے کی ضرورت ہے اور جس حد تک ہوسکے منبر کی لاج رکھنے اور اس کے تقدس کے عہد قدیم کی یاد تازہ کرنے کے لئے مسلسل جد و جہد اور محنت و کاوش کی ضرورت ہے۔

دوسرا طریقہ

منبر کے غلط اور ناجائز استعمال نے نصیحت اور تبلیغ کے دوسرے طریقہ کو مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے کیونکہ منبر کا تقدس جب ختم ہوگیا تو مصلّٰی کی اہمیت خود بخود نظروں سے غائب ہوگئی۔ مصلّٰی پہ آنے کے لئے قسم قسم کی پابندیوں کو اپنے اوپر عائد کرنے کی ضرورت تھی پس دیکھا دیکھی سے ہر ایک نے منبر کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور جس کو توفیق ملی وہ منبر پہ جا کودا۔ نیز مصلّٰے پہ جانے کے لئے کچھ شرائط تھیں اور منبر کو شرائط سے خالی دیکھا۔ پس ہر نااہل کی طبیعت وقار کی خاطر یا آمدنی کے لالچ میں اس کی طرف مائل ہوگئی۔ پس یہ دوڑ دھوپ اور پس و پیش منبر اور مصلّٰے کے درمیان ایک اچھی خاصی رسہ کشی کا موجب بن گئی۔ اب اگر مصلّٰے والے اصلاحی قدم اٹھائیں بھی تو منبر والے اسے اپنی توہین سمجھنے لگتے ہیں اور اعلانیہ منبروں پر سے کوستے ہیں۔ پس

وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ منبر والوں کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ کر زندگی کے سانس گزاریں کیونکہ اگر وہ اپنے رویہ و نظریہ پر ڈٹ کر رہیں تو عوام الناس جو منبر کے دلدادہ ہیں وہ ان کی اقتداء چھوڑ بیٹھتے ہیں اور آخر کار مصلّے سے ان کو فارغ کر دیا جاتا ہے اور ایسی قوم کی حالت پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے جس میں اچھے اور برے کے درمیان تمیز کا مادہ ہی ختم ہو جائے اور حضرت امیر علیہ السلام فرط حسرت میں بیان فرماتے تھے کہ شام والے اپنے امام کو ناحق غلط کار سمجھنے کے باوجود اس کے وفادار غلام اور اطاعت گذار رعایا ہیں۔ لیکن اے کوفہ والو تم مجھے امام برحق اور ہادی حق نما سمجھنے کے باوجود بھی میری اطاعت اور فرمانبرداریوں سے گریز کرتے ہو آج کل معاملہ بالکل وہی ہے غلط کار اہل منبر کے تمام کرتوت اور آوارگیاں سننے سمجھنے۔ جاننے اور باور کرنے کے باوجود ان کے ساتھ وفاداری میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور نیک و صالح پیش نماز کی شرافت و دیانت کے اقرار کے باوجود اس کی شنوائی و پذیرائی نہیں۔

تیسرا طریقہ

بفضل خدا جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے۔ اہل دل حضرات نے مدارس دینیہ کے قیام کی ضرورت محسوس کی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند ایک مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ تدریسی خدمت سے قوم کے خفتہ افراد کو جگایا جا سکے اور بفضل پروردگار نتیجہ نہایت اچھا نکلا اور تھوڑے عرصہ میں پڑھے لکھے لوگوں کا ایک طبقہ میدان میں آ گیا اور زبان پر حق گوئی کھل کر آ گئی لیکن منبر والے قوم کی اس ترقی کو برداشت نہ کر سکے انہیں صرف یہی احساس بے تاب کئے جا رہا ہے کہ قوم پر اگر وعظ و نصیحت کارگر ہو گیا تو ہماری آمدنیوں میں معتدبہ کمی کا واقع ہونا لازمی ہے نیز ممکن ہے کہ کسی وقت قوم ہمارا محاسبہ کرنے لگ جائے۔ لہٰذا منبروں پر کھل کر علمائے مدرسین کو برا بھلا کہنے کے لئے طالع آزما حضرات کی ایک ٹولی آ گئی۔ کسی نے کہا مدارس دینیہ میں بے دینی کی تعلیم ہوتی ہے۔ وہی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والی رسم کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ کسی نے کہا علماء آئمہ اہل بیتؑ کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں اور یہ صرف اس لئے تاکہ علماء کو بدنام کر کے اپنی علانیہ بدکاریوں اور دھاندلیوں پر پردہ ڈالا جائے کسی نے کوئی الزام عائد کیا کسی نے کوئی تہمت لگائی اور یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت ہے کہ منبر کے تقدس کا سوال نہ اٹھایا جائے اور انہیں بے راہ روی سے نہ روکا جائے پچھلے سالوں میں علمائے اعلام کو منبروں پر لوگوں نے گالیاں دیں لعن و طعن کیا اور سب و شتم کیا علماء کی توہین و تذلیل کے لئے نظمیں گائی گئیں اور علماء کی ہجو کی نظموں کو قصیدہ کا مقدس نام دیا

گیا لیکن ہمیں گانے والوں پر کوئی گلہ نہیں کیونکہ ان کا کسب معاش کا ذریعہ ہی صرف گانا ہے اور وہ اہلبیتؑ کے ذکر کی آڑ میں اپنے کسب کو فروغ دینے کے متمنی ہوتے ہیں (خدا کرے وہ اپنی اصلاح پر موفق ہو جائیں) ہمیں تو افسوس ان لوگوں پر ہے جو حقیقت کو سمجھنے کے باوجود گانے والوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے علمائے کرام کی تذلیل و توہین کی اپنا محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ بہرکیف مذہبی و دینیہ کے خلاف کافی آوازے کسے گئے اور اوچھے حربے استعمال کئے گئے۔ لیکن بحمداللہ علماء نے اپنے اپنے مقام پر جوابات متجاہلانہ پر کان دھرے بغیر نہایت صبر و سکون سے اپنے کام کو جاری رکھا اور محمدؐ و آل محمدؐ کے علوم کی ترویج کی سعی بلیغ میں کوتاہی نہ برتی جس کی بدولت حملہ آور زبانیں خود بخود کند ہوتی گئیں اور مذہبی دینیہ کے وقار کو کوئی صدمہ نہ پہنچ سکا

چوتھا طریقہ

کافی عرصہ تک ہماری قوم کے ذمہ دار افراد نے تبلیغ دین کے اس مقدس ذریعہ سے پہلو تہی اختیار کی جس سے غیر ذمہ دار افراد کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے مذہب کو غلط حلیہ میں پیش کر کے عوام کے اذہان کو ماؤف کرنا شروع کیا۔ اس ضمن میں عقائد مذہب حقہ خاص طور پر متاثر ہوئے۔ چنانچہ بعض ایسی باتوں کو جزو مذہب سمجھ لیا گیا۔ جن کو حقیقتِ مذہب سے دور تک کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اور ایسی چیزیں غیر ضروری سمجھ لی گئیں۔ جن کی ضرورت کا انکار کفر صریح ہے اور اس بے راہ روی نے علماء کو للکارا۔ چنانچہ بفضلِ خداوندی اہلِ قلم نے قلمی خدمات پیش کرنا شروع کیں۔ تاہم میری دانست میں عقائد ملت جعفریہ کی وضاحت کے لئے ایسی کتاب کی ضرورت باقی رہی جو عوام کے اذہان کے مطابق ہو اور ان کی طبائع کے لئے قابلِ قبول ہو۔ خداوند کریم مجھے توفیق سدید مرحمت فرمائے۔ تاکہ میں اس اہم ترین خدمتِ مذہب کو انجام دے سکوں اس ضمن میں یہ بات واضح ہو گئی کہ عوام کا ذہن اس قدر پختہ نہیں کہ عقل سلیم سے وہ ہر اصول و عقیدہ کو خود سمجھ سکے۔ وہ ایک نرم کونپل کی طرح ہوا کے رخ کے ساتھ مڑ جانے کو تیار ہوتا ہے لہذا مذہب حقہ کے اصول جن کو دلیل و برہان سے سمجھنا ضروری ہے ان کا قرآن و حدیث کی روشنی میں پختہ بیان سے پیش کیا جانا لازمی ہے تاکہ کورانہ تقلید سے پیدا شدہ توہمات و شبہات کا قلع قمع ہو جائے اصول میں تقلید کے حرام ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اصول کو بلا دلیل مان لینا درست نہیں بلکہ دلیل کا مطالبہ ضروری ہے جس سے عقل سلیم مطمئن ہو جائے اور فروع میں تقلید کے وجوب کا یہ مقصد ہے کہ مجتہد کے فتاوی کو اس سے دلیل طلب کئے بغیر تسلیم کر لینا اور اسے واجب العمل سمجھنا ضروری ہے۔

اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی ضروری ہے کہ اصول کو دلیل سے جاننے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر انسان علم کلام کا ماہر ہو جائے لیکن اس کے برخلاف یہ بھی جائز نہیں کہ دین کے معاملہ میں لوگ صرف ماں باپ کے مقلد بن کر رہ جائیں اور ان کا اساس مذہب اور اصول و عقائد صرف ایسے چند کلمات ہوں جن کا معنی وہ خود بھی نہ سمجھتے ہوں بلکہ ان دو حدوں کے درمیان ایک ایسا راستہ موجود ہے جو بفضلِ خدا نہایت آسان اور نفع رساں ہے اور انشاء اللہ ہم اسی کو سمجھانے کی کوشش کریں گے اور یہی بات اس کتاب میں مقصود ہے

افسوسناک صورتِ حال

دین جب داخلی انتشار میں مبتلا ہوا تو اس پر بیرونی حملہ آوروں کی فوجیں ٹوٹ پڑیں ادھر محافظین دین میں تساہل نمودار ہوا اور انہوں نے قوم کی رسّی اس کی گردن پر ڈال کر اسے شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ دیا ۔ تو ان کے پاس دین صرف لفظی جمع خرچ کا نتیجہ بچ گیا ۔ دامن میں سنی سنائی باتیں رہ گئیں ۔ دل دینی عقائد کی بہار سے اجاڑ بن گئے اور جو کچھ عقیدہ موجود تھا عمل نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا پس قوم کی حالتِ کس مپرسی سے دشمن نے فائدہ اٹھایا اور شکوک و شبہات کی فوجیں لے کر وہ آدھمکا خصوصاً مغربیت کی مسموم فضا نے کافی حد تک کامیابی حاصل کر لی اور اکثریت دین سے باغی ہونے لگ گئی ۔ دلوں کے میدان جیت لئے گئے اور راہ مستقیم سے بہت سوں کو پھسلا لیا گیا

خلاصہ یہ کہ ایک طرف تو دین کی کمزوری اپنوں کی بے راہ رویوں کے باعث رونما ہوئی اور دوسری طرف اغیار کی چرب لسانی اور سبز باغات کی نمائش اس کی موجب بنی اور ایسے بے ہودہ قسم کے افراد منظر عام پر آ گئے جو سادہ لوح انسانوں کو شک میں ڈالنے اور خواص کو پریشان کرنے کے لئے قرآن و حدیث کے متشابہ مقامات سے کھینچنے لگ گئے اور قسم قسم کے رسوا کن اور توہین آمیز بہتانوں اور اوچھے و ناپاک ہتھکنڈوں کی بدولت شریعتِ حقہ اور ملّتِ بیضا کے مقدس چہرہ کو داغدار کرنے کی ناپاک کوششوں میں مصروف ہو گئے پس سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے اعتراضات و شبہات کا فرداً فرداً جواب دیا جائے تاکہ ملّتِ حقہ کے مقدس اصولوں پر ناروا حملوں کی روک تھام ہو سکے اور شریعتِ مقدسہ کے پاک دامن سے حملہ آوروں کے ناپاک چھینٹے دھل جائیں ۔ پھر خیال پیدا ہوا کہ اعتراضات و شبہات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو سکتا ہے بہتان و افتراء پردازی اور جھوٹ کے خلائی سمندر کا تو کوئی کنارہ ہی نہیں ۔ لہٰذا ان سوالات و جوابات کے چکر میں پڑنا شاید چنداں سود مند نہ ہو ۔ آخرکار تائیدِ غیبی اور عنایتِ خداوندی سے یہ نظریہ ذہن میں آیا کہ پرندوں کو مارنے اور اڑانے سے درخت کو جڑ سے نکال دینا ہی بہتر ہے کیونکہ تحقیق

حق خود بخود ابطال باطل کے لئے کافی و وافی ہے نیز بنیادوں کا استحکام مکان کی پختگی کا خود ضامن و کفیل ہوا کرتا ہے پس میں نے اس نظریہ کو آخری فیصلہ کی حیثیت دے دی اور عقائد حقہ کی وضاحت کا بیڑا اٹھایا۔ تاکہ افراط و تفریط کی وادیوں میں گم گشتہ افراد صراط مستقیم پر چلنے میں آسانی محسوس کریں۔ خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ میرے لئے یہ مرحلہ آسان فرمائے وھو الموفق المعین۔

تمہید سدید بتائید رب مجید

یہاں چند ضروری باتوں کا تذکرہ ضروری ہے جو کسی حد تک مقصود کتاب سے مرتبط ہیں۔

علمائے سلف کی بیش بہا خدمات کا اعتراف

عراق و ایران کی سرزمین کو بجا طور پر

فخر ہے کہ اس زمین کو جلیل القدر علماء کی تربیت کا شرف ملا۔ زمان آئمہؑ سے لے کر آج تک یہ زمین گہوارۂ علم چلی آئی۔ دوسرے اکثر ممالک میں بھی کم و بیش علمائے صالحین کا وجود ہر دور میں منصہ شہود پر ظاہر ہوا لیکن عراق و ایران کو جو شرف ملا اور کسی زمین کو حاصل نہ ہو سکا۔ اللہ ان علمائے اعلام رضوان اللہ علیہم کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت بخشے اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

تقسیم سے قبل ہمارے ملک میں لکھنؤ علوم آلِ محمدؐ کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور تھا بھی ایسا۔ لکھنؤ کی سرزمین نے بڑے بڑے اعلام پیدا کئے۔ بے شک اطراف و اکناف مملکت پر اس سرزمین کا ناقابلِ فراموش احسان ہے۔ لکھنؤ کے علاوہ دوسرے مقامات بھی ہیں۔ جہاں علوم آلِ محمدؐ کی نشر و اشاعت کا مقدس فریضہ ادا کیا جاتا رہا ہے اور پاکستان کی سرزمین میں پیدا ہونے والے علماء کو انہی مدارس دینیہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہے۔ اب تقسیم ملک کے بعد بھی وہ مدارس دینیہ اگرچہ اپنے اپنے مقام پر لوگوں کی تشنگیٔ علوم کو بجھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے لیکن پاکستانیوں کے لئے وہاں سے استفادہ ناممکن ہو گیا ہے۔ خداوند کریم ان تمام علمائے اعلام کی خدمات کو قبول فرمائے۔

سرزمین پاکستان میں تقسیم ملک سے قبل علامہ سید ابوالقاسم لاہوری قدہ اور ان کے سپوت

علامہ سید علی المعروف حائری قدہ نے لسانی و قلمی لحاظ سے قوم و ملت کی تعمیر میں بہت حصہ لیا۔ چنانچہ ان کی متعدد تصانیف آج تک محل استفادہ ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر لوامع التنزیل ان کی قابل قدر اور مایۂ افتخار خدمت تھی لیکن افسوس کہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور جس حد تک اس کا مسودہ لکھا گیا۔ وہ بھی قوم کی بے قدری کا شکار ہو کر رہ گیا اور آخرکار اس کا اکثر و بیشتر حصہ دریائے راوی کی موجوں کی نذر ہو گیا۔ مولانا سید حشمت علی نصیر اللہ پوری قدہ مولانا سید شرف حسین صاحب قدہ آف جھکڑ مولانا سید محبوب علی شاہ قدہ خوشابی مولانا سید طالب حسین شاہ قدہ چکڑالوی مولانا ملک العلماء ملک فیض محمد صاحب قدہ تلمیالوی مولانا خادم علی خان قدہ مولانا محمد حسن صاحب قدہ ٹامٹے پوری اور ان کے علاوہ دیگر علماء سرزمین پاکستان میں پیدا ہوئے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی حیثیت کے مطابق دینی خدمات میں حصہ لیا۔ بعض تقسیم ملک سے پہلے اور اکثر تقسیم ملک کے فوراً بعد عالم فنا سے عالم بقا کی طرف منتقل ہوئے ان میں سے مولانا سید محبوب علی شاہ صاحب قدہ اور مولانا سید طالب حسین شاہ قدہ نے جو بیش بہا تدریسی خدمات انجام دیں وہ قابل صد شکر ہیں۔ ان کے تلامذہ آج تک خدمتِ ملت بیضا میں مصروف کار ہیں۔ خداوند کریم ان سب کی خدمات کو قبول فرمائے۔ اور انہیں اپنے نزدیک اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت کرے۔

استاد العلماء مولانا سید محمد باقر قدس سرہٗ

پاکستان کی زمین کو استاد العلماء مولانا السید محمد باقر اعلی اللہ مقامہ ایسے لائق فرزند پیدا کرنے کا بجا شرف حاصل ہے۔ یہ بزرگوار آسمان علم و فضل کا نیر درخشندہ اور برج زہد و تقویٰ کا تابندہ سورج تھے۔ اس گئے گذرے دور میں ان کی صورت پر سیرت آئمہ کی جھلک تھی اور ان کے اطوار کردار آئمہ کا آئینہ تھے انہوں نے اپنی پوری زندگی جو تقریباً نوے برس کے لگ بھگ تھی انتہائی سادگی سے گزاری نام و نمود کا کبھی ادنیٰ سا خیال بھی ان کی خاطر شریف میں نہ گزرا تھا۔ خداوند عالم نے ان کو حافظہ کی قوت اس غضب کی عطا فرمائی تھی کہ بچپنے کے مطالب سن ضعیفی میں بھی من و عن یاد تھے جو کتاب ایام تحصیل میں نظر سے گزری تھی اس کے مطامین آخر عمر تک خاطر عاطر میں محفوظ رہے مطالعہ اور کتب بینی کا از حد شوق تھا اور ان کا عام دستور تھا کہ جو کتاب پڑھتے اس کے شروع میں خاص خاص مطالب کی فہرست تیار کرتے جاتے تھے تاکہ کسی مطلب کو ڈھونڈنے کے لئے از سر نو محنت کرنی پڑے

لیکن حافظہ کا یہ عالم تھا کہ مطلب ڈھونڈنے کے لئے کبھی تیار کردہ فہرست کی احتیاج ان کو لاحق نہ ہوئی۔ خود اپنی قوتِ حافظہ کے متعلق فرماتے تھے کہ میں نے علوم و فنون میں سے ہر فن کا ایک ایک متن یاد کیا تھا اور فن صرف میں کتاب شافیہ کا متن صرف ایک ہفتہ میں یاد کیا تھا۔ چنانچہ اس کا اثر دماغ پر بھی پڑا۔ جس کو وہ آخر عمر تک محسوس کیا کرتے تھے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں مولوی فاضل کا امتحان ۱۹۰۹ء میں دے کر پوری یونیورسٹی میں اول آنے کا شرف حاصل کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب قاضی حمد اللہ وغیرہ نصاب میں داخل تھے آپ فرماتے تھے کہ مجھے حمد اللہ کی پوری عبارتیں اس وقت یاد تھیں اور ملا عبداللہ ٹونکی ان کے استاد تھے جو اس وقت یونیورسٹی میں مدرس اعلیٰ تھے اور انہوں نے زیادہ تر تحصیل علوم مجگراؤں کے مشہور عالم سید شریف حسین صاحب قبلہ قدہ سے کی اور تقسیم سے پہلے محرم اور جہلم کی مخصوص مجالس کے لئے لازمی طور پر وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ مولانا سید شریف حسین مولانا سید رجب علی خان ارسطو جاہ کے فرزند تھے جو دولت برطانیہ میں ملک کے ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔

آپ کا حلقہ درس و تدریس

اس وقت پورے ملک پاکستان میں ان کے فیوض و برکات کے قابل قدر اثرات موجود ہیں اور کوئی ضلع ایسا نہیں۔ جہاں ان کے بحر علمی سے سیراب ہونے والے اور ان کے شجر فیوضات خوشہ چینی کرنے والے مشغولِ خدمت دین نہ ہوں ان کے تقدس کی بدولت ان کا ہر شاگرد ان کی خدمت کا شرف حاصل کرتے ہی ان کے رنگ میں اپنے تئیں رنگنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا تھا پھر حسبِ استعداد و لیاقت ان کے تقویٰ کی جھلک ان کے شاگردوں میں موجود تھی عام طور پر فقہ و ادب کی تدریس پر زیادہ زور دیتے تھے۔ آپ عربی زبان کے بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ چنانچہ امام شافعی کا ایک شعر انہوں نے ایک طویل عربی قصیدہ میں تضمین کیا تھا اور وہ شعر یہ ہے۔

اِنْ کَانَ رِفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ فَلْیَشْهَدِ الثَّقَلَانِ اِنِّیْ رَافِضٌ

اگر آلِ محمدؐ کی محبت کا نام رفض ہے تو بیشک جن و انس گواہ ہو جائیں کہ میں رافضی ہوں۔

بہر کیف زبان عربی کے آپ لاجواب ادیب تھے اور فن طب میں بھی آپ کو کافی دسترس حاصل تھی۔ لیکن انہوں نے تدریس تک ہی محدود رکھا کافی شاگردوں نے آپ سے

فنِ طب پڑھا جو بعد میں نامور طبیب ہوئے۔

آپ کا حوزہ علمیہ چک نمبر ۴۰ تحصیل خانیوال ضلع ملتان میں رہا۔ جہاں دُور دُور کے لوگ کھچ کر ان کے چشمہ فیض سے سیرابی کے لئے حاضر ہوئے اس وقت وہاں منظم مدرسہ نہیں تھا بلکہ طلبہ کرام مسجد کے ایک کچے حجرہ میں ٹھہرتے تھے اور سادات و مومنین کے گھروں میں الگ الگ ان کے کھانے کا بندوبست ہوتا تھا تقریباً بیس برس یا کم و بیش انہوں نے چک نمبر ۴۰ میں تدریس کی جہاں تک مجھے خیال پڑتا ہے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک وہاں رہے اور ان کے اکثر شاگرد اسی جگہ سے فیض یاب ہوئے اور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک بدھ رجبانہ میں مائی جند وڈھی سیال کی دعوت پر تشریف فرما رہے اس جگہ بھی کافی طلبہ نے ان سے استفادہ کا شرف حاصل کیا۔ ان کی تدریس کا رنگ انوکھا تھا۔ عبارت عربی طالب علم سے خود پڑھاتے تھے اور کسی عبارتی یا معنوی غلطی کو نظر انداز نہیں کرتے تھے جس کی بدولت ان کے شاگرد عربی عبارت پڑھنے میں بڑے مشاق ہو جاتے تھے۔ اخلاق کریمانہ کا یہ عالم تھا کہ کبھی بلند لہجہ سے شاگرد کو جھڑکنا تک گوارا نہ کیا۔ گالی گلوچ یا بدکلامی کا تو ان کے ہاں تصور ہی نہ تھا۔ حسن کلمی ان کا شیوہ تھا۔ اور حضرت سید الشہداء علیہ السلام کا نام لیتے ہی ان کی آنکھیں برسنے لگ جاتی تھیں۔ اور جب بھی جاتا تھا وہ خود مصائب پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ بالجملہ وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے جو گنوائی نہیں جا سکتیں۔

ان کے تلامذہ

ویسے تو وہ حضرات جنہوں نے ان کے علمی بحرِ ذخار سے سیرابی حاصل کر کے اپنی علمی پیاس بجھائی یا بجھانے کی کوشش کی۔ میرے بس کا روگ نہیں کہ ان کو شمار کر سکوں۔ البتہ ان کے تلامذہ میں سے چند مشاہیر کا ذکر ہی میرے لئے ممکن ہے اور اسی پر اکتفا مقصد کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔

① استاد العلماء سید الفضلاء استاذی و استاد الاذکیاء مولانا السید محمد یار شاہ صاحب قبلہ مدظلہ العالی جنہوں نے آپ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حوزہ علمیہ عراق کا رخ کیا اور بہت قلیل عرصہ میں وہاں سے فراغت حاصل کر کے مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور تقسیم ملک سے تقریباً آٹھ نو برس پہلے چک نمبر ۳۸ میں درس و تدریس کی باقاعدہ ابتداء کی سیراب علوم دین کچھ عرصہ رہے۔ شتشہ سیالاں میں کچھ عرصہ قیام فرمایا ان کے بعد حلقہ نجف اشرف میں تشریف لائے اور تشنگان علوم دینیہ کو بھی سیر کر کے سیراب

کیا اور قبلہ مرحوم کے بعد آپ ہی اس قابل ہیں کہ ان کو استاد الکل کہا جائے اور اس وقت پاکستان میں جس قدر افاضل موجود ہیں ، ان میں سے اکثر ان کے علمی سمندر سے سیراب شدہ ہیں ۔ موصوف آج کل مدرسہ باب الہدیٰ علی پور میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں مدارس وغیرہ کی ابتداء اور ان میں فقہ و اصول کی کتابوں کی تدریس کا سلسلہ انہیں سے جاری ہوا اور مدرسہ دارالعلوم جعفریہ خوشاب بھی ان کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے ۔ خداوند کریم قوم کو ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق مرحمت فرمائے۔

② استاد العلماء ، سید الاذکیاء ، مولانا السید محبوب علی شاہ صاحب مرحوم اعلی اللہ مقامہ آپ مولانا کے دور اول کے شاگردوں میں سے تھے اور اپنے دور کے امام النحو شمار ہوتے تھے باقی علوم کی بہ نسبت ان کو علوم عربیہ سے خصوصی دلچسپی حاصل تھی ۔ ان کا اوڑھنا بچھونا درس و تدریس ہی تھا ۔ فن طب اور گنڈہ جات میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے اور علم کلام میں بھی کافی مہارت کے مالک تھے ۔ بہت لوگوں نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا ۔ ان کے ارشد تلامذہ آج تک خدمت دین میں مصروف ہیں ۔ انہوں نے ضلع سرگودھا کے مشہور شہر خوشاب میں سکونت اختیار فرما رکھی تھی اور یہیں ان کا سلسلہ تدریس قائم تھا ۔ ان کی خودداری ضرب المثل ہے ۔ ہفتوں فاقہ کے باوجود دست سوال دراز کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے بلکہ کسی سے کچھ لینا اپنی شان کے منافی سمجھتے تھے البتہ ہدایا کو خندہ پیشانی سے قبول فرما لیا کرتے تھے ۔ نیز اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ ان کے کتب خانہ کی نذر ہو جاتا تھا ۔ لیکن افسوس کہ ان کے بعد ان کا کتب خانہ بالکل تلف ہو گیا کیونکہ ان کی اولاد میں سے کوئی بھی کتب کا قدردان نہ نکلا ۔ ان کی وفات تقسیم ملک کے سال بعد یا اس کے قریب قریب ہوئی ۔

③ استاد العلماء و سید الفضلاء ، مولانا السید گلاب شاہ نقوی مدظلہ ۔ ان کا وطن مالوف ضلع کیمبل پور میں ہے اور اس وقت مخزن العلوم الجعفریہ شیعہ میانی کے مدرس اعلیٰ کی حیثیت سے ہیں ۔ انہوں نے بھی مولانا سے ایک عرصہ تک استفادہ کیا اور پھر مختلف مدارس سے تحصیل علوم کرنے کے بعد شیعہ میانی میں سلسلہ تدریس قائم کیا اور جلیل القدر علماء ان کے علمی خزانہ سے فیض یاب ہو کر خدمت دین کرنے پر موفق ہوئے ۔ علماء میں آپ کا تقدس و زہد ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ مطالعہ کتب ان کا مرغوب مشغلہ ہے نیز حق گوئی

اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں جرأت کا مظاہرہ ان کا خاصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کے مطلق العنان بعض صاحبان منبر کی مختلف اوقات میں ان سے ٹکر ہوئی اور آخر کار ان کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور چونکہ غلطی پر ٹوکنے والا اچھا نہیں لگتا۔ لہٰذا خود ساختہ صاحبان منبر کے نزدیک امم سالفہ کے قدیمی دستور کے مطابق تمام تر الزامات اور طعن وتشنیع کا اولین مستحق انہی کو قرار دیا گیا۔ لیکن باطل کی صف آرائی اور باوجود ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آسکی۔ انہوں نے ڈٹ کر باطل کی موجوں کا سامنا کیا اور اس کی طوفانی لہروں کا کوہ گراں بن کر مقابلہ کیا پس فتح وکامرانی نے ان کے قدم چوم لئے اور لوگوں نے حق گو ذات کو پہچان لیا۔ خداوند کریم قوم پر ایسے علماء کا سایہ تا دیر رکھے موصوف آقائے سید محسن الحکیم طباطبائی نجفی قدس سرہ کے پاکستان میں وکیل خاص بھی رہے ہیں۔

④ مولانا السید عبد الستار شاہ مرحوم جو تقدس میں اپنی نظیر آپ تھے۔ علاقہ بجگرائی ضلع میانوالی کے رہنے والے تھے مولانا قدس سرہ کو نہایت پیارے تھے اور ان کی موت سے مولانا کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچا تھا۔

⑤ مولانا عبد الحسین خان جو مذہب حقہ کی تبلیغ میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ بہت کافی تعداد میں مومنین کرام مذہب حقہ کے اصول وفروع کا ان سے درس لے کر اپنی نجات کا سامان فراہم کر چکے ہیں۔ علاقہ بھکر میں جو عملی تبلیغ آپ نے انجام دی وہ آپ کے شغفِ دینی کی بولتی ہوئی زبان ہے۔ چنانچہ مدرسہ باقر العلوم کوٹلہ جام جو مولانا حافظ سیف اللہ صاحب جعفری کی تحریک سے قائم ہوا۔ اس میں مولانا موصوف کی مساعی جمیلہ کو بڑا دخل ہے۔

⑥ مولانا السید الطاف حسین شاہ قدس سرہٗ یہ مولانا کے اپنے عزیزوں میں سے تھے انہوں نے علوم عربیہ میں کافی حد تک دسترس حاصل کی اور حالات حاضرہ کے ماتحت انہوں نے حکومتی تعلیمی اداروں میں سلسلہ تدریس کو اپنایا اس وقت ان کے تلامذہ بڑے بڑے حکومتی عہدوں پر فائز ہیں۔ لیکن ملازمت کے باوجود مولانا کی تربیت کا اثر ان سے زائل نہ ہوا۔ متانت دیانت امانت صداقت اور جملہ امور میں شریعت کی پاسداری ان کا لائحہ زندگی رہا ان کی وفات ۱۹۸۰ء میں ہوئی اور مولانا مرحوم کے چھوٹے شہزادے آقا سید زین الدین حسین ان کے داماد ہیں۔

⑦ مولانا السید غلام عباس شاہ مدظلہٗ یہ بھی مولانا کے اپنے خاندان کے فرد ہیں۔ علوم عربیہ

بی کا ای و سند درس حاصل کرنے کے بعد انہوں نے علاقائی ادارہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی۔ فن خطابت میں بھی اچھی مہارت رکھتے ہیں مولانا مرحوم کی تربیت کے آثار ان کی سیرت و صورت سے ہویدا ہیں آج کل بھکر میں قیام فرما ہیں اور علاقہ کے مومنین کی ہر قسم کی امداد و اعانت کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے احکام شریعت کی حفاظت و اشاعت ان کا مقصد زندگی ہے

(۸) مولانا سید آغا حسن شہید بن مولانا سید شرف حسین شاہ اعلیٰ اللہ مقامہ ان کو مولانا سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ نہایت نیک طینت شستہ مزاج تھے آپ فن تقریر میں کافی مہارت رکھتے تھے آخر ایک دشمن اہل بیتؑ کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرما کر اللہ کو پیارے ہو گئے ان کا لڑکا آغا سید حیدر حسن نیک اور لائق نوجوان ہے جو اس وقت فاضل عربی کا امتحان دے کر خدمت دین میں مصروف ہے۔

(۹) مولانا خادم حسین مرحوم یہ میرے عم زاد بھائی تھے اور میری ہی تحریک سے انہوں نے تحصیل علوم دینیہ کی طرف قدم اٹھایا تھا ابتداء میں ان کی طبیعت غیر شائستہ تھی جس سے مولانا مرحوم کو مایوسی ہوئی تھی لیکن مولانا کے زہد و تقویٰ اور تقدس کا رنگ ان پر ایسا چڑھا کہ چند دنوں کے اندر ان کی کایا پلٹ گئی اور مولانا مرحوم ان کے ذہنی انقلاب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو اپنے حقیقی بیٹوں کی طرح سمجھنے لگے حتیٰ کہ وہ جہاں جاتے یہ ان کے ساتھ سایہ کی طرح چمٹے رہتے اور آخری سفر زیارت میں مولانا کی خدمت کا شرف ان کو حاصل تھا اور سرکار مولانا کو ان پر اعتماد کلی تھا۔ بہرکیف انہوں نے مولانا کی خدمت اس طرح کی جس طرح کسی لائق شاگرد کو استاد کی کرنی چاہیئے۔

سفر زیارت سے واپس آ کر مرحوم بیمار ہو گئے چنانچہ ایک سال کے قریب بستر علالت پر رہنے کے بعد ۲ جنوری سن ۱۹۵۰ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا مولانا کو جب مولوی خادم حسین مرحوم کی خبر مرگ پہنچی تو بے حد متاثر ہوئے اور اپنی زندگی کے آخری لمحات تک وقتاً فوقتاً ان کو یاد فرمایا کرتے تھے۔ مرحوم مولانا سید طالب حسین شاہ قدس سرہٗ کے پاس چکڑالہ میں بھی تحصیل علوم کے لئے گئے تھے۔ پس ان دونوں بزرگوں سے تلمذ کا شرف ان کو حاصل تھا۔ دیانت امانت ان کا شیوہ زندگی تھا۔ اپنے وطن مالوف جاڑا میں ان کے دینی شغف کے آثار آج تک یادگار ہیں اور اپنے بیگانے ان کی تعریف میں اب تک رطب اللسان ہیں جاڑا کی شیعہ جامع مسجد کے سامنے وضو کے لئے پختہ برآمدہ اور امام باڑا کی تعمیر مرحوم کی مساعی جمیلہ کی بولتی ہوئی

زبانیں ہیں۔ مرحوم نے عالمِ شباب میں وفات پائی اور ان کی وفات ان کے والدین کے لئے ناقابلِ برداشت صدمہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ ان کی وفات کے فوراً بعد ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور ان کے والد ملک جان محمد مرحوم مہلک مرض میں مبتلا ہوگئے جو کافی عرصہ تک بیمار رہنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں ملکِ بقاء کی طرف چل بسے اور ان کی قبر جامعہ علمیہ باب النجف کے صحن میں جامع مسجد کے پیچھے شمال مغربی گوشے کے قریب ہے۔ مولوی خادم حسین مرحوم نے ایک لڑکا محمد رضا اور ایک لڑکی اپنے پیچھے چھوڑے ہیں۔ مولانا کاظم حسین صاحب اثیر جاڑوی فاضلِ قم ان کے داماد ہیں۔

(۱۰) اپنی مختصر سرگزشت

بندۂ حقیر مصنفِ کتاب بھی ان کے علوم و فیوض کے بحرِ ذخار سے استفادہ کا شرف رکھتا ہے۔ چنانچہ میں نے جب سے ہوش سنبھالی اور ابتدائی اردو تعلیم مڈل تک حاصل کرلی تو والد بزرگوار ملک اللہ بخش بن ملک خان محمد مرحوم کو شوق پیدا ہوئی کہ علوم دینیہ کے لئے کسی دینی درس گاہ کی تلاش کی جائے چنانچہ بصورت ذاکری چک نمبر ۳۸ میں تشریف لائے اور واپس عزم صمیم لے کر چلے کہ اپنے لڑکے کو مولانا سید محمد باقر کے حوالہ ہی کروں گا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے اواخر میں وہ بنفسِ نفیس سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے چک نمبر ۳۸ مجھے لے گئے اور مجھے ان کے سپرد کر کے واپس مراجعت فرما ہوئے۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت کو اختیار کرلیا۔ تاکہ ان کے فوائد سے خوشہ چینی اور ان کے علمی دسترخوان سے ریزہ چینی کرتا رہوں۔ میرے والدِ بزرگوار کی انتہائی خواہش کمالِ شوق اور میلانِ طبع صرف ایک فن کی طرف بہت زیادہ تھا اور اس پر وہ فریفتہ و عاشق تھے یعنی فن بیان و گویائی۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا فرزند ایک بلند پایہ خطیب ہو لیکن قبلہ و کعبہ کا نظریہ میری ذہنی استعداد کا جائزہ لیتے ہی یہ تھا کہ اسے علوم میں تکمیل حاصل کرنی چاہیئے۔ ظاہراً یہ دونوں نظریئے ایک دوسرے کے متضاد تھے اور ہر ایک کے مبادی و غایات ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے۔ میں نے اپنے استاد کی خواہشات کا بصد احترام لحاظ کرتے ہوئے شغفِ علمی کو ہی اپنا مآلِ زندگی قرار دیا پس ہر وقت کتب کے ساتھ چمٹا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ تحصیل و تعطیل کے ایام میرے لئے برابر تھے اور میری اس علمی محبت کی وجہ سے مولانا کو میرے ساتھ بے حد انس تھا۔ پس میں مدارجِ ارتقاء میں قدم آگے بڑھاتا گیا اور والدین کی دعاؤں اور استادِ مہربان کی شفقت کی بدولت فتح و کامرانی میرے لئے چشم براہ

جنتی چلی گئی۔ میرا مطمحِ نظر صرف علوم کی بلندیوں کو سَر کرنا تھا اور یہی فنِ تقریر و خطابت کو شاید یک میرے دل میں جگہ نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ والدین کی خواہش اور استاد محترم قدس سرہٗ کی منشا بہر دو بفضلِ خداوندی احسن وجوہ پوری ہوئیں۔ چنانچہ اللہ نے علوم دینیہ میں کسبِ حاصل نتیجہ حاصل کرنے کے بعد مجھے ملکہ گویائی اور فنِ تقریر بھی عطا فرما دیا۔ اور ان دونوں سے آگے بڑھ کر مجھے تقریر کے لئے قلم مضبوط بھی عطا ہوا جس کی بدولت میں اظہارِ خیال پر اچھی طرح موفق ہوتا ہوں اور اسی کی بدولت تفسیر قرآن لکھنے پر توفیق سعید پائی ہے اگرچہ میرے حاسدین کو میری ان کامیابیوں کا کافی دکھ ہے لیکن ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ بعض ناموزوں حالات کی بنا پر مجھے ایک عرصہ تک علوم دینیہ کو ترک کرنا پڑا تھا۔ لیکن تائیدِ غیبی اور لطفِ خداوندی نے دستگیری کی۔ اور مختلف مدارس دینیہ کا چکر لگانے کے بعد سنہ ۱۹۴۶ء میں پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا پھر اہل سنت کے درسوں میں فنونِ مروجہ منطق و فلسفہ و معنی، بیان و ہیئت و ادب وغیرہ کی تحصیل میں ایک مدت عمر خرچ کی اور کچھ عرصہ تدریس کے بعد نجف اشرف جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ علوم دینیہ و معارفِ ربانیہ کی تحصیل کا عشق بحد جنون دل و دماغ پر مسلط تھا جس کی بدولت اپنی عمر کا شاندار حصہ اور زندگی کا بارونق تحفہ میں نے اس پر خرچ کیا اور یہ اسی عشق کی کارستانی تھی کہ مجھے جوانی کے پرکیف دور کی قربانی پر توفیق حاصل ہوئی۔ پس خوبیٔ قسمت اور یاوری بخت سے ایسے ماہرِ فنون اور کامل استاد دستیاب ہوئے کہ اس زمانہ میں ان کا وجود نایاب ہے۔ میں نے ان کے علمی خزائن اور فنی ذخائر سے کافی استفادہ کیا اور ان کے فضل و کمال کے صاف و شفاف اور شیریں و جاری چشموں سے جی بھر کر سیرابی حاصل کی۔ یہاں تک کہ جو کچھ میرے لئے میسر ہو سکا اور جس قدر میں نے چاہا یا جتنا عنایتِ عالیہ کی مشیت میں تھا میں نے حاصل کر لیا اور بابِ علوم نبویہ کی بارگاہِ قدس سے وداع کے وقت میں نے اپنے دل سے عہد کیا تھا کہ خدمتِ دین اور ترویجِ علوم آلِ محمدؐ کو اپنی زندگی کا لائحہ قرار دوں گا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۵ء میں وطن مالوف میں پہنچتے ہی اس کی دھن میں لگ گیا اور انتہائی نازک حالات کے باوجود جامعہ علمیہ باب النجف کا سنگِ بنیاد رکھ دیا جس کا مفصل تذکرہ تفسیر انوار النجف کی ابتداء میں کر چکا ہوں۔ اور مدرسہ کا نقشہ تفسیر کی دوسری جلد میں پیش کیا گیا ہے۔ بہرکیف تائیدِ غیبی نے پشت پناہی کی اور نصرت نے قدم چومے ایک کامیاب مدرسہ کی تشکیل ہو گئی اور آج تک علوم آلِ محمدؐ کی تحصیل

کرنے والوں کی ایک معتد بہ جماعت اس مدرسہ سے استفادہ کرکے مختلف مقامات پر خدماتِ مذہب انجام دے رہی ہے کچھ پیش نماز ہیں، کچھ مدرس ہیں بعض خطیب و واعظ ہیں اور کچھ تکمیل علوم کے بعد عراق سے واپس آ چکے ہیں۔ اگر خود نمائی اور کبریائی کا لحاظ نہ ہوتا تو بعض اپنے ارشد تلامذہ کا ذکر زینتِ کاغذ بنا لیتا جیسا کہ بعض چھپر چھپرے لوگوں کا دستور ہوا کرتا ہے۔ لیکن میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا بہرکیف حقیقت اور بناوٹ میں عقلاء خود تمیز پیدا کر سکتے ہیں۔

میں نے جب اپنے پس ماندہ علاقہ میں مدرسہ باب النجف کی تعمیر میں کامیابی حاصل کر لی اور اسے خیال و وہم کی منزل سے نکال کر ایک زندہ حقیقت کے لباس میں پیش کر لیا۔ تو حوصلے بڑھ گئے۔ پس تصنیف و تالیف کا خیال مضبوط ہوا۔ جو نجف اشرف کے قیام کے دوران میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کے متعلق تھا اور ناسازگار حالات کی بنا پر اب تک قابل عمل نہ بن سکا تھا۔ پس اسے عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا اور اسی مناسبت سے اس کا نام تفسیر انوار النجف رکھا۔ پہلے پہلے میں نے جب اپنا ارادہ قبلہ و کعبہ مرحوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ تو آپ نے میرے اس خیال کی تائید نہ فرمائی۔ لیکن کتاب کی جلد اول چھپ جانے کے بعد جب مطالعہ فرمایا تو آپ داد دیے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

مولانا قدس سرہٗ کا مجھ پر حسنِ ظن

تفسیر کی ہر جلد کا مطالعہ فرمانے کے بعد مجھے اپنے پاس بلواتے اور داد دیتے تھے جس سے میرے حوصلے بڑھتے جاتے تھے اور ان کے حسنِ ظن کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ضروری مسائل کا عراق سے دریافت کرنا چھوڑ دیا اور ہر مسئلہ پیش آمدہ میں میری طرف رجوع فرماتے تھے اگر کسی مسئلہ میں کوئی دقت محسوس ہوتی تو مجھے بلا کر تسلی فرماتے تھے اور سہم امامؑ کی اجازت مطلوب ہوتی تو مجھے لکھ دیتے یا پاس بلا کر سامنے پوچھ لیا کرتے تھے اور کسی وجہ سے مجھے دیر ہو جاتی تو مسائل کی فہرست تیار کر کے اپنے پاس محفوظ رکھ لیتے تھے اور جب میں حاضر ہوتا تو پوری فہرست کا جواب حاصل کر کے مجھے دعائیں دیتے اور خوش ہوتے تھے اور اسی دوران میں ان کے معتقدین جس قدر ان سے مسائل دریافت کرتے تھے آپ ان کو بھی میری طرف رجوع کرنے کا حکم صادر فرماتے تھے اگرچہ میں خود ان کے بحرِ ذخار علمی سے فیض یاب ہوا ہوں۔ لیکن میرے متعلق ان کا حسنِ ظن ان کی انتہائی کرم فرمائی کا غماز ہے جو میرے لئے مایۂ صد افتخار ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اس وقت پاکستان میں جس

قدر افاضل موجود ہیں خواہ مدرس مقرر خواہ پیش نماز غرضیکہ سب اہل علم طبقہ یا تو ان کے براہ راست شاگرد ہیں یا ان کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ بس پاکستان بھر میں قوم شیعہ کی علمی بازگشت انہی کی طرف سے ہے اور وہ پوری قوم کے محسن ہیں اور ان کا یہ صدقہ جاریہ ان کے درجات کی بلندی کا ضامن ہے۔

مولانا کی کوئی تصنیف زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی کیونکہ وہ مقام شہرت سے انتہائی گریزاں تھے ان کی مجالس کا قلمی مسودہ اب تک موجود ہے جو ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ ہے اگر کسی وقت حالات سازگار ہوئے تو ان کو نقل کر کے ضروری وضاحت کے بعد طبع کرایا جائے گا تاکہ مرحوم کی یاد تازہ رہے۔ چنانچہ صرف ۲۸ مجالس کا مجموعہ شائع کرا دیا گیا ہے جس کا نام المجالس المرضیہ ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن بھی اب چھپ چکا ہے۔

وفاتِ حسرت آیات

مرحوم نے ۹ ماہ جون ۱۹۶۶ء مطابق ۱۹ صفر المظفر ۱۳۸۶ھ بروز جمعرات اپنی جائیداد واقع موضع کبا ڈرکلاں تحصیل بھکر میں انتقال فرمایا اور وہیں ریلوے لائن کے قریب ایک قبرستان میں مدفون ہوئے۔ خداوند کریم ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں ان کے نقوش پر چلنے کی سعادت نصیب فرمائے سال ۱۹۶۶ء کے شیعہ قوم پر مصائب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سال ماہ جون میں مولانا سید العلماء اعلی اللہ مقامہٗ نے قوم کو داغِ مفارقت دیا۔ جس کا زخم قابل اندمال نہیں اور اسی سال کے اختتام پر ۲۳ ماہ اکتوبر مطابق ۸ رجب ۱۳۸۶ھ بروز اتوار قدوۃ السالکین حضرت پیر سید فضل حسین شاہ صاحب قدس سرہٗ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی موت بھی شیعان پاکستان کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے خداوند کریم ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور پس ماندگان کو اپنی مرضات کی تحصیل کی توفیق مرحمت فرمائے اور میں سچ کہتا ہوں کہ پیر صاحب قبلہ کی تبلیغی مساعی علماء کی تبلیغ و تدریس و تصنیف کی خدمات سے کم نہیں تھیں۔ آپ نے زندگی کا اہم حصہ موضع کرڑ ضلع سرگودھا میں بسر کیا جس کی وجہ سے وہ عموماً کرڑ کی طرف منسوب ہوتے تھے حالانکہ ان کا مقام ولادت جہلم کی ایک بستی ملیار تھی اور کرڑ کے بعد انہوں نے چک نمبر ۲۱ علاقہ کوٹ مومن تحصیل بھلوال کو مرکز تبلیغ قرار دیا اور ہزاروں تشنگان معارف کو اس جگہ سے درس معرفت ملا اور سینکڑوں کو توفیق توبہ نصیب ہوئی۔ آپ کا مدفن چک ۲۱ میں ہے آپ نے ایک سو برس کے لگ بھگ زندگی پائی۔

خلاصۃ الکلام

وہ تمام علمائے اعلام جنہوں نے علوم آلِ محمد اور معالم مذہب اہل بیت کی نشر و اشاعت میں قلمی سخنی یا تدریسی طور پر کم و بیش حصہ لیا۔ خواہ وہ کسی سرزمین کی پیداوار ہوں۔ ان کی محنت و کاوش قابلِ قدر ہے اور لائق داد و ستائش ہے۔ شَکَرَ اللّٰہُ سَعْیَہُمْ۔ ہم انہی لوگوں کے انوارِ علمیہ سے اقتباس کرنے والے ہیں اور ان کے فیوضِ عرفانیہ سے استفادہ کرنے والے ہیں۔ ان کی تحقیقات و بیانات کا مطالعہ ہماری جلائے ذہن کا باعث ہے اور انہی کی تصنیفات ہمارے معلومات کا ماخذ ہیں بیشک ان کی کد و کاوش اور محنت و کوشش کا معیار بہت بلند ہے۔ خداوند کریم ان کو اور ان کے آباء کو اس کا صلہ عطا فرمائے۔ انہوں نے مذہب کے چہرہ پر اغیار کی جانب سے اڑائے ہوئے گرد و غبار کو اپنی تحقیق و تدقیق اور پرخلوص محنت و ہمت کے چھینٹوں سے دھو دیا حتیٰ کہ کسی کے لئے مجالِ مقال باقی نہ رہی اور نہ کسی مطلب میں محلِ اشکال باقی رہا۔

عربی و فارسی زبان میں بہت کتابیں لکھی گئیں جن میں اصول و عقائد مذہب جعفریہ پر سیر حاصل بحثیں اور تبصرے کئے گئے علماء اعلام نے اپنی اپنی وسعت کے لحاظ سے اس اہم موضوع کی وضاحت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ لیکن اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب معرضِ وجود میں نہ آسکی۔ جس کی عبارتیں مضبوطی و پختگی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوں۔ جس کا طرزِ بیان پرکشش اور سلامت و سلاست جاذبِ طبع ہو اس میں سوال و جواب کا لہجہ ایسا پرپیچ نہ ہو جس کو کافی غور و خوض اور انتہائی ذہنی تگ و دو کے بعد صرف کوئی ایک آدھ انسان ہی سمجھ سکے اور اس قدر مختصر نہ ہو کہ عقدۂ لاینحل اور معمۂ حل طلب بن جائے یا خواص کی طبع آزمائی کا محل بن جائے اور طولِ بلاطائل بھی نہ ہو کہ طبیعتیں منتہائے مقصد تک پہنچے بغیر اکتا کر مایوسی کا شکار ہو جائیں۔

پس ایک بین بین راستہ ضروری ہے جو تشنگان علوم کے لئے علمی پیاس بجھانے کا کفیل ہو اور سادہ ضمیر انسانوں کے لئے سادہ بیانی سے مطلب کے چہرہ کو صاف و ستھرا پیش کرنے کا ضامن ہو۔ تاکہ ہر پڑھا لکھا توجہ کرنے کے بعد اس میں مطالعہ کر کے اپنے دینی مسائل کا حل تلاش کر سکے بلکہ دین کی حقیقت کو پہچان سکے۔ بہرکیف مرض کا علاج مریض کی مزاج شناسی سے ہو تو زیادہ موثر ہوتا ہے۔ مریض کا فائدہ بھی اسی میں ہے اور معالج کا نفع بھی اسی کے اندر ہے۔ شکوک و شبہات کا میدان اگرچہ وسیع بلکہ وسیع تر ہے۔ لیکن ہم اپنے بیان

ہمیں اس حد تک رہنا چاہیئے۔ جہاں تک عقیدۂ مذہب کی اچھی خاصی وضاحت ہو سکے۔ اس سے آگے قدم بڑھانا ـــــ اضطراب و تشویش کے سوا اور کچھ نہیں۔ خداوند کریم ہمیں سمجھنے اور سمجھانے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

دشمنانِ دین کی دین سے آزادی اور اس کے مہلک اثرات

یہ وہ پُر خطر دَور ہے جس میں دھریت اور کمیونزم کا خونخوار عقاب ادیانِ عالم کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے اپنے پر و بال خوب مضبوط کر چکا ہے اور اس کی گرفت روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان صرف گوشت پوست خون اور ہڈیوں کا مجموعہ ہے جو بہت جلد مضمحل اور منعدم ہونے والا ہے اور اس کی زندگی ان اعضاء کی مجموعی حیثیت اور ان میں توازن کے قیام کا نام ہے۔ جبکہ موت ان کے تفرقہ کی تعبیر ہے ان لوگوں کے نزدیک شرف و خیر یا فضل و کمال بالکل بے معنی اور بے مقصد ہے وہ مادّی زندگی نفسِ حیوانی کی لذّات اور جذبات شہوانیہ کے ذرائع میں وسعت کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان جنسی لذّات اور شہوانی جذبات کے استعمال میں خواہ کس قدر ہی ترقی کر جائے وہ اس مرحلہ میں خسیس ترین حیوان کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔

بہر کیف ان کا مطمحِ نظر یہ ہے، کہ دنیا سے تمام ادیان و مذاہب کے نقوش کو محو کر دیا جائے اور غیرت و حمیت اور عزت و شرافت کو کچل کر رکھ دیا جائے وہ اس سلسلہ میں سعیٔ بلیغ اور حد درجہ کی دریدہ دہنی اور کمینہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں اور دین و مذہب کی جملہ قیود سے آزادی کو انسان کا فطری اور بنیادی حق کہہ کر سادہ لوح انسانوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنساتے ہیں۔ یہ عقل و دانش کے دشمن اس تصور سے بالکل بے نیاز ہیں کہ اگر دین و مذہب کا تصور نہ ہو اور قانون کی گرفت کا خطرہ نہ ہو تو انسانیت اوجِ شرف سے اوندھے منہ قعرِ ہلاکت و ہلاکت اور ذلّت و رسوائی کی پستی میں جا گرے گی۔

انسان کا دین و مذہب سے بغاوت کا نتیجہ صرف یہی ہے کہ وہ وحشیانہ انداز کو اپنائے اور عہدِ قدیم کی طرح بہیمیت و حیوانیت کا طور طریقہ اختیار کرے اور جہاں کمیونزم نے نئی روشنی کے بہانہ سے انسانی آزادی کے تصور کا چکمہ دے کر نوجوان طبقہ کو راہِ راست سے ہٹانے

کی سعی نامسعود کی ہے وہاں عیسائیت کے علمبرداروں نے اپنی پوری کوششوں اور ہر ممکن سازشوں سے اسلام اور محافظین اسلام پر قسم قسم کے ناروا اور رکیک حملے کر کے اسلامیان عالم کی روحوں کو زخمی کیا اور کچھ نہ سہی تو اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ لوگ اگرچہ عیسائیت کی طرف بہت کم مائل ہوئے لیکن اسلامی تعلیمات پر بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ دین و مذہب کی تعلیمات کو انہوں نے فرسودہ خیالات کہنا شروع کر دیا اور الحاد کی وادی میں کود گئے گویا ان کے سامنے کمیونزم کا دروازہ کھل گیا اور دہریت کا پرچار کرنے والے ان کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئے۔ حتیٰ کہ مسلمان کہلانے والوں کی زبان پر جس حد تک اسلام کا نام ہے وہ صرف اپنے آباء کی تقلید میں ہے ورنہ ان کا دل وعقیدہ مذہب و دین کے قیود سے بالکل آزاد ہے اور صرف اسلام نہیں بلکہ تمام ادیان عالم اس کی زد سے نہیں بچ سکے اور ہر انسان مذہب کا جوا گردن سے اتار پھینکنے کے لئے بے تاب ہے بے شک میں آپ کو پھر بھی دعوت دیتا ہوں کہ چشم خرد پہ بصیرت کی دوربین لگا کر دیکھئے کہ چہار دانگ عالم میں اور ربع مسکون کے گوشے گوشے میں کمیونزم اور دہریت کی تیز آندھیاں اور لادینیت کے بے پناہ طوفان تمام ادیان و مذاہب کا صفحہ ہستی سے ملیامیٹ کرنے پر کس طرح تلے ہوئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی شرافت و نجابت سے ہٹ کر عہد سابق کی طرح بہیمیت کو اپنا شعار بنائے۔ پس درندہ بن کر رہے جو چاہے سو کھائے اور جس سے چاہے نکاح کرے نہ اس کی خواہشات کے آگے قانون کی بندش ہو اور نہ تہذیب وادب کی رکاوٹ ہو اور خدا کی قسم اگر رہنمایان ملت سعی اور پامردی سے اس متعدی و مہلک مرض کے روکنے کی طرف اقدام نہ کریں تو وہ دن دور نہیں کہ شرافت بلکہ انسانیت کا جنازہ نکل جائے۔

باقی تمام اقوام کو چھوڑیئے ہمارے لئے تو یہ مصیبت اور زیادہ جان لیوا اور خطرناک ہے کیونکہ ہمارے منبر پر بعض ایسے لوگ بھی آدھمکے ہیں جو آل محمدؐ کے ذکر کی آڑ میں عوام کے لئے دین و مذہب کی قیود سے آزادی کے علمبردار ہیں اور عوام اس سم قاتل کو خوشنما لیبل کے دھوکے سے نوش کرتے جا رہے ہیں۔ ان کو ان کی سادہ ضمیری پس منظر کی تحقیق سے غافل کئے ہوئے ہے اس قسم کے ناخدا ترس اہل منبر کا یہ دعویٰ اور ببانگ دہل اعلان کہ فضائل آل محمدؐ سنو اور صرف زبان سے علیؑ علیؑ کرو اور پھر مصائب آل محمدؐ سنو اور آنسو کے چند قطرات بہالو بس جنت تمہاری ہے اور تم جنتی ہو۔

اس میں بڑے بڑے ہوشمند لوگوں کو ہم نے سرگرداں دیکھا ہے کیونکہ اس میں لاگت کم اور آمدنی بے حساب کا لالچ ہے۔ گویا ان کے نظریہ میں حبِ علیؑ اور غمِ حسینؑ کی موجودگی میں نہ نیکی کا بجالانا ضروری ہے اور نہ برائی سے بچنا لازمی ہے۔ حالانکہ اہلِ منبر پر فرض ہے کہ جہاں ایک طرف اللہ کی رحمت و بخشش کا ذکر کریں۔ وہاں دوسری طرف آلِ محمدؐ کے مشن کی مخالفت پر عذاب خداوندی سے بھی روشناس کرائیں۔ اس میں شک نہیں کہ علیؑ متقیوں کا امام ہے اور حسینؑ دین کا محافظ ہے ان عقل کے اندھوں سے پوچھتا کوئی نہیں کہ وہ تقویٰ کیا ہے جو علیؑ کے مقتدیوں کے لئے ضروری ہے اور وہ دین کیا شئے ہے جس کی خاطر امام حسینؑ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا جب تقویٰ کے بغیر علیؑ کسی کو اپنا مقتدی بنانا گوارا نہ کریں اور دین کو اپنانے کے بغیر حسینؑ اس کو اپنا نہ بنائیں تو یقین کیجئے صرف زبان سے علیؑ علیؑ کرنا علیؑ کو دھوکا میں نہیں ڈال سکتا۔ جب تک علیؑ کی سیرت کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش نہ کریں اور اسی طرح مگر مچھ کی طرح آنسو بہانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک حسینؑ کے بچائے ہوئے دین کو اپنا لائحہ زندگی نہ بنائیں۔

قوم کا علماء صالحین سے برتاؤ

مجھے معلوم ہے اگر مذہب اور دین کی ضرورت اور اعمالِ صالحہ کی اہمیت اور آئمہ طاہرینؑ کی سیرت کو پیش کیا جائے تو ایسے لوگوں کو غیر ذمہ دار افراد کے طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے اور افترا کا غیر متناہی سلسلہ اور الزامات کی بوچھاڑ بھی ان پر ہوتی ہے اور قسم قسم کے ہتھکنڈوں سے ان کو بدنام کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تاکہ حق بیانی کرنے والی زبان کو روکا جائے۔ آج سے نہیں، بلکہ یہ سلسلہ ہمیشہ رہا ہے اور ہر نبی کی امت کا یہی دستور رہا ہے کہ جب تک نبی خاموش رہے تو لوگ ان کو صادق امین دیانت دار اور نیک سمجھتے رہے لیکن جب انہوں نے بحکمِ خدا ان کی غلطیوں کی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا تو قوم کے سیٹھ پادری یا چوہدری لوگ جو قوم میں ہر قسم کی بے راہ روی کے بانی و موجد یا سرپرست تھے انہوں نے نبیوں پر ہر گندہ کیچڑ اچھالنے کی جسارت کی۔ تاکہ ان کی اپنی چوہدراہٹ کو ٹھیس نہ پہنچے۔

① جب نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا۔ لَا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ سورۂ ہود آیت ۲۶۔ یعنی اللہ کے سوا کسی

کی عبادت نہ کرو۔ ورنہ مجھے تم پر سخت عذاب کا خطرہ ہے تو ان کی تردید کے لئے عوام الناس نہیں بلکہ خواص امۃ کھڑے ہوئے چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا۔ الآیۃ اس قوم کے سرداروں نے کہا جو کافر تھے ہم تو تمہیں اپنے جیسا بشر ہی سمجھتے ہیں۔ گویا قرآن کی فرمائش کے مطابق کسی نبی و رسول کی دعوت کی تردید کا بہانہ کفار کے نزدیک یہ تھا کہ (آپ اگر رسول ہوتے تو بشر نہ ہوتے) یعنی ان کے ذہن میں بشر اور رسولؑ کے درمیان منافات تھی اور یہی اعتراض حضرت رسالتمآبؐ پر بھی کیا جانے لگا کہ اگر آپ نبی ہوتے تو بشر نہ ہوتے تو خدا نے ان کو یہ نہیں فرمایا کہ تم بشریت کا انکار کر دو بلکہ فرمایا۔ کھلے لفظوں میں کہہ دو۔ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ پارہ ۱۶ سورۃ کہف کہ واقعی میں تمہاری طرح کا بشر ہوں۔ میرے اوپر وحی ہوتی ہے کہ تمہارا اللہ یعنی معبود صرف ایک ہے تو جس کو اللہ کی لقاء مطلوب ہو وہ عمل صالح بجالائے اور عبادت پروردگار میں کسی کو شریک نہ بنائے اور مقصد یہ ہے کہ رسالت اور بشریت ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اگر کسی بشر پہ اللہ کی وحی ہو اور خدا اس کو عہدۂ جلیلۂ نبوت پر فائز کر دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے پس میں باوجود بشر ہونے کے اللہ کا نبی ہوں، صاحب وحی ہوں اور پیغام توحید لے کر آیا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مقرر اور خطیب ان کو ہمیشہ سے یہی باور کراتے چلے آئے تھے کہ نبی وہ ہوتا ہے جو بشر نہ ہو اور جب لوگوں کے اذہان میں یہ بات راسخ ہو گئی تو نبوت کی دعوت کو ٹھکرانے کے لئے ان بڑے بڑوں نے عوام کو اسی ہتھکنڈے سے گمراہ کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو ہم رسولؐ کا تو انکار نہیں کرتے اگر رسول ہوتا تو ہم مان لیتے یہ تو ہم جیسا بشر ہے پس عوام ان کے اشارہ پہ رقص کرنے لگ جاتے تھے اور ان کی اصلاح نبی و رسولؐ کے لئے درد سر بن کر رہ جاتی تھی۔

قوم مدین کی طرف جب حضرت شعیب مبعوث ہوئے تو ان کی تردید کے لئے بھی عوام نہیں بلکہ خواص امۃ کھڑے ہوئے۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (الآیۃ) پارہ ۹ پہلی آیت (ترجمہ) سرداران قوم نے کہا جو کافر تھے۔ اے شعیب ہم تمہیں اور تیری

قوم کو اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ ہمارے دین پر لوٹ آؤ۔
حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ۔ سورہ اعراف آیت ۱۰۳ پارہ ۹ یعنی پھر ہم نے موسیٰ کو فرعون اور اس کی قوم کے سرغنوں کی طرف بھیجا۔ فرعون کی قوم کے سرغنے وہی لوگ تھے جو فرعون کے درباری اور خواص تھے جو اپنی چکنی چپڑی تقریروں کے ذریعے عوام کالانعام پر فرعون کی خدائی تسلیم کرادیتے تھے اور فرعون کی خدائی پر وارد شدہ ہر اعتراض کا جواب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور عصا کا معجزہ پیش فرمایا تو فرعون خاموش رہا۔ قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ۔ سورہ اعراف۔ آیت ۱۰۹ قوم فرعون کے سرغنے درباری خطیب اور اس کی خدائی کے محافظ فوراً بول اٹھے۔ یہ تو ماہر جادوگر ہے۔ تمام انبیاء کی دعوت کا یہی حال ہے حتیٰ کہ جناب رسالتمآبؐ کی دعوت کو ٹھکرانے والے بھی وہی لوگ تھے جو دعوت سے پہلے آپ کو بہت نیک سمجھتے تھے لیکن دعوت کے بعد جادوگر اور مجنوں کا خطاب دینے لگ گئے۔ جیساکہ انبیاء ماسلف کا قصہ قرآن مجید میں مذکور و مسطور ہے اور تمام تاریخی کتب شاہد ہیں کہ قوم یہود کے علماء حضرت رسالتمآبؐ کے حلیے اور ان کی نشانیاں از روئے تورات جانتے تھے اور انہیں آپ کی تشریف آوری اور عہدۂ نبوت پر فائز ہونا صحیح طور پر معلوم تھا اور بایں ہمہ انکار پر ڈٹ گئے۔ جس کی بہت بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کی آمدنیوں میں معتدبہ رکاوٹ کا خطرہ تھا اور انہیں یقین تھا کہ جو معقول آمدنی نبوت کے انکار سے ہمیں دستیاب ہوتی ہے مسلمان ہونے کے بعد اس سے ہاتھ دھونے پڑیں گے لہٰذا وہ جان بوجھ کر آپ کی تردید کرتے تھے اور اس کا معاوضہ عوام سے بہت کچھ بٹورتے تھے

ہمت اور عزم صمیم کی ضرورت

بہرکیف یہ ایک مسلمہ ہے کہ دعوت حق پر کمربستہ ہونے کے لئے عوام سے پہلے قوم کے ملا یعنی وہ لوگ جو ان کی مرضی کے خطیب و واعظ ہوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور یہ لوگ اپنی آمدنیوں کے پیش نظر کبھی دعوت حق کے لئے کان دھرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ۔ ایسے لوگ جب انبیاء کو دیوانہ مجنون جادوگر اور گمراہ تک کہہ جاتے ہیں تو اگر علمائے اعلام گران القاب سے یا ان جیسے خطابات سے یا اس قسم کے رکیک حملوں سے ستائیں تو کون سی بڑی بات ہے۔ غالباً امالی صدوق میں ہے کہ

ایک شخص نے حضرت جعفر صادق علیہ السّلام کی خدمت میں یہی رونا رویا کہ ہم لوگوں کو نیکی کی باتیں کہتے ہیں تو لوگ ہمارے اوپر اپنے طعن و تشنیع والزامات کا نجس ترین کیچڑ اچھالتے ہیں۔ اور ہمیں ایسے خطابات سے مخاطب کرتے ہیں کہ ہمارا جی گھٹنے لگ جاتا ہے تو آپ نے فرمایا تم کیا چیز ہو؟ لوگوں نے کلمۂ حق کی پاداش میں نبیوں اور اماموں کو نہ چھوڑا۔ چنانچہ آپ نے حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت رسالتمآبؐ اور حضرت امیرؑ و امام حسن علیہم السّلام کی مثالیں گنوائیں۔ پس دورِ حاضر کی بے راہ روی اور بعض نااہل اور ناخدا ترس اہلِ منبر مقرر و خطیب حضرات کی دھاندلی سے گھبرانے کے بجائے علمائے اعلام کو اعلائے کلمۂ حق اور ابطالِ باطل کے لئے اپنی ہر ممکن جد و جہد کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے خواہ وہ گالیاں دیں خواہ گمراہ کہیں اور خواہ اس سے بھی زیادہ ستانے کی کوشش کریں۔ کاش ہماری قوم کا یہ طبقہ اصلاح پذیر ہوتا اور کاش قوم میں کچھ ایسے دردِ دل رکھنے والے افراد پیدا ہوتے جو شریعت مقدسہ کو اس قسم کے طالع آزماؤں سے نجات دلوانے کی سعادت حاصل کرتے بس تائیدِ غیبی اور عنایتِ الٰہیہ سے ہی اس قوم کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔

غضب ہے اگر کہا جائے کہ حسینی منبر ایک مقدس اسٹیج ہے، اس پر آنے والے اپنے خد و خال کو حسینی سیرت میں رنگ کر پیش ہوں تو فوراً اس کی تردید میں کہا جاتا ہے کہ یہ کہنے والا عزاداری کا دشمن ہے آلِ محمدؐ کا مخالف ہے وغیرہ درد دل کا غبار اٹھتا ہے آنکھیں فرطِ غم سے ڈبڈبا جاتی ہیں۔ سانس گلوگیر ہوتا ہے دل لرزتا ہے اور لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں لیکن کیا کیا جائے اپنے مولا کی مظلومیت کی داستان پہلے کتابوں میں پڑھتے تھے۔ تو دل دکھتا تھا۔ اب مولا کی مظلومیت آنکھوں سے دیکھنے میں آتی ہے لیکن صدائے حق بلند کرنے والی زبانوں پر پہرہ بٹھایا جاتا ہے امام مظلوم نے اپنا سب کچھ لٹا کر دین کو لٹنے سے بچایا تھا تو یہ کیسے گوارا ہو کہ مولائے مظلوم کی ہر لٹی ہوئی چیز کا رونا رو کر مولا کی اس قیمتی متاع دین کو لٹنے دیا جائے کیا علماء خاموش رہیں اور کچھ نہ بولیں جب کہ مولائے مظلوم کی محنت و خون کے بعد بچائی ہوئی پونجی یعنی دین کو آنکھوں سے لٹتا دیکھیں۔ ایک یتیم کے گھر کو خود آگ لگا کر اس کی یتیمی پر آنسو بہانا سود مند نہیں ہوتا اور اعلانیہ فسق و فجور کا مرتکب امام پاک کے نزدیک قابلِ معافی نہیں ہے جب تک تائب نہ ہو اور نہ اس کو امام مظلوم کی داستان پڑھنے سنانے کا حق پہنچتا ہے کیونکہ وہ خود یزیدی کردار کا حامی ہے۔ اسے یقین ہونا چاہیئے کہ حسینؑ دیگر

کی جنگ حسینیت و یزیدیت کی جنگ تھی۔ پس مولائے مظلوم کے نزدیک ہر وہ شخص یزید ہے جس میں یزیدیت موجود ہو۔ مومن اور حسینی وہ ہے جو حسینی پرچم کے نیچے آکر یزید سے نہیں بلکہ یزیدیت سے جنگ کرے۔

مقدمہ کتاب

ضرورتِ دین

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر عقل و خرد کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے علائق شہوانیہ سے قطع نظر کر کے بالکل غیر جانبدارانہ فکر و تدبر کیا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچنا نہایت آسان ہے کہ دہریت اور لادینیت کی وبا کا دلوں پر چھا جانے کا نتیجہ شرافت، عزت، غیرت، حمیت اور کرامت کا خون ہے اور شہوات حیوانیہ میں انہماک انسانیت کی موت ہے اور اگر دانشمند طبقہ اس موذی مرض کے قلع قمع کی طرف ہمہ تن مصروف نہ ہو تو بعید نہیں کہ یہ وبا ہمہ گیر بن کر نام نہاد انسانیت کو تباہ و برباد کر دے اور اس صورت میں نیکی و بدی اچھائی و برائی اور خیر و شر کی لفظیں صرف لقلقہ لسانی تک محدود رہ جائیں گی۔ میں اس مقام پر نہایت سہل طریق سے دین کی ضرورت کو واضح کرتا ہوں۔ تاکہ ہوشمند طبقہ کے لئے استفادہ آسان ہو۔

انسان شکم مادر سے پیدا ہوتے ہی جو جذبہ اپنے ساتھ لاتا ہے وہ ہے خود پسندی اور محبت نفس پس ہر مرغوب کی طرف ہاتھ بڑھانا اور اسے پورے اصرار سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا اس کا فطری اور پیدائشی حق ہے۔ لہٰذا ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس کے اندر یہ جذبہ بھی ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور عین بڑھاپے کے عالم میں جب کہ تمام قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں، یہ جذبہ انتہائی زوروں پر ہوتا ہے اور انسان زندگی کے کسی دور میں اس جذبہ سے دست کشی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اور ہر مرغوب و محبوب شئی کا اپنی طرف جذب اس کی قوائے عاملہ کا اہم مشغلہ رہتا ہے اور اسی طرح حب نفس کی خاطر ہر مضر اور نقصان دہ شئے سے اسے نفرت کا ہونا لازمی ہے پس جذب و دفع انسان کی فطرت اولیہ کا تقاضا ہے اور جب ہر انسان فطرتاً محبوب کا جاذب اور مکروہ کا دافع فطرت ہی سے لے کر آیا ہے تو محبوب اشیاء میں تجاذب کا ہونا

ضروری ہے کیونکہ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اچھی چیز میرے قبضہ میں ہو بنا بریں ہر ایک طاقت سے وہ برسرپیکار ہوگا جو اسے اس مقصد سے الگ کرنے کے درپے ہو تو اس کا لازمی نتیجہ تصادم اور باہمی فساد ہوگا۔ پس ان فطری حقوق میں حد بندی کرنے کے لئے ایک ضابطہ کی ضرورت ہے تاکہ انسانی تمدن فنا نہ ہونے پائے۔

ممکن ہے کہ کوئی کہنے والا یہ کہہ دے کہ ہر ملک کی حکومت وقت ان فطری حقوق کی حدود متعین کرتی رہتی ہے اور قانون کی حفاظت کے لئے ہر حکومت کے پاس ایک محکمہ ہوتا ہے جو تصادم کی روک تھام کرنے کے لئے کافی و وافی ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو چند اشخاص تک محدود نہ رکھیئے بلکہ اس کی پوری نوع کا جائزہ لیجئے اولاً تو ہر ایک ملک کی رعایا پر اس ملک کی انتظامیہ کنٹرول قائم کرے گی۔ لیکن اگر ممالک کے سربراہ خود جمہوری ہوں یا شخصی ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو ان کو کونسی انتظامیہ کس قانون کے ماتحت قابو کرے گی۔ نتیجہ میں فساد عالمگیر ہوگا۔ ثانیاً ہر ملک میں سلطان و رعایا کے ذہنی تصادم کو کون روکے گا جو ایک نہ ایک دن خارجی اور ظاہری انقلاب کی صورت میں نمودار ہو کر ملک و سلطنت کی تباہی کا باعث بن جایا کرتا ہے۔ ثالثاً برسر اقتدار طبقہ ہمیشہ اپنے ذہن کے مطابق قوانین کی تشکیل کرتا ہے جو ضروری نہیں کہ واقعاً انسانیت کی بھلائی کے کفیل ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آئے دن قانون بدلتے رہتے ہیں خواہ حکمران نہ بھی بدلیں اور حکومت کی تبدیلی کے بعد تو قانون کا بدلنا ضروری ہے ہی۔ پس ایک آدمی یا چند آدمیوں کی من چلی منشاء کو تمام رعایا پر مسلط کرنا یقیناً جذبات کو کچلنے کا موجب ہے جو کسی نہ کسی وقت فساد کا پیش خیمہ بن سکتا ہے پس ان وجوہ کے ماتحت تمدن انسانی کو برقرار رکھنے کے لئے خالق کون و مکان اور موجد فطرت کی جانب سے انسانی وقار و امن کی بحالی و بقاء کے لئے ہمہ گیر ضابطہ کی ضرورت ہے جس کی پاسداری نو من امن انسانی کو بربادی سے محفوظ رکھے اور اسی ضابطہ کا نام دین اسلام ہے۔ چنانچہ فرمایا:- اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اور اللہ کے دین کو پہنچانے کے لئے جو ذات متعین ہوا کرتی ہے وہ نبی و رسول کے مقدس لقب سے ملقب ہوتی ہے۔

علاوہ بریں قانون کی گرفت سے ڈر کر خاموشی اختیار کر لینا ہی صرف امن کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس ضابطہ میں ایسی جزئیات کا ہونا ضروری ہے جو انسانوں کے لئے اصلاح نفس کی محرک ہوں اور جن کی بدولت انسان اپنے اختیار سے اپنے فطری تقاضوں پر کنٹرول کرنے کی جرأت کر سکے

کیونکہ انسان قدرت رکھتے ہوئے اپنے محبوب کو ترک نہیں کرتا مگر اس وقت جبکہ اس کے ترک سے کسی بہتر کے ملنے کی اُمید ہو۔ پس اصلاحِ نفس و معاشرہ و تمدّن کے لئے خالق کے تجویز کردہ دینِ اسلام میں ایسی تحریکات موجود ہیں جو انسان کی اصلاح اور اس کے فطری تقاضوں میں توازن پیدا کرنے کی موجب ہیں۔ چنانچہ جنّت و جہنّم کا تصوّر انسان کے لئے دنیا میں ہر محبوب کے ترک کا محرک ہو سکتا ہے اور یہی تصوّر ہی انسان کو ناگوار حالات کی طرف دعوت دینے کا کفیل ہے۔

کیونکہ جب دینی تعلیم کی روشنی میں یہ معلوم ہو گا کہ ایک ایسی ذات موجود ہے جو میری ہر حرکت و سکون کو جانتی ہے اور ایک دن میں نے اس کے سامنے جواب دہ ہونا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرے گا پس معلوم ہوا کہ دین ہی ایک ایسی حقیقت ہے جس کی پاسداری ناموس و شرف انسانی کی بقاء کی ضامن ہے۔

دیکھئے جب انسان کو یقین ہو کہ زندگی صرف یہی ہے جو میں گزار رہا ہوں اور سعادت صرف یہی ہے جو میں محسوس کر رہا ہوں تو دریں صورت شہوات و لذات کی تحصیل کے لئے ہر ممکن طریقہ بلکہ ہر خطرناک حربہ کو بروئے کار لانا بھی اس کا فطری و پیدائشی حق ہو گا اور اس سے کنارہ کشی یا دست برداری اس کی انتہائی بزدلی بلکہ جہلِ مرکب ہو گا۔ بنا بریں اپنی زندگی کو پُرلطف بنانے کے لئے ہر ذی ہوش بے تاب ہو گا اور حرص و ہوس کا بھوت اسے کبھی آرام سے بیٹھنے نہ دے گا۔ پس یہ چیز فتنہ و فساد کی جڑ بن جائے گی۔

لیکن بخلاف اس کے جب معلوم ہو کہ اس ظاہری اور عارضی زندگی کے بعد ایک دائمی زندگی بھی ہے جس میں دائمی خوشی یا دائمی غم ہو گا تو انسان کے لئے دنیا میں ہر بڑی سے بڑی قربانی آسان ہو گی تاکہ ہمیشہ کا سرور حاصل ہو پس دائمی عذاب سے بچنے کے لئے اس پر دنیاوی چند روزہ تکلیف کو برداشت کرنا سہل ہو گا اور اس صورت میں نہ برابر کا برابر سے تصادم ہو گا اور نہ بڑے کا چھوٹے سے مقابلہ ہو گا۔ بلکہ برابر والوں میں ایثار چھوٹوں میں صبر و حوصلہ اور بڑوں میں رحم و کرم کے محرکات پیدا ہو جائیں گے جن کی بدولت خون خرابے سے دامنِ انسانیت پاک و صاف رہے گا۔

ہاں اس میں شک نہیں کہ بعض کریم النفس اور شریف الاصل لوگ ذاتی و طبعی طور پر اچھائی سے مانوس اور برائی سے متنفر ہوا کرتے ہیں خواہ وہ کسی دین و ملّت سے وابستہ ہوں یا نہ ہوں گویا وہ بذاتِ خود نیک اور نیکی پسند ہوتے ہیں لیکن ساری نوعِ انسانی کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ پس نوعِ انسانی کے لئے دین ضروری ہے۔ ورنہ شرافت بلکہ انسانیت کی کشتی گرداب بنتا

بن آجائے گی۔ نیز بعض نیک طینت وگ یا شریف النفس انسان جو بغیر تربیت کے ذاتی طور پر ایک قابل زمین کی پیداوار ہوتے ہیں ان سے بھی پردۂ غفلت دور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی باگ ڈور بھی عقلِ سلیم کے ہاتھ میں ہو اور اسی کے زیرِ تربیت اعمالِ شریفہ و اطوارِ صالحہ کی طرف بابصیرت اقدام کرکے پروان چڑھیں اور آزادانہ طور پر اپنے حسنِ اختیار سے نورِ معرفت کی روشنی میں اس راستے پر گامزن ہوں جو صحیح طور پر فلاح و بہبودِ دائمی کا ضامن ہے اور اس عالمِ کون میں ایسے بہت کم افراد ہوں گے جو مذکورہ بالا طریقہ سے شرفِ ذاتی اور کمالِ فطری کے حامل ہوں۔ خلاصہ یہ کہ انسانی کمالات کی تحصیل اور ناموس و شرفِ بشری کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے کہ انسان دینِ حق کے تابع ہو کر زندگی بسر کریں۔

شرفِ انسانی

جہاں تک عقل کام کرتی ہے۔ انسان کے لئے کسی قوم کا سردار بن جانا یا کسی جاگیر و جائیداد کا مالک ہو جانا عالی شان محلات کا تعمیر کرنا اور اسبابِ عیش و عشرت میں فراوانی حاصل کرنا حتیٰ کہ دنیاوی بڑے سے بڑے اقتدار کو ہاتھ میں لے لینا ملاکِ شرف اور مدارِ عزت و کمال نہیں اور نہ اس سے اسکی غرضِ خلقت پوری ہوتی ہے بلکہ شرفِ انسانی اور کمالِ بشری کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنی چند روزہ زندگی میں منشائے خالق کے ماتحت اپنی قوم و ملت کی ایسی خدمت کر جائے جو اس کے نام کو صفحۂ ہستی سے کبھی مٹنے نہ دے خواہ مال و دولت کے ذریعے سے خواہ علم و ہنر کے ذریعے سے اور خواہ خطابت یا شجاعت کی بدولت ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود تحصیلِ کمال کرے اور پھر اس کے ذریعے سے قوم کی بھلائی کا بیڑا اٹھائے لہٰذا کمالات مذکورہ بذاتِ خود شرف نہیں بلکہ شرف کا زینہ و وسیلہ ہیں یعنی مال خود شرف نہیں بلکہ شرف حاصل کرنے کا وسیلہ ہے اسی طرح علم و ہنر خود شرف نہیں بلکہ شرف کمال حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں؛ اسی طرح خطابت یا شجاعت کا جوہر کمال و شرافت کی تحصیل کا زینہ ہے پس شرف اس میں ہے کہ انسان ان کمالات کے ذریعے سے قوم و ملت کی کوئی ٹھوس خدمت کرے ان سے ہر قسم کی تکالیف و پریشانیوں کو دور کر کے ان میں راحت و سرور کی لہر دوڑائے خودداری کی حفاظت کرے افکار کی انتشار سے نگہداشت کرے۔ احسان و حسنِ سلوک کی ترغیب کرے اور ناموسِ مذہب اور اصولِ ملت کی پاسداری و حمایت کرے۔ گویا شریف وہی ہے جس کا ذکر خدمتِ قوم و مذہب کی بدولت زندہ ہو جائے اور قانونِ مکافات کی رو سے اس کا حق شکر افرادِ قوم پر تا زیست باقی رہ جائے۔

حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی ذات وہ ہے جس نے اسلامیان عالم کی گردنیں اپنے احسان عمیم اور فیض جسیم کے سامنے جھکا دیں جس کا حق شکر تا قیام قیامت تمام اہل اسلام پر فرض و واجب ہے لیکن خراج تحسین یہ نہیں کہ ان کے ذکر کا تکرار اور ان کی مدح و ثنا کا ورد صرف زبان تک محدود رہے بلکہ ان کا حق شکر یہ ہے کہ ذکر لسانی سے آگے بڑھ کر ان کے کامیاب مقصد اور تابناک اصولوں کی حمایت کی جائے جن اصولوں کو انہوں نے اپنایا تھا ان کو اپنایا جائے اور جن فروعات کو انہوں نے زندہ کیا تھا ان کو زندہ کیا جائے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا ذکر دنیا کی آبادی کے اکثر انسان حتیٰ کہ ہندو سکھ عیسائی وغیرہ تک کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک ان کے ذکر کی کوئی قدر نہیں کیونکہ وہ حسینی اصول سے غافل اور فروع کے دشمن ہیں۔ پس حسینؑ سے محبت کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس دین سے محبت کی جائے جس کی بقاء کے لئے حسینؑ نے عظیم کام کیا یعنی اس دین کے اصول و فروع کو اپنایا جائے پس جن کاموں سے حسینؑ کو محبت تھی ان کی بجا آوری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے اور جن افعال بد سے حسینؑ کو نفرت تھی ان سے نفرت کی جائے اور یہی ہے حقیقی حسینیت اور یہی ہے حسینؑ کا حق شکر جو ہماری گردنوں پر واجب الاداء ہے۔ حضرت رسالتمآب کا سب امت پر بہت احسان ہے کہ انہوں نے خدا کا دین ہم تک پہنچایا اور ان کے بعد حضرت علیؑ سے لے کر مہدیؑ تک تمام آئمہ کا بالعموم تمام مسلمانوں پر اور بالخصوص قوم شیعہ پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے دین کی حفاظت کی اور بڑی سے بڑی قربانیاں دے کر ہم تک دین کو پہنچایا اور ان کا حق شکر یہ ہے کہ ہم ان کی زبانی تعریف اور لسانی مدح و ثنا تک محدود نہ رہیں۔ بلکہ ان کے بچائے ہوئے دین کے اصول و فروع کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنائیں اور اسی بناء پر حضرت صادق علیہ السلام کی کافی میں فرمائش موجود ہے۔ کُوْنُوْا لَنَا زَیْنًا وَلَا تَکُوْنُوْا شَیْنًا۔ یعنی ہماری زینت بن کر رہو اور ہمارے لئے باعث عیب نہ بنو معصومین علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ شرف انسانی اور کمال بشری کا سہرا ان بزرگان دین کے سر ہے۔ جنہوں نے انتہائی پرخطر اور تاریک دور میں ہر قسم کے تشدد و استبداد کا نشانہ بنتے ہوئے مظالم و مصائب کے سامنے کوہ گراں بن کر ملت جعفریہ اور دین الٰہیہ کی محافظت کی اور اس عظیم مقصد کی خاطر انہوں نے تن من اور دھن کی بازی لگا کر اپنے عزم صمیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی سعادت حاصل کی اور وہ علمائے اعلام کی ذوات مقدسہ ہیں۔ جنہوں نے کبھی باطل کی تیز سے تیز تر آندھیوں کے

سے سامنے اپنے ضمیر کی آواز کو بلند کرتے ہوئے جھجک محسوس نہ کی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں جلاوطنی کی روح فرسا مصیبت برداشت کی۔ اہل و عیال سے جدائی اولاد کی ہلاکت اور دوستوں کا فراق غرضیکہ سب کچھ ہنس کر برداشت کیا لیکن دین کے چہرہ کو مسخ نہ ہونے دیا اور اعلائے کلمۃ اللہ سے ان کو بڑی سے بڑی طاقت باز نہ رکھ سکی۔ حتیٰ کہ سر تن سے جدا ہوا اور زبانیں کٹ گئیں لیکن قدم جادۂ حق سے نہ ہٹ سکا اور یہ انہی کی قربانیوں کے اثرات ہیں۔ جن کی بدولت ہم ولائے آلِ محمد کا دم بھر رہے ہیں۔ آج ان علمائے اعلام کے احسانات کا ہم سے وہی تقاضا ہے جو ان کے اسلاف کا ان سے تھا یعنی یہ کہ دین کی مقدس امانت انہوں نے ہر ممکن قربانی سے ہم تک پہنچائی اور ہمارا فرض ہے کہ وہ مقدس امانت ہم بعد میں آنے والی نسلوں تک پہنچائیں اور انسان کا حقیقی شرف یہی ہے کہ قوم و ملت کی ایسی خدمت کرے جو دائمی طور پر حقِ شکر کی سزاوار ہو۔

اصولِ اسلام

چونکہ دین ایک مخصوص طریق پر طرزِ زندگی کا نام ہے۔ لہٰذا اس کے اصول بھی ہیں اور فروع بھی اور اللہ کے دین کا مقصد یہ ہے کہ مخلوقِ خدا اس کے حکم کے سامنے جھک جائے اور اسلام کا معنی بھی جھک جانا ہے یعنی مان لینا جس طرح ذاتِ پروردگار کا حضرت ابراہیم سے خطاب ہے۔ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ حکم ہوا جھک جاؤ عرض کی کہ میں عالمین کے پروردگار کے سامنے جھک چکا ہوں۔ اس لئے معصوم سے منقول ہے۔ اَلْاِسْلَامُ ھُوَ التَّسْلِیْمُ۔ یعنی اسلام تسلیم کرنے کا نام ہے تو گویا مسلم وہ ہے جو اسلام کے اصول و فروع کو تسلیم کرے یعنی ان کو جان لے اور مان بھی لے کیونکہ جان لینا معرفت سے تعلق رکھتا ہے اور مان لینا عمل سے متعلق ہے

اصولِ اسلام عام مسلمانوں کے نزدیک تین ہیں توحید۔ نبوت اور قیامت لیکن فرقہ امامیہ کے نزدیک پانچ ہیں۔ انہوں نے توحید کے بعد عدل اور نبوت کے بعد امامت کو بھی اصول میں سے قرار دیا ہے اور انہی کو اصولِ دین سے تعبیر کیا جاتا ہے ان کے علاوہ بہت سے اصول ہیں جن کی بازگشت انہی پانچ اصول کی طرف ہے اسی طرح دین کے فروعات چھ بتائے جاتے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس جہاد لیکن ان کے فروعات کی ایک طولانی فہرست ہے جن کو فقہاء نے اپنی بڑی بڑی تصانیف میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

ایمان کی حقیقت

اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ ایمان صرف تصدیق کرنے اور جان لینے کا نام ہے یا کہ ایمان تصدیق اقرار اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ ہم اس سلسلہ میں وقت ضائع کرنے کے بجائے قرآن کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و عمل کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے یا جسم و جان کا سا ربط ہے کیونکہ جہاں بھی مومنوں کے لئے پروردگار عالم نے انعامات اخرویہ کی بشارت دی تو وہاں ایمان و عمل صالح دونوں پر تفریع کی صورت میں اس کو ظاہر فرمایا چنانچہ پہلے پارہ میں ارشاد ہے بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ الآیت یعنی ان لوگوں کو بشارت دو جو ایمان کے ساتھ نیک عمل بجالائیں کہ ان کے لئے باغات جنت ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جہاں انسان کا بالعموم خسارہ کی طرف جانا ذکر فرمایا۔ وہاں استثناء ان لوگوں کا کیا جو ایمان کے ساتھ زیور عمل سے آراستہ ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ یعنی مجھے عصر کی قسم تحقیق انسان خسارہ میں ہے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ایمان کے ساتھ نیک اعمال کئے اور بالجملہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجا گیا۔ تو ان کو ایک کلی حکم سنایا گیا جو کسی نبی کی شریعت میں منسوخ نہ ہو سکا۔ چنانچہ فرمایا۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ پارہ ۱ یعنی تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت نامہ پہنچے گا۔ پس جس نے میری ہدایت کی اتباع کی تو اس پر کوئی خوف و حزن نہ ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان کے دعویٰ کے بعد اس کے مطابق عمل نہیں بجالاتے ان کے ایمان کو نہ ہونے کے برابر قرار دے کر ارشاد فرمایا۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا یعنی اے وہ لوگ جو ایمان کا زبانی دعویٰ کرتے ہو صحیح معنوں میں ایمان لے آؤ یعنی عمل کو دعویٰ کے مطابق بجالاؤ۔ پس ایمان پر عمل صالح کا عطف یا تو عطف تفسیری ہے اور یا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایمان و عمل میں لازم و ملزوم کی نسبت ہے جس طرح علم و عمل کے درمیان ہے مثال کے طور پر جس شخص کو ایک حیوان کے درندہ ہونے کا یقین ہو تو وہ قطعاً اس کے قریب نہ جائے گا۔ پس درندہ کہہ کر اس کے قریب جانا اور مقام عمل میں علم کی مطابقت نہ کرنا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ دیوانہ ہے اور یا یہ کہ اس کو یقین صحیح نہیں۔ اسی طرح ایک مجبوب شئے کا علم اور پھر اس سے گریزاں ہونا۔ پس کہنا پڑے گا کہ یا علم کا دعویٰ غلط ہے یا عمل کرنے والا

دیوانہ ہے اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ علم اور عمل دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اور لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیساکہ مضمون احادیث بھی ہے

اور اسی طرح ایمان والوں کو تقویٰ کا حکم دینا ایمان اور تقویٰ کی غیریت کی دلیل نہیں بلکہ ایمان کے مدارج میں سے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کا حکم ہے کیونکہ تقویٰ عمل کے اعلیٰ مرتبہ کا نام ہے اسی بناء پر حضرت امیر المؤمنین کو امام المتقین کا لقب حاصل ہے کہ وہ عمل کے بلند مرتبہ پر فائز ہونے والوں کے بھی پیش رو ہیں کہ عمل کے میدان میں کوئی بھی ان سے سبقت حاصل کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

علائم ایمان

خداوند قدوس نے جو قرآن حکیم میں مومنین کے علائم بیان فرمائے ہیں ان میں ایمان کی حقیقت صاف طور پر منکشف ہے۔ چنانچہ سورۂ انفال کی آیت ۲ میں ارشاد ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝

ترجمہ: بجز اس کے نہیں کہ مومن وہی لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آئے تو ان کے دل کانپ جائیں اور ان پر اس کی آیات کی تلاوت ہو تو ان کا ایمان زیادہ ہو اور وہ اپنے رب پر توکل رکھتے ہوں اور وہ وہ ہیں جو نماز کو قائم کرتے ہوں اور ہمارے دیئے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہوں اور اِنَّمَا کلمہ حصر شروع میں لگا کر اس بات کو زیادہ ناقابلِ تاویل بنا دیا کہ مومن وہی ہے جس میں یہ علائم موجود ہوں۔

① اللہ کے ذکر سے کانپ جانا یعنی دل کا اس کی عظمت کے سامنے جھک جانا۔
② اس کی آیات سے ایمان میں زیادتی۔
③ توکل
④ نماز کا قائم کرنا۔
⑤ حقوق مالیہ کا ادا کرنا۔

اور آخر میں پھر اسی حصر کو صراحت کے رنگ میں تاکیدی لہجہ سے فرمایا۔ اور مبتداء

و خبر کے درمیان ضمیر فصل کو لا کر پھر حصر کر کے فرمایا۔ بس یہی لوگ ہی مومن ہیں جن میں متذکرہ بالا موجود ہوں اور آخر میں حَقًّا کا اضافہ پھر مزید تاکید کے لئے ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ان اوصاف سے عاری ہو کر اگر کوئی اپنے تئیں مومن کہتا ہو تو وہ صرف لسانی اور زبانی مومن ہے۔ اللہ کے نزدیک سچ مچ اور حق مومن وہ ہے جس میں متذکرہ اوصاف موجود ہوں اور آخر میں ارشاد فرمایا لَهُمْ دَرَجَاتٌ یہاں پھر جار و مجرور کا تقدم اسی حصر کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کے نزدیک درجات صرف انہی لوگوں کے لئے ہیں اور مغفرت اور رزق کریم بھی انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور جن میں یہ اوصاف نہ ہوں نہ وہ سچ مچ مومن ہیں اور نہ ان انعامات و اکرامات کے حق دار ہیں۔

پس ان آیات نے تو صاف صریح کہہ دیا کہ عمل کے بغیر ایمان کا دعویٰ بالکل کھوکھلا اور بے حقیقت ہے اور احادیث معصومینؑ اس بارہ میں بالتواتر موجود ہیں۔ ہم نے تفسیر انوار النجف کی چھٹی جلد میں انہی آیات مجیدہ کی تفسیر میں بہت کچھ احادیث نقل کی ہیں۔ یقیناً وہ شخص بیمار نہیں جس میں بیماری کی کوئی علامت موجود نہ ہو۔ اسی طرح وہ شخص تندرست نہیں جو بیماری کی متعدد علامتوں میں گھرا ہوا ہو۔ اسی طرح یہ بات واضح ہے کہ کفر علامتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ ورنہ کسی کے ماتھے پر ہرگز لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ فلاں کافر ہے پس انصاف یہ ہے کہ اگر علامات کفر سے کافر کا یقین ہوتا ہے اور اسے واجب القتل بھی انہی علائم کی بنا پر سمجھا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مومن کو بغیر علامات کے مومن سمجھا جائے اور جس طرح ایمانی صفات کی موجودگی میں کسی کو کافر نہیں کہا جا سکتا تو تمام کفر والی صفتوں کے باوجود کسی کو مومن کیسے کہا جائے گا؟

فروعات میں سے نماز کا مقام

اسی بناء پر چونکہ نماز تمام اعمال کی راس و رئیس ہے۔ لہٰذا اس کے تارک کو کافر کہا گیا مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ یعنی جس نے عمداً نماز کو ترک کیا وہ کافر ہوا اور ایک حدیث میں ہے کہ کفر و اسلام کے درمیان فرق صرف نماز سے ہوتا ہے۔ جناب رسالتمآبؐ اور آئمہ طاہرین علیہم السلام سے اس بارہ میں احادیث تواتر معنوی کا درجہ رکھتی ہیں اور قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ یعنی نماز کو قائم کرو اور مشرک نہ بنو۔ جس کا مفہوم یہ ہو گا کہ تارک الصلوٰۃ اللہ کے نزدیک مشرک ہے

اس کی توجیہ و تقریب یہ ہے کہ دینِ اسلام کے اصول بھی ہیں اور فروع بھی اور اصول جس قدر بھی۔ ان کی تسلیم کا مقصد یہ ہے کہ ان پر عقیدہ ہو اور عقیدہ کا تعلق دل سے ہے لہٰذا ظاہری صورت میں مسلم و کافر کی پہچان عقیدہ سے تو ہو نہیں سکتی کیونکہ دل کے حالات سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ باقی رہا فروعات کا معاملہ تو ان میں سے اہم صرف چھ ہیں جو عام دینی ابتدائی کتب علمیہ جات میں مذکور و مسطور ہوتے ہیں۔ اگر مقام عمل میں ان کا تجزیہ کیا جائے تو روزہ ہر ایک پر واجب نہیں بلکہ اس کے لئے تندرستی و طاقت شرط ہے نیز یہ کہ مسافر بھی نہ ہو لہٰذا یہ علامتِ ایمان بیمار و ناتواں و مسافر کے لئے نہیں بن سکتی اسی طرح حج دولت مند و مالدار طبقہ کے لئے ہے جو اخراجاتِ آمد و رفت کی طاقت رکھتے ہوں لہٰذا یہ بھی عام علامتِ ایمان نہیں بن سکتی۔ زکوٰۃ بھی صاحبِ نصاب پر شرائط کے ماتحت ہے اور خمس بھی بچت سے متعلق ہے۔ تو جن لوگوں کے پاس مال کا نصاب نہ ہو یا جو لوگ اپنی آمدنی میں بچت نہ رکھتے ہوں تو ان سے زکوٰۃ و خمس کا وجوب ساقط ہے۔ پس یہ دو بھی علامتِ ایمان بالعموم نہیں بن سکتے اور چھٹا جہاد ہے جو صرف فوجِ اسلام کی ڈیوٹی ہے۔ وہ بھی بالعموم علامت نہ بن سکا۔ بنا بریں صرف ایک نماز ہی ہے جو بالعموم مسلمان کی علامت بن سکتی ہے تندرست و بیمار مسافر و متوطن۔ امیر و غریب۔ مالدار و فاقہ مست مجاہد و قاعد اور زن و مرد سب کے سب اس کے دائرہ وجوب میں داخل ہیں۔ پس اگر نماز بھی درمیان سے اٹھ جائے تو مسلم و کافر کے درمیان باقی فرق کیا رہے گا۔

عقل رسولِ باطنی ہے

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں بلکہ اظہر من الشمس ہے کہ عقل خدا کی جانب سے بندوں پر پہلا رسول ہے۔ علامہ آں کاشف الغطاء نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ عقل نفسِ انسانی کی اس قوت کا نام ہے جس کی بدولت حاضر سے غائب کی طرف اور محسوس سے غیر محسوس و معقول کی جانب انتقال ہو سکے اور یہی قوت انسان کے مکلف ہونے کا معیار اور حیوانات سے ممتاز ہونے کا مدار ہے اور تمام افرادِ انسانی عام طور پر ایک وقت معلوم اور حد معین پر پہنچ کر اس نعمتِ پروردگار کے حامل ہوتے ہیں۔ جس کی نشانی شریعت نے علاماتِ بلوغ کو قرار دیا ہے اور یہیں سے تکالیفِ شرعیہ کا بوجھ انسان پر رکھ دیا جاتا ہے۔

صدر المتالہین محمد بن ابراہیم شیرازی المعروف ملا صدرا اعلی اللہ مقامہٗ جو علمائے امامیہ میں

فنِ فلسفہ و حکمت میں چوٹی کے ماہر اور مشاہیر میں سے ہیں۔ انہوں نے اس کی تعریف اس طرح فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل وہ جوہر ہے جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے اور اسے علومِ نظریہ اور فنونِ فکریہ کے قبول کرنے کا اہل بناتا ہے۔ یہ جوہر ہر انسان میں ہوتا ہے کند ذہن ہو یا ذہین، حتاکہ سویا ہُوا غافل اور بے ہوش انسان بھی اس سے خالی نہیں ہوتا۔ جس طرح کسی ذی رُوح میں زندگی وہ جوہر ہے جس کی بدولت جسم حرکات اختیاریہ اور ادراکِ حسیہ کے اہل ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل وہ جوہر ہے جس کی بدولت انسان علوم نظریہ کے اہل ہوتا ہے جس طرح شیشہ باقی اجسام سے ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے کہ صورتوں اور رنگوں کی عکاسی کرتا ہے اسی طرح جوہر عقل کی بدولت انسان انکشافات کی استعداد کا حامل ہوتا ہے۔ انتہی ملخصاً

علامہ کاشف الغطاء قدس سرہ نے ان کی عبارت پر اس قدر استدراک کیا ہے کہ عقل کو شیشے سے تشبیہ دینے کے بجائے اگر یوں کہا جائے کہ عالمِ ادراکات و معلومات میں نورِ عقل کو وہی حیثیت حاصل ہے جو عالمِ محسوسات میں نورِ شمس کو حاصل ہے تو زیادہ بہتر و موزوں ہوگا۔ کیونکہ جس طرح آنکھ ہر مرئی چیز کو عالمِ محسوسات میں نورِ شمس کی بدولت دیکھتی ہے کہ اگر سورج کی روشنی نہ ہوتی تو آنکھ کچھ نہ دیکھ پاتی۔ اسی طرح چشمِ بصیرت عالمِ معقولات میں ہر نظری و فکری چیز کا نورِ عقل کی بدولت ادراک کرتی ہے کہ اگر نورِ عقل نہ ہوتا تو بصیرت کی علوم تک ہرگز رسائی نہ ہو سکتی اور انسان کو باقی حیوانات سے امتیاز اسی نورِ عقل ہی سے ہے اور یہی عقل دل کی آنکھ کا سورج اور چشمِ بصیرت کا نور ہے اور چشمِ بصیرت نورِ عقل کے بغیر علوم و معارف سے اس طرح اندھی ہوتی ہے۔ جس طرح ظاہری بصارت نورِ شمس کے بغیر محسوسات سے اندھی ہوتی ہے۔ حدیثِ قدسی میں ہے جو تواتر سے منقول ہے (اے عقل میں نے کوئی مخلوق تجھ سے زیادہ محبوب تر پیدا نہیں کی اور تجھے میں نے اپنے محبوب ترین بندوں میں کامل کیا ہے۔ جزا و سزا کا مدار صرف تو ہی ہے) اور یہاں عقل فطری مراد ہے۔

عقل کے مراتب

یاد رہے کہ عقل فطری اور عقل کسبی الگ الگ دو مفہوم نہیں ہیں۔ بلکہ وہی عقل فطری بارہا کے تجربہ کے بعد ترقی کر کے عقل کسبی بن جاتا ہے یا اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ عقل کے لئے چار مراتب ہیں (۱) عقل بالقوہ۔ (۲) عقل بالفعل (۳) عقل بالملکہ (۴) عقل مستفاد (کسبی) عقل اپنے پہلے مرتبہ میں صرف بدیہیات و ضروریات کے سمجھنے تک محدود ہوتی ہے۔ جیسے بچپنے کا دُور اور یہی عقل بالقوہ کہلاتی

ہے اور اس کو عقل ہیولانی بھی کہتے ہیں اور اس کا دوسرا مرتبہ بدیہیات سے قدم بڑھا کر نظریات تک پہنچنا ہے اور یہ عقل بالفعل کا مرتبہ ہے اور پھر نظریات میں غور و فکر کی اہلیت رکھنا اس کا تیسرا درجہ ہے جسے عقل بالملکہ کہا جاتا ہے اور اس کے بعد نظریات میں غور و فکر کر کے انہیں بدیہیات تک پہنچانا اس کا چوتھا مرتبہ ہے جو عقل مستفاد یا عقل کسبی کہلاتا ہے اور پھر اس کے لئے ایک لمبا چوڑا میدان ہے اور اس کے لئے بھی بلند و پست مراتب ہیں جس قدر مرتبہ بڑھتا جائے گا۔ اس کی قوت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ عقل فطری جو پیدائشی طور پر انسان ساتھ لاتا ہے وہ منازل ترقی طے کرتا ہوا عقل کسبی کے بلند ترین مقام تک پہنچ جاتا ہے گویا وہ بیج ہے اور یہ ثمر ہے۔ نیز بعض مقامات پر عقل فطری کو عقل مسموع اور عقل کسبی کو عقلِ مطبوع بھی کہا گیا ہے۔

جس طرح اندھے پن کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک مادر زاد اور دوسرے عارضہ کی وجہ سے اسی طرح عقل فطری میں عقل مستفاد کی قوت کا نہ پیدا ہونا یعنی عقلِ مسموع میں عقل مطبوع کا نہ ہونا بھی دونوں طریقوں سے ہوا کرتا ہے ایک مادر زاد و پیدائشی جس طرح احمق و دیوانے اور دوسرے عارضی مثلاً خواہشات نفسیہ یا علائق شہویہ نے اسے معطل کر دیا ہو یا اس تک پہنچنے کے ذرائع دستیاب نہ ہو سکے ہوں۔

بہرکیف قوتِ عقل ہی کی بدولت انسان علوم نظریہ کی تحصیل کی طرف اقدام کر سکتا ہے اور اس کی مضبوطی نظریات کے میدان کو سر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان بعونِ اللہ المتعال نظریات کو بدیہیات کے رنگ میں بدل لینے پر موفق ہو جاتا ہے۔

علم و عمل کا توافق و تعاون

اس سے پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ عمل علم و یقین کے بغیر ایک ناپائیدار اساس پر تعمیر شدہ محل کے مثل ہے اور علم عمل کے سوا اس بنیاد کی مثل ہے جس پر مکان نہ بنایا جائے اور اس کا مالک ہمیشہ زیرِ آسمان گزر اوقات کرتا ہو اس کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ عقل فطری جب عقل مستفاد کی منزل پہ پہنچ کر علوم و معارف کے میدان میں قدم بڑھاتی ہے تو اس شمع بصیرت اور نورِ معرفت کو جب تک عمل کی پشت پناہی حاصل نہ ہو۔ اس کی تگ و دو محدود اور اس کی کد و کاوش محصور ہو جاتی ہے اور منزلِ مقصود تک رسائی سے پہلے ہی اس کی ہمت ختم اور قدم لنگ ہو جاتے ہیں۔ پس جس طرح علم و یقین عمل کی صحت کے کفیل ہیں اسی طرح

عمل صحیح نورِ عقل کی روشنی کو آگے بڑھاتے ہوئے علم و یقین کے اضافہ کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اور اس کی حسی مثال یوں سمجھئے جس طرح تاریکی میں چلنے والا انسان چراغ ہاتھ میں لئے چل رہا ہو تو وہ چراغ بے شک قدم بڑھانے کے لئے راہ کو روشن کرتا ہے لیکن راستہ کی روشنی ایک حد تک محدود رہے گی پس جونہی عملی طور پر قدم اس روشنی میں آگے بڑھے گا۔ وہ روشنی منزل کی طرف آگے بڑھتی جائے گی۔ پس روشنی کا وجود عمل کو آگے بڑھانے کا موجب ہے اور عمل کا آگے بڑھنا روشنی کے آگے بڑھنے کا ضامن ہے کیونکہ قدم کے نہ بڑھانے کی صورت میں جب چراغ آگے نہ بڑھے گا تو روشنی آگے کی طرف کیسے بڑھ سکے گی؟

یقین و معرفت کے مراتب

جس طرح عقل فطری منازلِ ارتقا طے کرنے کے بعد عقل مستفاد کا درجہ حاصل کرتی ہے یا عقل مسموع طے منازل کے بعد عقل مطبوع کی حد تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح یقین و معرفت بھی مسموع سے مطبوع تک، یا فطری سے کسبی یا مستفاد کے مدارج تک پہنچتے ہیں، چنانچہ اس کے بھی چار مرتبے ہیں۔ پہلا یقین مسموع دوسرا علم الیقین تیسرا عین الیقین اور آخری حق الیقین اور ان کی وضاحت یہ ہے کہ سنی سنائی کو یقین کر کے مان لینا اور مقام اطاعت و انقیاد میں سر جھکا لینا یہ علم مسموع اور یقین صرف ہے جس میں نہ طلب دلیل نہ طلب مشاہدہ اور نہ طلب ذوق ہے اور یہ مرتبہ صرف تقلید ہی تقلید ہے۔ اس میں ثبات و پائیداری نہیں ہوتی بلکہ ادنیٰ سے شکوک و شبہات کے باد گرے اور معمولی سے اوہام کے جھکولے اس کی عالیشان و بظاہر پختہ عمارت کو چشم زدن میں منہدم کر دیا کرتے ہیں۔ لہٰذا اس سے بلند و پائیدار یقین کا وہ مرتبہ ہے جو سننے کے بعد دلیل و برہان سے استواری و مضبوطی کا حامل ہو اور یہ مرتبہ علم الیقین کہلاتا ہے یہ مرتبہ جس طرح اپنے لئے تسکین قلب کا موجب ہوتا ہے اسی طرح مقام تبلیغ و تفہیم میں بھی یہ سہولت کا موجب ہے اس یقین پر تعمیر شدہ عقیدہ کی عمارت عام تشکیکات و شبہات کے جھکولوں سے متزلزل نہیں ہو سکتی اور اس سے بڑھ کر یقین کا وہ مرتبہ ہے جو مشاہدہ سے حاصل ہو اور اُسے عین الیقین کہا جاتا ہے اور یہ یقین و عرفان اور ایقان و اطمینان کی وہ منزل ہے جس میں پھسلنے کا امکان تک نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر کسی کے کہنے سے آگ کا وجود مان لینا یقین مسموع ہے اور اس کی دلیل دھواں موجود ہو تو اسے دیکھ کر آگ کو تسلیم کرنا علم الیقین ہے پھر خود آگ کا مشاہدہ کرنا عین الیقین ہے

اور اس کی گرمی کو چکھ لینا حق الیقین ہے

بحار الانوار جلد ۱۵ - باب الیقین والصبر میں بروایت کافی امام محمد باقر علیہ السلام نے ان چار مراتب کو اسلام - ایمان - تقویٰ اور ایقان سے تعبیر فرمایا ہے - چنانچہ فرمایا ایمان اسلام کو کہتے ہیں - لیکن یہ اس سے ایک درجہ بلند ہے اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ بلند ہے اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ بلند ہے اور لوگوں میں یہ درجہ بہت کم تقسیم ہوا ہے - الخبر - اور یہاں سے واضح ہو گیا کہ قرآن مجید میں ایمان والوں کو ایمان کی دعوت دینا یا ایمان والوں کو تقویٰ کی دعوت دینا مرتبہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ارتقاء کی دعوت ہے اور منازل معرفت میں سے کسی ایک زینہ پر بیٹھ جانے کے بجائے عملی میدان میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے عملی بلندیوں کے سر کرنے کی پیش کش ہے ۔

اس ذیل میں علامہ مجلسی اعلی اللہ مقامہٗ فرماتے ہیں کہ ایمان کا پہلا زینہ جس کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے جو صرف سنی سنائی سے تسلیم کی بدولت حاصل ہوتا ہے - اس میں کم و بیش شکوک و شبہات کی ملاوٹ ہوتی ہے جیسے ارشاد خداوندی ہے - وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ - یعنی ان میں سے اکثر کا ایمان شرک کی ملاوٹ رکھتا ہے اور اسی بناء پر اعراب کو جھڑک دیا گیا تھا - قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ الآیہ یعنی بدوی لوگوں نے کہا ہم ایمان لا چکے ہیں تو ارشاد ہوا ان سے

کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لا چکے بلکہ یوں کہو کہ ہم ایمان لا چکے ہیں اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا یعنی وہ لوگ جناب رسالتمآب اور صحابہ کرام سے سن کر اسلامی عقائد کو تسلیم کر چکے تھے جن میں شکوک و شبہات کی بھی ملاوٹ تھی ، ابھی ان کے ایمان کی پختگی دلیل و برہان کی محتاج تھی جس کے بعد ان کی تسلیم کا ایمان کا درجہ ملتا اور اسی ایمان کا درجہ وہ ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو کیونکہ دلیل عقلی اس کی پشت پناہ ہوتی ہے الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا الآیہ - یعنی وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور پھر شک و فریب کی وادیوں میں بھٹکے اور یقین کے تیسرے درجہ کو تقویٰ اور آخری درجہ کو احسان سے بھی تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ بعد میں فرمایا - ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ - یعنی ایمان کی منزل کے بعد وہ تقویٰ کی منزل میں پہنچے اور پھر احسان کی منزل تک پہنچے اور یہی یقین کی آخری منزل ہے جس کے متعلق فرمایا کہ خدا محسنین کو محبوب رکھتا ہے - محمد و آل محمد یقین و عرفان کی اسی

آخری منزل پر فائز ہیں۔ اسی بناء پر وہ ماتحت کے تمام مراتب پر حاکم ہیں۔ پس وہ مومنوں کے حاکم اور متقیوں کے امام و قائد ہیں۔

عقل کے فرائض و خدمات

قوتِ عقل ہی وہ قوت ہے جس کی بدولت انسان علوم نظریہ اور معارفِ واقعیہ کی طرف اقدام کرسکتا ہے اور تدریجاً قوت سے فعل کی طرف بڑھتا ہے پس طائر عقل کے پروبال جس قدر مضبوط و طاقت ور ہوں گے اس کی پرواز میں اتنی ہی بلندی ہوگی اور علم و عمل میں تکالیف شرعیہ کا بوجھ بھی اسی نسبت سے ہوگا کیونکہ معمولی و پست درجہ کے انسان سے جو خدمت لی جاتی ہے ایک بلند مرتبہ اور کامل انسان سے اس پر اکتفا ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ ہر شخص اپنی اپنی شان و حیثیت سے مکلف ہوتا ہے اور اسی ہی نسبت سے اس سے بازپرس ہوگی۔ جس کا وہ جواب دہ ہوگا۔

علامہ اجل ثقۃ الاسلام کلینی قدس سرہٗ نے اپنی کتاب کافی میں ایک باب قائم کیا ہے جس میں اس مضمون کی احادیث نقل فرمائی کہ معرفت اللہ کی جانب سے ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ اللہ کی جانب سے بندوں پر یہ فریضہ نہیں کہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں بلکہ اللہ پر ضروری ہے کہ بندوں کو اپنی پہچان کرائے اور بندوں پر واجب ہے کہ جب اللہ ان کو اپنی معرفت کی طرف بلائے تو وہ اسے قبول کریں۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اسباب معرفت اور ذرائع علم عطا فرماتا ہے جس کی بدولت وہ اس وادی میں قدم رکھنے کے اہل ہوتے ہیں۔ پس خداوند کریم نے اپنے بندوں کو عقل کی نعمت سے نوازا۔ جو معرفت کی طرف قدم بڑھانے کی محرک اعظم ہے اور یہ خدا اور بندوں کے درمیان حجت باطنی ہے اور بندوں پر معرفت کا لزوم اتنا ہے جس قدر ان کی عقل طاقت رکھتی ہو۔

عنایت عالیہ الٰہیہ اور اس کی رحمتِ واسعہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بندوں کے لئے معرفت کے راستے آسان فرمائے تاکہ وہ عقل کی روشنی میں آگے بڑھنے کے قابل ہوں۔ پس اس نے انبیاء و مرسلینؑ اور خلفاء معصومینؑ کا انتظام فرمایا تاکہ وہ بندوں کو خالق کی شناخت کی دعوت دیں اور یہ باور کرائیں کہ اس کی طرف ہماری بازگشت کا بھی ایک

دن مقرر ہے جس کے لئے ہم کو زادِ راہ مہیا کرنا ہے نیز معارفِ ضروریہ کی تحصیل پر جو انسان کو توفیق حاصل ہوتی ہے وہ اسی کی ہی عطا کردہ ہے۔ چنانچہ وجود تندرستی نورِ عقل اور بصیر بذریعہِ وحی و الہام یا تعلیمِ انبیاء و آئمہؑ اس کی بیداری و ہوشیاری کا انتظام اور عقل کو نفع و نقصان کے درمیان تمیز کا ملکہ اور خیر و شر کے درمیان فرق کی قوت یہ سب اللہ کی جانب سے معرفت کے ذرائع ہیں۔ پس احادیث میں معرفت کا خدا کی جانب سے ہونے کا یہی مقصد ہے کہ ابتدائی اسباب و ذرائع قدرت و توفیق اور تنبیہ وارشاد وغیرہ اسی کی ہی جانب سے ہوتے ہیں اور علما کا کہنا کہ معرفتِ خدا انسان کا فطری فریضہ ہے اس سے مراد توفیق وارشاد کے بعد عرفان کی تفصیلی منازل کا طے کرنا ہے یا یوں سمجھئے کہ اپنے مبداء و صانع محسن کا تصور قہری و فطری چیز ہے جو اللہ کی جانب سے ہے اور دلیل عقل سے حدِ یقین تک پہنچنا انسان کا فریضہ ہے جو غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔

معرفتِ خداوندی کیلئے وجوب نظر و فکر پر عقلی استدلال

وجوب نظر و فکر پر جو علمائے اعلام نے استدلال کیا ہے اس کی آسان لفظوں میں توضیح و تنقیح یہ ہے کہ ہر قوتِ شعور رکھنے والا انسان جب اپنے اوپر نعماتِ ظاہریہ و باطنیہ کے غیر متناہی سلسلہ پر نگاہ کرتا ہے تو قہراً اس کا ذہن اِن نعمات کا سبب تلاش کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان نعمات کا موجد نہ میں خود ہوں اور نہ مجھ جیسا کوئی اور انسان ہے نیز فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جس چیز کو نہ جانتا ہو توجہ منعطف ہونے کے بعد اس کا ذہن اس کے جاننے کا خواہاں ہوتا ہے پس اس توجہ کے بعد فطری طور پر اپنے منعم کو ڈھونڈنے کے لئے اس کے فکر میں تحریک پیدا ہوتی ہے نیز یہ احتمال بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ محسن منعم کی معرفت سے غفلت کہیں سلب نعمت کی موجب نہ بن جائے پس دفع ضررِ محتمل کے لئے فکر اس کی معرفت کے لئے بے چین ہو جاتی ہے اور چونکہ محسن کا شکر بھی عقلی و فطری فریضہ ہے اور یہ احتمال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان نعمات کی بقاء و دوام شاید ادائیگی شکر سے وابستہ ہو اور شکر بغیر معرفت کے ناممکن ہے پس ثابت ہوا کہ معرفتِ منعم کی طرف اقدام اور نظر و فکر کا وجوب ایک فطری فریضہ ہے۔

معرفتِ تفصیلیہ کے وجوب کی دلیل آسان عقلی طریقہ سے یوں بھی بیان کی جا سکتی

ہے کہ جب انسان بلطفِ خداوندی بذریعۂ تعلیم نبی اپنے صانع منعم و محسن کے وجود کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کی جانب سے نعمات کا لاغیر متناہی سلسلہ جاری و ساری ہے تو وجدانِ سلیم اور طبعِ مستقیم اسے اس کی ذات و صفات کی معرفت کے لئے غور و فکر پر مجبور کرتی ہے اور انسانی ضمیر اس سے پیدا ہونے والی توجہ کو مہمل چھوڑ دینا احسان فراموشی بلکہ محسن کشی اور کفرِ عظیم سمجھتی ہے پس معلوم ہوا کہ معرفت تفصیلیہ کی تحصیل اور اس میں نظر و فکر کا وجوب عقل کے نزدیک ایک بدیہی امر ہے بشرطیکہ عقل میں صحت و سلامتی موجود ہو اور تحصیل معرفت کے لئے غور و فکر کی خاطر علم کلام اور اس کی اصطلاحات و مباحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ اللہ کی وہ آیات جو آفاق میں یا نفوسِ انسانیہ میں تکوینی طور پر موجود ہیں۔ ان میں غور و خوض اور انبیاء مرسلین و آئمہ طاہرین علیہم السّلام کی فرمائشات اور ان کے اقوالِ نورانیہ میں تأمل و تدبر قلوبِ سلیمہ اور اذہانِ مستقیمہ کو انوارِ معرفت سے منور کرنے کیلئے کافی ہیں۔

مبداءِ اوّل کی تلاش میں نظر و فکر کی دوڑ دھوپ

انقلاباتِ زمانہ اور تطورات کونیہ

محفوظ فطرتِ انسانیہ کے تقاضوں میں سے یہ ایک بدیہی اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ زندہ دل اور حساس انسان بچپنے کی فارغ البالی سادہ خیالی اور پر از عیش و آرام زندگی کے بعد جب ابتدائی حیوانی طور سے انسانی عرفانی دور کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اس کی غور و فکر کا پہلا قدم طبعی نیند سے آنکھ کھلنے کے بعد میدانِ علم و ادراک میں اس کی پہلی حرکت یا لمحات کی موت کے بعد اس تازہ زندگی کی پہلی رُوح جو اس میں نفوذ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مادی دنیا کے نت نئے تغیرات و تطورات کے واقعی اسباب و علل کیا ہیں اور غیر مانوس انداز سے بعض حوادث کا رونما ہونا ان علل و اسباب کی جستجو میں پڑنے کی تحریک کو اور زیادہ تیز کر دیتا ہے جیسے کسوف خسوف زلزلے اور دمدار ستارے وغیرہ اور فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ورطۂ عدم سے منصۂ شہود پر ظاہر ہونے والی ہر شے کے سبب کی طرف ذہن متوجہ ہو۔ یہ توجہ دو طرح سے ہوتی ہے ایک وہ جو آنی ہو یعنی ذہن متوجہ ہونے کے بعد پھر غفلت کی نیند سو جائے یعنی یہ توجہ بجلی کی چمک کی طرح ہے جو ظاہر ہو کر ختم ہو گئی۔ اور عامۃ الناس میں یہ توجہ اسی انداز سے ہی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑھاپے

کے دَور تک انسان اسی بچپن کی سی غفلت کے بحر میں غرقاب رہے اور مادیات کے بارہا کے تجربہ سے وہ صرف فانی اور کثیف بدن کی اصلاح و بہبود کا کفیل رہے۔ یعنی خورد و نوش۔ سیر و تفریح اور بہیمانہ زندگی کے لئے ذرائع عیش و عشرت میں فراوانی کی تحصیل میں مصروفیت ہی اس کی زندگی کا مآل ہوتا ہے۔

دوسری وہ جو آنی نہ ہو بلکہ مستمر و پائیدار ہو اور اس توجہ کے حامل وہ بلند بخت لوگ ہوتے ہیں جو شرفِ انسانی اور اس کے عرشِ رفعت کے بلند ترین کنگرہ تک پہنچنے کی سعادت حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہوں۔ پس یہ دائمی توجہ کائنات کی ہر چیز کے اسباب کی تلاش میں ہر دم فکر کو متحرک رکھتی ہے۔ ایک سبب کے بعد دوسرے کی تلاش پھر تیسرے کی اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ جب تک روحِ انسانی قفسِ عنصری میں بند اور ہیکلِ مادہ کی قیود میں محبوس ہے۔ فکر و نظر کی تگ و دو اور اس کی انتھک کوشش حقیقت کے تعاقب میں لگاتار مصروفِ کار رہتی ہے اور اس میں شک و شبہ نہیں کہ طبیعتِ سلیمہ۔ فطرتِ صحیحہ اور عقلِ مستقیم رکھنے والوں کے افکار و انظار جو کج روی کے عیب سے پاک و منزہ ہوں طبیعت کی تحریک اور فطرت کی قیادت میں اسباب و ذرائع کے انداز سے اپنی ذاتی قابلیت و استعداد کی بدولت علم و ادراک کی بلندیوں اور معرفت کی چوٹیوں کو تا حدِّ امکان سر کر لینے میں کامیاب ہو کر ایسے انجام تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے ممکنات نے کتمِ عدم سے فضاءِ وجود میں قدم رکھا اور جہاں اسباب کا سلسلہ ختم ہوا۔ جو ہر شیٔ کا مبداء ہے اور اس کا کوئی مبداء نہیں۔

یہاں تک پہنچ کر ہم اپنے اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جس کے لئے اس کتاب کی تدوین معرضِ وجود میں آئی اور وہ ہے اصولِ اسلام کا اثبات قابلِ قبول انداز سے جس کو ہر فہمِ مستقیم قبول کر سکے اور یہی وہ اصول ہیں جن کو اپنانے پر نجاتِ اخروی کا دار و مدار ہے کتاب کا نام لمعۃ الانوار فی عقائد الابرار تجویز کیا ہے۔ خداوند کریم ہمیں سمجھانے اور قارئین کو صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور خداوندِ قدوس سے پر اُمید ہوں کہ اس کو بارگاہِ قبولیت میں جگہ عطا فرمائے اور اس کو میرے اور میرے آباد مومنین کے باقیات صالحات میں سے قرار دے کر اس کو ہمارے لئے روضات الجنات میں پہنچنے کا وسیلہ قرار دے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۞

پہلا باب

مبدأ اوّل حضرت حق سبحانہٗ کے وجود کی تلاش

فطری تحریک

جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ فطرت کے تقاضے غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمارا مطمحِ بحث اور موردِ فحص کیا ہونا چاہیے اور ہماری عقول و افکار پر سب سے پہلے کس شئی کی تلاش واجب و لازم ہے تو صاف واضح و عیاں ہے کہ عقل و دانش کے نزدیک اپنے وجود کا موجد و مبدأ اور کائنات کا خالق معلوم کرنا سب مقاصد سے اہم ترین مقصد ہے پس فطری تحریک کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سمجھیں۔ کیا ہمارا وجود اتفاقی طور سے اور بلا مقصد معرضِ وجود میں آگیا یا کسی ذاتِ مقدسہ کی عنایتِ عالیہ اور اس کے ارادہ و اختیار سے کسی حکمت و مقصد کے ماتحت خلق ہُوا؟ کیا ہماری صرف یہی ایک زندگی ہے یا اس کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے۔ جس کے لئے ہم نے اس زندگی میں کچھ کرنا ہے کیا ہم کو نعمتِ وجود عطا کرنے والی قوتِ حس و ادراک سے عاری ہے یا ہمارا مبدأ علیم و حکیم و مرید و مدرک ہے؟

لوگوں کی تحصیلِ معرفتِ خالق میں اقسام

جب فطرت کے تقاضوں نے عالم اکوان کے نت نئے تغیرات اور اس میں ظاہر ہونے والے حیرت انگیز مشاہدات کی بناء پر ان کے علل و اسباب کی جستجو کی طرف نظر و فکر کی تحریک کی تو لوگوں کی اس مقام پر تین قسمیں ہو گئیں۔

ایک قسم ایسے عقل و بصیرت کے اندھے لوگوں کی ہے جو فطرتِ انسانیہ بلکہ شرفِ ذاتی کا منہ چڑاتے ہوئے تحقیق و تدقیق کے لئے نظر و فکر سے کام لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے وہ اس زندگیٔ فانی کے علاوہ کسی دوسری زندگانی جاودانی سے قطعاً غافل ہیں پس ان کا مطمحِ نظر صرف اس چار روزہ زندگی کی خوشحالی کے سوا اور کچھ نہیں وہ

اس سے آگے کچھ نہ جانتے ہیں۔ نہ جاننا چاہتے ہیں۔ گویا انہوں نے جہالت کے تاریک گڑھے میں قندیلِ عقل و فانوسِ فراست کو خاموش کر کے حیوانیت کی بہیمانہ زندگی پر آنکھیں بند کر لیں اور دین و مذہب کی جملہ قیود سے آزادی کو کامیاب زندگی تصور کر لیا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے جہالت کی تنگ و تار وادیوں میں گم گشتہ رہنے کو رُوحِ انسانی اور ناموسِ بشری کیلئے سمِ مہلک سمجھا۔ پس افکار و اذہان کی پشت پر سوار ہو کر تلاشِ حقیقت میں وہ آگے بڑھے۔ کافی دوڑ دھوپ اور محنت و کاوش کے بعد ایک مبداء تک پہنچے۔ جس کو انہوں نے مبداء المبادی کے نام سے پکارا اور تمام غایات کی غایت اقصٰی اس کو قرار دیا اور اس کے قائل ہوئے کہ وہ خود شعور و ادراک سے خالی ہے۔ پھر اس کا نام طبیعت مادہ۔ ہیولی۔ دہر۔ زمانہ وغیرہ وغیرہ ہر ایک نے اپنی اپنی پسند سے تجویز کر لیا

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے کہا کہ طبیعت و مادہ کے بعد تمام اشیاء حتٰی کہ مادہ و طبیعت کا مبداء بھی ایک الگ ذات ہے جو درحقیقت مبداء المبادی ہے اور وہی سب سے اوّل ہے اور اس سے اوّل کوئی چیز نہیں ہے۔

گویا علل و مبادی کی جستجو میں دوسرا اور تیسرا گروہ ایک حد تک شریکِ سفر رہے مادہ و طبیعت تک پہنچ کر دوسرے گروہ نے ہمّت ہار دی اور تھک کر بیٹھ گیا۔ لیکن صاحبانِ ہمّت آگے بڑھے اور انہوں نے مادہ و طبیعت کو منازلِ سیر اور مراحلِ سفر میں سے ایک منزل و مرحلہ قرار دیا اور غایت و مقصود اس کے علاوہ اور ذات کو سمجھا جو مبداء اوّل کہلانے کی مستحق ہے اور وہی اللہ ہے۔

ان میں سے پہلا عقل کے اندھوں کا گروہ جو بحث و تمحیص اور تحقیق و تدقیق میں جانا عبث سمجھتے ہوئے تاریکی کی زندگی کو غنیمت سمجھتے ہیں ان سے بات کرنا فضول ہے البتہ دوسرے گروہ سے بات کرنا کسی حد تک مفید اور اچھے نتائج کا باعث بن سکتا ہے۔

اثباتِ وجودِ باری سُبحانہٗ

یہ وہ حقیقت ہے جو تمام حقیقتوں سے واضح تر ہے اور ایسا مسئلہ ہے جو تمام مسائل سے بدیہی تر ہے اس کی وضاحت ہی اس کی خفا کی موجب ہے اور اس کا ظہور ہی اس کی غیبت کا [illegible] مسئلہ عقولِ سلیمہ کی فطرتِ اوّلیہ کا محسوس اوّلی ہے لیکن زمانہ کی کج

رفتاری کے بدترین نتائج میں سے سمجھ لیجئے کہ اربابِ دانش اور صاحبانِ ذوق بے بس ہیں کہ ایک واضح ترین اور بدیہی اوّلی مطلب پر دلیل و برہان پیش کریں اور اسی میں اپنی عمرِ عزیز کا قیمتی حصہ خرچ کر دیں اور ایک ایسی شیٔ کو ثابت کرنے کے درپے ہیں جو واضح سے واضح تر بلکہ اپنی ذات سے بھی جلی اور قریب تر ہے۔

مجھے اس مقام پر فلاسفہ و حکمار کے طرزِ بیان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں اور نہ متکلمین کی اصطلاحات کو بروئے کار لاکر سادہ اذہان کو الجھانے کو میں بہتر سمجھتا ہوں بلکہ اس مقام پر جو اندازِ قرآن اور قرآن والوں نے اختیار کیا ہے وہ ہی موزوں تر اور عقولِ انسانیہ کے قریب تر ہے اس سے مطلب کے چہرے سے گرد و غبار بھی ہٹ جاتا ہے۔ اور عام اذہان پر اس کے سمجھنے کا چنداں بوجھ بھی نہیں پڑتا۔ خداوند عالم نے ہر انسان کو اپنے وجود کے اثبات کے لیے اپنے نفس اور آفاق میں مطالعہ کرنے کی دعوت دی ہے اور سچ یہ ہے کہ اثباتِ صانع کے لئے اس دعوت سے بڑھ کر اور کوئی آسان طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور قرآنِ مجید میں ایک دو مقام پر نہیں بلکہ متعدد مقامات پر خدائے قدوس نے اسی دعوت کو دہرایا ہے۔

بے شک کائناتِ عالم میں تدبر و تعمق وجود خالق صانع حکیم کے اثبات کا بہت بڑا ذریعہ ہے کیونکہ کوہ و جبل کا ہر کنگرہ موجِ دریا کا ہر قطرہ ریگِ صحرا کا ہر ذرہ وسعتِ زمین کا ہر چپہ اوقات و ازمنہ کا ہر لمحہ اور اشجار و نباتات کا ہر پتہ اپنے خالق محسن کے وجود کا پتہ دیتا ہے۔ اسی طرح آسمانوں کی گردشیں زمینوں کی وسعتیں شب و روز کے اختلاف میں نور و ظلمت کا فرق دریاؤں کی طغیانیاں پہاڑوں کی سربفلک چوٹیاں پانی کی لطیف موجوں پر جہاز رانیاں فضا میں بادلوں کی آمد بارش کا برسنا ہواؤں کا منظم ہو کر چلنا۔ زمینوں کی سرسبزی و شادابی۔ بارانِ رحمت سے ان کی سیرابی و فیض یابی سورج کی روشنی چاند کی چاندنی ستاروں کی چمک دمک، پھولوں کی مہک، باغوں میں گل و غنچہ کی رونق بادِ نسیم کی سرسراہٹ بلبلوں کی چہک اور پھر تمام کائنات کے نظامِ اعلیٰ و اتم کا دوام و بقا اور ان کا باقاعدگی سے مصروفِ کار رہنا یہ سب چیزیں وجودِ صانع کی بولتی ہوئی زبانیں ہیں۔

اسی طرح اگر اپنے نفس کی طرف دھیان کیا جائے تو نطفہ کی حقیقت پھر شکمِ مادر میں علقہ اور اس سے مضغہ کی طرف انتقال پھر انسانی قالب میں اس کا ڈھلنا اور نہ معلوم

کن کن ادوار سے گذر کر نفس و رُوح کا محل بننا اور ایک عرصہ تک ایک ایسی جگہ محبوس ہونا جہاں نہ ہوا کا گذر نہ غذا کی آمد نہ ماں کو خبر نہ باپ کو پتہ عالمِ وحشت و تنہائی میں اکیلا و تنہا ایک وقتِ خاص کا منتظر رہنے کے بعد پیدائش کی منزل تک پہنچنا وغیرہ۔ عقل و فہم حیران ہے اور اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کے کان کیسے بنے؟ اس کی آنکھ کو کس طرح بنایا گیا اور اس کا ناک زبان چہرہ ہاتھ پاؤں بلکہ تمام کے تمام اعضاء کس طرح تیار ہوئے حالانکہ وہاں روشنی تک نہیں تھی۔ اب کس کی مجال ہے کہ کہے وہ خود بخود بن گیا۔ جبکہ اس کا بے عیب جسم و وجود اور بے داغ وضع و قطع ببانگِ دہل پکار رہی ہے کہ میرا صانع بے شک بے عیب و بے داغ ہے ماہر ترین مصور اندھیرے میں بے عیب و بے داغ تصویر نہیں کھینچ سکتا اور مالک فرماتا ہے کہ میں نے انسان کو تین تاریک پردوں کے اندر بنایا۔ ایک شکمِ مادر کا پردہ دوسرا رحم کا پردہ اور تیسرا اس کے جسمِ نازنین کے اُوپر باریک جھلی کا پردہ اور اس تاریک در تاریک فضا میں ایسا پیدا کیا کہ کوئی عیب کی جگہ نہ رہی کوئی عضو بے جا نہ ہُوا اور لطف یہ کہ اگر مادہ کو بنایا تو اس کے مناسب اعضاء میں کوئی کمی نہ چھوڑی اور نر کو بنایا تو اس کو اس کی حیثیت سے اتم و اکمل بنایا اور طرہ یہ کہ آدم سے لے کر آخر دم تک جس قدر انسان پیدا کئے سب کی شکل و صورت کو ایک دوسرے سے ممتاز فرمایا بلکہ ان کے ہر ہر عضو کو ایک دوسرے کی مشابہت سے محفوظ رکھا۔ بہر کیف ایک بہت بڑی تفصیل ہے جو انسانی اعضاء میں حکمت و مصلحت کے گوناگوں تقاضوں پر مشتمل ہے جو اپنے صانع حکیم کی بولتی ہوئی زبان ہے اور کہنا پڑتا ہے:۔ تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ چنانچہ بعض نکات حضرت صادق علیہ السلام کے حکیم ہندی کے ساتھ مکالمہ میں واضح کئے گئے ہیں جو مقدمہ تفسیر انوار النجف میں ص۱۸۱ تا ص۱۸۲ پر مذکور و مسطور ہیں۔ انسان کی جملہ خوبیوں پر مشتمل پیدائش اگر اتفاقاً ہوتی تو کبھی یہ حلیہ دوسرے حلیے سے تبدیل ہو جاتا۔ حالانکہ کبھی کوئی انسان اس معروف و مشہور شکل کے علاوہ کسی دوسری شکل میں پیدا نہ ہُوا اور نہ کبھی اتفاقی طریقے سے اعضاء میں سے ایک کی جگہ دوسرے نے لی۔ پس ثابت ہُوا کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ خالقِ کائنات کے حسن اختیار اور لطفِ تدبیر کا نتیجہ ہے پس یہ کہنا کہ یہ مادہ و طبیعت کی کارستانی ہے اور اتفاقاً ایسی مخلوق پیدا ہو گئی ہے بالکل غلط ہے کیونکہ جب مادہ و طبیعت میں حس و شعور ہی نہیں ہے تو ان سے ایسی پُر از حکمت و تدبیر مخلوق کیسے سرزد ہو سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس ذات واجب الوجود کی خلقت وصنعت کا کرشمہ ہے جو علیم و حکیم ہے اور دانا و بینا ہے ۔ بہرکیف وجودِ انسانی میں بدن کی رگ رگ خون کا قطرہ قطرہ جسم کا بال بال اور ہڈیوں پٹھوں کا ریزہ ریزہ اپنے خالق مدبر کے وجود کا شاہد بیّن ہے ۔

مزید وضاحت

انسان جب آسمان وزمین کے وجود اور ان کے اندر نت نئے رُونما ہونے والے عجائب وغرائب کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ جو چیز حوادث کا محل ومقام ہے وہ خود بھی حادث ہے پس ماننا پڑتا ہے کہ آسمان وزمین کا وجود ازلی نہیں بلکہ ایک وقت میں یہ نہ تھے اور پھر ہو گئے ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان کو کسی نے پیدا کیا ہے ۔ پس ان کا حدوث و وجود ان کے خالق کے وجود کی دلیل ہے جو قادر ہے اور ان کے وجود میں عجیب وغریب مصالح اور ان کا نظم و نسق خالق کے علم وحکمت کے ناقابلِ تردید دلائل ہیں نیز ان کا حدوث خالق کے قدم کا پتہ دیتا ہے کیونکہ اگر وہ بھی حادث ہو تو اس کے لئے ایک اور موجد کی ضرورت ہوگی ۔ پس انتہا ایک ایسے موجد تک ضروری ہوگی جو تمام اشیاء کا مبداء المبادی ہو اور وہی اللہ ہے اسی طرح شب وروز کا اختلاف اور ان کا ایک مقدار معین کے ماتحت تعاقب پھر بلحاظ موسم ایک خاص انداز کے ماتحت ایک کا گھٹنا اور دوسرے کا بڑھنا اس طرح کہ گھٹنے والے کی کمی بڑھنے والے کی زیادتی کے برابر رہے یہ سب صانع قادر حکیم کے وجود کی محکم و متقن براہین ہیں ۔

کیا زمین پر زندگی کی نمود محض اتفاق ہے

عصر حاضر کے ایک مفکر پروفیسر کی تحقیق اس مقام پر پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں ۔ جس سے اتفاقاً پیدائش مخلوق کے قائلین کا ناطقہ بند ہو جائیگا نیز بے حس مادہ اور لاشعور طبیعت کو خالق ماننے والوں کو بھی سوچنے اور صحیح فیصلہ کرنے کا اچھا خاصا موقع مل سکے گا ۔

" عصر جدید سائنس کا دور ہے اگرچہ آفتاب سائنس ابھی طلوع ہوا ہے ۔ تاہم ہر نئی دریافت یہ تصدیق کرتی ہے کہ یہ دنیا کا تخلیقی کارنامہ ایک حکیم مطلق یعنی خالق پروردگار کا ہی مرہونِ منت ہے ۔ ڈارون کے بعد ایک صدی میں انسان نے عظیم الشان ایجادات کی ہیں اور ہم ایک ایسے سرچشمۂ علم سے

بہرہ ور ہوتے ہیں کہ جہاں سائنس اپنے عجز کے اقرار کے ساتھ خدا پر ایمان کو مستحکم کرتی ہے اور ہم خدا کی حقیقت کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ مشاہدہ قدرت اور جدید سائنسی علوم۔ ریاضی طبیعات جغرافیہ فلسفہ اور علم حیوانات وغیرہ سے چند دلائل نے میرے خدا پر ایمان کو تازہ کر دیا ہے شاید آپ بھی ان سے اتفاق کریں۔

حساب کے لافانی قانون کی رو سے ہم ثابت کرتے ہیں کہ ہماری یہ کائنات ایک عظیم انجینئر کے ہاتھوں سے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی تھی۔ فرض کیجئے آپ دس سکے لے کر ان پر ترتیب وار ایک سے دس تک ہندسے لکھ دیتے ہیں اور انہیں ملانے کے بعد جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ اب آپ انہیں اس ترتیب سے نکالنے کی کوشش کریں کہ پہلے نمبر ایک آئے پھر نمبر دو پھر علی الترتیب نمبر دس نکلے اور ہر سکہ نکالنے کے بعد سے جیب میں ڈال کر ملاتے رہیں۔ حساب کی رو سے ہم جانتے ہیں کہ ان دس سکوں میں سے نمبر ایک کو پہلی دفعہ نکالنے کی کوشش کریں تو اس کا امکان $\frac{1}{10}$ ہے۔ اگر نمبر ایک اور نمبر ۲ کو ترتیب وار نکالنے کی کوشش کریں تو اس کا امکان $\frac{1}{100}$ ہے اسی طرح ایک دو تین کو ترتیب سے نکالنے کے لئے ہزار میں سے ایک دفعہ کا امکان ہے لیکن ایک سے دس تک تمام سکوں کو ترتیب سے نکالنے کے لئے امکان کس حد تک ہے شاید ایک ارب دفعہ میں ایک مرتبہ۔ تو اس توجیہہ سے ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ہماری زمین پر زندگی برقرار رکھنے کے لئے کئی شرائط کا ہونا ضروری ہے البتہ ان میں توازن و تناسب ناگزیر ہے زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگاتی ہے اگر یہ سو میل کی رفتار پر آ جائے تو ہمارے دن رات موجودہ وقت سے دس گنا بڑھ جائیں گے اور سورج کی تمازت دنیا کے سبزے کی پتی پتی کو جلا کر رکھ دے گی اور اگر کوئی سخت جان کونپل بچ بھی گئی تو یخ بستہ طویل رات اُسے ختم کر دے گی۔

سورج جو ہماری زندگی کے لئے ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کی اوپر کی سطح کا درجہ حرارت ۱۲ ہزار فارن ہیٹ ہے۔ ہماری زمین اس سے اتنی دور ہے کہ یہ ازلی ابدی آگ کی بھٹی ہمیں مناسب گرمی دیتی ہے اگر یہ اس سے آدھی حرارت دے تو ہم برفاب ہو جائیں گے اور اگر یہ اس سے آدھی حرارت تیز کر دے تو ہم کباب ہو جائیں گے

ہماری زمین ۲۳ درجہ عمود جھکی ہوئی ہے۔ اسی سے ہمارے موسم بنتے ہیں۔ اگر یوں نہ ہوتا تو سمندروں سے اُٹھنے والے بخارات شمالاً جنوباً ہر سمت میں برف کے براعظم بنا دیتے اگر چاند موجودہ فاصلہ سے صرف پچاس ہزار میل دُور ہوتا تو سمندروں میں اس قدر شدید مد و جزر پیدا ہوتا کہ دو روز میں سارے براعظم طوفانِ نوح کی داستان دہراتے حتیٰ کہ ہمالیہ کی چوٹیاں بھی غرقاب ہو جاتیں۔ اگر سطح زمین کا چھلکا صرف دس فٹ اور موٹا ہوتا تو یہاں آکسیجن نہ مل سکتی جس کے بغیر زندگی موت بن جاتی اگر سمندر موجودہ گہرائیوں سے زیادہ عمیق ہوتا تو کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آکسیجن اتنے زیادہ صرف ہو جاتے کہ نباتات کا قلع قمع ہو جاتا اور اگر زمین کے گرد فضا کا ہالہ اتنا کثیف نہ ہوتا تو کائنات میں روزانہ لاکھوں کی تعداد میں ٹوٹنے والے شہاب ثاقب زمین کو چاروں طرف سے آگ لگا دیتے اسی طرح اور بیسیوں مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ کروڑ میں سے ایک مرتبہ بھی امکان نہیں ہے۔ کہ ہماری زمین پر زندگی کی نمود محض اتفاق ہے بلکہ اسے ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق تیار کیا گیا ہے اور یہ سکیم کسی حکیم و دانا و عقلِ کل کے وجود پر دلالت کرتی ہے (یعنی وجود خالق) انتہٰی۔

خلاصہ بحث سابق

اس ساری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرتِ انسانیہ نے جب غور و فکر کو اسباب و علل کی معرفت کی طرف بڑھایا تو دو نظریئے سامنے آگئے۔ پہلا یہ کہ سب حوادث و عجائب و غرائب مادہ سے خود بخود منصۂ شہود پر آگئے اور ان کی کوئی علتِ فاعلہ نہیں۔ گویا یہ کائنات خود قدیم ہے اور ایسی ہی چلتی رہے گی اور یہ سب حسن اتفاق کی پیداوار ہے اور دوسرا یہ کہ اس سب عالم کون کا مبداء المبادی ایک ذات ہے جو دانا و بینا اور جامع جمیع صفات کمال ہے جس نے اپنے حسن تدبیر اور کمال حکمت سے اس تمام نظام کو باختیار خود پیدا کیا اور لازوال مصالح و حکم ان میں تفویض فرما کر اس کو ایک بہترین دستور و نظام کے ماتحت قائم فرمایا اور وہی خالقِ کل ہے جسے اللہ کہتے ہیں۔ پس کائنات کی حکم و مصالح میں غور و خوض اور کتابِ نفس کا گہرا مطالعہ پہلے نظریئے کو باطل اور آخری نظریہ پر مُہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور خدا کی قسم علمائے اعلام اور صاحبان افہام پر اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہوگی کہ زمانہ کی کج روی نے ان کو ایسے ظالم لوگوں سے نپٹنے پر مجبور کر دیا جو اوضح البدیہیات کے وجود کا

انکار کریں پس میں اس جھگڑے کا فیصلہ عقل و وجدان کی عدالت میں پیش کرتا ہوں اور اسی کا فیصلہ ہی انصاف شعار اور حقیقت طلب طبائع کے لئے آخری فیصلہ ہے۔

بہرکیف وجود باری کا یقین اس قدر بدیہی ہے کہ اس کو بچے بوڑھے زن و مرد اور عالم و جاہل اپنے اپنے انداز سے واضح طور پر جانتے ہیں۔ حتاکہ جب ایک بدوی عرب اونٹوں کے چرواہے سے سوال کیا گیا کہ وجود باری کا کیا ثبوت ہے تو بلا تامل کہنے لگا۔ جب مینگنی کا وجود اونٹ کے وجود کی دلیل ہے۔ نشان قدم کسی گذرنے والے کا پتہ دیتا ہے تو کیا اتنا بڑا اچرچ نیل گوں اور اتنی لمبی چوڑی زمین اپنے خالق کے وجود کا پتہ نہیں دیتی اور جب ایک بوڑھیا سے پوچھا گیا تو اس نے اپنے انداز سے جواب دیا کہ جب چرخہ میرے ہاتھ کی حرکت کا محتاج ہے اور خود بخود گردش نہیں کر سکتا تو اتنے بڑے گنبد افلاک کا چکر اور اس پر شمس و قمر و ستارگان کی سیر کسی خالق مدبر کے بغیر کیسے ممکن ہے!

مقصد یہ ہے کہ ہر ایک انسان وجود خالق کو اپنی حیثیت کے مطابق جانتا ہے اور اس کے پاس اسی حیثیت سے دلیل بھی موجود ہے اور یہ اس مسئلہ کے انتہائی روشن اور واضح ہونے کی دلیل ہے؟ پس خالق کی معرفت کے لئے راستے اس قدر ہیں جس قدر انسانی نفوس ہیں۔ اور جب موجودات کا ہر فرد بذات خود اپنی لازوال حکمتوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے خالق کے وجود اور اس کی حسن صنعت کی دلیل ہے تو پھر عقلی یا نقلی فلسفی یا کلامی دلیل قائم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

ہاں خواہشات و لذات دنیاویہ کے چکر میں پھنس کر دین و مذہب کی قیود سے آزاد ہونے والے ہٹ دھرمی سے اگر کہہ دیں کہ کوئی خدا نہیں تو براہین ساطعہ اور ادلۂ قاطعہ کے مقابلہ میں ان کا قول ایسا ہے جیسے مینڈک کی چانخ شیر کی گرج کے سامنے لہٰذا ان کی تردید میں زیادہ وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ آخر میں بطور تتمہ یا تبرک حضرت سید الشہداء کی مناجات کے چند فقرے ذکر کرتا ہوں۔ جن کو ابن طاؤس قدس سرہ نے اقبال میں ذکر فرمایا ہے (علی نازوی)

سُبْحَانَكَ أَيَكُونُ لِغَيْرِكَ مِنَ الظُّهُورِ مَا لَيْسَ لَكَ حَتّٰى يَكُونَ هُوَ الْمُظْهِرُ لَكَ مَتٰى

تسبیح تیری ہی ذات کو زیبا ہے کیا تیری ذات کے علاوہ اور کسی کو اس قدر وضاحت حاصل ہے جو تیری ذات میں نہ ہوتا کہ وہ تیری مظہر

دوسرا باب

توحیدِ باری عزاسمہٗ

مسئلہ توحید سابقہ مسئلہ اثبات باری کی طرح اگرچہ بدیہیات میں سے نہیں ہے لیکن باوجود غامض ہونے کے اس لحاظ سے یہ بھی بالکل واضح ہے کہ اس کی مخلوق کی ہر شئی بہانگِ دہل اس کی وحدانیت کی نغمہ سرا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں یہاں بھی کتابِ نفسی اور کتاب آفاقی کا مطالعہ اثباتِ توحید کے لئے ناقابلِ تردید براہین کو متضمن ہے۔ گردشِ فلک اور اس کی متوازن رفتار زمین پر نیرِ اعظم کے محیر العقول آثار بلکہ کل کائنات میں تفویض کردہ بے حد و حساب رموز و اسرار سب کے سب ادلۂ توحید کے الگ الگ دفتر ہیں۔ نیز جسم انسانی کا ہر حصّہ توحید پروردگار کی ہزاروں دلیلوں کا خزانہ ہے۔ پس عالمِ اکبر جسے کتابِ آفاقی کا نام دیا جاتا ہے اور عالمِ اصغر (بدنِ انسانی) جسے کتابِ نفسی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کتابوں کا ہر ہر باب بلکہ ہر ہر ورق اور اس کی ہر ہر سطر حتٰی کہ ہر ہر لفظ اور ہر ہر حرف خالقِ عالم کی عظمت اور اس کی توحید کی بولتی ہوئی زبانیں ہیں۔ اور ان کی تفصیلات میں سے اقل قلیل کا بیان بھی مجھ ایسے قلیل البضاعۃ انسان سے ناممکن ہے۔ البتہ جلائے ایمانی اور غذائے روحانی کے طور پر مشتے نمونہ از خروارے کے طریقہ سے کچھ نہ کچھ بیان کر دینا ضروری ہے۔ ورنہ ہر ذی ہوش اور صاحبِ عقل و دانش اگر علائق شہویہ کا بھوت اس کے سر پر سوار نہ ہو تو غور کے بعد خود خاطر خواہ نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے۔

ایسی دقیق حکمتیں عجیب صنعتیں تعجب خیز کارنامے اور عبرت انگیز کرشمے اسی بدن کے اجزاء اور جسم کے اعضاء میں پوشیدہ ہیں جو سمجھ لینے کے بعد یقین کی پائندگی اور عرفان کی تابندگی کے ضامن ہیں۔ حکمت و صنعت کی عجیب و غریب جلوہ گری ملاحظہ

فرمائیے۔ آنکھ کی رطوبت کا مادہ نمکین کان میں تلخ منہ میں شیریں اور ناک میں بے ذائقہ ہے۔ حالانکہ یہ سب نہریں ایک ہی سرچشمہ سے پھوٹتی ہیں لیکن ایک کا اثر دوسری تک سرایت نہیں کرتا۔ نیز اعضاء میں سے ہر ایک اگرچہ جداگانہ فرائض کی انجام دہی کے لئے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کا تعطل باقی سب کی معطلی کا موجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ سرسبز و شاداب باغ میں تشریف لے جائیں۔ جہاں ہر طرح قسم قسم کے میوہ جات سے لدے ہوئے درخت موجود ہوں تو خدانخواستہ اگر ہاتھ یا پاؤں کٹ جائیں کوئی ایک بے کار ہو جائے یا یہ سالم ہوں اور آنکھ اپنا کام نہ کرے تو پورے کا پورا وجود صرف حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے کام میں دوسروں کے سہارے سے مشغول رہتا ہے۔ دیکھئے درد سر والے انسان کو چلنا اور بولنا بلکہ دیکھنا حتیٰ کہ کھانا اور پینا بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ جسم کا کوئی حصہ اگر کسی بیماری کی زد میں آجائے تو وہ باقی پورے جسم کے معطل ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح یقین کیجئے کہ عالم اکبر کے تمام اعضاء اگرچہ الگ الگ فرائض کی بجا آوری پر مامور ہیں۔ لیکن ان میں بھی عالم اصغر کا سا ربط و لگاؤ موجود ہے کہ اگر ایک اپنا کام چھوڑ دے تو پوری کائنات اس سے متاثر ہو کر نظام عالم کی بربادی کی موجب ہو جائے گی۔ گویا وجود عالم کے ایک عنصر کی خرابی پورے عالمی نظام کی خرابی کا سبب ہوگی۔ پس اس حکمت و تدبیر پر غور کرنے کے بعد اس یقین پر پہنچنا بدیہی ہے کہ اس عالم کون کا خالق مدبر واحد و یکتا ہے جس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ ورنہ حکم و مصالح میں اس قدر مضبوطی اور پائیداری مفقود ہوتی اور فسادات کی وجہ سے نظام کی اتم تدبیر بالکل انقص سے بدل کر موت و فنا کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوتی۔ پس عالمی وجود اور اس کے کل لازوال مصالح بذات خود خالق کی قدرت کاملہ اور اس کے لاشریک ہونے کی بولتی ہوئی زبانیں ہیں۔

تعدد کی نفی

اگر ایک خدا کے علاوہ دوسرا بھی اس کا شریک کار ہوتا تو قطع نظر اس سے کہ یہ نظام فساد کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں جا پہنچتا۔ ہم کہتے ہیں دو خدا ماننے کی صورت میں تین شقیں سامنے آتی ہیں۔

① یا تو ہر دو اپنے اپنے مقام پر کامل اور اس نظام اتم کی تخلیق پر پوری طرح قادر ہوں گے
② یا دونوں انفرادی حیثیت سے ناقص ہوں گے۔

③ یا ایک کامل اور دوسرا ناقص ہوگا اور ناقص کامل کا ممد و معاون ہوگا

اور یہ تینوں شقیں باطل ہیں۔ پہلی اس لئے کہ اگر وہ دونوں اپنے اپنے مقام پر کامل ہوں تو ان میں سے ہر ایک کا نظام الگ الگ ہونا چاہیئے۔ پس ایک نظام کا ہونا ایک خدا کے وجود کا پتہ دیتا ہے اور دوسری شق اس لئے باطل ہے کہ دو ناقص مل کر ایک کامل نظام کے خالق نہیں بن سکتے کیونکہ ناقصوں کی اجتماعی مساعی میں نقص کا اضافہ ہوگا نہ کہ ان میں کمال پیدا ہوگا۔ علاوہ ازیں ناقص خالق و مدبر نہیں بن سکتا۔ پس خدا ایک کامل ذات کا نام ہے جس کا کارنامہ یہ نظامِ اکمل سامنے موجود ہے اور تیسری صورت بھی باطل ہے کیونکہ خدا تو وہی ہوگا جو کامل ہے اور اسے ناقص سے اگر امداد لینے کی احتیاج ہو تو وہ کامل نہ رہے گا۔ پس اس تقریب سے شریک باری عزاسمہٗ کی نفی ہو گئی۔

اللہ سبحانہٗ نے اپنے کلامِ بلاغت نظام میں بار بار اپنی توحید کا اعلان فرمایا اور سب کے سب انبیاء بھی اسی ایک خدا کی جانب سے مبعوث ہوئے اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی اپنی طرف سے کوئی نمائندہ بھیجتا۔ بہرکیف شریک باری کا تصور صرف عقل کے اندھے اور دانش و خرد سے کورے ہی کر سکتے ہیں ورنہ کوئی صاحبِ فکر و نظر تعددِ آلہہ کا قائل ہو سکتا ہی نہیں کیونکہ کتابِ نفسی اور کتابِ آفاقی کا مطالعہ اسی سلسلہ میں ہر دلیل سے بے نیاز کر دیتا ہے اور خداوندِ قدوس نے عقل و فطرت کے اس واضح ترین مسئلہ کو صرف تائید و ارشاد کے طور پر مختصر لفظوں میں اس طرح بیان فرمایا کہ ہر کس و ناکس کے ذہن میں آسانی سے سما سکے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا :- لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ___ یعنی اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے علاوہ کوئی اور خدا بھی ہوتے تو ان کے باہمی اختلاف کی وجہ سے عالم علوی و سفلی کا نظام ٹکرا کر ختم ہو جاتا۔

ایک آسان دلیل

اگر واجب الوجود ایک سے زیادہ مثلاً دو یا تین ہوں۔ تو وجوب کی صفت میں دونو شریک ہوں گے۔ پس ایک دوسرے سے امتیاز کے لئے ہر ایک میں جداگانہ صفت کا وجود ضروری ہے۔ پس ہر واجب دو صفتوں کا مرکب بن جائے گا۔ ایک وجود اور دوسری وہ صفت جس کی بدولت اسے امتیاز نصیب ہوا۔ اور واجب الوجود کا مرکب ہونا باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ مرکب کے لئے فاعل ضروری ہے جس نے ترکیب دی ہو۔ پس یہ حادث ہوں گے۔

اور وہ قدیم ہوگا جس نے ان کو ترکیب دی پھر اس کے متعلق سوال ہوگا کہ ایک ہے یا متعدد اور اسی طرح آگے بڑھتے ہوئے یا تو سلسلہ لامتناہی چلے گا جو محال ہے اور یا ماننا پڑے گا کہ فاعل ایک ہے جو واجب الوجود ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ مرکب کو احتیاج لازم ہے اور جو محتاج ہو وہ واجب نہیں ہوسکتا اور ثالثاً اس لئے کہ مرکب کے لئے حدوث ضروری ہے اور حادث واجب نہیں ہوسکتا پس ماننا پڑے گا کہ واجب الوجود صرف ایک ہی ہے۔

اس دلیل کی ادائیگی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اگر واجب دو ہوں تو دونو قدیم یا ایک قدیم اور دوسرا حادث ہوگا اور چونکہ حادث تو خدا ہو نہیں سکتا پس خدا وہی ہے جو قدیم ہو اور دونو کے قدیم ہونے کی صورت میں دونوں کے درمیان ایک حد فاصل ہوگی وہ بھی قدیم ہوگی۔ پس دو کی بجائے تین قدیم بن جائیں گے پھر ان تینوں کے درمیان دو حدیں۔ جو ان دونو کے درمیان حائل ہوں ماننی پڑیں گی۔ پس تین کی بجائے پانچ قدیم بن جائیں گے اور پانچ ہونے کی صورت میں چار حد دو کو ملا کر نو قدیم ماننے پڑیں گے۔ اور یہ سلسلہ غیر متناہی چلا جائے گا۔ پس ماننا پڑتا ہے کہ خدا واجب الوجود جو تمام صفات کمال کا جامع ہے وہ صرف ایک ہے اور تمام عالم اکوان کی انتہا اسی کی ذات تک ہے اور وہی سب کا مبداء اول اور موجد قادر ہے اور وہی اس ساری کائنات کے نظام اتم واکمل کا مدبر و ناظر ہے اور اسی ایک کی طرف تمام کی بازگشت ہے۔ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۔ پس افہام وتفہیم اور ایمان و ایقان کے لئے اتنا بیان ہی کافی ووافی ہے۔ اس سے زیادہ طول صرف طول کا باعث ہی ہوگا۔

مزید وضاحت جب یہ ثابت ہوگیا کہ پورے عالم کی تخلیق و تدبیر میں خدا کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے تو یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ وہ تمام امور تکوینیہ جن کے متعلق خداوند کریم نے متعدد مقامات پر شرک کرنے والوں کو چیلنج کیا ہے ان کی انجام دہی میں کسی کو خدا کا شریک نہیں قرار دیا جاسکتا نہ بالذات اور نہ بالعرض۔ شریک بالذات کی نفی تو دلیل توحید میں کی جاچکی ہے کہ ایجاد عالم اور اس کے نظام اتم واکمل میں وہ یکا و تنہا ہے اور شریک بالعرض کا یہ مطلب ہے کہ ادلہ توحید سے خدا کی وحدانیت ثابت کرنے کے بعد یہ کہنا کہ خدا نے کسی کو اپنا

نائب بنا کر امور تکوینیہ انجام دیئے ہیں یہ عقیدہ بھی شرک ہے اور قرآنی آیات صریحی طور پر اس کی نفی کر رہی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ نے خداداد اختیار کی بدولت آسمان و زمین و جملہ کائنات کو خلق فرمایا یعنی خدا نے ان کو بنایا اور انہوں نے سب کائنات بنائی کفر اور شرک ہے۔

بہرکیف عقیدہ قرآنی یہ ہے کہ خلق رزق موت حیات تدبیر امور، تصویر فی فی الارحام، ہواؤں کا چلانا۔ بارش کا برسانا وغیرہ جس قدر امور تکوینیہ ہیں ان میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور قرآن مجید میں خداوند کریم نے ان کا متعدد مقامات پر صریحی تذکرہ فرمایا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ پ۲۱ سورہ روم ع ۷ ۔ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر رزق دیا پھر تم کو مارے گا پھر زندہ کرے گا۔ پھر فرمایا کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو یہ کام کر دکھائے اور اس کے بعد ایسا عقیدہ رکھنے والوں کو مشرک کہہ دیا چنانچہ فرمایا وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ یہ صفات کسی اور میں ثابت کرتے ہیں وہ مشرک ہیں اور اللہ اس سے اجل و ارفع ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ نیز فرماتا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ الآیہ سورہ یونس آیت ۲ پھر وہ عرش پر متمکن ہے اور نظام کی تدبیر کرتا ہے نیز فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِىْ يُصَوِّرُكُمْ فِى الْاَرْحَامِ الآیہ (سورہ آل عمران) وہ وہی ہے جس نے شکم مادر میں تمہاری تصویر کشی کی اسی طرح تمام وہ اُمور جو خلقت عالم اور اس کی تدبیر سے متعلق ہیں چنانچہ فرماتا ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ الآیہ کہ مخلوق کا پیدا کرنا اور اس کے نظام و تدبیر کا معاملہ اُسی کی ذات سے ہی مختص ہے تو قرآن کے ان صریحی فرامین سے روگردانی کرکے عقیدہ کی بنیاد ایسی روایات پر رکھنا جو نہ سند کے لحاظ سے درست ہوں نہ نقل کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہوں اور نہ مضمون و معنی کے لحاظ سے قابلِ تسلیم ہوں انتہائی ظلم اور ناخدا ترسی ہے۔

نیز یہ امور جن کے متعلق ہمارے عوام کو ناخواندہ یا نیم خواندہ اہلِ منبر نے دھوکے میں ڈالا ہوا ہے ان کے متعلق مشرکین مکّہ کو بھی شک نہ تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں بطور

سوال وجواب حکایۃ ان باتوں کا تذکرہ موجود ہے کہ اہلِ مکہ کو ان کے متعلق خدا کی الوہیت کا اعتراف ہے بہرکیف بے راہ روی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو آخری فیصل بنایا جائے اور اسی پر ہی عقیدہ کی بنیاد کو استوار کیا جائے۔

عقیدۂ تفویض عقیدۂ توحید کے منافی ہے

پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ تفویض کے عقیدہ کی تین صورتیں ہیں۔

① خداوند کریم نے حضرت محمدؐ مصطفےٰ اور آئمہ طاہرینؑ علیہم السلام کو خلق فرمایا اور پھر ان کو باقی مخلوق کے پیدا کرنے رزق دینے اور ان کی موت وحیات کا کلی اختیار دے دیا۔ پس یہی سب کام کرتے ہیں اور اللہ کا ان افعال سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

② خداوند کریم نے محمدؐ وآلِ محمدؐ علیہم السلام کو پیدا کرنے کے بعد ان کو باقی مخلوق کے خلق ورزق کا جزوی اختیار دیا کہ کسی کو وہ خود پیدا کرتا ہے اور کسی کو یہ پیدا کر دیتے ہیں کبھی وہ رزق دے دیتا ہے اور کبھی یہ رزق دیتے ہیں نہ ان کے کام کو وہ روک سکتا ہے اور نہ اس کے کام کو یہ روک سکتے ہیں۔ وہ بھی جو چاہتا ہے کرتا ہے اور یہ بھی جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

③ خداوند کریم کا محمدؐ وآلِ محمدؐ کو خلق ورزق وغیرہ امور کا اختیار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان کے ذمہ ایک ڈیوٹی سپرد فرمائی ہے۔ جس طرح بادلوں بارشوں سبزیوں انگوریوں ہواؤں اور دریاؤں وغیرہ میں ملائکہ کی الگ الگ ڈیوٹی ہے اور یہ چونکہ ملائکہ سے افضل ہیں۔ لہٰذا ملائکہ کے سپرد شدہ تمام امور ان کے زیر نگیں ہیں اور ملائکہ ان کے حکم سے سارے کام سرانجام دیتے ہیں اور چونکہ اللہ نے ہی ان کو یہ عہدہ عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ان کے کام کو اللہ کی طرف بھی منسوب کیا جاسکتا ہے درحقیقت کرتے فرشتے ہیں اور کرواتے یہ ہیں اور جس خدا نے ان کو یہ اختیار دیا ہے وہ خود فارغ نہیں بلکہ اصلی اختیار اس کا ہے اگر وہ ان سے اختیار واپس لے لے تو اس کے لئے کوئی ممانعت ورو کاوٹ نہیں وہ ان کا محتاج نہیں۔ بلکہ یہ اس کے محتاج ہیں اور اس کے عابد وشاکر عبد ہیں۔

پہلی صورت کفر و شرک ہے اور دلیل توحید کے بالکل منافی ہے خداوند کریم کا خلق میں کوئی شریک نہیں اور نہ اس نے کسی کو اپنا شریک بنایا ہے۔

دوسری صورت یہ بھی شرک محض اور کفر صریح ہے آئمہ طاہرین علیہم السلام خود بھی اس قسم کے مشرکانہ عقائد سے بری و بیزار ہیں۔

تیسری صورت یہ عقیدہ محمدؐ و آل محمدؐ کے اصلی مقام کو نہ پہچاننے کا نتیجہ ہے اور ان کا ملائکہ سے افضل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ امور تکوینیہ میں سربراہ مملکت الٰہیہ ہیں نہ اس پر کوئی حدیث صحیح ناطق ہے اور نہ قرآن مجید کی کوئی آیت اس مطلب کی تائید کرتی ہے اور اس قسم کا عقیدہ اگرچہ موجب شرک تو قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ یہ باعث کفر ہے لیکن دلیل قطعی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے بے بنیاد ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

نظامِ تکوین اور نظامِ تشریع چونکہ مملکت کلیہ الٰہیہ میں خالق کائنات کی جانب سے دو نظام ہمیشہ سے جاری و ساری ہیں ایک نظام تکوین (جیسے خلق رزق موت و حیات اور موجودات میں رونما ہونے والے تمام کلی و جزئی حوادث و واقعات) اور دوسرا نظام تشریع جو صرف ذوی العقول اور اولی الالباب طبقہ کے لئے فلاح تمدن اصلاح معاشرہ ارتقاء نفس اور نجات اُخروی کے لئے تشکیل کیا گیا ہے ان ہر دو نظام کا سربراہ اعلیٰ اور مختار کل خالق کائنات و مدبر عالم جل شانہٗ ہے اور اس کی تقسیم کار کا طریقہ یہ ہے کہ تکوینی امور کی انجام دہی کے لئے اس نے ملائکہ مقربین کو مقرر کیا ہے ہواؤں کا چلانا بادلوں کا بنانا۔ درختوں و دیگر نباتات کی نشو و نما اور ان کی حفاظت۔ حیوانوں و انسانوں کی خدمات بارشوں کا برسانا۔ دریاؤں و سمندروں اور ان میں بسنے والی مخلوق کی نگہداشت غرضیکہ کلی و جزئی تمام امور تکوینیہ (خواہ عالم علوی سے متعلق ہوں یا عالم سفلی سے ان کا تعلق ہو) کی تنظیم و تدبیر ان کے ذمہ ہے اور وہ اللہ کے حکم و ارادہ اور اس کی مشیت و مصلحت کے ماتحت ان تمام امور کی انجام دہی میں مصروف کار ہیں اور یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ کے مصداق ہیں۔ اور تشریعی معاملہ کو اس نے انبیاء و مرسلین یا ان کے اوصیا سے

طاہرین علیہم السلام کے سپرد فرمایا ہے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اس سنے اسی مطلب کے لئے مبعوث فرمائے جنہوں نے اپنی اپنی حیثیت سے اپنے اپنے زمانہ میں اپنے کام کو باحسن طریق انجام دیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے ہر کسنے والی مصیبت کا سینہ تن کر مقابلہ کرتے ہوئے حکم پروردگار کو پہنچانے میں عزم صمیم سے کام لیا اور سب کے آخر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے جو ان سب کے سلطان وسید تھے اور نظام تشریع میں ان سب سے افضل وبرتر اور ان کا حلقہ تبلیغ ایک یا دو قومیں نہیں بلکہ پورے عالم کو قرار دیا گیا۔ پس اس نظام میں آپ سید الانبیاء والمرسلین اور سلطان الاوّلین والآخرین تھے جس طرح نظام تکوین میں حضرت جبرئیل سید الملائکۃ المقربین ہیں۔

نظام تشریعی میں تفویض

چونکہ حضرت سید الانبیاء جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام انبیاء ومرسلین سے افضل واشرف ہیں اور ان کا دائرہ نبوت سب سے وسیع تر اور ہمہ گیر ہے اور کبھی منشاء پروردگار کے خلاف ان سے کوئی قول یا فعل سرزد نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان کے قول وفعل کو پروردگار نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا۔ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی پارہ ۲۷ النجم۔ میرا رسول اپنی مرضی سے کلام نہیں کرتا وہ جو کچھ بولتا ہے میری وحی ہی ہوا کرتی ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی الآیہ ترجمہ:۔ اور جو تو نے تیر مارا تھا وہ تو نے نہیں بلکہ اللہ نے مارا تھا۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ الآیہ بیعت کے وقت ان کے ہاتھوں پر نبی کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ فرمایا اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اور حضرت علیؑ سے لے کر حضرت قائم علیہ السلام تک تمام آئمہ حضورؐ کے صحیح قائم مقام ہیں اس کی مثال یوں سمجھئے جس طرح ایک آقا اپنے عبد خاص کو جو اس کا پورا مطیع وفرمانبردار ہو اپنے غلاموں پر حاکم بنا دیا کرتا ہے اور اپنے تمام اوامر ونواہی اس کے سپرد کر دیا کرتا ہے۔ پس جناب رب العزت نے محمدؐ وآلِ محمدؐ کو نظام تشریعی میں اپنے تمام بندوں پر حاکم اعلیٰ مقرر فرما کر امور شرعیہ کو ان کے سپرد فرما دیا۔ چنانچہ فرمایا۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔

جس کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان چاہے کہ میں اللہ کا محب و محبوب ہو جاؤں اور خدا مجھے اپنا مقرب بنالے تو اس پر واجب ہے کہ حضرت رسالتمآب محمد مصطفیٰؐ کی اتباع و اطاعت کو شعار بنائے۔ نیز ارشاد فرمایا:۔ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ یعنی تم کو جو رسول دے دے لو اور جس سے تم کو رسولؐ روکے رک جاؤ علاوہ ازیں دیگر آیاتِ بیّنات بھی ہیں جن سے یہی مفہوم نکل سکتا ہے۔ پس اوامر و نواہی میں ان کا حکم شریعت ہے اور ان کا فرمان دین ہے جو ان کے حکم کی اطاعت کرے گا وہی دین دار کہلانے کا حقدار ہوگا اور جو ان کے فرمان سے سرتابی کرے گا وہ بے دین ہوگا خداوند عالم کے صریحی حکم کے بعد اثباتِ مقصد کے لئے کسی حدیث کو پیش کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا البتہ تقویہ ایمان یا تشحیذ اذہان کے لئے بطور تائید مطلب کے صرف ایک روایت ہی کافی ہے جو بحوالہ تحفہ کشف الغمہ بروایت جابر بن عبداللہ انصاری جناب رسالتمآب سے منقول ہے:۔ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ثُمَّ دَعَاهُنَّ فَاَجَبْنَ فَعَرَضَ عَلَيْهِنَّ نُبُوَّتِيْ وَوِلَايَةَ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَبِلْنَهُمَا ثُمَّ خَلَقَ الْخَلْقَ وَفَوَّضَ اِلَيْنَا اَمْرَ الدِّيْنِ فَالسَّعِيْدُ مَنْ سَعِدَ بِنَا وَالشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ بِنَا نَحْنُ الْمُحِلُّوْنَ لِحَلَالِهٖ وَالْمُحَرِّمُوْنَ لِحَرَامِهٖ۔ ترجمہ:۔ اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ پھر ان کو اپنی اطاعت کی کی طرف بلایا تو انہوں نے قبول کیا۔ پس ان پر میری نبوت اور علیؑ بن ابی طالب کی ولایت کو پیش کیا تو انہوں نے قبول کیا۔ پھر باقی مخلوق کو پیدا کیا اور دین کا معاملہ اس نے ہمارے سپرد کیا ہے پس نیک بخت وہی ہے جو ہماری وجہ سے نیک بخت ہو اور بد بخت وہ ہے جو ہماری وجہ سے بد بخت ہو۔ ہم ہی اس کے حلال کو حلال کہنے والے ہیں اور ہم ہی اس کے حرام کو حرام کہنے والے ہیں جب دلیلِ عقل و نقل سے ثابت ہو گیا کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ دینی و شرعی معاملہ میں مختارِ کل ہیں۔ تو جس کو یہ حلال کہیں گے وہ حلال ہوگا اور جس کو یہ حرام کہیں گے وہ حرام ہوگا۔

محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کی محبت کا دم بھرنے والوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ سوچیں کہ قرآن مجید نے ان کی جس تفویض کا اعلان فرمایا ہے اس سے ہم نے کیا تاش کیا ہے؟ نظامِ تکوینی اضطراری نظام ہے جس کے متعلق خدا فرماتا ہے۔ اِذَآ اَرَادَ

شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ کہ جب وہ کسی شے کے متعلق ارادہ فرماتا ہے تو اس کے کُن کہنے سے شے ہو جاتی ہے یعنی اس کے ارادہ سے چیز کتمِ عدم سے منصۂ وجود میں قدم رکھ دیا کرتی ہے لیکن نظامِ تشریع ایک اختیاری نظام ہے جس کے متعلق ارشادِ قدرت ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی دین میں کسی کے لئے زبردستی نہیں ہے۔ ہاں جو لوگ اپنے اختیاری افعال کو شرعی قیود سے آزاد کرانے کے درپے ہوتے ہیں وہ ادھر ادھر کی باتوں میں الجھانے کی سوچتے ہیں اور عوام کو فریب خوردہ کرکے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ تاکہ آلِ محمد کی سیرت و کردار جو دین کی دعوت کا اتم و اکمل طریقہ ہے اس کے سامنے ہمیں جھکنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اضطراری نظام کو آلِ محمدؐ کے سپرد کرنے کے بجائے ذرا ان کے اختیاری نظام کے آئینے میں اپنے کردار کا جائزہ تو لے لیں کہ ہم سے وہ کیا چاہتے ہیں اور ہم کیا کچھ کر رہے ہیں؟ بہرکیف نظامِ تکوین مثلاً خلق و رزق کے معاملہ میں اگر قرآن مجید کی آیات واضحات کی تلاوت کی جائے تو اس کے مقابلہ میں انتہائی ضعیف روایات کا سہارا لینا معقول نہیں ہے جبکہ قرآن مجید کی آیات کے خلاف جو روایت بھی بزبانِ آئمہ وہ دیوار پر مارنے کے قابل ہے نہ کہ اس کو عقیدہ کی اساس قرار دیا جائے) اور یہ انتہائی ایمانی کمزوری ہے کہ جب سیرت و کردار اور صورت و عمل کے متعلق آئمہ کا صحیح فرمان و عمل نقل کیا جائے مثلاً کسی ریش تراش سے کہا جائے کہ داڑھی منڈوانا حرام ہے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کا بھی عمل یہی تھا تو فوراً قرآن مجید سے اس کا ثبوت طلب کیا جاتا ہے۔ دیکھئے جہاں معاملہ بالکل ان کے سپرد ہے۔ وہاں ان کے فرمان سے تسلی نہیں اور نہ ان کا عمل کافی ہے بلکہ آیت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جہاں خدا و رسول و آئمہ سب متفق ہیں کہ امورِ تکوینیہ میں سوائے اللہ کے کسی کا کوئی دخل نہیں اور قرآن کی تصریحات بھی موجود ہیں۔ وہاں روایت کو عقیدہ کا سہارا بنا لیا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ جہاں کرنا کچھ نہیں پڑتا صرف زبانی جادو سے کام نکلتا ہے۔ وہاں قرآن کی پرواہ نہیں اور جہاں عمل کرنا پڑتا ہے وہاں آئمہ کے فرمان سے جان چھڑانے کا بہانہ تلاش کرتے ہوئے قرآن کا سہارا لیا جاتا ہے (کہ داڑھی قرآن میں کہاں ہے؟)

انسان کا وجود پورے عالمِ تکوین کا خلاصہ ہے

اگر نظرِ غائر سے انسانی وجود کو دیکھا جائے تو

اس میں عالمِ اکبر کا تمام علوی و سفلی نظام موجود ہے۔ سر عالمِ علوی کی مثال اور باقی جسم عالمِ سفلی کا نمونہ ہے۔ سر میں ہڈیاں پردے اور جھلیاں طبقاتِ سماویہ کی مثل ہیں، اس میں دماغ عرش کی مثال ہے اور دیگر قوائے باطنہ عاقلہ متخیلہ حافظہ متفکرہ اور مدبرہ وغیرہ ملائکہ کی مانند ہیں بے حساب بال ستاروں کی طرح دو آنکھیں شمس و قمر دونوں کان قطبین آنسو بارش اور ہنسا بجلی کی چمک کی طرح ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔ باقی جسم میں چمڑا زمین بال نباتات اور خون کی نالیاں دریاؤں اور نہروں کی مانند ہڈیاں پہاڑوں کی طرح شکم سمندر کی مثل اور دل کعبۃ اللہ کی مانند ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔

اس کی تکوین و ترتیب میں دو جز علوی آگ و ہوا اور دو جز سفلی مٹی اور پانی ہیں۔ اس میں چار کیفیتیں ہیں (خشکی تری گرمی اور سردی) جو انہی اجزاء کا لازمہ ہیں جو اس میں موجود ہیں۔ نیز چار اخلاط دم صفرا بلغم اور سوداء بھی انہی اجزاء کی جداگانہ کیفیات کی بناء پر اس کو لازم ہیں اور عالمِ اکبر کے اندر کوئی شیٔ ایسی نہیں جس کے خواص و اثرات انسان کے اندر موجود نہ ہوں۔ پس چونکہ متضاد اجزاء اس کے خمیر میں داخل ہیں اور متضاد کیفیتیں اور متضاد امزجہ اس میں کارفرما ہیں۔ لہٰذا طبعی و فطری طور پر کائناتِ عالم میں ہونے والے متضاد افعال کا جسمِ انسانی مظہر ہے۔

پس غصہ، حوصلہ، غضب، رحم، شہوت و خواہش ضبط و صبر، بیماری، تندرستی، خوبصورتی، بدصورتی، جذبات، تدبر، تفکر، شجاعت و سخاوت، بزدلی و بخل، گرم مزاجی تلخی جوشش، سوچ سمجھ، درندگی ظلم کرم بے حیائی شرم، محبت، نفرت، تکبر، تواضع، سچ، جھوٹ، ضد، تسلیم، اطاعت، نافرمانی، ذکاوت، غباوت، طہارت، نجاست، امانت، خیانت، صیانت، نجابت، مکر فریب، دھوکا، حسد، بغض، کینہ، نخوت، غرور، جلدبازی، عیاری، ہوشیاری، غیبت، سطوت، اعیاشی، طاقت، کمزوری، مروت، سعادت، شقاوت، برتری، خودداری، ریاکاری، شماتت، ضرر رسانی، احسان، عدل انصاف اور حرکت و سکون اور وضع وغیرہ بے حد و حساب عادات و اطوار و خواص و اثرات ہیں جن کا ذاتِ انسانی سے ظہور ہوتا ہے۔

اسباب و علل کی کارستانیاں

ہر ذی ہوش اچھی طرح جانتا ہے کہ خداوندِ قدوس نے عالمی وجود کو اسباب

علل کا مرہونِ منت بنایا ہے اور اس کی تمام تر حرکات و سکنات لمحہ بہ لمحہ اور لحظہ بلحظہ سبب و علت یا مُسَبَّب و معلول کی حیثیت سے معرضِ ظہور میں نمودار ہوتی ہیں کوئی شیٔ اگر کسی کی سبب ہے تو کسی کی مسبب بھی ضرور ہے اسی طرح اگر کوئی شیٔ کسی کی علت ہے تو کسی اور کی معلول بھی ضرور ہے اگر ایک شیٔ کسی کا مبداء ہے تو کوئی دوسری شیٔ اس کا مبداء بھی ماننی پڑتی ہے یہاں تک کہ انتہا ایک ایسی علت سبب اور مبداء تک ہوتی ہے جو تمام کا مبداء المبادی ہے اور اس کا مبداء کوئی نہیں اور وہ اللہ واحد ہے اور وہی واجب الوجود ہے اور وہی تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے۔

چونکہ یہ بات مسلم ہے کہ ہر معلول اپنی علت سے اس کے مناسب اثرات لے کر جنم لیتا ہے اور ہر مُسَبَّب اپنے سبب سے اس کے مزاج کے مطابق خواص کا حامل ہوتا ہے لہٰذا انسان تکوینی طور پر چونکہ ایسے مبادی کا مرہونِ منت ہے جو صفات و اخلاط متضادہ کے حامل ہیں۔ لہٰذا انسان کے اندر اس تضاد کا ظہور ضروری ہے پس جسمِ انسانی میں اس تضاد کو کنٹرول کرنے کے لئے خداوند کریم نے اس کے اندر ایک ایسی قوت رکھی ہے جو اس کے توازن کو قائم رکھے۔ خواہ اسے طبیعت سے تعبیر کیا جائے۔ یا اس کا نام حرارتِ غریزیہ رکھا جائے اور کسی غذا کی نامناسبت یا آب و ہوا کی ناموزونیت جب متضاد اخلاط میں سے کسی کو کمزور کر دے یا کسی کو طاقت ور بنا دے تو فوراً جنگ چھڑ جاتی ہے اور وجودِ انسانی کی پوری کائنات اس سے متاثر ہو کر بیماری کے گڑھے میں جا گرتی ہے۔ بعض اوقات خود طبیعت یا حرارتِ غریزیہ اندر ہی اندر اس کی مناسب اصلاح کر کے معاملہ کو رفع دفع کر دیتی ہے اور بعض اوقات جب فساد کے بڑھنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو بیرونی امداد کی ضرورت لاحق ہوتی ہے پس مناسب دوا یا علاج سے مزاج میں توازن پیدا کر کے انسانی وجود کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ لیکن جب اخلاط کا بگاڑ حد سے بڑھ جائے تو ایسی صورت میں نہ طبیعت کا چارہ لگتا ہے اور نہ بیرونی امداد فائدہ دے سکتی ہے۔ پس نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان موت کی آغوش میں جا آرام کرتا ہے۔

جب ایک انسان کی انفرادی طور پر یہ حالت ہے تو تمام انسانی افراد بھی تو انہی موادِ متضادہ ہی کی پیداوار ہیں اور بمطابق مضمونِ روایت۔ اس کی تخلیق کے لئے

فرشتے نے نرم سخت سیاہ و سفید ہر قسم کی مٹی کو جمع کیا تھا اور آگ، پانی اور ہوا کی آمیزش نے اس میں متضاد کیفیات پیدا کر دیں۔ پس اس کی کثرت مجموعی طور پر ان ہی اثرات کی حامل ہے جو اس کے افراد کی فطرت میں شامل تھے۔

جب انفرادی طور پر ایک انسان کے وجود میں بعض اسباب و ذرائع کی وجہ سے اخلاط و امزجہ کی ٹکر ہوتی ہے تو ناممکن ہے کہ مجموعی طور پر سب انسانوں میں صفاتِ متضادہ ہوں بھی اور ٹکراؤ بھی نہ ہو۔ پس اسی ٹکراؤ کی روک تھام کے لئے اللہ نے دین بھیجا جس کی تبلیغ کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے تاکہ انسانوں کو متوازن زندگی کی دعوت دے کر ان کو باہمی تصادم سے بچائیں اور ان کو ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے بجائے دائمی فلاح و نجات کا راستہ دکھائیں۔

یاد رکھئے انسان کی چھوٹی سی کائنات میں تکوین و تشریع کے نظام رائج ہیں۔ اس کے ظاہری و باطنی اعضاء و اجزاء کی خلقت ان کی خاصیات و کیفیات اور ان کے فطری اثرات و نتائج دل و دماغ اور ان کے قوائے محرکہ و متحرکہ حواس خمسۂ باطنہ و ظاہرہ اور ان کے مخصوص فطری اعمال و آثار وغیرہ یہ سب تکوینی ہے اور اس میں انسان بے بس و مجبور محض ہے اور یہ سب چیزیں اپنے مبادی سے معرضِ ظہور میں آئیں جن کی انتہاء مبداءِ فیض ذاتِ واجب الوجود ہے اس کے بعد انسان کا خیر و شر کی طرف قدم بڑھانا اچھائی اور برائی کو اختیار کرنا اور شرافت یا رذالت کی طرف جھکنا وغیرہ تمام صفاتِ اختیاریہ ہیں۔ جو نظام تشریعی کی محتاج ہیں۔

تکوین کے لحاظ سے جسمِ انسانی میں بڑے بڑے کارخانے موجود ہیں اور قوائے باطنہ میں سے ہر ایک اپنے اپنے متعلقہ کارخانہ کا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ مثلاً قوتِ شامہ ناک کے ذریعے خوشبو یا بدبو کی رپورٹ حسِ مشترک تک پہنچاتی ہے۔ قوتِ باصرہ رنگوں اور شکلوں کا فوٹو پیش کرتی ہے قوتِ سامعہ آوازوں کی کیفیات نقل کرتی ہے۔ قوتِ ذائقہ چکھنے کے قابل اشیاء کی اچھائی یا برائی معلوم کرنے کا راستہ ہے اور قوتِ لامسہ سردی گرمی اور سختی و نرمی کی تحقیق پر مامور ہے یہ تو ظاہری قوتوں کے کرشمے ہیں ذرا اندر جھانک کر دیکھئے۔ قوتِ غاذیہ غذا کی بہم رسانی کا کام کرتی ہے قوتِ نامیہ جسم میں ارتقائی جذبہ بڑھاتی ہے قوتِ ماسکہ غذا کو محفوظ کرنے پر مامور ہے قوتِ ہاضمہ غذا کو ہضم کر کے اسے

جزو بدن بنانے کی کفیل ہے قوتِ جاذبہ اپنے مناسب اجزاء کو جذب کرکے جزوِ بدن بناتی ہے اور قوتِ دافعہ فضلات اور غیر ضروری حصہ غذا کو انتڑیوں کے ذریعے نکال پھینکنے کی ضامن ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس اور ان قوتوں میں سے جس کا کام معطل یا مخدوش ہو جائے وہ سب کارخانہ جسم کو معطل یا مخدوش بنا دیتا ہے یہ ہے بدن کا نظامِ تکوین جو اضطرار پر مبنی ہے کہ ہر قوت مجبوراً اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونے پر مامور ہے۔

یہاں تک یہ واضح ہو گیا کہ

تشریعی نظام تکوینی نظام سے اشرف و افضل ہے

بدنِ انسان عالمِ اکبر کا خلاصہ و نچوڑ ہے جس طرح عالمِ اکبر میں دو نظامِ تکوینی و تشریعی رائج ہیں اسی طرح عالمِ اصغر (بدنِ انسانی) میں بھی دو نظام جاری و ساری ہیں۔ بے شک عالمِ اکبر کی وسعتوں بلندیوں اور پستیوں میں خالقِ اکبر کی جانب سے قائم کئے جانے والے بے حد و حساب کارخانہ جات میں اس کے ملائکہ کام کر رہے ہیں اور بلا کمی بیشی ایک پائیدار و لازوال نظام کے ماتحت ہر کارخانہ دار اپنے کارخانے کا کام چلا رہا ہے کوئی ہوا چلاتا ہے کوئی بادل بناتا ہے کوئی بارش پر مامور ہے کوئی سبزیاں اگاتا ہے کوئی دریاؤں، پہاڑوں وادیوں اور غاروں میں مصروفِ کار ہے کوئی صرف تسبیح و تقدیس پروردگار پر مامور ہے اور انہی سے عالمِ اکبر کا تکوینی نظام اپنے اسباب و علل کے ماتحت باحسن وجوہ چل رہا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا کہ میں نے زمین کا سارا نظام تمہارے لئے ہی پیدا کیا ہے اور قرآن مجید کے مفصل مطالعہ سے آپ کو پتہ چلے گا کہ نظامِ تکوین سب انسان ہی کی خاطر ہے زمین اور اس کی آبادیاں پہاڑ اور اس کے دامن میں چھپے ہوئے بیش بہا خزانے سمندر اور اس کے تہ نشین موتی و جواہر ہوا بادل آگ بجلی اور آسمانی مخلوق چاند سورج ستارے حتاکہ محکمہ جات قدرت کی تمام سرگرمیاں انسان کی خاطر ہی معرضِ وجود میں آئی ہیں اور ظاہر ہے کہ غرض مبادی سے اشرف و اعلیٰ ہوا کرتی ہے چونکہ یہ انسان تمام موجوداتِ عالم کا غرضِ تخلیق ہے۔ پس اشرف المخلوقات و اکرم الموجودات ہے اور چونکہ وہ مبادیٔ متضادہ و مواد متحاربہ اخلاطِ متخالفہ اور امزجۂ متباینہ سے علل و ذرائع کے گوناگوں انقلابات تصرفات اور تطورات کے بعد

اوصافِ متضادہ اور حرکات و سکناتِ مختلفہ کا مظہر بن کر آیا ہے جس میں عالم علوی اور
عالم سفلی کے ملے جلے اثرات موجود ہیں۔ پس ان کو تصادم و تحارب سے بچانے اور
ان کے تمدّن کو برقرار رکھنے کے لئے جس نظام کی ضرورت ہے وہ اس تکوینی نظام سے
بدرجہا افضل و اشرف ہوگا کیونکہ وہ نظام تکمیل و تقسیم کے بعد وجود انسانی کا مقدمہ ہے۔
پس انسان کی بقاء و ارتقاء تکوینی نظام کی غایتِ تصوئی ہے تو لامحالہ وہ اشرف و ارفع ہے
کیونکہ حکیم کی شان سے بعید ہے کہ ناقص کو کامل کی غرض قرار دے اور اخس کو اشرف
کا مقصود بنائے اور انسانی بقاء و ارتقاء کے لئے جو نظام قائم کیا گیا ہے وہ ہے نظامِ
تشریعی نیز تکوینی نظام اضطراری ہے اور تشریعی نظام اختیاری ہے اور نظامِ اختیاری
نظامِ اضطراری سے بدرجہا افضل و اشرف ہوا کرتا ہے۔

جس طرح بدنِ انسان میں تکوینی نظام یعنی اصلاحِ بدن کا نظام انسان کے اختیاری
افعال کی بجا آوری کا مقدمہ ہے اور نظامِ تشریعی میں عقل کو خیر کی طرف اقدام کرنے کا مبلغ
و داعی قرار دیا گیا ہے اور اسی کو شریعت نے رسولِ باطن کا لقب دیا ہے اسی طرح
عالم اکبر میں تشریعی نظام انبیاء کے سپرد کیا گیا ہے اور حضرت سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ ص
اور اس کے جانشین آئمہ طاہرین علیہم السلام پوری کائنات میں نظام تشریعی کے علمبردار
اور ناظمِ اعلیٰ ہیں نیز جس طرح نظامِ تشریعی نظام تکوینی سے افضل و اشرف ہے اسی طرح
نظام تشریعی کے عہدہ دار نظامِ تکوینی کے عہدہ داروں سے افضل و اشرف ہیں پس جس
طرح بدنِ انسان میں عقل باقی جسمانی قوی سے افضل ہے اسی طرح عالم اکبر میں نبی ملائکہ
سے افضل ہیں اور تمام نبیوں کا سلطان تمام کائنات کے جزوی و کلی کارخانہ دار و عبادت گذار
ملائکہ مقربین قدسیین و کروبیین سے بدرجہا اشرف و ارفع ہیں حتاکہ نظامِ تکوین کے تمام
ملائکہ کا سلطان سیّدالملائکہ حضرت جبرئیل نظام تشریع کے سلطان سیدالانبیاء کا غلام
ہے لیکن یہ یاد رہے کہ نظام تکوین اگرچہ ملائکہ کے سپرد ہے اور اسباب و علل کے ماتحت
ایک خاص انداز سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن اقتدارِ اعلیٰ خالقِ کائنات پروردگار عالم
کے پاس ہے وہ اس موجودہ نظام کا محتاج نہیں اور نہ ملائکہ کے ہاتھ میں دے کر وہ
بے بس ہے بلکہ جب چاہے جس طرح چاہے اس کو بدل سکتا ہے اور اس کو ختم بھی
کر سکتا ہے ملائکہ سے لے بھی سکتا ہے اور ان کو اس عہدہ سے برطرف بھی کر سکتا ہے

اور سب ملائکہ باوجود انتہائی اطاعت گذار ہونے کے اس کے غضب و جلال اور اس کی قہرمانیت سے ترساں و لرزاں ہیں اور اس کی عظمت کے سامنے ہر وقت سرنگوں و مصروف اطاعت ہیں اسی طرح نظام تشریعی میں محمدؐ و آلِ محمدؐ اگرچہ مختار کل ہیں اور حلال و حرام ان کے حکم سے بنتے ہیں۔ ان کی اطاعت اطاعت خدا ہے اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ اور ان کی رضا خدا کی رضا ہے اور ان کا غضب خدا کا غضب ہے لیکن ان کا اقتدار اعلیٰ اور اختیار بالا بھی ہر وقت و ہر لمحہ خالق کائنات کے پاس ہے۔ وہ جب چاہے جس وقت چاہے ایک نظام کو بدل کر دوسرا نظام رائج کر سکتا ہے یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ الآیہ فرماتا ہے جسے چاہے مٹا دے اور جسے چاہے اس کو ثابت رکھے اور اس کو روکنے والا کوئی نہیں وہ فاعل مختار ہے فاعل مجبور نہیں فرماتا ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِہَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْہَا اَوْ مِثْلِہَا الآیہ یعنی جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں اور جسے فراموش کرا دیں اس کی جگہ ہم اس سے بہتر یا اس جیسی اور لاتے ہیں پس جس طرح نظام تکوینی فرشتوں کے ہاتھوں میں دینے کے بعد وہ مجبور و بے بس نہیں اسی طرح نظام تشریعی نبیؐ و آئمہؑ کے ہاتھ میں دینے کے بعد بھی وہ مجبور و بے بس نہیں بلکہ اس کی ترمیم یا تنسیخ اس کے ہاتھ میں ہے اور حضرت محمدؐ و آلِ محمدؐ نے کبھی اس کے سامنے فخر نہیں کیا۔ بلکہ اس کی ذات کے سامنے ہر وقت سرنگوں رہے اور اس کی عظمت کے سامنے سربسجود رہے وہ خوف خدا میں اس قدر روتے تھے۔ کہ ریش مبارک آنسو سے تر ہو جاتی تھی۔ حتیٰ کہ آذان کی آواز سن کر بدن تھرا جاتا تھا۔ چہرہ کی رنگت پریشان ہو جاتی تھی جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی اور آنکھیں خوف خدا میں موتیوں کی لڑیوں کی طرح آنسو کے قطرات مسلسل گراتی جاتی تھیں۔

عبرت و نصیحت

اللہ کی عظمت و جلالت کی قسم لوگوں نے خدا کی عظمت و جلالت کو پہچانا نہیں۔ اگر مولائے مومنین سید الموحدین و امام المتقین حضرت امیر علیہ السلام کی زبانی اپنے پروردگار کی عظمت کو سنیں تو کان کھل جائیں اور طبیعتیں صاف ہو جائیں تاریک شب میں خوف خدا سے کراہ رہے ہیں اور فرماتے ہیں آہ مِنْ قِلَّۃِ الزَّادِ وَبُعْدِ الطَّرِیْقِ ہائے زاد راہ کم ہے اور مسافت سفر طولانی ہے غرضیکہ وہ ہر وقت اپنے اوپر اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو

محسوس کرتے تھے۔

ان سے اشرف حضرت رسالتمآب کے حالات زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ جن سورہ ہائے قرآنیہ میں توحید اور اس کی عظمت کا ذکر موجود ہے ان کو بار بار پڑھ کر روتے تھے اور کسی سائل کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ہود، حاقہ اور قارعہ نے بوڑھا کر دیا ہے اور عبادت کا یہ عالم تھا کہ بارگاہِ رب العزت میں اس قدر قیام فرماتے تھے کہ پاؤں پر ورم آجایا کرتے تھے۔ بہرکیف محمدؐ و آلِ محمدؐ کی عبادت، زہد و تقویٰ اور خوفِ خدا میں گریہ ایسی چیزیں ہیں جو محتاجِ ثبوت نہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہے کہ وہ خدا کو اپنا محسنِ اعظم اور عالمِ کل سمجھتے تھے۔ لہٰذا شیعوں کی طرف یہ منسوب کرنا کہ یہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کو خدا یا خدا کا شریک مانتے ہیں۔ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔

پس عقیدہ صحیحہ یہ ہے کہ نظامِ تکوین میں محمدؐ و آلِ محمدؐ وسیلہ ہیں۔ جیسا کہ حدیثِ قدسی کے الفاظ ہیں۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ کہ اگر یہ نہ ہوتے تو اور کچھ نہ ہوتا نہ خلق ہوتی نہ رزق ہوتا۔ البتہ وہ ان کی دعاؤں کو رد نہیں فرماتا بلکہ عام انسان بھی ان کے وسیلہ سے اگر دعا مانگیں تو وہ ان کی دعاؤں کو بھی رد نہیں کرتا۔

آلِ محمدؐ کو فرشتوں پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے

اس ساری وضاحت اور بسط کے بعد یہ کہنے کی مجال نہیں رہی کہ فرشتہ ہوا چلا سکتا ہے تو آئمہ کیوں نہیں چلا سکتے۔ وہ بارش برسا سکتا ہے تو یہ کیوں نہیں برسا سکتے؟ وعلیٰ ہذا القیاس

اولاً تو یہ کہنا کہ فرشتہ فلاں فلاں کام کر سکتا ہے۔ غلط اور بے معنی ہے کیونکہ ہم نے ثابت کیا ہے کہ تکوینیات کی انجام دہی پر جو قوتیں مامور و مسلط ہیں۔ خواہ عالمِ اکبر میں فرشتے ہوں یا عالمِ اصغر میں قوائے بدنیہ ہوں ان کے افعال اختیاری نہیں۔ بلکہ اضطراری ہیں۔ پس فرشتے کر سکتے نہیں بلکہ وہ کرنے پر مجبور ہیں خدا جسے بھی تکویناً جس کام پر مامور کرے اس نے وہ کام کرنا ہی ہے کیونکہ علیٰ کلِّ شیءٍ قدیر کی تکوین و تقدیر کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ جس طرح سورج روشنی دینے میں اور چاند چاندنی پھیلانے میں مجبور ہے اسی طرح کائنات عالم میں ہر تکوینی امر بے چون و چرا ہوتا رہے گا اور اس پر مامور و مسلط طاقت فرشتہ ہو کوئی اور وہ اس فریضہ کی انجام دہی پر مجبورِ محض ہے۔

ثانیاً ہم نے ثابت کیا ہے کہ نظام دو ہیں ایک تکوینی اور دوسرا تشریعی اور یہ دونو محکمے الگ الگ ہیں اور نظام تشریعی نظام تکوینی سے اشرف و ارفع ہے پس ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا بالکل لغو اور فضول ہے جس طرح کہا جائے قوتِ ہاضمہ غذا کو ہضم کر سکتی ہے تو عقل جو اس سے افضل ہے غذا کو کیوں ہضم نہیں کر سکتی اسی طرح بے ہودہ ہوگا اگر کہا جائے کہ فرشتہ ہوا چلاتا ہے اور بارش برساتا ہے تو محمدؐ و آلِ محمدؐ یہ کام کیوں نہیں کر سکتے

ثالثاً :- جو اپنے اختیار سے اپنے مولا کا مطیع اور فرمانبردار ہو وہ اس سے بدرجہا افضل ہے جو مجبور ہو کر اطاعت گذار ہو محمدؐ و آلِ محمدؐ جب اختیاری اطاعت میں تمام انبیاء و مرسلین سے سبقت لے گئے ہیں۔ پس ان کو اضطراری اطاعت والوں پہ قیاس کرنا۔ آلِ محمدؐ کی انتہائی ناقدرشناسی ہے۔

رابعاً :- ملائکہ کی پوری جنس اور اس کے تمام افراد سے محمدؐ و آل محمدؐ اشرف و افضل ہیں تو غلام کے عہدہ کو کمال سمجھنا اور آقا کے لئے وہ کام ثابت کرنا بصیرت کی کوتاہی ہے جس طرح گھوڑا انسان کا خادم ہے جب کسی کو گھوڑے کی دوڑ پسند آجائے تو کہنے لگ جائے کہ یہ گھوڑا اپنے سوار کو پشت پر بٹھا کر اس قدر دوڑ سکتا ہے تو اس کا آقا جو اس کا سردار ہے اور اس سے افضل ہے وہ تو اس سے بھی تیز دوڑ سکے گا تو ایسے خیالات آقا کی ناقدردانی اور کور بصیرت ہونے کی علامت ہے۔

خامساً :- جوہر عقل و علم شرفِ انسانی کا معیار ہے اور جوہر نبوّت و ولایت وہ اشرف جوہر ہے کہ تمام صاحبان عقول اس کی بدولت ان کے غلام ہیں۔ پس سید الانبیاء یا اس کے اوصیائے طاہرینؑ کے فرائض منصبیہ باقی تمام جن و انس اور ملک و نبی کے فرائض منصبیہ سے اہم و اشرف ہوں گے تو ایسی صورت میں یہ کہنا کہ فرشتہ فلاں کام کر رہا ہے تو نبی و امام کیوں نہیں کر رہے انتہائی حماقت ہے۔

سادساً :- نبوت و ولایت کا عہدہ خدا کی جانب سے عطا شدہ تمام عہدوں سے افضل ہے۔ خصوصاً تکوینی فرائض کے انجام دینے والوں سے تو بدرجہا افضل ہے کیونکہ وہ اضطراری ہیں اور یہ اختیاری لہٰذا ان کا ان پر قیاس کرنا غلط ہے۔ ایک چراغ جو انسان کی خدمت کے لئے ہے اور روشنی دیتا ہے پس یہ کہنا کہ وہ روشنی دیتا ہے تو انسان کیوں نہیں روشنی دیتا جو اس سے افضل ہے اس سے بڑھ کر کور باطنی اور کیا ہو سکتی ہے؟

سابقاً :۔ موسیٰؑ سے کلام کرنے کے لیے خدا نے درخت کو گویا کر دیا اور حضرت یوسفؑ کی عصمت کی شہادت کے لئے بچے کو طاقت دے دی۔ پس جس طرح اس نے تکوینی کے کارخانہ جات چلانے کے لئے ملائکہ کی قہری ڈیوٹی لگا دی ہے اگر ان کے بجائے کسی اور کو مقرر کرتا تو مجال انکار نہ تھی نبی یا امام تو بجائے خود اگر عام انسانوں میں سے کسی ایک کو مامور کرتا تو وہ بھی یہ کام کرتا رہتا۔ کیونکہ تکوین میں اختیار کو دخل نہیں۔ لیکن کیا محمدؐ و آلِ محمدؐ علیہم السلام کو اس نے ان کاموں پر مامور کیا ہے؟ تو کتب سیر و احادیث سے اور قرآن سے اس کا جواب نفی میں ہے۔ بہر حال خدائے قدوس کا اس نظام اتم و اکمل میں کوئی شریک نہیں نہ کوئی نبی نہ ولی اور نہ ملک بلکہ سب اس کے عباد مکرمین اور اس کے عبادت گذار بندے ہیں۔ پس وہ اپنی ذات و افعال میں لاشریک ہے۔

اہلِ تفویض کے متعلق آئمہ کی فرمائشیں

۱۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے بروایت عیون الاخبار مروی ہے :۔ مَنْ زَعَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ اَفْعَالَنَا ثُمَّ يُعَذِّبُنَا عَلَيْهَا فَقَدْ قَالَ بِالْجَبْرِ وَمَنْ زَعَمَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ فَوَّضَ اَمْرَ الْخَلْقِ وَالرِّزْقِ اِلٰى حُجَجِهٖ فَقَدْ قَالَ بِالتَّفْوِيْضِ وَالْقَائِلُ بِالْجَبْرِ كَافِرٌ وَالْقَائِلُ بِالتَّفْوِيْضِ مُشْرِكٌ۔

ترجمہ :۔ جو شخص یہ کہے کہ خدا خود ہمارے افعال کا فاعل ہے اور پھر ہمیں عذاب بھی دے گا تو وہ جبر کا قائل ہے اور جو یہ گمان کرے کہ تحقیق اللہ نے خلق و رزق کا معاملہ اپنے نمائندوں (محمدؐ و آلِ محمدؐ) کے سپرد کر دیا ہے تو وہ تفویض کا قائل ہے حالانکہ جبر کا قائل کافر اور تفویض کا قائل مشرک ہے۔

۲۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی مناجات کے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔ جو عیون الاخبار سے نقل کئے جاتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا عَبِيْدُكَ وَ اَبْنَاءُ عَبِيْدِكَ لَا نَمْلِكُ لِاَنْفُسِنَا نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا وَّلَا مَوْتًا وَلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا اَللّٰهُمَّ مَنْ زَعَمَ اِنَّا اَرْبَابٌ فَنَحْنُ عَنْهُ بُرَآءُ وَمَنْ زَعَمَ اَنَّ اِلَيْنَا الْخَلْقَ وَعَلَيْنَا الرِّزْقَ فَنَحْنُ اِلَيْكَ مِنْهُ بَرَاءٌ كَبَرَاءَةِ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مِنَ النَّصَارٰى (الحدیث)

ترجمہ:۔ اے اللہ ہم تیرے بندے اور تیرے بندوں کی اولاد ہیں۔ ہم اپنی ذات کے لئے نہ نفع نہ نقصان کے مالک ہیں نہ موت و زندگی ہمارے بس میں ہے اور نہ ہم مرنے کے بعد اٹھنے کے خود مالک ہیں اے اللہ جو لوگ ہمیں رب سمجھتے ہیں ہم ان سے بیزار ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ خلق و رزق کا معاملہ ہمارے سپرد ہے تو ہم تیری طرف ایسوں سے بے زار ہیں جس طرح حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نصاریٰ سے بے زار تھے۔ الحدیث قرآن مجید میں ارشاد ہے قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا۔ الآیہ پ۹ (اعراف) کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لئے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں اس بارہ میں احادیث بکثرت موجود ہیں جن میں غلاۃ اور مفوضہ کی تردید موجود ہے غالی تو وہ لوگ ہیں جو ان کی خدائی کے قائل ہیں چونکہ ایسے عقل کے اندھوں سے بات کرنا بھی فضول ہے اور اہلِ انصاف کے لئے دلیل اثباتِ خدا اور دلیل توحید کافی ہیں لیکن تفویض کے قائل لوگ بعض شکوک و شبہات کی بناء پر اس چکر میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی تفہیم شائد نتیجہ خیز ہو اس لئے بیان مقصد میں طول بھی ہو گیا ہے خدا کرے فائدہ مند ثابت ہو ہماری تائیدِ مطلب کے لئے مذکورہ بالا دو حدیثیں ہی کافی ہیں۔ اگر مزید تسلی کی ضرورت ہو تو ہم نے کتاب مقدمہ تفسیر انوار النجف کے آخر میں رد تفویض پر جو نوٹ دیا ہے اس کو غور سے پڑھیں۔

قرآن مجید سے مزید وضاحت

ہم کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جو پڑھتے ہیں جس کو آدم سے لے کر حضرت خاتم تک سب نبی دھراتے رہتے ہیں یعنی یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کو اِلٰہ نہیں مانتے اور ہر روز کلمہ شہادت میں وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کا ورد بھی کرتے ہیں تو سوچنے کی بات ہے کہ وہ کیا شیئی ہے جس میں اللہ کا کوئی شریک نہیں تو قرآن مجید کا فیصلہ ہی کیوں نہ معلوم کر لیں کہ کون کون سے کام ہیں جو اللہ بجا لاتا ہے اور ان میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

اللہ کون ہے؟

پارہ نمبر ۱۸ سورہ الفرقان شروع بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ بابرکت ہے وہ ذات۔ جس

الرَّحِیْمِ • تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا

نے اپنے بندہ پر فرقان کو نازل فرمایا۔ تاکہ وہ عالمین کا نذیر ہو۔ وہ ذات جس کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین کا ملک ہے نہ اس کا بیٹا ہے اور نہ اس کے ملک میں کوئی شریک ہے اس نے ہر شیئ کو پیدا کیا اور اس کو صحیح اندازہ سے بنایا۔

مشرکین کی نشانیاں

آیتِ سابقہ میں پروردگار نے اپنے لئے آسمانوں اور زمین کا ملک اور اس میں شریک کی نفی کا ذکر فرمایا۔

اور اس کے بعد یہ دعویٰ فرمایا کہ صحیح اور درست اندازہ سے ہر شیئ کو صرف میں نے ہی خلق کیا ہے تو اس کے بعد فوراً فرمایا۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝

مشرکوں نے اللہ کے علاوہ اور اِلٰہ مان لئے جو خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ اور نہ اپنے نفسوں کے لئے نفع و نقصان کے اور نہ موت و حیات کے اور نہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کے وہ خود مالک ہیں۔

پس اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو خالق ماننا ہی اس کو اِلٰہ سمجھنا ہے اور اللہ فرماتا ہے کہ وہ کب خالق بن سکتے ہیں جو خود پیدا کئے گئے ہیں؟ یعنی جو اپنے پیدا ہونے میں محتاج ہیں وہ دوسرے کو پیدا نہیں کر سکتے اور جو اپنے لئے موت و حیات نفع و نقصان اور حشر و نشر کے مالک نہیں وہ اِلٰہ کیسے بن سکتے ہیں؟ آیت مجیدہ سے صاف ظاہر ہوا کہ اِلٰہ وہ ہے جس میں یہ آٹھ صفات پائی جائیں۔

۱۔ آسمانوں اور زمین کی ملکیت رکھتا ہو۔
۲۔ ہر شیئ کا خالق ہو۔
۳۔ ہر شیئ کی تقدیر بنانے والا ہو۔
۴۔ مخلوق کے نفع و نقصان کا مالک ہو۔
۵۔ موت اس کے قبضہ میں ہو۔

۶۔ زندگی اس کی قدرت میں ہو
۷۔ موت کے بعد زندہ کرنا اس کے بس میں ہو۔

۸۔ خود مخلوق نہ ہو
اور جوان معنوں کو کسی غیر میں ثابت کرے وہ مشرک ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی سیر کیجئے کہ وہ کون سے کام ہیں جو اللہ کے سپرد ہیں؟ (ملاحظہ ہو پ۲۰ رکوع ۱)

اللہ کے افعال

① **آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا** — اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟

② **بارش برسانا** — وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ اور تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا۔

③ **رونق دار باغات کا اگانا** — فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝

پس ہم نے رونق دار باغات اگائے تمہارے بس میں نہیں تھا کہ اس کا پودا اگاتے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ یہ لوگ راہِ راست سے بھٹکے ہوتے ہیں۔ گویا یہ تین معنی بیان کرنے کے بعد تنبیہ فرمادی کہ یہ تین صفتیں جو غیر کے لئے ثابت کرے گویا اس نے اس کو الٰہ بنایا اور ایسا کرنے والے صحیح راستہ پر نہیں بلکہ گمراہ ہیں۔

④ **زمین کو رہنے کے قابل بنانا** — اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا۔ زمین کو ٹھہرنے کے قابل کس نے بنایا؟

⑤ **نہروں دریاؤں کا پیدا کرنا** — وَجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا۔ اور اس کے اندر نہروں کو جاری فرمایا۔

⑥ **پہاڑوں کو پیدا کرنا** — وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ۔ اور اس کے لئے پہاڑ پیدا کئے جو اس کو جمائے رکھیں۔

⑦ سمندروں کے درمیان حد بندی

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا۔ اور تلخ و شیریں سمندروں کے درمیان حجاب مقرر فرمائے۔

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ بلکہ اکثر لوگ ان باتوں کو نہیں جانتے یعنی یہ چار کام بھی اللہ خود ہی انجام دیتا ہے۔

⑧ مُضطر کی دُعا کا سُننا

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ۔ کون ہے جو مضطر و مصیبت زدہ لوگوں کی دعاؤں کو سُنتا ہے۔

⑨ مُصیبت دُور کرنا

وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ اور ان کی مصیبت کو دُور کرتا ہے۔

⑩ زمین میں خلیفہ مقرر کرنا

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے کیا کوئی الٰہ ہے اللہ کے ساتھ بہت کم سوچتے ہو۔

⑪ برّ و بحر کی تاریکیوں میں ہدایت کرنا

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وہ کون ہے جو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی فرماتا ہے؟

⑫ بارش سے پہلے ہوا کا بھیجنا

وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ اور کون ہے جو اپنی رحمت یعنی بارش سے پہلے ہوائیں بھیجتا ہے جو بارش کا پتہ دیں؟ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ٥ کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور الٰہ ہے؟ پھر فرمایا اگر یہ باتیں کوئی آدمی کسی اور میں ثابت کرے تو وہ مشرک ہے اور اللہ اس شرک سے بلند و بالا ہے۔

⑬ ایجادِ خلق

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ کون ہے جس نے خلقت کو ایجاد فرمایا؟

⑭ موت کے بعد دوبارہ لوٹانا

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ۔ کون ہے جو مخلوق کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرکے پلٹائے؟

⑮ رزق دینا

وَمَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ قُلْ ہَاتُوْا بُرْہَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

اور کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق عطا فرمائے (انہی مسلسل آیات میں بندرہ چیزیں شمار کی ہیں اور ان کے بعد فرمایا کوئی اللہ کے علاوہ دوسرا الٰہ ہے؟ (جو یہ کام انجام دے سکے اور استفہام انکاری ہے یعنی میرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے) ورنہ کہہ دیجئے اگر تمہارے پاس کوئی برہان ہو تو لاؤ۔ اگر تم سچے ہو۔

⑯ پیدا کرنا اور چُننا

پ۲۰ رکوع ۱۰۔ وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ مَا کَانَ لَہُمُ الْخِیَرَۃُ سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ اللہ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور چن لیتا ہے ان کے لئے چُننے کا اختیار نہیں۔ تسبیح ہے اللہ کے لئے اور اللہ اس سے بلند ہے جو لوگ شرک کرتے ہیں۔

⑰ ظاہر و خُفیہ باتوں کا جاننا

وَرَبُّکَ یَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُہُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ہُوَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ۔ الآیۃ

اور تیرا رب ان کی خفیہ و اعلانیہ باتوں کو جانتا ہے اور وہی اللہ ہے۔ جس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں گویا ان باتوں کو جو غیر میں ثابت کرے وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا منکر ہے اور بہت سے معانی ہیں کہ اگر مشرکین مکہ سے دریافت کیا جاتا تھا تو وہ بھی بلا دریغ کہہ دیا کرتے تھے کہ ان کے کرنے والا اللہ ہے۔

⑱ زمین و آسمان کی خلقت

پ۲۱ رکوع ۲ وَلَئِنْ سَاَلْتَہُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟

⑲ سُورج اور چاند کی تسخیر

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ فَاَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ اور کس نے سُورج اور چاند کو مسخر و مطیع بنایا ہے تو کہیں گے کہ وہ اللہ ہے۔

⑳ تقسیم رزق

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ بَیْنَ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ لَہٗ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ اللہ ہی تقسیم کرتا ہے رزق بندوں کا اور اس پر قادر ہے کیونکہ وہ ہر شئی کا جاننے والا ہے۔

آسمان سے مینہ برسانا

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اور ان سے پوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی برسایا ہے۔

زمین کو سبزیوں سے آباد کرنا

فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ اور یہ کہ بربادی کے بعد زمین کو کس نے آباد کر دیا تو کہیں گے کہ اللہ نے پس اللہ کی حمد کرو۔

رزق دینا

پ۱۱ رکوع ۹۔ قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ۔ پوچھو کہ تمہیں آسمانوں اور زمین سے رزق کون دیتا ہے۔

کان اور آنکھ کا مالک

أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ۔ کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے؟

زندہ کو مُردہ سے پیدا کرنا

وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ۔ اور زندہ کو مُردہ سے کون پیدا کرتا ہے؟

مُردہ کو زندہ سے پیدا کرنا

وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ۔ اور مُردہ کو زندہ سے کون پیدا کرتا ہے؟

امر کی تدبیر کرنا

وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ

اور امر کی تدبیر کون کرتا ہے؟ تو جواب دیں گے کہ اللہ ہی یہ سب کام کرنے والا ہے تو ان سے کہو کہ پھر اتنی باتوں کو جانتے ہوئے اس سے ڈرتے کیوں نہیں ہو۔ آیت مجیدہ میں رب اور الٰہ کا معنی ایک ہے چنانچہ فرمایا۔ فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ کہ یہی تو اللہ ہے جس میں ان افعال کی قدرت کو تم خود تسلیم کرتے ہو اور وہی پروردگار ہے حق کو چھوڑ کر دوسری طرف جانا تو گمراہی ہی ہے۔ پھر کہاں جاتے ہو۔ بہرکیف قرآن مجید میں سیر کرنے سے اس باب میں بہت کچھ معلومات ملتے ہیں اور اس قسم کی آیات بہت زیادہ ہیں جن میں الوہیت کو بیان کیا گیا ہے اور جگہ بہ جگہ مشرکین کو چیلنج کیا گیا ہے لیکن تعجب ہے ان مسلمانوں پر جو مشرکین مکہ پر لعنت کا مینہ برسانے کے بعد خود ایسی امراض کا شکار ہیں

جن سے وہ بھی بری تھے۔

مشرکین مکہ اللہ کے وجود کے قائل تھے اور خلق رزق موت وحیات وغیرہ سب صفات کو اللہ میں تسلیم کرتے تھے اور اس میں وہ اپنے بتوں کو قطعاً شریک نہیں مانتے تھے البتہ عبادت میں شریک کرتے تھے اور اگر ان سے پوچھا جاتا تھا کہ جب تم اللہ کو مانتے ہو تو عبادت بتوں کی کیوں کرتے ہو تو جواب میں کہتے تھے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى الآیہ پ۲۳ ہم ان کی اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ ان کی بدولت ہمیں اللہ کا قرب نصیب ہوگا یعنی مشرک فی العبادۃ تھے۔

پس معلوم ہوا کہ خدا کا کوئی دوسرا شریک نہیں جو اس نظام عالم میں اس کا حصہ دار ہو اور تمام صفات کمال اللہ کی عین ذات ہیں تو جس طرح اس کی ذات میں تعدد نہیں اسی طرح اس کی ان صفات میں شرکت بھی کسی کو نصیب نہیں جو اس کی عین ذات ہیں۔ و ذات تمام مخلوق کی الٰہ ہے اور وہ سب کی عبادت کا سزاوار ہے۔ لہذا استحقاق عبادت میں بھی وہ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ توحید فی العبادۃ ہے۔

تنبیہ و اتمام حجت

ادلہ توحید اس قدر صاف و ستھری اور پاک و پاکیزہ ہیں۔ کہ آسانی سے ہر سلیم الذہن انسان ان کو سمجھ سکتا ہے۔

اور باوجود اس کے بھی اگر کوئی نہ سمجھے تو اسے خدا سمجھے ہم نے اپنا حق حتی الامکان ادا کر دیا ہے اور مسئلہ کے چہرہ سے اجمال و اشکال کا غبار صاف ہو چکا ہے لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں کج روی داخل ہو اور خواہ مخواہ ایک سیدھی سادی بات کو بھی الجھانا اپنا کمال سمجھتے ہوں ایسے لوگوں سے توقع رکھنا دانشمندی سے بعید ہے اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان لوگوں کے پاس شکوک و شبہات کے علاوہ اور کچھ نہیں بعض آیات متشابہات سے تمسک کر کے محکمات و بینات کو چھوڑ دینا حق سے انحراف ہے خدا ارشاد فرماتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ الآیہ یعنی جن لوگوں کے دل ٹیڑھے ہیں۔ وہ ان آیات کے پیچھے چلتے ہیں جو متشابہ ہوں صرف فتنہ کی خاطر اور اس کی تاویل کی خاطر بہر کیف توحید حق جل شانہٗ کا مسئلہ وجود حق سبحانہٗ کے مسئلہ کی طرح منصف طبائع کے لئے بدیہی و روشن ہے اور ایک دو نہیں بلکہ اس پر بھی اس قدر دلیلیں ہیں جس قدر نفوس بشریہ یعنی غیر متناہیہ

ہیں کیونکہ کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ جس طرح اپنے خالق کے وجود کا پتہ دیتا ہے اسی طرح اس کے لازوال مصالح اور بے حد و حساب حِکَم و تدابیر اور مشتمل بر عجائب و غرائب نظام یہ سب خالق حکیم کی توحید کی بولتی ہوئی زبانیں ہیں۔

انبیاء کی دعوت

مجھے اس اللہ کی قسم جس کی توحید کو بیان کر رہا ہوں۔ میرا مقصد اس سے اختلاف و انتشار یا حیلہ گری ہرگز نہیں۔ اور نہ معاذ اللہ تعصب اور جاہلانہ حمیت۔ میری غرض ہے بلکہ میں نے وجدانی و برہانی طریقہ سے۔ اپنے ایمانی بھائیوں کو ایک نقطۂ نظر پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کے لئے یہ اقدام کیا ہے نہ کہ افتراق و تشتت کی خلیج کو وسیع تر کرنے کے لئے اور معاذ اللہ میرا یہ کبھی دعویٰ نہیں کہ میں اپنے تئیں دعوت و ارشاد کے اہل سمجھتا ہوں یا میں اس بلند اور مشکل ترین مرحلہ پر پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ مجھ سے اپنا فریضہ اور ذمہ داری کا وظیفہ ترک نہ ہو اور اپنی قوم و ملت بلکہ ہر جویائے حق اور طالب بحقیقت پر اس شئے کا بخل نہ ہو جو میرے پاس موجود ہے اور تمام انبیاء کی دعوت کا مدار اور محورِ گردش یہی مرکزی عقیدہ ہے۔

حضرت صالحؑ کے متعلق فرماتا ہے سورہ ہود آیت ۶۱ رکوع ۶ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ الآیہ یعنی اے قوم اللہ کی عبادت کرو کہ تمہارا اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے تو اس کے جواب میں وہ کہنے لگے۔ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا یعنی اس سے پہلے ہم تجھے اچھا سمجھتے تھے (اب نہ معلوم تجھے کیا ہو گیا ہے؟) کیا ایسی شئے سے روکتے ہو جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔

حضرت شعیبؑ کے متعلق فرماتا ہے سورہ ہود آیت ۸۴ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ۔ یعنی اے قوم اللہ کی عبادت کرو کہ تمہارا اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا۔ الآیہ کہنے لگے اے شعیب کیا تیری نماز تجھے کہتی ہے کہ ہم اس چیز کو چھوڑ دیں جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔

سورۂ انبیاء پارہ ۱۷ میں فرماتا ہے۔ أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنشِرُونَ کیا ان لوگوں نے زمین میں کوئی الٰہ بنا رکھے ہیں جو مرنے کے بعد ان کو زندہ

کریں گے پھر فرمایا لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا الآیہ اگر آسمان
اور زمین میں کوئی اور الٰہ اللہ کے سوا ہوتے تو یہ نظام ارضی و سماوی فاسد ہو جاتا۔ پھر
آگے چل کر فرمایا اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ۔
کیا ان لوگوں نے میرے سوا کوئی اور الٰہ بنا رکھے ہیں تو ان سے کہو کہ کوئی برہان لے
آؤ۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ
اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ آیت ۲۵ یعنی اے محمدؐ ہم نے تجھ سے پہلے جس قدر
رسولؐ بھیجے ان کو صرف اسی لئے بھیجا کہ وہ یہ پیغام پہنچائیں کہ میرے سوا اور کوئی الٰہ
نہیں ہے پس میری ہی عبادت کرو۔ گویا اول سے آخر تک دعوت۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔
ایک رہی اور دعوت کے لانے والے بدلتے رہے کبھی آدمؑ صفی اللہ کبھی نوحؑ
نجی اللہ حتیٰ کہ آخری دعوت دینے والے محمدؐ رسول اللہ تھے۔ پہلا حصہ جو دعوتِ دین کی
اساس ہے وہ کبھی تبدیل نہیں ہوا۔ البتہ پیغمبر بدلتے رہے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ
وَلَدًا اور وہ کہنے لگے خدا نے اپنا بیٹا بنا لیا (جس طرح یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کے
متعلق اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق غلطی کھائی پس خدا اپنی تنزیہ بیان کرتے ہوئے
فرماتا ہے سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ آیت ۲۶ وہ تو میرے باعزت اور
شریف بندے تھے لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ
مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ
مُشْفِقُوْنَ ۝

یعنی وہ اپنے اللہ سے بات میں سبقت نہیں کرتے اور ہر عمل ان کا اس کے
امر کے تابع ہوتا ہے وہ ان کے پہلے اور پیچھے کی باتیں جانتا ہے وہ اس کی رضامندی
کے بغیر کسی کی شفاعت تک نہیں کر سکتے اور اس کے خوف کی وجہ سے سہمے رہتے
ہیں۔ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ
كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

اور اگر ان میں سے کوئی یہ کہے کہ میں بھی اس کے علاوہ الٰہ ہوں تو اس کو ہم
جہنم کی جزا دیں گے اور ظالموں کو ہم یہی جزا دیا کرتے ہیں۔

سورۂ مائدہ پ ۶ رکوع ۱۴ میں نصاریٰ کے متعلق فرماتا ہے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ تحقیق ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہے حالانکہ حضرت مسیح فرماتے تھے اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔

ترجمہ:- جو بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنائے گا۔ اس پر اللہ نے بہشت کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں سے تیسرا ہے (مریم و عیسیٰ و خدا) حالانکہ ایک کے علاوہ کوئی بھی الٰہ نہیں ہے اور آگے چل کر اہلِ کتاب کو غلو سے منع فرماتا ہے۔ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا یعنی اے اہلِ کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ یعنی حد سے نہ بڑھو ناحق اور ایسی قوم کی خواہشات کے پیچھے نہ جاؤ۔ جو خود بھی گمراہ ہیں اور جنہوں نے بہت سوں کو گمراہ کر رکھا ہے۔

غالی اور مفوضہ مذہب امامیہ میں کافر و مشرک ہیں

چنانچہ شیخ صدوق نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ غالیوں اور مفوضہ کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے۔ کہ وہ کفار ہیں اور وہ یہود و نصاریٰ اور مجوس قدریہ حروریہ بلکہ تمام بدعتی اور گمراہ فرقوں سے بدتر ہیں اور جس قدر اللہ کے نزدیک یہ ذلیل ہیں۔ ایسا کوئی نہیں۔ غلو کا معنی ہے حد سے آگے قدم رکھنا اور جو بھی دینی معینہ حدود سے آگے قدم رکھے گا وہ غالی ہوگا اگر کوئی شخص ایسے شخص کو امام مانے جو درحقیقت۔ امام نہ ہو خواہ وہ نیک ہو یا بد ہمارے نزدیک۔ ایمان سے خارج ہے۔ پس جہاں امام حسینؑ کے مقابلہ میں یزید کو امام ماننا بے ایمانی ہے اسی طرح حضرت عباسؑ کو امام سمجھنا بھی منافی ایمان ہے جس طرح علیؑ کے مقابلہ میں ابوبکر کو خلیفہ برحق کہنا غلط ہے اسی طرح سلمانؓ یا ابوذرؓ کو علیؑ کی بجائے خلیفہ برحق یا امام کہنا ناجائز ہے اور جس طرح رسالتمآبؐ کی جگہ مسیلمہ کذاب کی رسالت کا قول یا مرزا قادیانی کی نبوت کا اقرار کفر ہے اسی طرح محمدؐ رسول اللہ کی بجائے علیؑ رسول اللہ

کہنا بھی کفر ہے پس اس قاعدہ کی رُو سے الوہیت کی مسند پر جس طرح کسی فرد دو فرعون و شدّاد وغیرہ جیسے فاسق کو جگہ دینا شرک ہے اسی طرح اس کے کسی نیک بندے عزیز و عیسیٰ یا محمد و آلِ محمد علیہم السلام کو اِلٰہ جاننا بھی شرک ہے کیونکہ غلو فی التوحید میں دونو عقیدے برابر ہیں۔ خدا قرآن میں حضرت عیسیٰ کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰہَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ بن مریم کیا تونے لوگوں کو کہا تھا۔ کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ اِلٰہ مانو تو جواب میں فوراً عرض کی۔ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ پ ۷ رکوع ۵ ترجمہ:- اے اللہ تسبیح تیرے لئے ہے مجھے کیسے جائز ہے کہ میں ایسی بات کروں جو میرا حق نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ جب الٰہ کے دعویٰ کی اپنی ذات سے نفی فرما رہے ہیں تو حضرت علیؑ جس کی معرفت گذشتہ تمام انبیاء سے اکمل و ارفع تھی، کیسے اپنے لئے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ میں نے زمین و آسمان کو خلق کیا یا میں کائنات عالم کو رزق تقسیم کرتا ہوں۔ خدا کی توحید کی قسم ایسے لوگوں نے نہ علیؑ کو پہچانا اور نہ خدا کی قدر کی۔ وہ خطبہ جس میں حضرت علیؑ کی طرف یہ نسبتیں علیؑ کی اپنی زبانی منقول ہیں وہ بالکل مجعول ہے کتب امامیہ معتبرہ میں اس کا اندراج نہیں بلکہ صوفی خیال کے لوگوں یا غالی قسم کے گمراہوں کا ذہنی اختراعی مجموعہ ہے جس کو نہ قرآن تسلیم کرتا ہے اور نہ حدیث قبول کرتی ہے۔ بہرکیف قرآن مجید کے صریح فیصلہ کے بعد کسی قول کی وقعت نہیں اگر قابل تاویل ہوگا تو اس کی تاویل کی جائے گی ورنہ وہ بقول معصوم دیوار پر مارنے کے قابل ہے۔ عقیدۂ مذہب ایسی کمزور بنیادوں پر کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔

آثارِ توحید

دیکھئے کسی شئے کو پہچاننے کے لئے اس کے آثار و علائم سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہم نے اپنے جسم میں اپنی رُوح کو کبھی نہیں دیکھا لیکن اس کے آثار و علائم ہی اس کے وجود کا پتہ دیتے ہیں اور انہی آثار کی بدولت ہم اس کی توحید کے قائل ہیں کہ رُوح بدن میں موجود ہے اور وہ واحد و یکتا بھی ہے پس عالم اکبر میں بے حد و حساب آثار کا وجود ذاتِ باری کے وجود اور اس کی توحید کی واضح دلیل و برہان ہے جس طرح بدن میں دو روحوں کا ہونا بدن کے فساد کا باعث ہے اسی

طرح کائنات میں دو خداؤں کا ہونا عالم کی بربادی کا پیش خیمہ ہے پس بدن میں عقل اگرچہ رسول باطنی ہے لیکن اس کے پاس روح کے اختیارات نہیں ہیں۔ اسی طرح عالم اکبر کی بقاء و اصلاح صرف ایک خدا کو ثابت کرتی ہے اور انبیاء و آئمہ اگرچہ اس کی حجتیں ہیں لیکن خدائی اختیارات اس کے اپنے پاس ہیں کیونکہ تکوینی اختیارات قابل انتقال ہوتے ہی نہیں تاکہ دوسرے کے سپرد کئے جا سکیں۔

خدا نے قرآن مجید میں اپنی نشانیاں و علائم تفصیل وار بیان کیں تاکہ کسی کو دھوکا نہ ہو سکے اور طریق معرفت کو آسانی سے طے کیا جا سکے۔ پس اپنی نشانیوں کی ایک طولانی فہرست ذکر فرما دی (سورہ مریم)

۱۔ مردہ کو زندہ سے نکالتا اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔

۲۔ زمین کو بربادی کے بعد آبادی کی دولت عطا فرماتا ہے۔

۳۔ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کر کے بشر کی شکل دے دی کہ تم زمین میں پھیلے ہوئے ہو۔

۴۔ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے فائدہ کے لئے تمہارے نفسوں سے اس نے تمہارا جوڑا بنایا تاکہ تم سکون حاصل کرو۔

۵۔ تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کر دی اور فکر کرنے والوں کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔

۶۔ اس کی نشانیوں میں سے آسمان و زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا الگ الگ ہونا ہے۔

۷۔ اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات کو آرام سے سونا اور دن کو جاگ کر اپنی معاش میں دوڑ دھوپ کرنا ہے۔

۸۔ اس کی نشانیوں میں سے بجلی کا ظاہر کرنا ہے جس میں خوف بھی ہوتا ہے اور باران رحمت کی امید بھی اس میں پائی جاتی ہے۔

۹۔ وہ آسمان سے بارش برساتا ہے کہ تمہاری زمین آباد ہو عقل مندوں کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔

۱۰۔ اس کی نشانیوں میں سے آسمان و زمین کا اس کے امر سے قائم ہونا ہے۔

۱۱۔ پھر جب تم کو دعوت دے گا تو تم زمین سے نکل کھڑے ہو گے۔
۱۲۔ ایک اور مقام پر فرمایا هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ۔ وہ وہ ہے جس نے شکم مادر میں تمہاری تصویر بنائی۔

پس خداوند کریم کا اپنی معرفت کے لئے یہ نشانیاں بیان کرنا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ نشانیاں اور کسی میں نہیں پائی جاتیں بلکہ اسی کا ہی خاصہ ہیں کیونکہ جو نشانی مشترک ہو وہ کسی کی پہچان کا ذریعہ نہیں بن سکتی پس کسی نبی یا ولی میں ان نشانیوں میں سے کسی ایک کا ثابت کرنا بھی آیاتِ قرآنیہ کے مقصود کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے ہم نے منصف طبع لوگوں کے لئے یہ مواد بہم پہنچایا ہے اور اس سے بہت زیادہ لکھا جا سکتا ہے لیکن ہم نے دوسرے بہت سے عنوانات کو زیر بحث لانا ہے لہٰذا اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں۔

زمانے کی کج رفتاری اور اس کے تقاضے

اس سے بڑھ کر مصیبت علمی اور کیا ہو گی کہ موسم باراں میں مادرِ گیتی کے شکم سے پیدا ہونے والے بے شمار حشرات الارض کی طرح وادیٔ علم کی خود رو پیداوار علمائے حقہ سے اصول و عقائدِ مذہب کے بارے میں دست و گریباں ہیں اور طورِ زمانہ اور دورِ دہر کے تقاضے ہمیں بعض ایسے احمقوں کے ساتھ اُلجھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جن کے ہاں حقائق کا بازار زم اور اوہام کا بازار گرم ہے اور وہ حق کی مضبوط چٹانوں اور علم و معرفت کے آہنی قلعوں کے ساتھ ٹکرانے کے لئے صرف انکار ہی انکار کو پیش کرنے کی جراُت کر سکتے ہیں ایسے علمی نسل کے مادر زاد یتیموں کی حالتِ زار بے شک قابلِ رحم ہے اور بلا مبالغہ ہم نے بہت سوں کو دیکھا ہے جو نادانستہ طور پر تحصیل مبادی کے بغیر علوم و فنون کے میدان میں آگے بڑھے اور انجام کار اپنی ذہنی اختراعات اور غیر مہذب افکار کے تخیلاتی پنجوں سے علم کے لباس کو تار تار کرنے میں مشغول ہو گئے انہوں نے ماہرینِ علم پر ناروا حملے کرنا اپنا شیوہ بنا لیا اور اپنی جہالت اور کج بحثی کے تیز ناخنوں سے وقار علم کو زخمی کرنا اپنا محبوب مشغلہ سمجھ لیا۔ اور لوگوں میں یہ وباء عام ہے اور ایسی مصیبت ہے جس کی کوئی حد نہیں کہ جو شخص کسی شئی کو کسی حد تک جانتا ہے اس سے زیادہ کا دعویٰ کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ

معمولی سے معمولی فرعی مسئلہ کو جاننے کی بمشکل صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ بڑے مسائل کلامیہ واعتقادیہ میں خواہ مخواہ اپنی ٹانگ پھنسانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور تعجب بالائے تعجب ہے ان عقل کے اندھوں پر جو یہ کہیں کہ ہر معمولی سے معمولی فن سیکھنے کا محتاج ہے لیکن اصول وعقائد کے سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں بس جس کے ذہن میں جو کچھ سما جائے وہی درست ہے اور اصول میں تقلید کی نفی کو اس کی سند میں پیش کرتے ہیں کاش ایسے لوگ عقائد کی عظمت کو سمجھیں کیونکہ علم عقائد کی ہر شخص پر وحی نہیں ہوتی۔ فطرت صرف تحریک کرتی ہے اور عقل کے قدموں پر چل کر آگے بڑھنا انسان کی اپنی ہمت ہے اور جب تک عقل کی صحیح رہنمائی قرآن وحدیث کے پائیدار اصولوں پر نہ ہو۔ اس کے قدم قدم پر لڑکھڑانے اور ڈگمگانے کا خطرہ ہے اور عام گرے ہوئے انسانوں کا دستور ہے کہ جب کسی فن کی جہالت کا دھبہ دامن سے داغ دھونا چاہیں تو اس فن کی عظمت وضرورت کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں ہم نے متکلمین کے کلمات کو غور وفکر اور تصفح وتتبع کی نگاہ سے دیکھا تو ان کے دامن میں سوائے وہم وخیال کے اور کچھ نہیں ہے اور وہ یقین کا مقابلہ احتمال سے پانی کا سراب سے اور سورج کا حباب سے کرنا جانتے ہیں اور بس۔

زمانہ کی کجروی کے ناخوشگوار اور بدترین نتائج میں سے ہے کہ علماء ایسی بے سروپا باتوں میں الجھے رہیں اور کوئی دوسرا ٹھوس قدم نہ اٹھا سکیں۔ بہرکیف لغیرانہ کی ضرورت نہیں۔ اپنی ہمت کے مطابق عقائد حقہ کی وضاحت اور ان سے شکوک وشبہات کے بدنما داغوں کو دھونا ہمارا فرض ہے لہٰذا ہمیں مہر خاموشی کو توڑ کر میدان عمل میں قدم بڑھانا چاہیئے۔ ادلۂ ساطعہ اور براہین قاطعہ ہی جو شرف ذاتی اور کمال ملکوتی کی طرف لے جانے والی معرفت الٰہیہ میں فکر ونظر کے نتائج ہیں۔ بشرطیکہ ان کی بنا صحیح اصولوں اور مضبوط بنیادوں پر ہو اور شیریں چشمے اور پاکیزہ گھاٹ ان کا ماخذ ہوں۔ ان کی بدولت ہم نے حقیقت کے چہرہ سے نقاب الٹا ہے اور یہ ہمارا ذاتی وظیفہ ہے۔

وہ نیک اثرات جو انسان اپنے پیچھے چھوڑ کر آتا ہے وہ بہت بہتر اور نہایت خوشگوار نتائج کی شکل میں کئی گنا زیادہ ہو کر واپس اس کی طرف پلٹے ہیں جب تک وہ آثار باقی رہیں گے اور آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کرتی رہیں گی خواہ وہ

آثارِ خیر کسی نوعیت کے ہوں۔ اس کو اسی نوعیت کا صلہ ضرور ملے گا۔ کیونکہ ہر عمل کی جزاء اسی جنس سے ہوتی ہے اور احسان کا بدلہ احسان ہونا معلوم و مسلّم ہے۔ نماز روزہ و تسبیح وغیرہ جس قدر عبادات ہیں اپنے اپنے مقام پر ان کو فضیلت حاصل ہے لیکن ان کی حد معین اور مقدار معلوم ہے اور انسان کی موت سے یہ خیر کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے آثار کو قوم و ملت کے استفادہ کے لئے بقاء و دوام حاصل نہیں۔ لہٰذا قوم و نسل کے استفادہ کے لئے ایسی خدمت کرنا ضروری ہے۔ جس کے آثار دائمی و پائیدار ہوں جس کی بدولت خفتہ قوم کے خفتہ بخت بیدار رہوں۔ پس عقائد حقہ کی وضاحت و حفاظت۔ اور اصولِ مذہب کی صراحت و صیانت ہی بہترین خدمت ہے اور اس بناء پر عقیدۂ توحید کے متعلق شکوک و شبہات کا ازالہ ضروری ہے۔

شبہات و تشکیکات کا حل

اس مقام پر چند شبہات ہیں جن کا جواب ضروری ہے۔

پہلا شبہ حضرت جبرئیل جب جناب مریم کے سامنے آئے تو مریم نے گھبرا کر فرمایا کہ اگر تیرے دل میں خوفِ خدا ہے تو مجھ سے دُور ہٹ جا۔ پس جواب میں جبرئیلؑ نے کہا میں اس لئے آیا ہوں کہ تجھے بچہ بخشوں لفظ یہ ہیں۔ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا پ۱۶ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت جبرئیلؑ نے مریمؑ کو بچہ دیا تھا؟ اور اگر جبرئیلؑ کی طرف یہ نسبت صحیح ہے تو پھر انبیاء و اوصیاء بھی یہ کام کر سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ محض مغالطہ اور ناخدا ترسی ہے۔ ایک مقام پر سورہ آلِ عمران میں ارشاد ہے کہ جب مریم کو بشارت دی گئی تو کہنے لگی۔ اے پروردگار مجھے تو بچہ کس طرح دے گا۔ حالانکہ میں شادی شدہ نہیں ہوں اور مجھے کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا۔ تو ارشاد ہوا۔ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔

یعنی اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کر لیتا ہے اور جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے ارادہ کُن سے شئی ہو جایا کرتی ہے۔ اب یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ عیسیٰؑ کا خالق خود خدا ہے تو جہاں سورہ مریمؑ میں حضرت جبرئیلؑ نے ہبہ کو اپنی طرف منسوب کیا وہ بحیثیت رسولِ پروردگار ہونے کے تھا چنانچہ کہا اَنَا رَسُوْلُ

رَبِّكِ ۔ میں تیرے رب کا فرستادہ ہوں ۔ یعنی یہ ہبہ اللہ کی جانب سے ہے۔
مثال کے طور پر اگر کسی کے ہاں کوئی مبارک بھیجی جائے تو بڑے آدمی جہاں خود نہیں
جاتے وہاں اپنا غلام بھیج دیا کرتے ہیں اور ان غلاموں کا لہجہ بھی ہوتا ہے کہ فلاں کا
فرستادہ ہوں اور تجھے فلاں امر پر مبارکباد کہنے کو آیا ہوں اور یہ کہہ کر بات کرنا کہ
میں فلاں کی جانب سے آیا ہوں اس کی نیابت کو ظاہر کرتا ہے ورنہ جہاں اپنی طرف
سے بات کرنی ہو وہاں یہ نہیں کہا جاتا کہ مجھے فلاں نے بھیجا ہے بلکہ کہا جاتا ہے
کہ میں خود اس کام کے لئے حاضر ہوا ہوں اور عقیدہ کے لحاظ سے حضرت عیسیٰؑ کو حضرت جبرئیلؑ کا
عطیہ کہنا ہی اسلام سے دوری کا باعث ہے اور عقلی لحاظ سے بھی محال ہے۔
کیونکہ ہبہ کی ہوئی شئے ہبہ کرنے والے سے مرتبہ کے لحاظ سے کم ہوا کرتی ہے اور
عطا کرنے والا اپنے عطیے سے افضل ہوا کرتا ہے ۔ حالانکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ملائکہ
سے انبیاء افضل و برتر ہیں ۔ پس یہ ناممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ اولوالعزم نبیؑ اپنے
مفضول کا عطیہ و ہبہ ہو ۔ ہاں لوگ اگر محمدؐ و آل محمدؐ کے دروازہ پر التجا کریں اور خدا سے
دعا مانگیں تو خداوند کریم ان کی دعا کو مستجاب کرکے اولاد عطا فرما دیتا ہے ۔ دوسرا شبہ حضرت
عیسیٰ کا فرمانا ۔ اِنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَهَیۡـَٔةِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡهِ فَیَکُوۡنُ
طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۔ ترجمہ :- میں تمہارے لئے مٹی سے ایک پرندہ جیسی شکل بناتا
ہوں پس اس میں پھونک ماروں گا تو وہ باذن خدا پرندہ بن جائے گا تو اس کا جواب یہ ہے
کہ یہاں مطلب صاف واضح ہے کہ میں مٹی سے پرندہ کے بوتے جیسا ایک بوتہ بناتا
ہوں اور مٹی سے کسی شئی کا بوتہ بنا لینا کمال نہیں یہ تو ہر شخص بنا لیتا ہے ۔ اس کے بعد
فرمایا کہ میں اس میں پھونک مارتا ہوں اور پھونک مارنا بھی کوئی بڑی بات نہیں ۔ ہاں جو
کام عیسیٰؑ نہیں کر سکتے تھے وہ یہ ہے فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰهِ کہ وہ حکم پروردگار
سے پرندہ بن جاتا ہے اور اسی کا نام معجزہ ہے اور جہاں تک حضرت عیسیٰ کے کام
کا تعلق ہے وہ معجزہ نہیں بلکہ ہر شخص کر سکتا ہے اور جہاں معجزہ اور خارق عادت امر
کے ظہور کا مرحلہ آیا تو عیسیٰؑ نے صاف کہہ دیا کہ میرے نہیں بلکہ اللہ کے اذن سے
ہی وہ پرندہ بن جاتا ہے جس طرح حضرت موسیٰؑ کا کام تھا عصا کا پھینکنا اور اژدہا کا بنانا اللہ کا
کام تھا لہٰذا جس طرح حضرت موسیٰؑ کو اژدہا کا خالق نہیں کہا جا سکتا اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو پرندہ کا خالق بھی نہیں کہا جا سکتا

اس کے بعد ارشاد ہے۔ وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ نابینا کو بینا مبروص کو تندرست اور مردہ کو زندہ کرتا ہوں باذنِ خدا اور ان واقعات کو احادیث کی روشنی میں دیکھئے اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی تفاسیر کو ملاحظہ کیجئے تو صاف صاف مذکور ہے کہ وہ اللہ سے دعا مانگتے تھے اور اللہ ان کی دُعا کو مستجاب فرماتے ہوئے نابینا کو بینائی سے مبروص کو تندرستی سے اور مردہ کو تازہ زندگی سے مشرف فرما دیتا تھا اور نبیوں کی دعاؤں سے ان امور کا وقوع پذیر ہونا اور خارق عادت امور کا منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونا معجزہ ہے اور محمدؐ و آل محمدؐ ان معجزات سے بہت زیادہ دکھانے پر قادر تھے اور حضرت صالح علیہ السلام کے معجزہ سے پتھر سے ناقہ کے پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت صالحؑ پیغمبر کو خالق مان لیا جائے۔

کرنے اور کر سکنے کی دو لفظوں میں امتیاز نہ کرنا اکثر اوقات بڑی سے بڑی غلط فہمی کا باعث بن جاتا ہے۔ معجزہ کی صورت میں کسی خارق عادت امر کو دکھا نا کر سکنا نہیں ہوتا چنانچہ حضرت صالحؑ کا پتھر سے ناقہ کو ظاہر کرنا بصورت معجزہ تھا کہ حضرت صالحؑ کی تصدیق کے لئے خُدا نے اس کو پیدا کیا تھا۔ پس حضرت صالحؑ نے کر دکھایا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بذاتِ خود کر سکتے تھے اور اسی طرح حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ و تمام انبیاءؑ کے معجزوں کی یہی صورت ہے کیونکہ جو بات انسان کر سکتا ہے وہ اس کا معجزہ نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی عادی رفتار ہوا کرتی ہے انسان دیکھ سکتا ہے سُن سکتا ہے چل پھر سکتا ہے لہٰذا یہ قوتیں انسان کے لئے معجزہ نہیں انسان اڑ نہیں سکتا پس اگر وہ اڑے تو اس کے لئے معجزہ ہوگا اور اسی طرح پرندہ کا اڑنا معجزہ نہیں بلکہ بولنا اس کا معجزہ ہے اور طوطا چونکہ عام طور پر سیکھ کر بول سکتا ہے لہٰذا اس کا معجزہ نہیں ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ معجزہ اس امر کے صدور کا نام ہے جو عادی رفتار کے خلاف ہو۔

بنا بریں انبیاءؑ یا آئمہؑ کی دعاؤں سے بعض اوقات مردوں کا زندہ ہونا معجزہ ہے جو باذن پروردگار ان کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ کیونکہ معجزہ وہی ہوتا ہے جو انسان خود نہ کر سکتا ہو اور کر دکھائے پس آل محمدؐ کی اعجاز نمائی ان کے خالق و رازق و محی و ممیت ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی بلکہ ان کے معجز نما ہونے کی دلیل ہے اور نصیریوں اور غالیوں نے چونکہ کرنے اور کر سکنے میں فرق نہیں کیا۔ لہٰذا وہ کفر کے دریائے ظلمات میں جا گرے۔ پس اگر یہ فرق مفوضہ

گروہ کی سمجھ میں آجائے تو وہ بھی شاید راہِ حق پر آجائیں۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب:۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اَحْسَنُ الْخَالِقِيْن یا خَيْرُ الرَّازِقِيْن کی لفظیں ہیں ان کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا خالق یا رازق ہے مقصد یہ ہے کہ خدا وہ ہے جو بغیر مادہ وطبیعت کے بغیر اسباب وآلات کے بغیر کسی مشورہ وصلاح کے اور بغیر محنت ومشقت کے ارادہ کُن سے بڑی سے بڑی مخلوق کے پیدا کرنے پر قادر ہے چنانچہ اس نے تمام آسمانوں زمینوں اور اس کے اندر ہزارہا قسم کی مخلوق کو کتم عدم سے منصۂ وجود پر ظاہر فرمایا۔ باقی رہا مادۂ موجودہ سے کسی شئے کا تیار کرنا جس طرح مٹی سے عیسیٰؑ کا پُتلا بنانا یا سامری کا گوسالہ بنانا۔ بلکہ دورِ حاضر میں جو سائنس کا دَور ہے ماہرین کا بڑی بڑی چیزوں کا ایجاد کرنا۔ چونکہ یہ سب مادۂ موجودہ سے ہیں۔ لہٰذا مبادہ کوئی شخص اس قسم کی حیرت ناک ایجادات وتعجب خیز مصنوعات کو دیکھ کر فریب خوردہ ہو جائے اس لئے اپنے لئے اس نے احسن الخالقین کی لفظ بڑھائی کہ میری صنعت مواد و آلات اور محنت کی محتاج نہیں ہے اسی طرح خیر الرازقین کی لفظ بھی اس مطلب کو ادا کرنے کے لئے ہے کہ رزق کے بنیادی اسباب وذرائع زمین میں قوّتِ نامیہ بیجوں میں قوّتِ قابلہ آسمانوں سے بارش دریاؤں کی روانی سورج کی روشنی چاند کی چاندنی ستاروں کی چمک اور ہواؤں کی صرصراہٹ نہ معلوم کتنی چیزیں ہیں جو اس کارخانۂ قدرت میں انسان کے غذائی بندوبست کے لئے مصروفِ کار ہیں۔ چونکہ اس کی حسن ایجاد اور پرازحکمت نظام سے وابستہ ہیں لہٰذا وہ خیر الرازقین ہے۔ کیونکہ انسانوں میں سے کوئی کسی کو رزق یا غذا دیتا ہے تو وہ درمیان میں وسیلہ ہے پس اس قسم کے چکر میں سادہ ذہن لوگوں کو پھنسا کر ان کے ایمان کو تباہ کرنا انتہائی جرأت اور زبردست جسارت ہے۔ بلکہ توحید خالق کے ساتھ کھلی ہوئی لڑائی ہے۔

چوتھا شبہ اور اس کا حل:۔ علمائے اعلام نے زیارتِ مطلقہ امیر المومنین علیہ السّلام کے اس فقرہ کی توجیہ فرمادی ہے جو مقامِ تشکیک بنا ہوا ہے اور مقصد یہ ہے کہ خداوند کریم کی جانب سے ہونے والے امور کے متعلق آئمہؑ کو پہلے حسبِ مصلحت آگاہ کر دیا جاتا ہے اور ان کی بدولت ان امور کا علم لوگوں تک پہنچتا ہے اور اس

کا اشارہ شبِ قدر میں نزولِ ملائکہ کی طرف ہے کہ وہ مقادیر الامور لے کر آئمہ کے پاس پہنچے ہیں اور آئمہ حسبِ مصلحت لوگوں کو فرماتے ہیں۔

علاوہ ازیں خطبۃ البیان کے الفاظ سے دھوکا کھا کر آئمہ کے لئے خلق و رزق و دیگر صفاتِ پروردگار کا ثابت کرنا قرآنی آیات کو رد کرنے کے مترادف ہے اور ایسی باتوں پر اعتماد کرنا مذہبِ امامیہ سے کھلی بغاوت ہے اور یہ ایک مفروضہ خطبہ ہے جس کو حضرت علیؑ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور کتبِ صحیحہ میں اس کا وجود نہیں ہے۔

مقامِ اہلبیت

اس میں شک نہیں کہ محمد و آلِ محمد علیہم السلام خدا کی مصلحت کے سامنے سراپا تسلیم تھے اور اس کی رضا کے لئے ان کو ایسا کرنا چاہیئے تھا پس انہوں نے راہِ خدا میں جہاد بھی کیا اور مصائب بھی برداشت کئے جس طرح کہ باہمت انسانوں کی شان ہے اور ان کی معیت میں ان کے غلام بھی ان ہی شدائد میں ان کے نقشِ قدم پر چلے جو سب کے سب رضائے پروردگار کے تابع تھے پس وہ اللہ کے خاص بندے تھے اور انہوں نے اس کے دین کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور دشمنانِ دین سے اپنی زندگی بھر جہاد کیا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اور ناموسِ اسلام کی حفاظت کے لئے باطل طاقتوں سے ٹکرا گئے۔ حتیٰ کہ اپنی جان و مال و ناموس تک کو قربان کر دیا اور دینِ خدا کی لاج رکھ لی۔ وہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ

ف ۱:- چونکہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان وسیلہ ہیں۔ لہٰذا ہر دو پہلوؤں کے لحاظ سے ہر دو طرف وابستہ ہیں نورانی پہلو کے اعتبار سے وہ خدا سے وابستہ ہیں اور جسمانی و بشری پہلو کے لحاظ سے ہم سے وابستہ ہیں پس ان کی پیدائش بھی ہر دو پہلوؤں کے لحاظ سے الگ الگ ہے نورانی پہلو کے اعتبار سے وہ اول الخلق ہیں جب کوئی نہ تھا وہ تھے اور اس مرحلہ میں وہ صلب و رحم کے محتاج نہیں بلکہ ان کی پیدائش صرف امرِ کن سے ہے۔ لیکن بشری پہلو کے لحاظ سے وہ حضرت آدمؑ و حواؑ کی اولاد میں سے ہیں، انکی مائیں بھی ہیں اور باپ بھی ہیں لیکن ان کی ماؤں کا سلسلہ حضرت حواؑ تک پاک و پاکیزہ تھا کہ کبھی آلائشِ شرک یا کفر سے ان کا دامن آلودہ نہ ہوا اور اسی طرح ان کے آبائے طاہرینؑ بھی حضرت آدمؑ تک پاک و پاکیزہ تھے۔ علاوہ ازیں ان کی پیدائش کی خصوصیات الگ ہیں وہ پاک و پاکیزہ ناف بریدہ اور ختنہ شدہ پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی کلمہ شہادتین زبان پر جاری کرتے ہیں چنانچہ اس کی تفصیل ہم نے تفسیر انوار النجف جلد ۱ صفحہ ۔۔ پر ذکر کی ہے۔ لہٰذا جو شخص یہ کہے کہ ان کی ولادت کی تمام کیفیات عام انسانوں کی طرح ہیں یا علماء کی طرف ایسی باتیں منسوب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی اولاد میں سمجھتے تھے اور ان کی اولاد ان کی صلب سے ہے اور اللہ کی سب مخلوق سے افضل و برتر مخلوق تھے لیکن اس کی توحید کے علمبردار تھے اور عقیدۂ توحید جس طرح انہوں نے سمجھایا اس طرح کوئی بھی نہ سمجھا سکا۔ ہم ان کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

میں نے اپنی وسعت بھر مسئلۂ توحید کو واضح کیا ہے اگر میرے بیان کا مطالعہ کرنے والوں نے علیحدہ ہو کر اپنے عقل سلیم کی قندیل کی روشنی میں افکار و انظار صحیحہ سے تائید لیتے ہوئے طالب دین بن کر منصفانہ طور پر غور کیا تو بعید نہیں کہ خدا ان کو اور ہم کو ایک صراط مستقیم پر جمع کر دے۔

ثنویہ فرقہ ایک فرقہ ہے جسے ثنویہ کہتے ہیں۔ وہ دو خداؤں کے قائل ہیں ایک نیکیوں کا خالق اور اسے یزداں کہتے ہیں۔ دوسرا برائیوں کا خالق اور اس کو اہرمن کہتے ہیں گویا ایک خیر کا خالق ہے اور دوسرا شر کا خالق ہے اسی طرح مادہ و طبیعت والے بھی مادہ و طبیعت کو دو خدا مانتے ہیں تو دلیل توحید سے ہم نے ان بیہودہ خیالات کو باطل کر دیا ہے۔ مزید توضیح کی ضرورت نہیں اور اس کی مزید وضاحت ہم نے تفسیر انوار النجف کی پانچویں جلد ص۱۹۸ میں کر دی ہے۔ تفصیل کے خواہشمند اس کی طرف رجوع کریں۔

کرے وہ کذاب و مفتری ہے اسی بناء پر یہ کہنا بھی بجا ہے کہ مقام نور میں ان کی نوع تمام انواع سے الگ ہے۔ لہٰذا وہ نوع منفرد ہیں اور مقام جسم میں نوع انسانی کے اکمل افراد ہیں۔ نہ مقام نور میں کوئی نوری ان جیسا ہے اور نہ مقام جسم میں کوئی انسان و بشر ان کی مثل ہے۔ عام انسان تو بجائے خود حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء بھی ان جیسے نہیں ہیں۔ پس نہ وہ خدا کی مثل ہیں۔ کیونکہ خدا خالق ہے اور وہ مخلوق اوّل ہیں اور نہ عام انسان ان کی مثل ہیں کیونکہ عام انسان محض خاکی ہیں اور وہ نوری انسان ہیں۔ لہٰذا اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

تیسرا باب

صفاتِ خداوندی کا بیان

توحید پر ایمان راسخ ہو جانے کے بعد آپ کو اس امر کا بھی یقین ہو جائے گا کہ حق سبحانہٗ تمام صفات جمال و جلال اور تقدس و کمال کا جامع ہے اور متکلمین کے نزدیک یہ صفات دو قسموں پر ہیں۔ صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ۔ صفاتِ ثبوتیہ کی تعداد انہوں نے آٹھ بتائی ہے اور صفاتِ سلبیہ کی تعداد سات گنوائی ہے۔

علامہ شیخ محمد حسین قدہٗ آل کاشف الغطاء فرماتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے صفاتِ ثبوتیہ کے آٹھ ہونے کی اصطلاح قائم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی اور اتنے وسیع و عریض مقصد کے لئے انہوں نے اس قدر تنگ نظری کا مظاہرہ کیوں کیا پس صفاتِ کمالیہ جن کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے۔ کو اس عدد میں محصور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ صاف طور پر اس طرح کیوں نہ کہا جائے کہ صفت ثبوتی ہر وہ صفت ہے جو حالیت و محلیت تغیر اور حدوث کے عیوب سے دور رہ کر کمالِ مجد اور عظمت و جلال کی مظہر ہو اور اس کے مقابلہ میں صفتِ سلبی ہر وہ صفت ہے جو نقص و عجز محدودیت حدوث اور تغیر وغیرہ پر دلالت کرے جو مخلوق کے لئے مناسب ہیں۔ پس عارفین کے نزدیک معیار یہ ہے کہ جو صفت تقدیس و تنزیہ کی موجب اور کمال کی مظہر ہے وہ حق سبحانہٗ کی ذات میں ثابت ہے۔ لہٰذا نہ حصر کی ضرورت ہے اور نہ ضبط کی حاجت۔

میرے نزدیک ان کا فرمان بے شک واجب الاذعان ہے اور اسی پر اطمینان کرتے ہوئے اپنے بیان کو مختصر کرتا ہوں اور دلیل و برہان میں پڑ کر بے فائدہ نہ وقت کا نقصان کرتا ہوں اور نہ طبع قارئین کو طول و پریشان کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ صفاتِ ثبوتیہ کا متکلمین

ہمیشہ سے تذکرہ کرتے چلے آئے ہیں ان کو گنوا دینا بھی خالی از فائدہ نہیں۔ تاکہ ان کے ترک کو ایک خلا نہ محسوس کیا جائے۔

صفاتِ ثبوتیہ :- وہ صفات کہ الہی جن کو علمائے امامیہ نے صفاتِ ثبوتیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے وہ آٹھ ہیں۔ قدم۔ علم۔ قدرت۔ حیات۔ ارادہ۔ ادراک۔ کلام۔ صدق۔

(۱) وہ قدیم ہے یعنی ہر شیئ سے پہلے ہے کیونکہ وہ مبدء المبادی ہے اور باقی سب مخلوق حادث ہے۔

(۲) وہ عالم ہے یعنی ہر شیئ ہر وقت اس کے سامنے حاضر ہے اور کوئی اس سے مخفی نہیں ہے۔

(۳) وہ قادر ہے کہ ہر شیئے پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔

(۴) وہ حیّ یعنی زندہ ہے اور یہ وہ صفت ہے جو علم و قدرت سے متصف ہونے کے لئے ضروری ہے اور اس کا زندہ ہونا اس کی اپنی شان سے ہے جو صفاتِ مخلوقین سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

(۵) وہ مرید ہے کہ اس کا ارادہ و مشیت تمام کائنات پر حاوی ہے۔

(۶) وہ مدرک ہے اور یہ صفت اور اس سے پہلی یعنی ارادہ دونوں کی بازگشت علم کی طرف ہے۔

(۷) وہ متکلم ہے جس چیز سے چاہے کلام پیدا کر سکتا ہے (کلام کی تحقیق وحی کے بیان میں مذکور ہوگی۔)

(۸) وہ صادق ہے سچ فرماتا ہے اور سچ کو پسند کرتا ہے۔

صفاتِ سلبیہ :- وہ صفات بالنقص جن سے دامنِ الوہیت منزہ ہے وہ سات ہیں۔ ترکیب۔ جسمیت۔ محلیت۔ للحوادث۔ رویت۔ شریک کا ہونا۔ حالیت۔ احتیاج۔

(۱) وہ مرکب نہیں کیونکہ مرکب ہوگا تو حادث ہوگا پس ہمیشہ نہ رہے گا۔

(۲) وہ جسم سے پاک و منزہ ہے کیونکہ یہ چیزیں حادث کی شان ہیں۔

(۳) وہ محلِ حوادث نہیں کیونکہ اس کو تغیر لازم ہے اور خدا اس سے اجل و ارفع ہے

(۴) وہ مرئی نہیں یعنی وہ نظر نہیں آسکتا نہ دنیا میں نہ قیامت کے روز نہ نبیوں ولیوں

اور فرشتوں کو اور نہ عام انسانوں اور جنوں کو کیونکہ کم از کم دیکھنے کے لئے رنگ اور سمت ضروری ہیں خداوند کریم رنگ نہیں رکھتا کیونکہ وہ جسم کی شان سے ہے اور عرض ہے اور خدا محل حوادث و اعراض بھی نہیں ہے نیز جس کو دیکھا جائے وہ کم از کم دیکھنے والے کی سامنے کی سمت میں ہو اور خدا سمتوں کا پابند نہیں وہ ہر جگہ ہے اور اس کا احاطہ کوئی جگہ نہیں کر سکتی۔

⑤ اس کا شریک کوئی نہیں اور بیانِ توحید میں مفصلاً بیان کیا جا چکا ہے۔

⑥ وہ کسی میں حلول نہیں کرتا یعنی حلول نہیں کرتا اور یہ کہ وہ احوال کے اختلاف سے مبرا ہے۔

⑦ وہ محتاج نہیں ہے اور تمام کائنات اس ایک کی محتاج ہے بس یہ وہ صفات ہیں جن کو متکلمین نے ذکر کیا ہے ان میں زیادہ طول کرنا میں پسند نہیں کرتا۔ بیانِ توحید میرے خیال میں اس مرحلہ کے لئے کافی و وافی ہے۔

اس کی صفات عین ذات ہیں

ذات واجب الوجود چونکہ واحد و بسیط ہے اور اجزاء سے مرکب نہیں ورنہ حدوث و تعدد لازم آئے گا اور یہ دونوں باتیں ذات حق سبحانہٗ میں محال ہیں اور وہ ایک طرف چونکہ وحدت و بساطت کے بلند ترین مقام پر فائز ہے اور دوسری طرف تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس کی تمام صفات اس کی عین ذات ہیں وہ لوگ جو صفات کو زائد بر ذات مانتے ہیں۔ ان کے لئے توحید کا اثبات نہایت مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ ہر صفت کے قدیم ہونے کی صورت میں ایک نہیں بلکہ اتنے واجب بن جائیں گے جس قدر صفات ہوں گی اور اگر آپ اس کی تقریب تمثیل کے رنگ میں معلوم کرنا چاہیں تو اپنے نفس کا جائزہ لے لیں اور بقولِ معصوم جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

دیکھئے نفس میں متعدد صفات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً محبت، بغض، ارادہ، کراہت، علم و دانش، سخاوت، شجاعت اور علاوہ ازیں بیسیوں صفات جن سے وہ متصف ہے اور وہ اتنی صفات کے بعد بسیط بھی ہے اور واحد بھی ہے اور یہ صفاتِ متغایرہ نہ اس کی ذات میں ترکیب پیدا کر سکتی ہیں اور نہ اس کی حقیقی وحدت میں خلل انداز ہو

سکتی ہیں حالانکہ سب کی سب ایک ہی ذات سے ظہور پذیر ہوتی ہیں اور یہ مثال سمجھانے کے لئے ہے ورنہ اللہ کی عظمت اور اس کا جلال ارفع و اعلیٰ ہے اس سے کہ اس کی کوئی مثال دی جا سکے۔ ہر انسان بدیہی طور پر جانتا ہے کہ اس کا نفس ابتداً میں بالکل جاہل تھا پھر مراجعۂ کتب اور مطالعۂ صحف کے ذریعہ سے متفرق علوم و معارف سے وہ متصف ہوا نیز نچپنے میں عاجز تھا پھر ایک وقت کے بعد صاحب قدرت ہوا اور اعضاء و قوٰی کی مدد سے صنعتوں میں اس نے آگے بڑھنا سیکھا اسی طرح وہ پہلے کچھ نہ دیکھ سکتا تھا پھر ایک مدت کے بعد ماں کی دور و نزدیک چیزوں سے اس کی آنکھ شناسا ہوئی اور پہلے گونگا و بہرہ تھا پھر بولنے اور سننے لگا۔ غرضیکہ تمام صفات و ملکات ہماری ذات سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں نہ یہ ہماری عین ذات ہیں نہ جزو ذات ورنہ جب سے ہماری ذات تھی تب سے یہ صفات و ملکات بھی ہوتے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حاصل ہونے کے بعد یہ تمام صفات نفس کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں اسی بناء پر علم و معلوم و عالم کے اتحاد کا قول حکماء نے کیا ہے اور اس سب کچھ کے باوجود اگر عقل کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ ان صفات کو نفس سے الگ بھی دیکھتی ہے کہ ذات اور ہے اور صفات اور ہیں پھر ان صفات میں بھی باہمی اتحاد نہیں ہے علم قدرت سے متحد نہیں اور سماعت گویائی سے الگ صفت ہے یعنی عالم کے لئے قدرت ضروری نہیں اور قادر کے لئے علم غیر ضروری ہے اسی طرح سننے کے لئے بولنا ضروری نہیں اور بولنے کے لئے سماعت کا ہونا ضروری نہیں اور تمام صفات کا باہمی تعلق اسی نوع سے ہے پس جس طرح یہ صفات ذات سے بھی جدا ہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے بھی جدا ہیں تو اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں رہی کہ کسی ایجاد کرنے والے نے یہ صفات ہمیں سونپ رکھی ہیں۔

پس جس طرح ممکن کی ذات کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مبداء و منتہیٰ ایک ایسی ذات تک ہو جو خود واجب الوجود ہو اسی طرح اس کی صفات کے لئے بھی ضروری ہے کہ ان کا منتہیٰ بھی صفات واجبہ ہوں تو ضروری ہوا کہ وہ صفات واجبہ اس ذات واجب کی عین ذات ہوں ورنہ اگر زائد بر ذات ہوں گی تو ان کا منتہیٰ کسی اور ذات کو ماننا پڑے گا۔ حالانکہ ذات واجب سے پہلے کوئی شئے نہیں اور وہی سب سے

پہلے ہے۔

پس ذات واجب الوجود کی جمیع صفات کمالیہ اس کی ذات کی عین ہیں اور وہ صفات آپس میں بھی ایک دوسری کی عین ہیں گویا ایک ذات جو ہر حیثیت سے ایک ہے۔ وہ علم قدرت حیات اور ارادہ وغیرہ تمام صفاتِ کمال کی مظہر ہے اور وہ ان تمام صفات کی عین ہے اور صفات کو زائد بر ذات ماننا ترکیب و حدوث کا موجب ہے اور نیز شرک کا لازمہ ہے اور خدا اس سے اجل و ارفع ہے پس تمام صفاتِ کمال کا منبع و سرچشمہ واحد و بسیط ہے اس بارے میں حضرت امیر المومنینؑ رئیس الموحدین کا قول بطور تبرک ہم پیش کرتے ہیں۔

أَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهٗ وَكَمَالُ الْمَعْرِفَةِ التَّصْدِيْقُ بِهٖ وَكَمَالُ التَّصْدِيْقِ بِهٖ تَوْحِيْدُهٗ وَكَمَالُ التَّوْحِيْدِ الْإِخْلَاصُ لَهٗ وَكَمَالُ الْإِخْلَاصِ لَهٗ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ أَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوْفِ وَشَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوْفٍ أَنَّهٗ غَيْرُ الصِّفَةِ فَمَنْ وَصَفَهٗ سُبْحَانَهٗ فَقَدْ قَرَنَهٗ وَمَنْ قَرَنَهٗ فَقَدْ ثَنَّاهُ وَمَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّاهُ وَمَنْ جَزَّاهُ فَقَدْ جَهِلَهٗ وَمَنْ أَشَارَ إِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهٗ وَمَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ وَمَنْ قَالَ فِيْمَ فَقَدْ ضَمَّنَهٗ وَمَنْ قَالَ عَلٰى مَ فَقَدْ أَخْلٰى مِنْهُ

اول دین اس کی معرفت ہے اور کمال معرفت اس کی تصدیق ہے اور کمال تصدیق اس کی توحید کا اقرار ہے اور توحید کے اقرار کا کمال اخلاص ہے اور کمال اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ موصوف سے الگ ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے پس جس نے (ذات کو صفت سے الگ کرتے ہوئے) اس کی وصف کی تو اس نے گویا اس کے ساتھ وصف کو ملا یا اور جس نے کسی شئی کو ملایا تو اس نے دو بنائے اور جس نے اس کو دو بنایا تو اس نے صاحب اجزاء سمجھا اور صاحب اجزاء سمجھنے والا اس کا جاہل ہوا جس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے محدود سمجھا اور جس نے محدود سمجھا اس نے اس کو شمار کیا اور جس نے کہا وہ کہاں ہے تو اس نے اس کو مکان کا محتاج سمجھا

اور جس نے کہا کہ وہ کس جگہ ہے تو اس نے بعض مقامات کو اس سے خالی جانا

ایک اور مقام پر نفی صفات زائدہ کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

مَنْ وَصَفَهٗ فَقَدْ حَدَّهٗ وَ مَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ وَمَنْ عَدَّهٗ فَقَدْ اَبْطَلَ اَزَلَهٗ وَ مَنْ قَالَ كَيْفَ فَقَدِ اسْتَوْصَفَهٗ وَمَنْ قَالَ اَيْنَ فَقَدْ حَيَّزَهٗ عَالِمٌ اِذْ لَا مَعْلُوْمٌ وَرَبٌّ اِذْ لَا مَرْبُوْبٌ وَقَادِرٌ اِذْ لَا مَقْدُوْرٌ۔

جس نے اس کی وصف کی گویا اس نے اس کی تحدید کی اور جس نے اس کی تحدید کی گویا اس نے اس کو شمار کیا اور جس نے شمار کیا اس نے اس کی ازلیت کو باطل کیا اور جس نے کہا وہ کس طرح ہے گویا اس نے اس کی حالت دریافت کی اور جس نے کہا کہ وہ کہاں ہے تو اس نے اس کے لئے مکان تجویز کیا وہ اس وقت سے عالم ہے جب معلوم کوئی نہ تھا اور وہ اس وقت رب تھا جب مربوب کوئی نہ تھا اور وہ اس وقت قادر تھا جب مقدور کوئی نہ تھا۔

دعا مانگنے کا طریقہ

جب مسئلہ توحید کی وضاحت ہو چکی تو خیال پیدا ہوا کہ دشمنان اہلبیت شیعوں کی طرف جن اغلاط کو منسوب کرتے ہیں ان کا ازالہ کیا جائے چنانچہ ان میں سے ایک دعا تھی۔ یقیناً شیعہ لوگ مقام دُعا میں مصائب کا دفع یا مطالب میں حاجت روائی وہ صرف اللہ سے ہی چاہتے ہیں وہ محمدؐ و آل محمدؐ کو وسیلہ قرار دے کر اللہ کو ہی تمام امور کا مرجع و ماویٰ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح مقام عقیدہ میں بھی یہی یقین ضروری ہے کہ صرف اللہ ہی خلق و رزق و موت و حیات و تندرستی و بیماری اور سفر و حضر میں حل مشکل و دفع مصیبت کے لئے مختار کل ہے اور اسی کے ارادہ و مشیت سے تمام نظام عالم باقی و جاری ہے اور محمدؐ و آل محمدؐ اس کے دین کے مبلغ و ہادی ہیں اور بارگاہ رب العزت میں قرب کا وسیلہ ہیں اور ان کے ذ[illegible] سے دُعا مستجاب ہوتی ہے۔

نذر و نیاز

اور یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جب حل مشکل اور دفع مصیبت کے لئے نذر و منت مانی جائے تو اس کا طریقہ بھی یہی ہے۔

کر کہے اگر میرا فلاں مشکل کام ہو گیا یا فلاں مصیبت دفع ہو گئی یا فلاں مقصد پُورا ہو گیا۔ تو رضائے پروردگار کی خاطر یعنی قربتہً الی اللہ فلاں چیز کی قربانی کروں گا یا فلاں خیرات دوں گا یا فلاں عبادت کروں گا۔ البتہ حضرت ابوالفضل عباس علیہ السلام کے علم کو پکڑ کر یا تعزیہ مبارکہ کے سامنے کھڑے ہو کر یا مسجد و امام بارگاہ میں جا کر یہ منت ماننا اور زیادہ مقبولیت کی باعث ہوگی اور علاوہ ازیں آئمہ طاہرین علیہم السلام کے وسیلہ سے اگر دُعا کی جائے تو اور زیادہ بہتر ہوگی اور منت سوائے ذات پروردگار کے کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی ایفا واجب ہے اور اگر روحانی طور پر آل محمدؐ کو خطاب کر کے کہے مثلاً مولائے حضرت عباس مولائے حضرت مولائے مشکل کشا میری یہ مشکل ہے اور میرا وسیلہ تمہاری ذات کے سوا کوئی نہیں پس تمہارے وسیلہ سے میں عرض کرتا ہوں اگر اللہ میری یہ حاجت پُوری کرے تو میں تیرے ماننے والے مسکینوں اور غریبوں کو فلاں چیز کھلاؤں گا یا نیاز کروں گا یا اتنی نماز یا اتنے روزے یا اتنی خیرات کروں گا وغیرہ۔ چونکہ میرے گناہ دعا کے مستجاب ہونے سے مانع ہیں لہٰذا آپ ہی خدا سے مجھے فلاں چیز دلوا دیں پس اس میں کوئی شرک نہیں ہے بلکہ محمدؐ و آل محمدؐ کی امداد کا یہی مقصد ہے اور وہ اسی طرح حلالِ مشکلات ہیں

خلاصۃ القول

سارے سابق بیان سے یہ خلاصہ سمجھئے کہ توحید کے عقیدہ میں کوئی افراط و تفریط ہے لیکن صحیح عقیدہ یہ ہے کہ توحید باری کا چار طریقوں سے تسلیم کرنا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے توحید ذات توحید صفات توحید در افعال اور توحید در عبادت۔

توحید ذات

یعنی خداوند قدوس جو مبداء جمیع خلائق ہے وہ واحد اور ہر لحاظ سے بسیط ہے اس کی کوئی جزو نہیں نہ تحلیلی نہ ترکیبی۔ نہ خارجی نہ ذہنی تمام موجودات کو اس نے اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا ہے اس میں اس کا کوئی شریک و حصہ دار نہیں ہے اس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا وہ ہر شئے سے اوّل ہے اس سے پہلے کوئی نہیں اور وہ ہر شئے کے آخر ہے اس کے بعد کوئی شئے نہیں وہ فاعل مختار ہے فاعل موجب نہیں۔ ساری خدائی کا نظام اسی کے حسن تدبر و حکمت کاملہ کا نتیجہ ہے اور وہ اسی نظام میں نہ تھکتا ہے نہ کسی دوسرے کی مدد کا محتاج ہے وہ ہر ایک کا محسن ہے انسان ملک جن نبی رسول ولی اور سب کی سب مخلوق اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور ہر ایک کا ولی و کارساز وہی ایک ہے۔

توحید صفات یعنی وہ تمام صفات کمال کا جامع ہے اور تمام صفات اس کی عین ذات ہیں اگر صفات کو اس کی ذات سے الگ مانا جائے تو تعدد و احتیاج لازم آئے گا اور اس کی تمام صفات میں بھی اتحاد موجود ہے پس وہ ایک ذات ہے جو جمیع صفات کمال کی مظہر ہے۔

توحید در افعال یعنی خلق رزق موت و حیات اور امور تکوینیہ کا مکمل نظام اور اس میں چھوٹی بڑی تمام صنعتیں و حکمتیں اسی کی تدبیر اتم کی مرہون منت ہیں پس اس کا کوئی شریک نہیں نہ ذاتی طور پر اور نہ تفویض کے طریقے سے بس وہی ایک سب اقتدار کا واحد مالک ہے۔

توحید در عبادت یعنی عبادت صرف اسی ایک کیلئے ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کرنا ناجائز ہے البتہ مقام دعا میں محمد و آل محمد کا وسیلہ دعاؤں کی مقبولیت کا ذریعہ ہے

اللہ کی کنہ ذات کا علم ناممکن ہے

اتنا تو معلوم ہو گیا کہ اس عالم حادث کا ایک موجد ہے جو ازلی و ابدی ہے اور واجب الوجود ہر نقص کے علاوہ تمام صفات کمال کا جامع ہے۔ اور وہ واحد و یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ لیکن اس سے آگے قدم رکھتے ہوئے اس کی کنہ ذات کا معلوم کرنا ناممکن ہے اور اس کا ادراک نہ کسی ملک مقرب کے بس میں ہے اور نہ کسی نبی و مرسل اور ولی مرشد کی قدرت میں ہے اسی لئے تو سب کے سب یہ اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ یعنی ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا جس طرح حق معرفت ہے۔

پس نہ اس کی ذات کی کنہ پہچانی جا سکتی ہے اور نہ اس کی صفات کی کنہ جانی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے صفات عین ذات ہیں چنانچہ ابھی ابھی ثابت ہو چکا ہے ذرا حضرت امیر المومنین کی زبانی سنیئے۔ آپ ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَا یَبْلُغُ مِدْحَتَهُ الْقَائِلُوْنَ وَلَا یُحْصِیْ نَعْمَائَهُ الْعَادُّوْنَ وَلَا یُؤَدِّیْ حَقَّهُ الْمُجْتَهِدُوْنَ الَّذِیْ لَا یُدْرِكُهُ بُعْدُ الْهِمَمِ وَلَا یَنَالُهُ غَوْصُ الْفِطَنِ الَّذِیْ لَیْسَ لِصِفَتِهِ حَدٌّ مَحْدُوْدٌ وَلَا نَعْتٌ مَوْجُوْدٌ وَلَا وَقْتٌ مَعْدُوْدٌ وَلَا اَجَلٌ مَمْدُوْدٌ الخ

اس اللہ کے لئے حمد ہے جس کی مدح کو کرنے والے نہیں پہنچ سکتے۔ اور جس کی نعمتوں کو گننے والے نہیں شمار کر سکتے اور جس کا حق کوشش کرنے والے نہیں

ادا کر سکتے اور وہ جس کو ہمتوں کی بلندی نہیں پا سکتی اور نہ اس کی حقیقت کی تہہ تک عقل و دانش کی غوطہ زنی پہنچ سکتی ہے وہ جس کی صفت کی مقرر حد نہیں اور نہ اس کی تعریف کے لفظ معین ہیں نہ فانی زمان اور نہ طولانی مدت داس کی صفت کے لئے کافی ہیں)

انسانوں میں ادراک کے ذرائع پانچ حواس ہیں قوتِ باصرہ قوتِ سامعہ قوتِ شامہ قوتِ ذائقہ قوتِ لامسہ باصرہ صرف رنگ کو ادراک کرتی ہے سامعہ آوازوں کو معلوم کرتی ہے شامہ خوشبو و بدبو جان سکتی ہے ذائقہ سے تلخ و شیریں کا پتہ چلتا ہے۔ اور لامسہ سے گرم و سرد یا نرم و سخت معلوم کیا جاتا ہے اور حضرت حق سبحانہٗ ان سب سے بلند و بالا ہے نہ اس کا رنگ نہ آواز نہ خوشبو و بدبو نہ تلخ و شیریں نہ گرم و سرد اور نہ نرم و سخت بلکہ ان تمام کیفیات و حالات کا خالق ہے۔ جب یہ نہ تھیں وہ تھا اور قوائے باطنہ میں سے نہ وہم کی اس تک رسائی ہے نہ خیال کی پہنچ جس طرح عالم سفلی کی مخلوق اس کی حقیقت کنہ کے ادراک سے عاجز ہے اسی طرح عالم بالا اور ملاءِ اعلیٰ کی مخلوق بھی اس کی کنہ معلوم کرنے سے قاصر ہے کیونکہ جو ذہن میں آئے گا وہ ذہن کی مخلوق ہو گا اور محدود ہو گا اور اللہ اس سے اجل وارفع ہے اس کی معرفت اس کے افعال و آثار سے ہوتی ہے اور اس کی ذات میں گھسنا تحیر و اضطراب کا باعث ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

شعر: اے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم   وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

ترجمہ:۔ اے وہ جو قیاس و خیال و گمان و وہم سے بھی برتر ہے اور ہر اس صفت سے بلند ہے جو لوگوں نے بیان کی اور ہم نے سنی یا پڑھی۔

خدا کے تجسم کا ابطال

خداوند قدوس کے لئے جب یہ ثابت ہوا کہ وہ مبدأ المبادی اور علت العلل ہے تو اس میں تمام کمال کی صفات کا ہونا اور اس سے تمام صفاتِ نقص کا دور ہونا خود بخود واضح ہو جاتا ہے بنا بریں خدا کا جسم ہونا یا نہ ہونا یا کسی جسم کا عرض ہونا محال ہے۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں تغیر و زوال اور حدوث و امکان کا پیش خیمہ ہیں اور واجب الوجود ان سے اجل وارفع ہے لیکن اہل اسلام میں ایک فرقہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے جو اللہ کے جسم کے قائل ہیں اور خصوصاً صوفیوں میں یہ عقیدۂ فاسدہ کافی

حد تک مقبول ہے وہ لوگ اپنے خوابوں میں بھی اللہ کو جسم بشری کے سانچہ میں دیکھنے کی حکایات بیان کیا کرتے ہیں یہ لوگ معرفت پروردگار سے بہت دور ہیں اور قرآن مجید کی جن بعض آیات سے ان لوگوں کو اشتباہ ہوتا ہے مثلاً آدم کی خلقت کے متعلق فرماتا ہے۔ اے ابلیس تونے اس کا سجدہ کیوں نہ کیا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ اور جنہوں نے سچ مچ ہاتھ سمجھ کر خدا کو جسم دار کہہ دیا وہ مجسمہ کہلائے۔ اسی طرح کُنْ فَیَکُوْن کے لہجہ میں تکوین پروردگار کو صحیح معنوں میں نہ سمجھتے ہوئے مجسمہ نے سچ مچ کی زبان سمجھ کر اللہ کا جسم مان لیا اور کافر ہوئے اور غالی اور مفوضہ لوگوں نے اس کی زبان اور جسم کو محال قرار دے کر محمدؐ و آل محمدؐ کو کُنْ کہنے والا ثابت کرکے ان کو خالق عالم قرار دے دیا اور شرک کے جال میں جا پھنسے حالانکہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے خود ان کو پیدا کیا تھا اس وقت کُنْ کہنے والا کون تھا؟ پس جس طرح مجسمہ تفریط میں کافر ہوئے اسی طرح غالی افراط میں مشرک ہو گئے پس اس کا حل یہ ہے کہ پہلی جگہ دو ہاتھوں سے مراد قدرت و ارادہ ہے اور دوسری جگہ کُنْ سے مراد لفظ کُنْ نہیں۔ بلکہ ہمارے سمجھانے کے لئے یہ لفظ کہہ دی گئی ہے ورنہ مقصد یہ ہے کہ میں جس چیز کو پیدا کرنا چاہوں بس ارادہ کرتا ہوں کہ ہو جا تو چیز ہو جاتی ہے جس طرح ہم میں سے کوئی انسان کسی چیز کو کہے ہو جا اور وہ فوراً ہو جائے گویا یہ اس کی کمال قدرت اور سرعت خلق یا نفاذ ارادہ کی تعبیریں ہیں ورنہ لفظ کہنے کی کیا ضرورت ہے ایک مقام پر ارشاد خداوندی ہے۔ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وہ دن کہ پنڈلی سے کپڑا اتارا جائے گا اور لوگوں کو سجدہ کی دعوت دی جائے گی تو مجسمہ نے اس کو جسم سمجھا اور خدا کو ایک اچھی خاصی شکل و جسامت میں قید کر کے اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے قائل ہوئے۔ حالانکہ یہ فقرہ سختی کو ظاہر کرنے کے مقام پر مستعمل ہوتا ہے ایک حماسی شاعر نے کہا ہے کَشَفَتْ لَهُمْ عَنْ سَاقِهَا یعنی جنگ نہایت سخت حالت پر پہنچ گئی۔ آیت مجیدہ میں بھی روز قیامت کی سختی و شدت مقصود ہے ایسے ہی یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ میں چونکہ رسول کا ہاتھ بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں پر تھا اور رسول کا کام خدا اپنی طرف منسوب فرماتا ہے کیونکہ وہ بغیر رضائے پروردگار کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ پس رسول کے ہاتھ کو اللہ نے اپنا ہاتھ کہہ دیا۔

خلاصہ یہ کہ مجسمہ کا مذہب باطل ہے اور تجسم کے قائل کافر ہیں اور قرآن مجید یا احادیث میں جہاں بھی ایسے الفاظ ملیں جہاں خدا کے جسم ہونے کے متعلق شائبہ ہوتا ہو تو وہ واجب التاویل ہیں کیونکہ ادلہ قطعیہ سے خدا کا جسم و جسمانیات سے مبرّا و پاک ہونا ثابت ہے اور تاویل سے مراد ایسی تاویل جو آلِ محمدؐ سے منقول ہو اور عقل قبول کرے نیز ادلہ توحید سے ٹکرانے والی نہ ہو۔ غالیوں اور مفوضہ کی طرح تاویل نہ ہو کہ تجسم کے قول سے بچکر شرک میں جا کودے بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے کھڑا ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ حضرت علیؑ کی محبت میں دیوانہ پن غلو کے رنگ میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس محبت کی دیوانگی کا رخ حضرت علیؑ کی سیرت کی طرف ہونا چاہیے پس علیؑ کی محبت میں نماز واجب کے ساتھ ساتھ نوافل ادا کر لیا کریں۔ ان کی محبت میں اعمال ناشائستہ سے توبہ کر لیں ان کی محبت کے جوش میں اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کریں اور اگر حج واجب ہے تو وہ ادا کریں۔ بہرکیف محبت کو شریعت کے سانچہ میں ڈھال کر اپنی دیوانگی کا ثبوت دینا چاہیے حضرت علیؑ کی محبت میں دیوانگی صرف عقائد کو مسخ کرنے اور عقیدہ توحید پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے نہیں ہونی چاہیے۔

چوتھا باب

عدل کا بیان

عقیدہ عدل کے دو پہلو ہیں یا اس اصل کے دو رخ ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے عدل کا اعتقاد ہو اور دوسرے یہ کہ اللہ کے دین میں اور مقام عمل میں عدل کو میزان قرار دیا جائے پس پہلا عدل اعتقادی ہے۔ اور دوسرا عدل عملی ہے ہم اس جگہ بیان میں پہلے عدل عملی کو بیان کرتے ہیں کیونکہ افہام و تفہیم کی آسانی اسی میں ہی ہے۔

عدل عملی

عدل کا معنی ہے ہر شیئ کو اپنے موزوں مقام پر رکھنا اور حق دار کو حق دینا عدل مخلوق کے درمیان اللہ کا میزان ہے۔ عدل ہی کی بدولت آسمان و زمین کو بقاء حاصل ہے اور عقل کے جملہ احکام میں سے وجوب عدل سے واضح تر اور کوئی دوسرا حکم نہیں۔ گویا وجوب عدل و حسن احسان اور حرمت ظلم و قبح عدوان عقل کے بدیہی اور ضروری فیصلوں میں سے ہیں۔ عدل تمام خوبیوں کی جڑ ہے خواہ وہ خوبیاں نفسی ہوں یا معاشرتی و تمدنی اور ظلم تمام برائیوں کا منبع ہے خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اور میزان عدل کی موافقت انسان کی دنیاوی و دینی ہر دو زندگیوں میں اس کی ارتقاء کی ضامن ہے اور ظلم اس کے برعکس ہر دو لحاظ سے اس کی پستی کا موجب ہے۔ غرضیکہ عدل کی خوبیاں حد و شمار سے باہر ہیں جس طرح کہ ظلم و عدوان کی برائیاں حیطۂ حساب و شمار سے باہر ہیں۔ دنیا میں جن قوموں نے کسی حد تک معراج بلندی پر قدم رکھا ان کے دیگر اسباب ترقی و کمال میں سے عدل و انصاف کے اصول پیش پیش تھے اور جب بھی ان کو کمال ارتقاء کے بعد تنزل کے بُرے دن دیکھنے نصیب ہوئے تو دوسرے اسباب تنزل میں سے ظلم و عدوان کا دخل زیادہ تھا۔ پس انسانی شرافت کا معیار عدل ہے اور ان کی نحبت اور پستی کا سب سے بڑا نشان ظلم و عدوان ہے یہ دُور جس سے ہم گذر رہے ہیں ظلم و جور کا دَور ہے نہ شخصی و انفرادی سطح پر عدل

موجود ہے اور نہ تدبیرِ منزل عدل کی مقدس زندگی سے آشنا ہے اور نہ نوعی تمدن میں عدل کی حکومت ہے انسان کا معاشرہ عدل و انصاف کی گردن پر چھری پھیرنے کو اپنی بہت بڑی کامیابی تصور کرتا ہے اور اسے شرافت کا نام دیکھ خوش ہوتا ہے۔

اپنے نفس پر ظلم اولاد پر ظلم بیوی پر ظلم حتیٰ کہ ماں باپ پر ظلم اسی طرح سارے معاشرہ میں اپنے بیگانے سب ایک دوسرے کے ظلم کے شاکی نظر آئیں گے کہیں عدل کا نام تک سننے میں نہ آئے گا سلطان رعایا کے ظلم کا شاکی اور رعایا کو صاحبانِ اقتدار کے ظلم کا شکوہ ہے اور یہ ظلم ابھی منازل ترقی طے کر رہا ہے اور ساری دنیا اس چکی میں پستی جا رہی ہے لوگوں میں عدل کا نام صرف برائے نام ہے۔

آہ یہاں درد ہیں جو دل کو بے تاب کرتے ہیں آنسو ہیں جو آنکھوں میں جھلک جاتے ہیں مایوسی موت کا منظر سامنے لاتی ہے اور صرف اُمید ہے جو دل کو سہارا دیتی ہے کہ ایک وقت آئے گا حق کا بول بالا ہو گا۔ عدل کی بساط بچھی ہو گی اور امام عادل تختِ حکومت پر جلوہ فگن ہو گا آہ کس قدر وہ پُرکشش اور جاذبِ نظر منظر ہو گا۔ جب عدل کا دَور اور انصاف کا ظہور بسنے والوں کے لئے جنت کا سماں پیدا کرے گا اور کس قدر خوش بخت لوگ ہوں گے جو اپنے امام عادل کے سایہ میں امن و اطمینان کا سانس لیتے ہوئے شکر پروردگار میں رطب اللسان ہوں گے۔ اے اللہ اپنی حجت کے ظہور و فرج میں تعجیل فرما جس کی بدولت جور و ظلم سے پُر دنیا عدل و انصاف کا گہوارہ بنے گی اور ہمیں توفیق سعدیہ مرحمت فرما کہ ہم ان کے غلام بننے کی سعادت حاصل کر سکیں۔

اصولِ عدل

عدل و انصاف سے وابستگی اور اس کے میزان کو قائم کرنا یا اس کے اصول کا اجراء حقوق کی معرفت پر موقوف ہے اور چونکہ حقوق بہت کچھ ہیں اور ان کا شمار چنداں آسان بھی نہیں مثلاً حقوقِ اعتقادیہ اور حقوقِ عملیہ دو ہیں پھر حقوقِ اعتقادیہ جینتہ سی اقسام پر ہیں اور حقوقِ عملیہ کی بھی متعدد اقسام ہیں۔ حقوقِ نفس حقوقِ منزل حقوقِ معاشرہ پھر ان کے اقسام کو پھیلایا جائے تو ایک بہت لمبی فہرست مرتب ہو گی باپ بیٹے کے حقوق شوہر بیوی کے حقوق ہمسایہ کے حقوق فقراء و مساکین کے حقوق سائل کے حقوق دوست کے حقوق عالم و منبر و قرآن کے حقوق حیوانات کے حقوق کنیزوں و غلاموں کے حقوق چنانچہ الرائب فقہ میں ایک سرسری مطالعہ کرنے سے حقوق کا ایک بہت بڑا دفتر کھل جاتا ہے اور تمام حقوق یہ عدل کی حکومت ہی معیار شرف ہے پس حقوق کی نوعی و شخصی کثرت کے باوجود ان کا انحصار تین اصولوں میں کیا جا سکتا ہے جو تمام

موجود ہے اور نہ تدبیر منزل عدل کی مقدس زندگی سے آشنا ہے اور نہ نوعی تمدن میں عدل کی حکومت ہے انسان کا معاشرہ عدل و انصاف کی گردن پر چھری پھیرنے کو اپنی بہت بڑی کامیابی تصور کرتا ہے اور اسے شرافت کا نام دیکر خوش ہوتا ہے۔

اپنے نفس پر ظلم اولاد پر ظلم بیوی پر ظلم حتیٰ کہ ماں باپ پر ظلم اسی طرح سارے معاشرہ میں اپنے بیگانے سب ایک دوسرے کے ظلم کے شاکی نظر آتیں گئے کہیں عدل کا نام تک سننے میں نہ آئے گا سلطان رعایا کے ظلم کا شاکی اور رعایا کو صاحبان اقتدار کے ظلم کا شکوہ ہے اور یہ ظلم ابھی منازل ترقی طے کر رہا ہے اور ساری دنیا اس چکی میں پستی جارہی ہے لوگوں میں عدل کا نام صرف برائے نام ہے۔

آہ یہاں وہ درد ہیں جو دل کو بے تاب کرتے ہیں آنسو ہیں جو آنکھوں میں چھلک جاتے ہیں مایوسی موت کا منظر سامنے لاتی ہے اور صرف امید ہے جو دل کو سہارا دیتی ہے کہ ایک وقت آئے گا حق کا بول بالا ہو گا۔ عدل کی بساط بچھی ہو گی اور امام عادل تخت حکومت پر جلوہ فگن ہو گا آہ کس قدر وہ پرکشش اور جاذب نظر منظر ہو گا۔ جب عدل کا دور اور انصاف کا طور بسنے والوں کے لئے جنت کا سماں پیدا کرے گا اور کس قدر خوش بخت لوگ ہوں گے جو اپنے امام عادل کے سایہ میں امن و اطمینان کا سانس لیتے ہوئے شکر پروردگار میں رطب اللسان ہوں گے۔ اے اللہ اپنی حجت کے ظہور و فرج میں تعجیل فرما جس کی بدولت جور و ظلم سے پُر دنیا عدل و انصاف کا گہوارہ بنے گی اور ہمیں توفیق سعادت مرحمت فرما کہ ہم ان کے غلام بننے کی سعادت حاصل کر سکیں۔

اصول عدل

عدل و انصاف سے وابستگی اور اس کے میزان کو قائم کرنا یا اس کے اصول کا اجراء حقوق کی معرفت پر موقوف ہے اور چونکہ حقوق بہت کچھ ہیں اور ان کا شمار چنداں آسان بھی نہیں مثلاً حقوق اعتقادیہ اور حقوق عملیہ دو ہیں پھر حقوق اعتقادیہ بجنسہ کئی اقسام پر ہیں اور حقوق عملیہ کی بھی متعدد اقسام ہیں۔ حقوق نفس حقوق منزل حقوق معاشرہ پھر ان کے اقسام کو پھیلایا جائے تو ایک بہت لمبی فہرست مرتب ہو گی باپ بیٹے کے حقوق شوہر بیوی کے حقوق ہمسایہ کے حقوق فقراء و مساکین کے حقوق سائل کے حقوق دوست کے حقوق عالم و مسجد و قرآن کے حقوق حیوانات کے حقوق کنیزوں و غلاموں کے حقوق چنانچہ الواب فقہ میں ایک سرسری مطالعہ کرنے سے حقوق کا ایک بہت بڑا دفتر کھل جاتا ہے اور تمام حقوق میں عدل کی حکومت ہی معیار شرف ہے پس حقوق کی نوعی و شخصی کثرتوں کے باوجود ان کا انحصار تین اصولوں میں کیا جا سکتا ہے جو تمام

حقوق کا مرجع بن سکتی ہے اور بشہادتِ عقل جملہ حقوق ان میں منحصر ہیں۔

۱۔ حقوقِ نفسیہ	وہ حقوق جو انسان کے اپنے نفس کے لئے ہی اس کی ذات پر عائد ہیں۔
۲۔ حقوق اللہ	وہ حقوق جو انسان پر اپنے خالق کی ذات کے لئے عائد ہیں
۳۔ حقوقِ معاشرہ	وہ حقوق جو انسان کے دوسروں کے ساتھ وابستہ ہیں

اور حقوق کی ہر سہ اقسام اور ان میں عدل کے ضابطے درسِ خداوندی کے تعلیم یافتہ عالمِ ربانی کی زبانی ہم پیش کرتے ہیں جن کے سامنے معلمِ اوّل و ثانی طفلِ مکتب کی حیثیت سے بھی پست تر ہیں پس ہر اصل کے متعلق مولائے مومنین کا ارشاد کافی و وافی ہے۔

حقوقِ نفسیہ میں عدل کا میزان

ایک خطبہ میں آپ ایک عبد کی صفت بیان کر رہے ہیں جس کو خدا نے اپنی نفسی اصلاح کی توفیق دی وہ شخص جو اپنے نفس پر عدل کو ضروری قرار دے پس اس کا پہلا عدل یہ ہے کہ اپنے نفس سے خواہشات کو دور رکھے حق کو بیان کرے اور خود اس پر عمل کرے خیر کی کسی غایت کو ترک نہ کرے اور اس کی کسی جائے توقع سے چشم پوشی نہ کرے پس ایسا شخص ہی تاریکیوں میں چراغ دھندلکے میں مینار امورِ معضلہ کا فاتح اور طرقِ مشکلہ میں قائد ہو سکتا ہے بولے تو سچ ورنہ خاموش رہنے میں بہتری سمجھے پس اس نے اللہ کے لئے اخلاص کیا تو اللہ نے اس کو اپنا خالص بنا لیا ایسے لوگ اللہ کے دین کی معدن اور زمین پر اس کی ایک مضبوط چٹان ہوا کرتے ہیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کو اپنے نفس کی اصلاح کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

(بیٹا) اپنے دل کو موعظہ کے ساتھ زندہ رکھو اور زہد کے ساتھ اس (کی خواہشات) کو مارو اس کو یقین و حکمت کے ساتھ طاقت ور اور نورانی بناؤ ذکرِ موت سے اس کو مطیع کرو اور اس کو موت سے یقین دہانی کرو۔ دنیا کے حوادث اور زمانہ کے انقلابات سے اس کو بصیرت دو۔ اخبارِ سلف اور ان کے آلام و مصائب سے اس کو آگاہ کرو۔ ان کی تاریخ و آثار کا مطالعہ کرو دیکھو انہوں نے کیا کیا کہاں سے آئے اور اب کہاں فروکش ہیں وہ دوستوں سے جدا ہو کر مقامِ غربت میں اترے ہیں اور تو بھی عنقریب ان جیسا ہو گا پس اپنے اس ٹھکانے کی اصلاح کرو اور آخرت کو دنیا کے بدلہ میں، فروخت نہ کرو۔

عدلِ ذاتی اور خلقِ نفسی کے متعلق کوئی نظریہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ آپ نے نفس میں عدل کا پہلا زینہ نفسی خواہشات کو ہی قرار دیا ہے کیونکہ جب تک نفسی خواہشات میزانِ عدل

نہ اتریں تو تحصیل کمال اور نیل سعادت کے لئے کوئی قدم اٹھایا ہی نہیں جا سکتا پھر انسان رد سے
انسانی میں حیوانی لذات اور درندگی صفات کا دلدادہ ہو کر رہ جائے گا لیکن یہ یاد رہے کہ جذبات
ہیں انسان جس حد تک بڑھے ادنیٰ حیوانوں کی سی شہوت رانیوں تک نہیں پہنچ سکتا اور انسان
جس قدر ان خواہشات کا دلدادہ ہو گا۔ ان جیسے حیوانوں کے مشابہ اور قریب تر ہو گا اور جس طرح
انتہائی کوشش کے باوجود بھی انسان درندگی میں ایک خونخوار بھیڑیے کی برابری نہیں کر سکتا اسی
طرح جنسی تعلقات میں بے راہ روی میں کس قدر آگے بڑھے ایک معمولی گدھے کی سی لذت
اندوزی کا مقابلہ نہیں کر پاتا۔ بہرکیف حیوانی لذات و خواہشات و جذبات کو جس قدر بے لگام
کیا جائے گا فلاح و صلاح سے دوری ہوتی جائے گی اور ان قوتوں کا جوش تب ٹوٹ سکتا ہے
جب ان کی مخالفت میں محنت کوشش اور اچھی خاصی ریاضت کی جائے۔ دیکھئے زمین اگرچہ
بذاتِ خود قابلِ کاشت اور زرخیز ہے لیکن اگر اس پر محنت نہ ہو تو بے ہودہ نباتات اور خاردار
جھاڑیاں پیدا کر کے وہ وحوشِ صحرا اور طیورِ ہوا کا مسکن اور درندگانِ خونخوار کا ایک خاطر خواہ پیشہ
بن جاتی ہے اور جس قدر اس کی آبادکاری میں دیر کی جائے گی اسی قدر اس کی آبادی مشکل سے
مشکل تر ہوتی جائے گی اور زیادہ سے زیادہ محنت کی طالب بنتی جائے گی اور اس کی سطح سے
تمام جنگلات کو دور کر کے جب قلبہ رانی کے بعد اس کو کاشت کیا جائے گا تو وہی زمین اشرف المخلوقات
انسانوں کے معاش کا ذریعہ اور ان کا مسکن بننے کا شرف حاصل کرے گی پس اسی طرح زمینِ نفس
کو اگر اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اگرچہ بذاتِ خود اعمالِ صالحہ اور عقائدِ حقہ کے لئے نہایت
زرخیز اور کارآمد ہے جس کا نتیجہ سعاداتِ ابدیہ اور کمالاتِ دائمہ ہو سکتے ہیں لیکن خبر گیری کے
بغیر آوارگی کی صورت میں یہ بھی خواہشات و جذبات اور تعیش و توحش کی تربیت گاہ بن کر حیوانی عادات
و اطوار کا مسکن اور درندگی صفات کا مظہر بن جاتی ہے اور جس قدر اس کو اپنے حال پر رہنے دیا
جائے گا اس کی اصلاح اسی قدر مشکل سے مشکل تر ہوتی جائے گی۔ ابتداءً اس پر تھوڑی محنت کارآمد
ہو سکے گی اور دیر کے بعد بہت زیادہ ریاضت درکار ہو گی۔ عقل کی طاقت سے تمام خواہشات و
جذبات اور شہوت و غضب وغیرہ کے نامناسب درخت اس سے کاٹنے پڑیں گے اور
حرص و ہوس کے خلاف اس پر دانش و خرد کی قلبہ رانی کرنی ہو گی پھر آلاتِ عدل و انصاف سے
اس کو ہموار کرنا ہو گا اور اس ساری اصلاح کے بعد وہ حکمت و علم کی تخم ریزی کے قابل ہو گی۔
پھر آسمانِ رحمت کا پانی اس کو فائدہ دے گا اور سعادت و نجابت و شرافت و دیانت و امانت

وغیرہ اس زمینِ نفس کی خوشگوار پیداوار ہوگی جو اس کی قیمت کو بہت زیادہ بڑھا کر قدسیوں کے لئے باعثِ رشک بنا دے گی ورنہ اس مرحلہ کے بغیر سعادت مشکل ہے اور جو مخالفتِ نفس پر موفق ہوا۔ اس نے اپنے دامن میں سعادت کو جمع کر لیا اور اس کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى

ترجمہ:- لیکن جو بھی اپنے پروردگار کی عظمت کے سامنے خوفزدہ ہوگا اور نفس کو خواہشاتِ نفسانیہ سے روکے گا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا (خداوند کریم ہمیں اس مرحلہ میں کامیابی کی توفیق مرحمت فرمائے) نتیجہ یہی ہوا کہ انسان کا اپنی ذات سے عدل یہ ہے کہ خواہشاتِ نفس کی مخالفت کر کے اپنے مناسب کمال کی طرف اقدام کرے۔

حقوق اللہ میں عدل کا میزان

مصر کی گورنری سونپنے کے بعد مالک اشتر کو بطور دستور العمل کے ایک عہد نامہ میں ارشاد فرمایا

اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اس کی اطاعت کو ہر امر پہ ترجیح دو اور ان فرائض و سنن کی اتباع کرو جو اس نے اپنی کتاب میں ذکر فرمائے کیونکہ اس کے بغیر سعادت ناممکن ہے اور ان کا انکار یا مخالفت بدبختی ہے لہٰذا دین خدا کی ہاتھ اور زبان سے نصرت کرو۔ الخ

حضرت امام حسن علیہ السلام کے وصیت نامہ میں ارشاد فرمایا۔

اے فرزند میں تجھے اللہ کے تقویٰ اس کے امر کی اطاعت اس کے ذکر سے دل کی تعمیر اور اس کی توفیق سے تمسک کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ تیرے اور اللہ کے درمیان جو رشتہ ہے اس سے زیادہ قابلِ وثوق اور کوئی رشتہ نہیں بشرطیکہ اسے تھامے رکھو (پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا) اے فرزند عزیز میری وصیت جو مجھے تیرے لئے زیادہ عزیز اور محبوب تر ہے تقویٰ کو اختیار کرتے ہوئے اپنے فرائض کی ادائیگی پر کڑی پابندی جاری کرنا اور اپنے آبائے سلف اور اہلبیت طاہرینؑ کے مسلک پر ثابت قدمی کے ساتھ عمل کو جاری رکھنا ہے یہ آپ کے اس وصیت نامہ کا حصہ ہے جو جنگِ صفین سے واپسی پر آپ نے کافی حاضرین کی بھری محفل میں اپنے فرزند حضرت امام حسنؑ کے لئے تحریر فرمایا اس کے علاوہ حقوق اللہ کے متعلق بہت کچھ ارشادات خاندانِ عصمت سے دستیاب ہوتے ہیں جن کے جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے بندہ پر عائد شدہ حقوق کا جامع ہے تقویٰ (یس عبد کا اپنے مولا کے ساتھ عدل یہ ہے کہ خوف و تقویٰ کو اختیار کرے

اور رضائے خالق ہی اس کا مطمع نظر ہو اور اگر وجود خالق کا آپ کو یقین ہے تو اس کی مزید توضیح خود بخود آپ کے سامنے ہے

اس امر کو ضروری طور پر جان لینا چاہیئے کہ انسان پر اللہ کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کی ربوبیت و وحدانیت کا دل وجان سے اقرار کرے اس پر ایمان پر لاکر اس کی عبادت واطاعت میں کسی کو شریک نہ کرے اور یہی عقیدہ تمام حقوق اللہ کی جڑ اور تقویٰ کی اصل و اساس ہے ورنہ شرک کی صورت میں کوئی عمل صالح قبول نہیں ہو سکتا خواہ شرک جلی ہو یا شرک خفی جو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہو کر چلتا ہے پس جو عبد شرک کا مرتکب ہوگا وہ اپنے پروردگار کے حقوق کا ظالم ہوگا کیونکہ ارشاد قدرت ہے ۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ٥ اور تقویٰ اس حقیقت کے بعد ہی نصیب ہو سکتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں عمل صالح اور تقویٰ کو ایمان پر ہی عطف کیا گیا ہے

شرک جلی اور شرک خفی

شرک جلی کا معاملہ تو بہت واضح ہے کہ امور تکوینیہ خلق و رزق و موت و حیات اور تدبیر و تقدیر وغیرہ معاملات میں کوئی بھی اللہ کا شریک نہیں نہ پہلے سے اور نہ خدا نے کسی کو ان امور کی انجام دہی سپرد فرمائی ہے بلکہ سب کے سب اختیارات اس کے قبضہ میں ہیں اور ان کے متعلق کافی حد تک روشنی ڈالی جا چکی ہے جو صاحبان عقل اور ارباب دانش کے لئے کافی ہے بشرطیکہ عقل و خرد پر جذبات و خواہشات کا پہرہ یا پردہ نہ ہو باقی رہا شرک خفی کا معاملہ تو یہ فتویٰ کسی کے متعلق سن کر تالیاں بجانا یا شور مچانا دانشمندی نہیں جب تک کہ پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر اسے اس قسم کی آلائشوں اور گندگیوں سے پاک نہ کرے ۔ حضرت رسالتمآب نے اپنے کسی صحابی سے فرمایا تھا ۔ اِنَّ الشِّرْكَ اَخْفٰى فِيْكُمْ مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ اَوْ كَمَا قَالَ) کہ تحقیق شرک تم میں چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہو کر چلتا ہے ۔ حالانکہ ظاہراً وہ بت پرستی کو چھوڑ چکے تھے اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کے پڑھنے والوں میں سے تھے تو اس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ انسان ہر حال میں اپنی عبدیت کو ملحوظ رکھے ۔ تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف سمجھے اور جمیع احوال میں تکیہ و سہارا صرف اسی کی ذات کو قرار دے ۔ بس توکل اس کی ذات پر ہو اور بھروسہ و سہارا مکمل اس پر کرنے کے بعد کسی دوسرے کی طرف رجوع صرف وسیلہ کی حیثیت سے ہو جس طرح خود فرماتا ہے :۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا

اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ الآیہ۔ تقویٰ اختیار کرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔ بنا بریں قاضی الحاجات سوائے اللہ کے کسی کو سمجھنا اگر شرک جلی نہیں تو شرک خفی ضرور ہے پس دعاؤں کے وقت نذر و نیاز ماننے کے وقت اور ان کے ادا کرنے کے وقت قاضی الحاجات دافع بلیات رافع نقمات اور حلال مشکلات صرف اسی کی ذات کو سمجھا جائے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کو اس کی بارگاہ میں [illegible] پیش کیا جائے اور اہلبیت عصمتؑ کی جانب سے اپنے شیعوں کو یہی تعلیم دی گئی ہے اور صبر و سکون سے تدبر و تفکر سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ شرک خفی کیا ہے؟ نیز اس معاملہ میں بھی تدبر کی ضرورت ہے کہ مشرکین عرب جب اللہ کو خالق و رازق مانتے تھے تو ان کا شرک کیا تھا؟ صرف جذبات ہمارا مذہب نہیں ہم تو اصول پرستی کو اپنا شیوہ سمجھتے ہیں اور اس معاملہ میں نہ باپ دادا کی تقلید ہمارا دین ہے اور نہ جذباتی نعرے ہمارا اساس مذہب ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت

جب اللہ کو اپنا حقیقی مولا تسلیم کر لیا جائے تو تقویٰ کی حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ذات و نفس عقل و حس آنکھ اور کان، منہ اور زبان بلکہ سر تا پا جمیع اعضاء و قویٰ اقوال و افعال خواہشات و خیالات غصہ و رضا غرضیکہ جمیع احوال ملکیت کاملہ اور سلطنت تامہ کے لحاظ سے درحقیقت اللہ کی ولایت میں ہیں لہذا اس کی رضا و اذن کے بغیر ان کا استعمال ناجائز بلکہ ظلم و عدوان ہے پس انسان کا تمام حرکات و سکنات میں امور کے مالک کامل کے اذن کو ملحوظ رکھنا ہی حقیقت تقویٰ ہے پس کسی شیٔ میں مالک کی رضا معلوم کئے بغیر تصرف نہ کرے اور اس طرزِ عمل کو سختی سے اپنانے کی کوشش کرے اور اپنے افعال و اعمال کا محاسبہ کرتا رہے تو رفتہ رفتہ یہ ریاضت حقیقت کا جامہ پہن لے گی اور یہ عادت ملکہ بن جائے گی اور اس صورت میں اس کا ہر قول و فعل ہر حرکت و سکون ہر خیال و فکر اور ہر نشست و برخاست منشائے پروردگار کے ماتحت ہو جائے گی تو گویا حق خالق ادا ہو گیا اور حقوق اللہ میں عدل کا منشاء پورا ہو گیا اور یہی عبد کا بلند مرتبہ اور اس کی غایت قصویٰ ہے جس کے متعلق فرماتا ہے۔ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ یعنی تقویٰ ایسا اختیار کرو جو تقویٰ کا حق ہے اور یہ خاصان خدا کا حصہ ہے پھر اس کے نیچے تقویٰ کے مراتب ہیں جن کی انتہا اس گھٹیا پن تک پہنچتی ہے جب عبد اپنے خالق کے حق میں ظلم کا کردار ادا کرنے لگ جاتا ہے العیاذ باللہ

ہم لوگ صرف کہنے کے ہیں کہ ہمارا سب کچھ اللہ کا ہے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ دل و جان سے سب کچھ اللہ کا سمجھتے تھے اس لئے وہ دینِ خدا پر ہر قسم کی قربانی خندہ پیشانی سے دیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں بڑی سے بڑی محبت بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ حضرت سید الشہداء کی میدانِ کربلا میں قربانیاں اسی عظیم مقصد کے پیش نظر تھیں۔ اور یہی تقویٰ کی انتہائی منازل تھیں کہ امام نے اپنے کردار سے کھلے میدان میں ان کو سر کر دکھایا اور واضح کر دیا کہ ہم سب کچھ اپنے خالق کا سمجھتے ہیں اور اس کے دین کی بقاء کی خاطر کھلے دل سے اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں چنانچہ فرمایا :۔ تَرَکْتُ الْخَلْقَ طُرًّا فِیْ ھَوَاکَ وَاَیْتَمْتُ عِیَالِیْ لِکَیْ اَرَاکَ ترجمہ :۔ یعنی میں نے تمام خلق کی محبت کو تیری محبت قربان کر دیا ہے اور بچوں کی یتیمی کو تیری ملاقات کی خاطر برداشت کیا ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے القاب یداللہ عین اللہ لسان اللہ اذن اللہ اور نفس اللہ اسی مقصد کے آئینہ دار ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ان کو واقعی طور پر اللہ کی ملکیت و ولایت کے ماتحت سمجھتے تھے پس چونکہ ان کے ہاتھ سے بغیر رضائے پروردگار کوئی کام سرزد نہ ہوتا تھا پس ان کے ہاتھ گویا ان کے نہ تھے بلکہ یداللہ تھے اسی طرح ان کی آنکھ سے کوئی کام رضائے پروردگار کے خلاف نہ ہوتا تھا بلکہ وہ رضائے مالک کے تابع تھیں اس لئے گویا وہ آنکھ ان کی نہ تھی اللہ کی تھی پس عین اللہ کہلائی اسی طرح ان کی زبان رضائے پروردگار کی ترجمان تھی ان کے کان فحش کی سماعت سے یکسو اور قرآن و ذکرِ خدا یا حق بات سننے کے لئے وقف تھے گویا رضائے خدا کے تابع تھے اور ان کا نفس خواہشات و جذبات سے الگ تھلگ رضائے پروردگار کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ پس وہ لسان اللہ۔ اذن اللہ اور نفس اللہ کہلانے کے مستحق تھے اور اسی بناء پر رسولؐ کی زبان ناطق کو پروردگار نے اپنی وحی سے تعبیر فرمایا :۔ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی اور ان کی تیر اندازی کو اپنا فعل قرار دیا وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی اور ان کے ہاتھ کو اپنی طرف منسوب فرمایا یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ اور یہی وجہ ہے کہ علی علیہ السلام تقویٰ کے اس مرتبہ پر فائز ہیں کہ ان سے آگے کوئی نہ بڑھ سکا گویا وہ سب متقی لوگوں کے پیش رو ہیں پس وہ امام المتقین ہوئے اور حضرت رسالتمآبؐ تقویٰ کے اس زینہ پر تھے کہ وہ علیؑ کے بھی امام و آقا قرار پائے :۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ پس نتیجہ یہ ہوا کہ بندے اور اللہ کے درمیان بندے کا عدل یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرے۔

حقوق الناس میں عدل کا میزان

یعنی وہ حقوق جو مخلوق کے مخلوق پر عائد ہوتے ہیں اور یہ اس قدر زیادہ ہیں کہ جزئیات تو بجائے خود ان کے کلیات کو شمار کرنا بھی مشکل ہے اور حق یہ ہے کہ ان کی تفصیل حکمتِ عملیہ کی دو قسموں تدبیر منزل اور سیاست مدینہ میں بیان کی جائے لیکن وہاں ان کا بیان نہ ہونے کے برابر ہے اور علمائے اعلام رضوان اللہ علیہم نے بھی ان حقوق کو حق بیان عطا نہیں فرمایا البتہ مطالب منتشرہ اور حقائق متفرقہ کے طور پر کچھ علم فقہ کی کتابوں میں اور کچھ علم الاخلاق کے دفاتر میں یہ بکھرے ہوئے موتی مل جاتے ہیں بہرکیف جس طرح حقوق نفس کے متعلق اہتمام کے ساتھ علم الاخلاق کی تدوین ہوئی ہے اس طرح حقوق معاشرہ خواہ تدبیر منزل ہو یا سیاست مدنیہ اس کے متعلق الگ اہتمام نہیں کیا گیا خیر اس کی وجہ جو بھی ہو ہم اس سلسلہ میں بھی حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے بیان کردہ کلیات کو پیش کرتے ہیں جو حقوق معاشرہ میں عدل کے میزان کی وضاحت کے لئے کافی ہیں ویسے تو آپ کے خطبات، مکاتیب و مواعظ میں یہ مطالب آپ کو دُرِ منثورہ کی طرح جدا جدا ملیں گے لیکن ان سب حقوق میں ایک جامع کلمہ جسے عدل کا ضابطہ کلیہ کہنا چاہیئے وہ وہی ہے جو آپ نے اپنے وصیت نامے میں اپنے فرزند دلبند جناب امام حسنؑ مجتبیٰ کو تلقین فرمایا۔

فرزند گرامی! اپنے اور اپنے غیر کے درمیان اپنے نفس کو ہی میزان قرار دو پس غیر کے لئے وہی کچھ پسند کرو جو تجھ کو پسند ہو اور غیر کے لئے تم ایسی چیز کو قطعاً پسند نہ کرو جو تمہیں خود ناپسند ہو جس طرح تمہیں اپنی ذات پر غیر کا ظلم پسند نہیں اسی طرح اپنی جانب سے تم بھی غیر پر ظلم کو پسند نہ کرو۔ جس طرح تم کو غیر سے احسان محبوب ہے اسی طرح تم بھی غیر پر احسان کرنا محبوب رکھو پس جو غیروں سے بری لگتی ہے وہ اپنے نفس کے لئے روا نہ رکھو

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں۔

صاحبان خیر یعنی نیک لوگوں سے قرب اختیار کرو تاکہ تمہارا شمار انہیں میں سے ہو اپنی مقبوضہ چیز کی حفاظت غیر کی مقبوضہ چیز کی طلب سے بہتر ہے۔ یاس کی ناامیدی کی تلخی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے پاکدامنی سے کما کر کھانا فجور کی دولت مندی سے بہتر ہے اور کمزور پر ظلم کرنا بدترین صفت

ہے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا) ذلیل مددگار کا نہ ہونا ہونے سے بہتر ہوتا ہے اسی طرح بخیل دوست کا وجود کوئی خوبی نہیں رکھتا بھائی کی قطع رحمی کے بعد بھی اس کی صلہ رحمی کا بوجھ اٹھانا چاہیئے۔ اور بھائی کی روگردانی کے بعد بھی اس سے قرب و محبت کے ساتھ پیش آؤ اس کے بخل کے مقابلہ میں سخاوت اس کی سختی کے مقابلہ میں نرمی اور اس کے جرم کے مقابلہ میں قبول عذر کا سلوک کرو اور اس طرح معلوم ہو کہ وہ تمہارا محسن اور تم اس کے احسانمند ہو لیکن یہ خیال رہے کہ اس قسم کا برتاؤ بے محل نہ ہو اور نا اہل سے نہ ہو۔

حقوق معاشرہ میں آپ کا پہلا پہلا جملہ عدل و انصاف کی جان اور علوم و معارف کے بیش قیمت خزانہ کا آبدار موتی اور گلدستہ فصاحت و بلاغت کا مہکتا ہوا پھول ہے "اپنے اور غیر کے درمیان اپنے ہی نفس کو میزان قرار دو" اللہ کی توحید کی قسم گردش افلاک کی ناسازگاریوں اور دور زمان کی نیرنگیاں ایسے انقلابات کو سامنے لائیں کہ عقل و خرد کا ناطقہ بند اور عدل و انصاف کا دفتر مقفل ہو گیا بلکہ طائر ہوش و حواس منقار زیر پر نظر آیا نیز شرم حیا غیرت و حمیت انسانی اور شرافت و دیانت بشری نے سر جھکا لیا جب درطۂ ناسوت کی نا اہل مخلوق عالم لاہوت کے قدسیوں سے ٹکرائی۔ رجس و نجاست کا پائدۂ آسمان عصمت و طہارت کے آستانہ زرین سے الجھا جہالت و حماقت کے گندیدہ ظلمانی تالابوں میں مدتوں غوطہ زنی کرنے والوں نے علم و فضل اور شرف و کمال کی صاف و شفاف لذیذ و شیریں نورانی آبشاروں سے سیراب ہونے والوں کو اپنے جیسا سمجھ لیا حتیٰ کہ ناصاف و محدود پانیوں کے کناروں پر ٹیانیں مارنے والے مینڈک قلزم بلاغت اور سلسبیل فصاحت کی طرف ترچھی نگاہیں ڈالنے لگے۔ خدا کی قسم اگر خاندان عصمت کی زبان حق ترجمان سے نکلے ہوئے ان موتیوں کو میزان عدل کے پلڑے میں رکھا جائے اور پوری دنیا کے علماء و حکماء کے پر از حکم ارشادات و خطبات دوسرے پلڑے میں ہوں قرآن کا ایک جملہ جھکتا ہوا نظر آئے گا اگر اسلام کے پاس صداقت و حقانیت کی اور کوئی دلیل نہ ہوتی تو حضرت امیر علیہ السلام جناب رسالتمآب اور ان کی آل اطہار علیہم السلام کے یہ اور اس قسم کے دیگر معجز بیان و حق ترجمان جملے جنہوں نے کوزہ میں سمندر کو بند کر کے پیش کیا ہے۔ اسلام کی ضرورت اور اس کے علاوہ اعجاز کے ثبوت کے لئے کافی تھے کیونکہ جو شخص ایسے عربوں میں پیدا ہو کر پروان چڑھا ہو جن کو علوم و معارف سے دور تک کا واسطہ

نہ تھا اور پھر یکایک ان کی زبان دُرفشاں سے علوم و معارف کے ایسے شاہکار فروزاں ہوسکے ہوں جن پر بے پناہ براہین حکمیہ اور ادلۂ عقلیہ کا سایہ ہو اس کی صداقت کا ایسا بلند اور پائیدار مینار ہے جس کا نہ انکار ہو سکتا ہے اور نہ کبھی اس کو جھکایا جا سکتا ہے کیونکہ ظاہری طور پر انہوں نے نہ تحصیل علوم میں سیر و سیاحت کی نہ دُور دراز کے سفر طے کر کے کسی معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نہ کسی حکیم سے درسِ حکمت سیکھا اور نہ کسی مدرسہ میں داخلہ لیا۔

بایں ہمہ علم کا عالم یہ کہ عمر بھر علوم سیاسیہ اور معارف دینیہ کے وہ دریا بہائے کہ میں سچ کہتا ہوں اگر اولین و آخرین کے حکماء ماہرین علوم اور ہر طبقہ کے اساتذۂ فنون اکٹھے ہو جائیں اور دنیا بھر کے فصحاء و بلغاء جمع ہو کر ایک دوسرے سے تعاون بھی کریں تاہم حضرت امیر علیہ السلام کے ایک خطبہ کے برابر موادِ علمیہ نہیں لا سکتے اور نہ اس قدر فصاحت کی چاشنی پیدا کر سکتے ہیں کہ لذت و لطافت کے لحاظ سے سننے والوں کو اپنا دیوانہ بنا دے اور معانی و حقائق کا تسلسل و روانی انہیں اپنا گرویدہ و پروانہ بنائے بلکہ آخر کار ان کے لئے اعترافِ عجز کے بغیر کوئی اور چارہ نہ ہوگا۔

آپ کے خطبات و مواعظ کا اگر آپ جائزہ لیں گے تو ذوقِ سلیم آپ کو بتائے گا کہ آپ مسلسل بارش یا سیلاب رواں یا موج دریا بن کر کس طرح بڑھتے چلے جا رہے ہیں آپ کا بیان اگرچہ فی البدیہہ ہوتا ہے لیکن سلاست و روانی براہین کی پختگی اور معانی کا بے پناہ ذخیرہ اس کے دامن میں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور و سرور کا چشمہ ہے یا شراب طہور کی ایک نہر ہے جو تشنگان علوم کی سیرابی اور بیماران روح کی شفایابی کے لئے چھلک رہی ہے اور اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اس کے ہیرو اور رہبر اس جیسے تھے جہاں ایک طرف یہود و نصاریٰ کے علماء و فضلاء پر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے براہین واضحہ کے باوجود دامنِ اسلام سے رابطہ قائم نہ کیا تو دوسری طرف ان لوگوں کی عقلوں پر بھی رونا آتا ہے جو ایسی شخصیت کو نظر انداز کر کے دوسروں کو سابق الاسلام کہنے پر مصر ہو گئے اور غضب بالائے غضب یہ کہ جو لوگ فضل و شرف میں ان کے گردِ راہ کو نہیں پہنچ سکتے ان کو ان کے برابر سمجھنے لگ گئے خداوند کریم ان کو ہدایت فرمائے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی ہم معاشرتی عدل کے بارے میں حضرت امیر المومنین

علیہ السلام کے کلمات نقل کر رہے تھے آپ نے اپنے مواعظ میں بہت کچھ اس کے متعلق فرمایا بھائی چارے کے حقوق کی تفصیلات بیان کیں اور اہل قبیلہ ازواج و ملازمین کے حقوق اور ان کی حدود واضح کیں بلکہ رہن سہن کے جملہ حدود و تلقین فرمائے خدا جسے توفیق دے وہ ان کا مطالعہ کرے۔ حضرت امیر علیہ السّلام اور ان کی اولاد طاہرین کے کلمات میں اس قسم کا مواد کثرت سے ملتا ہے حتیٰ کہ کوئی حق ایسا نہیں جس کو انہوں نے تشنۂ بیان چھوڑا ہو لیکن یہ یاد رہے کہ اس بارے میں جامع کلمہ وہی ہے جو آپ نے اپنے وصیت نامہ میں فرمایا ہے۔ "اپنے اور غیر کے درمیان اپنے ہی نفس کو میزان قرار دو" اور یہ کلمہ حضرت رسالتمآبؐ اور دیگر آئمہ سے بھی بکثرت منقول ہے انسان اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو اسے اپنی ذات کے لئے پسند ہو۔)

جو شخص غور و فکر کر کے حقائق و معانی تک دسترس حاصل کرے اسے یقین ہو گا کہ سوائے انہی کی ذواتِ مقدسہ کے اس صفت کا خارج میں اور کوئی بھی مصداق نہیں۔ ہم سب اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو آج کل کی مسموم فضا میں اتنا بھی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنا شر دوسروں سے روک لے دوسروں کو نفع پہنچانا تو درکنار۔ ہماری حالت یہ ہے کہ قہر و غلبہ کے بل بوتہ پر اپنے میں انسانیت کو فراموش کر کے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسروں کو اپنے ظلم و تشدد کے ناخنوں سے نوچنے کے درپے ہوتے ہیں اور اپنے ایمانی بھائیوں کی ہتک عزت کے لئے ان کے عیبوں کی قبریں کھودنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بنا بریں ہمیں ان فضائل سے کیا واسطہ اور معاشرہ میں عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے سے کیا غرض؟ حد تو یہ ہے کہ اس زمانہ والوں کے سامنے اس قسم کی باتیں بھی سبکی کا باعث سمجھی جاتی ہیں اور انسان نما مخلوق ایسی باتوں کو خرافات کا درجہ دیتی ہے۔ ہم نے میزانِ عدل کے متعلق حضرت امیر علیہ السّلام کے ہی کلمات پر اکتفا کی ہے جو اصولِ عدل کے جامع ہیں تاکہ ان پر مطلع ہونے والا یقین جان لے کہ وہی امام عادل صدیق اکبر اور فاروق اعظم تھے کوئی دوسرا نہ اس کے ہم پلہ ہے۔ اور شان مقدس القاب کا اہل۔

خدا کرے استقامت و اعتدال کا وقت جلد آئے ظلم و تعدی اور جور و جفا کی رگ حیات کٹے امیدیں پوری ہوں اور عدل و انصاف کا علم اپنی پوری شان و شکوہ کے ساتھ بلند

ہو اور فضائے آسمانی میں لہراتا ہوا ساری دنیا دیکھے مظلوموں کی فریاد سننے والا آئے اور تشدد و استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ظلم و تعدی کی کند چھریوں سے کٹے ہوئے قہر و غضب کے بے درد قدموں میں روندے ہوئے اور شر و فساد کی خونخوار چکی میں پسے ہوئے لوگ امن و اطمینان کا سانس لے سکیں۔ آہ وہ کس قدر پرکیف دور ہوگا جسے کان سنتے ہیں اور کتنا پرآشوب زمانہ ہے جسے آنکھیں دیکھتی ہیں۔

عدل اعتقادی

خداوند کریم کی دلیل اثبات و دلیل توحید سے تو یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے اور چونکہ عدل بھی صفات میں سے ایک صفت ہے بلکہ یہ صفت تمام صفات میں سے اشرف و کمال اور عزّ و جلال کی محور و مدار ہے اسی بنا پر تمام مسلمان باوجودیکہ مختلف مکتبہ فکر کی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے مذاق و مشرب میں یگانگت عنقا ہے اس بات پر متفق ہیں۔ کہ ذاتِ حق سبحانہٗ فی الجملہ صفتِ عدل سے متصف ہے اور وجود باری کے ثبوت کے بعد نظامِ عالمِ اکبر میں تدبر خود بخود اس امر کا اعلان ہے کہ وہ ذات جس نے اس عالم کون و مکان کو گوناگوں مصالح و حکم کے ماتحت مخصوص تدبیر و تقدیر سے پیدا کیا اور اس کو باقی رکھتا ہے وہ ذات عادل ہے کیونکہ پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ اس کا معنی ہے ہر چیز کو اپنے مناسب و موزوں مقام پر رکھنا تو اس کے نظام اتم میں تفکر سے بڑھ کر اور کون سی برہان و دلیل دی جا سکتی ہے پس جس طرح صاحبانِ عقول کے لئے یہ نظام اکمل اس کے وجود کی ناقابلِ تردید دلیل ہے۔ اسی طرح یہی نظام اپنی پوری خوبیوں اور مصلحتوں کے ساتھ اس ذات کے عدل کی بولتی ہوئی زبان ہے گویا جس طرح اس کی ذات کا وجود اور اس کی توحید اظہر من الشمس اور ابین من الامس ہے اسی طرح اس کا عادل ہونا بھی اظہر و ابین ہے جس طرح ظلم ہر قسم کے عیبوں کی جڑ ہے اسی طرح عدل تمام صفات حسنہ کی جڑ ہے جس طرح ظلم کی برائی محتاجِ بیان نہیں اسی طرح عدل کا اثبات بھی توضیح الواضحات میں سے ہے پس خدا کا عادل ہونا ایک بدیہی مسئلہ ہے۔

ترکِ عدل کے مضرات

الدین والاسلام میں علامہ کاشف الغطاء اعلی اللہ مقامہٗ تحریر فرماتے ہیں ابن طباطبا فخری نے کتاب آدابِ سلطانیہ میں ذکر کیا ہے ... ہلاکو خان تاتاری مجوسی دشمن نے جب ۶۵۶ھ میں بغداد فتح کیا تو علمائے عراق

سے دریافت کیا کہ ایک طرف کافر عادل ہو اور دوسری طرف مسلمان ظالم ہو تو حکومت کا سزاوار ان دونوں میں سے کون ہے؟ تمام علماء فتویٰ دینے سے گھبرا گئے۔ مجلس میں سید رضی الدین ابن طاؤس موجود تھے انہوں نے وہ کاغذ لے لیا جس میں استفتا درج تھا اور کافر عادل کے حق میں فتویٰ صادر کر دیا۔ اس کے بعد تمام علماء عراق نے دستخط کر دیئے کیونکہ حضرت رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ ملک عدل سے قائم رہتا ہے اگرچہ کافر کے ہاتھ میں ہو لیکن ظلم سے قائم نہیں رہ سکتا خواہ مسلم کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو۔

ترکِ عدل کی سزا کی زد میں صرف عوام نہیں آتے بلکہ اس کی زد سلاطین کو بھی متاثر کرتی ہے بلکہ سلاطین پر ترکِ عدل کی سزا کی زد زیادہ پڑتی ہے اور ظلم عوام کے لئے بد ہے لیکن سلاطین کے لئے بدتر ہے اور عدل عوام کیلئے خوب ہے لیکن سلاطین کیلئے خوب تر ہے کیونکہ عام شخص کا عدل یا ظلم ایک محدود اثر رکھتا ہے اور سلطان و حاکم کا عدل یا ظلم بہت وسیع حلقہ تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جب ایک زمانہ تک عدل کو ترک کر دیا جائے اور از راہِ سرکشی مقتضائے عدل پر عملدرآمد نہ ہو تو طبائع ظلم کی عادی ہو جاتی ہے اور ان میں یہ صفت راسخ ہو جاتی ہے پس ایک دوسرے کی دشمنی دلوں میں گھر کر لیتی ہے حالانکہ وہ بھائی بھائی ہوا کرتے ہیں ایسی صورت میں طاقتور درندے بن جاتے ہیں اور صاحبان اقتدار کے انسانی لباس کے اندر ایک خونخوار بھیڑیا موجود ہو جاتا ہے پس کمزور لوگوں اور بے بس رعایا کی حیثیت لاغر اونٹوں یا بھیڑوں کے ریوڑ کی سی رہ جاتی ہے۔ جبھی تو بوجہ عجز ان کی آخری ہمت اور تگ و دو اپنے سے کمزور بھائی کا حق دبا بیٹھنے تک محدود ہوتی ہے اس سے اللہ کی عطا کردہ نعمات چھین لینا اس کی ہلاکت کے درپے ہونا اور اس کا نوچنا اور کاٹنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے آپ ان کے دلوں کا معائنہ کریں گے تو بغض و کینہ و حسد بھرپور نظر آئیں گے احوال و اطوار میں وحشت و درندگی کے سوا کچھ نہ ملے گا گویا سب کے سب انسان نما جانور اور خونخوار درندے ہیں۔

ہاں ہاں یہ درندے کہاں ہیں؟ بلکہ درندوں سے بھی بدتر ہیں۔ کاش درندوں کی سی ایک خصلت بھی ان میں ہوتی۔ کیونکہ کوئی درندہ اپنے افراد نوع پر حسد نہیں کرتا اور بہت کم ایسے درندے ہوں گے جو اپنے ابنائے جنس کے ساتھ جنسی ہمدردی اور سچی روابط نہ رکھتے ہوں لیکن ان انسان نما درندوں سے تو خدا بچائے ان کا سارا غصہ ہی افراد قوم اور

ابنائے جنس کے لئے وقف ہوتا ہے کیونکہ بھیڑیا کبھی دوسرے بھیڑیے کا گوشت نہیں کھاتا لیکن انسان کا گوشت بڑے شوق و ذوق سے کھا لیا کرتا ہے۔

ہر مملکت کے ارباب حل و عقد کو چاہیئے کہ وہ عدل و انصاف کا علم بلند کریں اور عدل سے انحراف کرنے والے تمام عملے کو عدل کے اصولوں کی طرف مائل کریں اور ظلم سے باز نہ آنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دیں کیونکہ زمین میں ظالم کا وجود ایسا ہے۔ جیسے بدن میں عضو فاسد اور بہتر یہی ہوتا ہے کہ جب اس عضو فاسد کا علاج نہ ہو سکے تو اسے سرے سے کاٹ دیا جائے۔ تاکہ دوسرے اعضا اس سے آہستہ آہستہ متاثر ہو کر کہیں پوری مملکتِ جسم کا ستیا ناس نہ کر دیں پس عدل ہی مدار زندگی اور معیار سعادت ہے اور یہی مرکز محبت و محور الفت ہے افراد خانہ میں عدل نہ ہو تو گھر آباد نہیں ہوتا قوم میں عدل نہ ہو تو قوم ترقی نہیں کر سکتی حکومت میں عدل نہ ہو تو حکومت معرض زوال میں ہوتی ہے پس کیسے ممکن ہے کہ عالمین کا کلی نظام عدل کے بغیر پایۂ تکمیل کو پہنچا ہو۔ پس ماننا پڑے گا کہ خدا جو اس نظام اتم و اکمل کا سربراہ و سلطان اور مملکتِ تکوین میں اقتدار اعلیٰ کا مالک و مختار ہے وہ عدل کی صفت سے متصف ہے وہ خود بھی عادل ہے اور تمام اپنی مخلوق کو بھی عدل کے اصولوں پر کاربند رہنے کی دعوت دیتا ہے چنانچہ ارشاد ہے اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى تم عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے نزدیک تر ہے۔ بہرکیف یہ مسئلہ بدیہی اولی ہے اور اس کا منکر وجدان و عقل کا منکر ہے۔

اشعری عقیدہ میں حسن و قبح کی نفی

اعتقادی طور پر تو اشعری بھی اللہ کے عدل کے ویسے ہی قائل ہیں جس طرح باقی سب مسلمان لیکن جس مسئلہ کی بنا پر اشاعرہ کے مذہب میں خدا کے عدل کی نفی لازم آتی ہے وہ حسن و قبح کا انکار ہے یعنی ان کے نزدیک جملہ افعال بالذات نہ اچھے ہیں نہ برے بلکہ ان کو اچھائی یا برائی کسی دوسرے اچھے یا برے اعتبار سے لاحق ہوتی ہے مثلاً طبیعت کی موافقت کسی فعل کو اچھا بناتی ہے اور اس کی مخالفت اس کو برا کہتی ہے یا نفع کی بدولت ایک فعل اچھا کہلاتا ہے اور نقصان و ضرر کی بدولت دوسرے کو برا کہا جاتا ہے اور اسی طرح باقی رسوم کسی فعل کو اچھا سمجھتی ہیں اور کسی کو برا نیز شریعت کا امر کسی فعل کو اچھا بناتا ہے اور اس کی نہی دوسرے کو برا بنا دیتی ہے لیکن اگر ان تمام خارجی امور کو

چھوڑ دیں تو افعال سب برابر ہیں پس ذاتی طور پر احسان و ظلم میں ان کے نزدیک کوئی فرق نہیں بلکہ احسان کی خوبی اور ظلم کی برائی خارج کی طرف سے آئی ہے لہٰذا شریعت نے جن امور کو واجب و سنت کر دیا وہ حسن بن گئے اور جن کو حرام یا مکروہ کہہ دیا وہ قبیح بن گئے اگر شریعت یہ پابندی نہ لگاتی تو دونوں فعل ذاتی طور پر برابر تھے اور اللہ کے افعال چونکہ ہر قسم کی پابندیوں سے بالاتر ہیں لہٰذا وہاں حسن و قبح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پس وہ جو کرے اچھا ہے اگر وہ چاہے کہ کسی عبادت گزار کو دوزخ میں بھیج دے تو قبیح نہ ہوگا اور کسی فاسق و فاجر کو بہشت دے دے تو بھی قبیح نہ ہوگا بلکہ وہ جو بھی کرے حُسن ہے اور جس کو نہ کرے یا جس سے روکے وہ قبیح ہے یعنی حسن یا قبح کا اعتبار اس کے فعل سے سابق نہیں تاکہ اس کا فعل حسن یا قبح کی کسوٹی پر پرکھا جائے بلکہ اس کا فعل یا ترک حسن یا قبح کی کسوٹی ہے جو وہ کرے حُسن ہے اور جو نہ کرے وہ قبیح ہے جس کا حکم دے وہ اچھا ہے اور جس سے روک دے وہ بُرا ہے ہمارے نزدیک یہ عقیدہ خدا کے عدل سے متصادم ہے۔ کیونکہ ان کے عقیدہ سے لازم آتا ہے کہ خدا نیک و بد کا فرق کئے بغیر کسی کو جنت یا جہنم میں اگر بھیج دے تو اس کے فعل کو منافیٔ عدل نہیں کہا جائے گا یعنی اگر وہ چاہے تو کسی نبی یا رسول یا عابد و زاہد کو جہنم میں بھیج دے اور فرعون جیسے کو جنت دیدے تو یہ سب اس کا عدل ہے گویا یہ لوگ عدل کے منکر نہیں لیکن ان کا مسلک عدل کے منافی ہے کیونکہ ان کے مسلک کا لازمہ یہ ہے کہ خدا کے لئے خلاف عدل کرنا بھی عدل ہے اور اس کا ظلم بھی ظلم نہیں بلکہ وہ جو بھی کرے عدل ہے۔

افعال کا حسن و قبح عقلی ہے

تمام اصحاب عقل و ارباب دانش مذکورہ بالا عقیدہ سے بیزار ہیں اور اہل اسلام کے متعدد گروہ باوجود باہمی کئی وجزوی اختلافات کے عقیدہ مذکورہ کے بطلان پر متفق ہیں۔ ہم وضاحت کرنے کے بعد وجدانِ سلیم کو اس کا فیصل مقرر کریں گے۔ دیکھئے افعال خارجیہ میں بعض حواس ظاہریہ سے ملائم ہیں اور بعض نا ملائم بلکہ تمام موجودات خارجیہ کی ہی دو قسمیں ہیں۔ کان قمری و بلبل کی آواز سے مانوس ہے لیکن گدھے کی آواز اور بجلی کی کڑک سے غیر مانوس قوت لامسہ نرم چیزوں سے مانوس سخت سے متنفر قوتِ شامہ خوشبو سے مانوس ہے بدبو سے اس کو کراہت ہے اور اسی طرح قوتِ باصرہ کی، مختلف اشکال سے اور قوتِ ذائقہ

کی مختلف ذائقوں سے یہی نسبت ہے بلکہ تمام موجوداتِ عالم کی یہی کیفیت ہے کہ کسی سے انس اور کسی سے نفرت اور ان تمام حواس کے رئیس حضرت عقل کی بھی یہی حالت ہے جو بدنِ انسانی میں رسول باطنی کی حیثیت رکھتا ہے۔

جب ہر قوت اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے آنکھ دیکھنے سے کان سننے سے ناک سونگھنے سے اور زبان بولنے سے وعلیٰ ہذاالقیاس تو عقل بھی آثار سے پہچانی جانی چاہئے اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ حواس خمسہ ظاہرہ یا حواس باطنہ یہ سب نفس کے آلات ہیں اور نفس کے ادراک کے ذرائع ہیں، نفس انہی ذرائع واسباب سے اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے پس کسی چیز کی طرف اقدام کرتا ہے اور کسی سے روکتا ہے اور اللہ نے چونکہ انسان کو نیکی و بدی کی دو راہیں دکھلائی ہیں کہ نیکی کے راستوں کو اختیار کرکے کسب کمال کی طرف قدم بڑھائیں اور برائی کو چھوڑ کر پستی کے گڑھے میں گرنے سے بچ جائیں اور بعض اوقات خود نفس اچھائی و برائی کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہوتا ہے کیونکہ حواس اگرچہ اپنی اپنی رپورٹ صحیح پیش کرتے ہیں لیکن یہ نفس نفع و نقصان یا نیکی و بدی یا دوست و دشمن یا ملائم و منافر میں غلبہ شہوات یا اختلافِ احوال کی وجہ سے فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ بعض اوقات اچھائی کو چھوڑ کر برائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اسی طرح نفع کی بجائے ضرر کی طرف کھیچ جاتا ہے وعلیٰ ہذاالقیاس تو خداوند کریم نے جو محسنِ حقیقی ہے اپنے کمال لطف و کرم اور فضل واحسان سے اس کو ایک ایسی قوت کاملہ عطا فرمائی جسے قوتِ عاقلہ کہا جاتا ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے وہ نفع و نقصان مصلحت و مفسدہ دشمن و دوست صحت و بیماری اور سعادت و شقاوت میں فرق پیدا کر سکے اور اس جگہ نفع و نقصان سے ہماری مراد صرف وہ نہیں جس کو حواس ظاہرہ ہی پرکھ سکتے ہیں جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اور خوشبو و بدبو یا تلخ و شیریں وغیرہ کا حواس ظاہرہ کے ذریعے سے پرکھ لینا بڑی بات نہیں کیونکہ یہ تو حیوان بھی کر سکتے ہیں بلکہ اس مقام پر ہماری مراد ہے بلندی اور پستی کی راہوں میں امتیاز پیدا کرنا اور خست و کرامت کے ذرائع معلوم کرنا اور یہی چیز بعض کی بعض پر فضیلت کی موجب ہوا کرتی ہے اور یہی چیز انسان اور حیوان کے درمیان امتیاز کا بڑا نشان ہے بس عقل ہی وہ قوت ہے جس کے ذریعے سے انسان سعادت ترقی اور علم و معرفت کی بلندیوں کی طرف اقدام کرنے کا اہل ہوتا ہے اور اسی قوت کے ذریعے سے انسان نیکی و بدی اور

صحت وفساد میں تمیز کرسکتا ہے اور اخلاق شریفہ وعاداتِ خبیثہ کے درمیان یہی قوت امتیاز دیتی ہے پس علو وارتفاع اور عزوشرف کا زینہ یہی قوتِ قدسیہ ہے۔

حیوان و انسان میں فرقِ واضح اور عقل کا اثبات

عام حیوانات کو دیکھئے باوجود کثرت اور صنفی ونوعی باہمی اختلافات کے اس بات میں سب کے سب برابر ہیں کہ وہ اپنی پرانی روایات پرانی عادات اور پرانی وضع پر پوری طرح جمے ہوئے ہیں بسیط زندگی اور معمولی گزر اوقات پر ہمیشہ اکتفا کرتے چلے آئے ہیں ان کے لباس طبعی مساکن اصلی اور ویسے کے ویسے ہیں مثلاً جو ابتداء از غاروں میں رہنے کے عادی تھے اب تک غاروں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جو پہلے سے پہاڑوں پر تھے ان کا اب تک پہاڑوں پر بسیرا ہے جو جنگلات میں رہنے کے پابند ہیں اور جن کو گھونسلوں کی عادت تھی وہ اب تک اسی دستور پر کاربند چلے آتے ہیں ان کی عادات وطور طریقہ میں قدیم وجدید کا کوئی فرق نہیں اور وہ اپنے آباء کے سابق طرزِ عمل سے ذرہ بھر اِدھر اُدھر نہیں ہوتے اور نہ کسی کی حالت میں کوئی ذرہ بھر بھی فرق یا انقلاب رونما ہوتا ہے پس ان کی تمام تر زندگی کی جدوجہد صرف گھاس پانی دانہ تک محدود رہتی ہے۔ سالہا سال گزرے لیکن ان کے رویہ میں کوئی ترقی رونما نہ ہوئی نہ ان میں علم نہ مادۂ ایجاد نہ جذبہ ترقی اور نہ شوقِ بلندی ہے نہ وہ مادہ کشف رکھتے ہیں اور نہ وہ صناعت سے بہرہ ور ہیں۔

حیوانات میں صناعت کی بڑی سے بڑی جو مثال پیش کی جاتی ہے وہ عنکبوت کا جال یا شہد کی مکھی کا چھتہ ہے کہ مثلاً اس کے تمام خانہ جات مسدس ہوا کرتے ہیں اور سب کے سب پیمائشی طور پر برابر ہوتے ہیں لیکن آپ نے کبھی نہ سُنا ہوگا اور نہ سُنیں گے کہ انہوں نے یا ان جیسی کسی نوع نے اپنی متعلقہ صنعت میں کبھی کوئی ترقی یا تبدیلی کی ہو یا اپنی وضع قدیم میں کچھ ترمیم یا تنسیخ کی ہو بخلاف اس کے ادھر انسان کو دیکھئے کہ اس کی پوری زندگی اپنی اصلاح اور ترمیم وتنسیخ میں گزرتی ہے اور ہمیشہ وہ کمال وسعادت کا طالب رہتا ہے خواہ حال حاضر کے لئے خواہ دارِ آخرت کے لئے اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو دنیا وآخرت دونوں کی اصلاح کی فکر کرتے ہیں اور وہی اللہ کے خاص بندے ہیں لیکن ہیں بہت کم۔

خلاصۃ الکلام ہم نے وحوش وطیور وبہائم کی زندگی کا جب مطالعہ کیا تو دیکھا کہ وہ بڑے

مزے سے مطمئن اور پرسکون زندگی گزارتے ہیں اور ہر قسم کے افکار سے بالکل مبرا ہیں۔ سوائے جنسی تعلقات اکل و شرب اور لہو و لعب کے۔ لیکن انسان کو دیکھا تو اس کی فکر مسلسل آگے بڑھنے میں مصروف عمل ہے اور اس کے تمام اعضاء دائمی طور پر اسی سلسلہ میں متحرک رہتے ہیں اگر آپ انسان کے کردار کا جائزہ لیں گے تو آپ قطعی طور پر اس نظریہ پر پہنچیں گے کہ وہ ہر وقت زمین میں گردش کر رہا ہے جیسے کسی گمشدہ شیئے کی تلاش اس کو مطلوب ہو یا جیسے کوئی شکاری نئے شکار کے پھنسانے کی فکر میں ہو اور یہی انسان کی فطرت ہے اور یہ سب کچھ کرنے پر اسے طلب کمال کا جذبہ ہی مجبور کرتا رہا ہے پس وہ اپنی کمزوریوں اور بدحالیوں کے رفع کرنے کے لئے ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

یہ حالات و آثار صاف بتلاتے ہیں کہ حیوان و انسان میں تمام قوائے ظاہریہ و باطنہ میں شرکت کے بعد انسان ایک خاص ایسی قوت کا حامل ہے جو اس کا امتیازی نشان ہے اور جس کی بدولت وہ ہمیشہ کمال و خیر اور عزو شرف کی اوج تک رسائی کے لئے بے چین رہتا ہے اور اسی کو کہتے ہیں قوتِ عاقلہ یا نفس ناطقہ پس جس نے اس کی بدولت سعادت اور شقاوت کے درمیان امتیاز کر کے سعادت کو طلب کیا اور شقاوت سے بچ نکلا اور اپنی کوششوں کی بنا پر قدسی مخلوق ملائکہ سے جا ملا بلکہ اس سے بھی افضل ہو گیا تو وہ ہے درحقیقت انسان لیکن اس قسم کی تعداد بہت کم ہے اور اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے متعلق خود خدا فرماتا ہے۔ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا یعنی وہ مثل حیوانوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں اور یہ عقلِ فطری ہے جو ترقی کے منازل طے کرنے کے بعد عقلِ کسبی بن جاتا ہے اور عقلِ مسموع کے بعد عقلِ مطبوع کے درجہ کو پہنچتا ہے پس اس واضح بیان کے بعد کوئی شک و شبہ نہ رہا کہ انسان میں ایک قوت موجود ہے جس کی بدولت وہ ورطۂ ناسوت یا خست و پستی سے اوج کمال و رفعت کی طرف بڑھتا ہے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ خیر و شر میں نیک و بد میں خست و شرف میں اور حسن و قبح میں تمیز کر سکے ورنہ ترقی کی طرف اقدام بے معنی اور شرف کی طرف تگ و دو بے فائدہ ہو جائے گی۔

اشعری نظریہ کی غلطی

عقل جب افعال کا جائزہ لے خواہ وہ افعال کسی سے صدور پذیر ہوں اور خارجی جہات و اعتبارات سے قطع نظر

کرلی جائے تاہم کوئی فعل ان حالتوں سے خالی نہ ہوگا یا تو عقل کے ملائم ہوگا جس طرح احسان کرنا تو وہ عقل کے نزدیک حَسَن ہوگا اور یا وہ عقل کے ملائم نہیں بلکہ اس سے منافرت رکھتا ہوگا جیسے ظلم وسرکشی پس اس قسم کا فعل عقل کے نزدیک قبیح ہوگا اور یا نہ ملائم نہ منافر بلکہ اس کے دونوں پہلو یکساں ہوں گے اور خارجی اعتبارات سے اس کا فیصلہ کیا جائے گا پس ایسا فعل نہ قابلِ مدح اور نہ قابلِ مذمّت ہوگا اور نفس کی جملہ قوتوں میں سے ملائمت یا منافرت صرف عقل کے لئے نہیں بلکہ نفس کی تمام قوتیں اپنے اپنے مقام پر اپنے ادراکات میں ملائمت یا منافرت رکھتی ہیں۔ جیسے کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ آنکھ کو بعض رنگ پسند اور بعض ناپسند کان کو بعض آوازیں پسند اور بعض ناپسند وعلیٰ ہذا القیاس بلکہ جس قوت میں یہ پسندی اور ناپسندی کا ملکۂ امتیاز ختم ہو جائے وہ قوت بے کار سمجھی جاتی ہے مثلاً ناک اگر خوشبو اور بدبو میں فرق نہ کر سکے تو اس کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ اور تمام قوائے بدنیہ اور حواس ظاہرہ کا یہی حال ہے۔

پس کسی کا احسان چونکہ دلالتِ خیر کرتا ہے لہٰذا یہ عقل کو محبوب ہے پس وہ حَسَن ہے اور ظلم اسی بناء پر اسے ناپسند ہے پس وہ قبیح ہے قوتِ باصرہ کی محبوب رنگ سے قوتِ شامہ کی خوشبو سے قوت سامعہ کی ملائم آواز سے ایک قسم کی سنخیت موجود ہے وعلیٰ ہذا القیاس جس قوت کو کسی شیٔ سے سنخیت حاصل ہو جائے وہی اس کی ملائم ومحبوب ہوتی ہے۔

پس عقل اور عدل بلکہ ہر کمال کے درمیان چونکہ سنخی طور پر مناسبت وباہمی قرب ہے لہٰذا عقل نیکیوں کی کان برکتوں کی بازگشت اور سعادتوں کا سرچشمہ ہے اور عقل اللہ کی محبوب ترین مخلوق ہے۔ عقل ہی عدل کی بنیاد کو اٹھانے والا اور قسط کے میزان کو نصب کرنے والا ہے پس عقل وعدل دو ایسے ساتھی ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے بلکہ عقل اصل اور عدل اس کی فرع ہے عقل راہ چلنے والا اور عدل راہ ہے عقل روشنی اور عدل اس کی مناسب فضا ہے عقل معنی ومطلب اور عدل اس کی زبان وترجمان ہے یا یوں سمجھئے کہ عقل دلیل وبرہان ہے اور عدل اس کا قانون ہے۔

اسلامی قواعد عقل کے مطابق ہیں

وہ لوگ عقل کے اندھے ہیں جنہوں نے حسن وقبح کا انکار کر کے عدل کی شریعت کو ٹھکرا دیا جب ہم ثابت کرچکے ہیں کہ عقل اشیاء کے حسن وقبح کو جانتا ہے اور اسی وجہ

سے انسان حیوانوں سے ممتاز ہے تو معلوم ہوا کہ ان کا حسن و قبح ذاتی ہے اعراض خارجہ اور حیثیات زائدہ سے نہیں جیسے احسان کا حسن اور ظلم کا قبح یا صدق کا حسن اور کذب کا قبح اور خدا چونکہ عادل ہے اور عدل کا معنی ہے ہر شئی کو اپنے مناسب محل پر رکھنا۔ لہٰذا وہ کبھی ایسی شئی کو بجالانے کا حکم نہ دے گا جس کا بجالانا قبیح ہو۔ بلکہ وہ ایسی شئی کا حکم دے گا جس کا بجالانا حسن ہو پس حسن کا اعتبار حکم سے پہلے ہوگا اور قبح کا لحاظ نہی سے مقدم ہوگا ایسا نہیں کہ تمام چیزیں ذات کے لحاظ سے برابر ہوں اور حکم یا نہی کے بعد وہ حسن یا قبیح ہوتی چلی جائیں البتہ یہ الگ بات ہے کہ کسی شئی کا حسن یا قبح ہمیں معلوم نہ ہو تو حکم شرعی اس کے حسن کا کاشف اور نہی شرعی اس کے قبح کی کاشف ہوگی۔ اور جو چیزیں کہ حسن و قبح کی صفات سے الگ ہیں تو شریعت میں نہ ان کے متعلق امر وارد ہے اور نہ نہی پس خارجی طور پر حیثیت حسن سے متصف ہوگی تو واجب یا سنت ہوگی اور اگر کوئی جہت قبح ان کو لاحق ہوگئی تو حرام یا مکروہ ہوگی ورنہ دونوں پہلو برابر ہونے کی صورت میں اسے مباح کہا جائے گا۔

خداوند کریم نے جب سے انسان کو پیدا کیا اور دین کے احکام جاری فرمائے کوئی امت اور کوئی شریعت وظائف عقل پر کما حقہ عامل نہیں ہوئی جس طرح شریعت سامیہ اسلامیہ اور ملت محمودہ محمدیہ اس پر عامل ہوئی۔ صرف اسی شریعت نے عقل کو آگے بڑھایا اور اس کے لئے دروازے کھولے اور اس کو آزاد چلنے پھرنے کی دعوت دی اور اسی شریعت نے ہی انسانی عقول کو حقوق عطا فرمائے جو ان کے لئے سزاوار تھے یعنی یہ کہ وہ علوم و معارف میں آگے بڑھیں اور عقائد حقہ کی تحصیل کر کے پستی سے نجات پاکر اوج کمال تک پہنچیں اسلام نے ہی فکر و بصیرت کو آسمانوں اور زمین میں سیر کرنے کی دعوت دی تاکہ ان کے دقیق راز معلوم ہو سکیں اور ان کے مخفی خزائن حاصل کئے جا سکیں قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں جن میں تدبر کی دعوت اور ترک فکر پر سرزنش کی گئی ہے اور ان آیات کا ظاہر و منطوق یہی بتلاتا ہے کہ فکر و نظر کے لئے قوت عاقلہ کو آگے بڑھایا جائے۔ اسی بناء پر تو قرآن نے ماں باپ کی تقلید سے روکا اور سابقہ خیالات کو اپنانے سے باز رکھنے کی سعی فرمائی اور اپنی دعوت میں عقل انسانی کو جھنجھوڑ کر ناقابل تردید دلیلیں پیش کیں نیز ظن اور اندازے پر اکتفا کر لینے کی مذمت فرمائی اور یہ صرف اسی مقدس دین کا ہی خاصہ ہے ورنہ اگر آپ روئے زمین

پر پھیلے ہوئے مذاہب بدھ برہمن سکھ اور آتش پرست وغیرہ کا جائزہ لیں گے تو آپ کو ہماری گذارشس کا مزید یقین ہوگا اور آج کل کے روشن خیال کہلانے والے انگریز لوگ مذہبی معاملہ میں بالکل مقلد ہیں اور دین کی کسی بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی ان کو قطعاً اجازت نہیں۔ بخلاف اس کے چونکہ اسلامی قواعد سب کے سب اصولاً و فروعاً عقلی حسن و قبح پر مبنی ہیں لہٰذا اسلام ببانگِ دہل ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو اپنے منشور کی دل کھول کر دعوت دیتا ہے اور ان کو تدبّر کرنے اور اسلامی اصول و فروع کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا چیلنج کرتا ہے۔

اس ساری تفصیل کے بعد آپ خود اندازہ فرمائیں کہ جو لوگ عقلی حسن و قبح کا انکار کریں ان سے بات کرنا کہاں تک درست ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ جو لوگ حسن و قبح عقلی کا انکار کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت عقل کے آثار کو باطل کرتے ہیں کیونکہ عقل کا اثر و عمل تو یہی ہے کہ حسن و قبح میں امتیاز کرکے حسن کی طرف بڑھے اور اسی کی بدولت تو وہ حیوانات سے ممتاز ہے اور جو لوگ عقل کے آثار کو باطل کریں گویا وہ عقل کی ذات و حقیقت کو باطل سمجھتے ہیں کیونکہ کوئی قوت بغیر آثار کے نہیں ہوتی اور عقل کو باطل قرار دینے والا خود عقل و شعور سے کورا اور بمنزلہ حیوان ہے۔

اشعری عقیدہ میں غلطی کی بنیاد

اشعری عقیدہ میں حسن اور قبح کے نہ ماننے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ ہے افعال خالق یعنی وہ کہتے ہیں کہ تمام کائنات میں ہر طرح کے تصرفات کا اللہ کو اختیارِ کامل حاصل ہے پس وہ جو کچھ کرے حسن ہے اور مطابق عدل ہے اس کی ملکیت میں اس کے تصرفات پر قید لگانا اور اس کے بعض تصرفات کو ممنوع کہنا اس پر ظلم ہے حالانکہ وہ فرماتا ہے لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ۝ وہ جو کچھ کرے اس سے باز پرس نہیں ہو سکتی اور لوگوں سے باز پرس ہوگی۔ لہٰذا کہنا پڑتا ہے کہ اس کا ہر فعل حَسَن ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہم اس کو ہر شئے کا مالک و مختارِ کل سمجھتے ہیں اور اس کے تصرفات میں قید لگانا ناجائز جانتے ہیں اور اس کے تصرفات میں قید کون لگا سکتا ہے؟ جب کہ نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ ضد اور نہ مثل بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی ذات سے جو فعل بھی سرزد ہو واقع کے اعتبار سے چونکہ وہ اس کا فعل ہے لہٰذا اسے حَسَن ہی

ہونا چاہیئے پس وہ محکم ہی ہوگا لیکن چونکہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ ہمارے نارسا عقول کے نزدیک دو قسموں سے خالی نہ ہوگا۔ محکم یا متشابہ۔ محکم وہ ہے جس کی مصلحت اور حسن معلوم ہو یا ظنی طور پر منکشف ہو۔ معلوم المصلحت کو نص اور مظنون المصلحت کو ظاہر کہا جاتا ہے اور متشابہ وہ ہے جس کا حسن اور مصلحت معلوم و مظنون نہ ہو خواہ اس میں احتمال ایک ہو یا زیادہ یا احتمالات کا دروازہ سرے سے بند ہو پس اگر قابلِ تاویل ہوگا تو مُاَوَّل ورنہ مجمل کہیں گے چونکہ تمام عقول کا جزمی و حتمی فیصلہ ہے کہ اللہ تمام صفات کمالی کا جامع ہے اور اس سے ایسے فعل کا صدور ناممکن ہے جو اس کی ذات کے لئے زیبا نہ ہو پس وہ فعل متشابہ صرف ہمارے نزدیک متشابہ ہے ورنہ واقع کے لحاظ سے وہ ضرور کسی مصلحت کا حامل ہوگا لہٰذا وہ حسن ہی ہوگا خواہ ہم اس کی مصلحت کو سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ باقی رہی یہ بات کہ اس کے تصرف پر قید اور پابندی نہیں لگائی جا سکتی تو اس کے متعلق ہم اس قدر کہتے ہیں کہ وہ اپنی عظمتِ شان۔ قدسیت ذات اور لطف و کرم کی بناء پر اپنے اختیار و ارادہ سے فعلِ قبیح نہیں کرتا نہ اس لئے کہ وہ کسی کا پابند ہے یا کسی باز پرس کا اس کو ڈر ہے پس یہ عقیدہ اس کے تصرف و اختیار کلی کے منافی نہیں کیونکہ اپنے لطف و کرم سے ایک کام نہ کرنا اور ہے اور مجبوراً ترک کرنا اور ہے پس وہ ذات ظلم و قبیح سے منزہ ہے۔ اور اپنی پوری خدائی میں تمام اختیارات و تصرفات میں کلی طور پر مختار ہے۔

دیکھئے ایک شریف زمیندار یا رئیس اپنی فطرتِ شریفہ کے لحاظ سے اگر شراب نہ پئے یا جوا نہ کھیلے یا کسی برائی کا ارتکاب نہ کرے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مجبوراً ایسا نہیں کرتا کیونکہ رعایا میں سے کسی کی مجال نہیں کہ اسے روکے ہاں اسے اپنی شرافت ضرور روکتی ہے جس کی بناء پر اس کے اختیار پر کوئی حرف نہیں آ سکتا پس یہاں بھی اس کی عظمت و جلال اس کی حکمت و علم اور قدرت وغیرہ کا تقاضا ہے کہ وہ ظلم نہ کرے یا فعل قبیح اس سے سرزد نہ ہو تو یہ عقیدہ اس کے اختیارات کو ہرگز باطل نہیں کرتا۔ پس اس شبہ کی بناء پر سرے سے حسن اور قبح کا انکار کر دینا اور عقل کا دروازہ بند کرنا ظلم اور اندھیر بلکہ انتہائی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

اشعری عقیدہ میں غلطی کی دوسری بنیاد

وہ یہ کہ چونکہ تمام چیزیں اللہ کی ملکیت ہیں اور تمام اشیاء

کا خالق وہی ہے تو بندوں کے افعال کا خالق بھی اللہ ہے۔ لہذا خیر و شر کے تمام افعال اسی کی تخلیق کا نتیجہ ہیں پس بندے اپنے افعال میں مجبور ہیں اور باوجود اس کے معذب بھی ہوں گے۔ بندوں کا فعل جب خدا کا فعل ہے تو حسن یا قبیح کا یہاں کوئی محل نہیں پس نہ وہ لائق مدح ہیں اور نہ لائق مذمت ہیں اور یہ عقیدۂ جبر ہے اسی بناء پر ان کو جبریہ بھی کہا جاتا ہے۔

شبہ جبر کا ابطال

بجائے اس کے کہ اس مسئلہ کو ہم ادھر اُدھر پھیلا کر درد سر کا باعث بنا دیں۔ ایک سیدھے سادے انداز میں لے واضح کرتے ہیں اگر آپ اپنے وجدان و دانش کی طرف دھیان فرمائیں تو مسئلہ بالکل واضح ہو جائے گا آپ سے صادر ہونے والا فعل جو آپ اپنے ارادہ اور اختیار سے بجالاتے ہیں۔ آپ صحیح معنوں میں اس کے کرنے یا نہ کرنے پر برابر قادر ہوا کرتے ہیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس فعل کی برائی کو جانتے ہوئے اور اس کو چھوڑنے کے فوائد کو سمجھتے ہوئے بھی مقتضائے خواہش یا غلبہ شہوت یا کسی کے جبر و اکراہ کی بدولت اُسے کر گذرتے ہیں حضرت امیر علیہ السلام کا فرمان ہے (کہ کتنی عقولیں ہیں جو خواہش نفس کی قید میں اس کے سامنے سرنگوں ہیں) بہرکیف کوئی فعل کرتے ہوئے اس کے نہ کرنے پر قادر ہونے کو اختیار کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ فعل اس کی قدرت علم اور ارادہ سے ہوا ہے اور یہ اس کے منافی نہیں کہ تمام امور اللہ کی طرف سے ہیں۔ بے شک انسان کا وجود اور اس کے جملہ عوارض اللہ کی جانب سے ہیں لیکن اس نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ اپنی مرضی و اختیار سے ہر طرح کا تصرف کر سکے جس طرح کوئی مالک اپنی ملکیت میں اور بادشاہ اپنی مملکت میں کیا کرتا ہے۔

خدا کی جس عطا کردہ قوت کے ماتحت ہم کسی کام کو بجالانے کی قوت رکھتے ہیں اسی عطا شدہ قوت کے ماتحت ہم اس کو ترک بھی کر سکتے ہیں مثلاً جس طاقت کے ماتحت ہاتھ کھول سکتے ہیں اسی طاقت کی بدولت ہاتھ باندھ بھی سکتے ہیں و علیٰ ہذا القیاس۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ بعض کاموں میں ایک پہلو آسان اور دوسرا مشکل بھی ہوا کرتا ہے کسی کام کا نہ کرنا کرنے سے آسان ہوتا ہے تاہم انسان کے اختیار میں کوئی فرق نہیں پڑتا خواہ آسان پہلو کو اختیار کرے یا مشکل پہلو کو اختیار کرے۔ مثال کے طور پر چور کے لئے

اپنے بستر پر سوتے رہنا آسان ہے لیکن بوقت شب تاریکی میں گھر سے نکل کر آرام کو ترک کر کے خطرناک مقام میں گھسنا نقب لگانا دیواریں پھلانگنا اور گرفتاری کے خوف سے ہمکنار ہونا کس قدر مشکل امور ہیں لیکن وہ حرص و ہوس خواہش نفس ناعاقبت اندیشی اور وسوسہ شیطانی کی بناء پر مشکل اور صعب ترین جانب کو اختیار کرتا ہے اور آسان کو چھوڑ دیتا ہے اسی طرح عابد شب بیدار سردی کی تکلیفیں برداشت کر کے ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کے بعد مسجد میں عبادت خدا بجا لاتا ہے اور یہ کام بستر پہ آرام کی نیند سونے سے بدرجہا مشکل ہے لیکن کچھ محرکات ہیں جو اسے مشکل کام پر آمادہ کرتے ہیں بہر کیف کسی سبب یا محرک کی بدولت اختیار کے دو پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دی جاتی ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ انسان اپنے اختیار میں آزاد ہے مثبت پہلو کو اختیار کرے یا منفی کو آسان پہلو پر عمل کرے یا مشکل پہلو پہ تو جبر کا شبہ باطل ہو گیا اور حسن و قبح عقلی ثابت ہو گیا کیونکہ اپنے اختیار سے صادر ہونے والا ہر فعل عقل کی ملائمت یا منافرت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ پس یا حسن ہو گا یا قبیح۔

تفویض کلی کا بطلان

خداوند کریم نے اپنے کلام بلاغت نظام میں ارشاد فرمایا کہ فرما دیجئے کہ ہر شیٔ اللہ ہی کی طرف سے ہے اور فرمانِ نبوی بھی منقول ہے۔

"کہ ہر شیٔ قضا و قدر سے وقوع پذیر ہوتی ہے" پس شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور عقول کی حیرت و ضلالت اور اقدام کی لغزشیں سب اسی کی بدولت رونما ہوئیں لیکن یہ سب کچھ اقدارِ کو بینہ سے غفلت کا نتیجہ ہیں اور اس بات سے چشم پوشی کا ثمرہ ہیں کہ ہر سبب اپنے مسبب سے اور ہر معلول اپنی علت سے مربوط ہے اور ناموسِ موجودات کی بقاء اسی سبب و مسبب اور علت و معلول کے سلسلہ کی مرہونِ منت ہے۔ پس صاحبانِ ادراک و شعور اور اربابِ ارادہ و اختیار کی قدرت سے صادر ہونے والا ہر فعل درحقیقت اسی ذاتِ مقدسہ کی طرف مستند اور اسی کا معلول ہے جس نے اس کو ارادہ و اختیار ادراک و شعور اور قدرت و طاقت عطا فرمائی ہے اگرچہ ظاہری طور پر اس فعل کی نسبت علتِ قریبہ کی طرف ہو گی لیکن علتِ اولیٰ کی طرف نسبت بھی حق اور واقع ہے کیونکہ قوت و اختیار کی علت وہی ہے لہٰذا اس کو فعل میں موثر ماننا بھی درست ہے پس خدا نہ تو بندے کے

فعل سے بالکل الگ ہے جس طرح تفویض کلی والے کہتے ہیں اور نہ بالکل وہی فاعل ہے جس طرح جبر والے کہتے ہیں گویا فعل کا وقوع پذیر ہونا علی الترتیب دو فاعلوں کے اثر سے ہے ایک وہ فاعل ہے جس سے وہ فعل صادر ہوا اور دوسرا وہ بھی فاعل ہے جس نے فاعل کو اس فعل کی طاقت اور ارادہ و اختیار تفویض فرمایا اور کلماتِ آئمہؑ میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے چنانچہ فرمایا:۔ لَاجَبْرَ وَلَاتَفْوِيْضَ بَلْ اَمْرٌ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ۔ کہ نہ جبر کا عقیدہ درست ہے کہ سب کچھ خدا کرتا ہے اور بندہ مجبور محض ہے اور نہ یہ عقیدہ درست ہے کہ بندہ کے فعل میں خدا کا دخل بالکل نہیں جیسے کہ اہلِ تفویض کہتے ہیں بالکل ان دونو کے درمیان عقیدہ رکھنا درست ہے کہ فاعل قریب بندہ ہے اور فاعل کی قدرت ارادہ اور اختیار چونکہ اللہ کی جانب سے ہے لہٰذا وہ اس کا فاعل بعید ہے پس انسان کا فعل حُسن و قبح کی صفت سے متصف ہوگا اور عدلِ پروردگار کے ماتحت فعلِ حُسن پر جزا اور فعلِ قبیح پر سزا ملے گی عدل کی بحث اپنی تمام فرعی نزاعات کے ساتھ ختم ہو گئی اور ہم اپنے مقصد کو بڑے مختصر انداز سے واضح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ والحمد للہ رب العالمین۔

قضا و قدر کا عقیدہ

یہ ایسا مسئلہ ہے کہ خازنانِ علومِ وحی و ترجمانانِ کتابِ کون معصومین علیہم السلام نے اس مسئلہ میں زیادہ گھسنے سے منع فرمایا ہے چنانچہ جب حضرت امیر علیہ السلام سے مسئلہ قدر کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا طَرِيْقٌ مُظْلِمٌ فَلَا تَسْلُكُوْهُ یعنی یہ تاریک و پر خطر راستہ ہے اس پر نہ چلو جب دوسری دفعہ سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا بَحْرٌ عَمِيْقٌ فَلَا تَلِجُوْهُ ؀ یہ گہرا سمندر ہے اس میں داخل ہونے سے بچو اور پھر تیسری مرتبہ سوال ہوا تو جواباً ارشاد فرمایا سِرُّ اللّٰهِ فَلَا تَتَكَلَّفُوْهُ ؀ یہ اللہ کا راز ہے اس میں نہ پڑو۔

بروایت تفسیر صدرا حضرت رسالت مآب سے منقول ہے کہ قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں ایک دوسری روایت میں فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الْقَدَرِيَّةَ عَلٰى لِسَانِ سَبْعِيْنَ نَبِيًّا قَبْلَكَ وَمَنِ الْقَدَرِيَّةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ قَوْمٌ يَزْعَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ قَدَّرَ عَلَيْهِمُ الْمَعَاصِيَ یعنی ستر نبیوں کی زبانی خدا نے فرقہ قدریہ پر لعنت بھیجی ہے جب آپ سے سوال کیا گیا کہ قدریہ کون لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا وہ قوم جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا نے ہمارے لئے گناہ مقدر کر دیئے ہیں۔ جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضور

نے فرمایا ایک قوم پیدا ہو گی جو گناہ کرنے کے بعد کہے گی کہ خدا کی تقدیر ایسی تھی پس ان کی تردید کرنا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے افضل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خداوند عالم نے عالم ظاہری میں اشیاء کو اسباب سے وابستہ کر دیا ہے اور اشیاء کے صحیح و غلط استعمال کا انسان کو پورا پورا اختیار دے رکھا ہے نیک اعمال کو سبب نجات اور بد اعمال کو سبب عذاب قرار دیا ہے ادھر علم ازلی میں یہ ثابت ہے کہ فلاں شخص نیک اعمال کر کے ناجی ہو گا اور فلاں شخص بد اعمالیوں کی بدولت جہنمی ہو گا تو جس شخص کی نیکی کے متعلق خدا کا علم ازلی ثابت ہے تو دنیا میں اس سے نیکی ہی ہو گی اور علم ازلی الٰہی میں جس کا بد اعمال ہونا ثابت ہے تو وہ بد اعمال ہی ہو گا اور مستحق سزا ہو گا لیکن دوسری طرف یہ ارشاد اس نے خود فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ کہ خداوند کریم کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے میں خود نہ تبدیلی پیدا کریں۔ پس اس کا صاف و صریح مقصد یہ ہے کہ خدا کا علم ازلی انسان کے اختیار میں رکاوٹ کا باعث نہیں ہے اور فرمایا وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ۔ یعنی جب اپنے اختیارات سے انسان اپنی غلطیوں سے باز نہ آئے اور عذاب حتمی کا سزاوار ہو جائے تو خدا اس پر عذاب بھیجتا ہے اور اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ قضا کا اعتقاد رکھنا بھی درست ہے چنانچہ حدیث قدسی میں وارد ہے مَنْ لَمْ يَرْضَ بِقَضَائِیْ۔ وَلَمْ يَصْبِرْ عَلٰی بَلَائِیْ فَلْيَبْغِ رَبًّا سِوَائِیْ وَلْيَخْرُجْ مِنْ اَرْضِیْ وَسَمَائِیْ۔ جو میری قضا پر راضی نہ ہو اور میرے بھیجے ہوئے مصائب پر صبر نہ کرے تو پھر میرے علاوہ کوئی اور رب تلاش کر کے اس کی عبادت کرے اور میرے زمین و آسمان سے سکونت منتقل کر کے کہیں اور جا کر آباد ہو۔ لیکن یہ بھی یقین کرنا چاہیے کہ قضا کی دو قسمیں ہیں ایک مبرم و محتوم دوسری قضائے غیر محتوم و غیر مبرم۔ محتوم وہ ہے جس کا ہونا ضروری ہو اور غیر مبرم وہ ہے جس میں انسان کے اختیار کو دخل ہو۔ پس انسان کا اپنے اختیار سے گناہوں پر ڈٹا رہنا اور فعل بد سے توبہ نہ کرنا اور کفر ہی کفر کی حالت میں مرنا اس کے لئے جہنم کو حتمی بنا دیتا ہے لیکن جب ابتداء میں کافر ہو تو اس کے لئے یہ قضا حتمی نہیں کیونکہ اگر توبہ کرے تو اس کا جہنمی ہونا جنتی ہونے سے تبدیل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کے تمام اختیاری افعال میں قضا و قدر حتمی و مبرم نہیں ہوا کرتی بلکہ بندے کے

اپنے اختیارات سے اس کی تقدیر بدل سکتی ہے جیسا کہ آیتِ مجیدہ کا مضمون تھا۔ حجاج بن
یوسف نے جب علماء سے قضاء و قدر کے متعلق دریافت کیا تو عامر شعبی نے لکھا کہ اس
مسئلہ میں حضرت امیر علیہ السلام کے فیصلہ سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا
ہے كُلَّمَا اسْتَغْفَرْتَ مِنْهُ فَهُوَ مِنْكَ وَكُلَّمَا حَمِدْتَ اللّٰهَ عَلَيْهِ فَهُوَ مِنْهُ ۔ یعنی ہر
وہ فعل جس سے تو معافی مانگے تو سمجھ لے کہ وہ تجھ سے اختیاراً صادر ہوا ہے اور ہر وہ فعل
جس کے متعلق تو اللہ کی حمد کرے تو سمجھ لے کہ وہ فعل تیرا نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے ہے۔
امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک شخص نے مسئلہ قضا و قدر کے متعلق دریافت کیا تو آپ
نے جواب میں ارشاد فرمایا ہر وہ فعل جس کے کرنے پر انسان کو ملامت کی جا سکے وہ عبد کا
فعل ہے اور وہ ہر فعل جس پر عبد کو ملامت نہ کی جا سکے وہ اللہ کا فعل ہے مثلاً کہا جاتا
ہے تو نے شراب کیوں پیا تو نے زنا کیوں کیا تو یہ بندے کے فعل ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا
کہ تو خوبصورت کیوں ہوا۔ تو چھوٹا کیوں ہوا۔ پس سمجھ لو کہ یہ اللہ کا فعل ہے۔ والحمد للہ رب العالمین
تفسیر انوار النجف کی دوسری جلد میں اس مسئلہ کی مزید توضیح ملاحظہ فرمائیے۔

سابقہ ابحاث کا تتمہ

دین میں دوکانداری

یہ دستور عام ہے کہ جب بازار میں کوئی شیئ مقبول ہو جائے اور منڈی میں اس کی مانگ عام ہو جائے تو تاجر لوگ اسی کی لین دین کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔ دینِ خداوندی پہلے دن سے اسی مصیبت سے دوچار رہا ہے کیونکہ دعوتِ اسلامیہ کو خدا کی جانب سے جو مبلغ بھی لے کر آیا ہے اس کے دلائل کے سامنے صاحبانِ عقول جھک گئے تو شیطان نے فوراً ان کو گمراہ کرنے کا حربہ نکال لیا اور وہ یہ کہ اس دین کی مقبولیت کے پیشِ نظر داعیانِ حق کے علاوہ اس نے کئی اور دکاندار کھڑے کر دیئے جو دین کا ڈھنڈورا پیٹنے لگ گئے اور دینِ اصلی میں اپنی طرف سے خواہشاتی اور جذباتی امور کی آمیزش کر کے اسے خوب چمکا سجا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے لگے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی صداقت نما فریب کاریوں اور حق نما جعل سازیوں کے جال میں سادہ ضمیر انسانوں کو پھنسانے کے درپے ہوئے ادھر اللہ کے دین میں چونکہ صرف خلوص کا ہی بول بالا تھا۔ لہٰذا انہوں نے خلوص پر کئی ملمع کاریوں کے لیبل لگائے پس اصلی دین کے مقابلہ میں جب ان دکانداروں نے خواہشاتی دین پر اصلی دین کا لباس دلیل پڑھا کر پیش کیا تو عوام کالانعام نے اس کو مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اصلی دین والے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے اور بناوٹی بازی لے گئے۔ اُن سے مفت دین کوئی نہیں لیتا اور ان سے بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے دین لینا معمول بن گیا۔ وہاں صرف ثواب ہی ثواب تھا اور یہاں سواد اور ثواب کی کھچڑی پکی ہوئی ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ایسے لوگ نہ دین کے رہتے ہیں اور نہ دنیا کے۔

پیری و مریدی کی وباء عام اور اس کا انجام

خدا کا دین جو انسانی شرافت کا ایک بہترین دستور العمل اور تکمیل کمال کا عمدہ ترین طریق کار تھا۔ اور خدائے قدوس نے جو اپنی طرف

ہے اس کے مبلغ و محافظ بھیجے وہ معصوم تھے اور ان کا مقصد صرف لوگوں کی بھلائی تھا لیکن خود غرض شکم پرست اور حرص و ہوس کے بندے جب شیطانی تحریک سے اس کو کاروباری کامیاب طریقہ سمجھ کر آگے بڑھے تو دیکھا کہ لوگ دین سے وابستگی کی جو غرض رکھتے ہیں وہ ہے بہشت کا حصول اور دوزخ کے عذاب سے نجات اور یہ مقصد تب حاصل ہو سکتا ہے کہ خوشنودئی خدا حاصل کی جائے پس انہوں نے اپنے آپ کو خوشنودی خدا کا ذمہ دار اور جنت کا ٹھیکیدار ظاہر کرنے کا پروگرام مرتب کر لیا اور پیری و مرشدی اسی جذبہ کا نام ہے اور ان کا یہ جذبہ تشنۂ تکمیل رہتا اگر یہ اپنے حق نما شیطانی جال پر دین و ایمان کا لیبل نہ لگاتے اور یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتا اگر وہ اپنی دو کانداری اور کاروباری حیثیت پر خلوص و تقدس کا غلاف نہ چڑھاتے پس دوکان چمکی اور خوب چمکی انہوں نے سستے داموں جنت کی نیلامی کا اعلان کر دیا اور زمانے کے انقلابات کے ساتھ ساتھ گرگٹ کی طرح انہوں نے بھی کئی رنگ بدلے اور اپنی دوکانوں کو رفتارِ زمانہ کے مطابق جاذبِ نظر لیبلوں سے آراستہ کیا اور مرید طبقہ میں سے ہوشیار لوگوں نے مخصوص منافع کی خاطر اپنے اپنے انداز میں اشتہار اور اعلان کا بہت بڑا کردار ادا کیا اور آخر کار مسلّمہ طور پر آخرت تو بجائے خود دنیا میں بھی وہ خدائی ٹھیکہ دار بن بیٹھے اگر کسی کو اولاد کی ضرورت ہے تو خدا سے دُعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے پیر کے دروازہ پر چلو۔ اگر رزق میں وسعت کی ضرورت ہوتی ہے تو پیر کے دروازہ کا رُخ اور بیماریوں کا دفعیہ مقدمہ میں فتح و کامرانی دشمن کی شکست بلکہ جملہ تکوینی امور میں پیر کو مختارِ کل سمجھا جانے لگا ہواؤں کو چلانے والا بارشوں کو برسانے والا اور دریاؤں کا رُخ موڑنے والا گویا تقدیر و تدبیر خداوندی کا مالک اسی کو قرار دیا گیا۔ ہمارے ملک میں یہ مرض اس قدر زوروں پر ہے کہ خدا کی پناہ پیر و مرشد کا سجدہ کرنا تو ایسا معمول ہے جسے واجب سے بھی زیادہ درجہ دیا جاتا ہے فرعونی مسند کو سجانے والا نمرودی راگ الاپنے والا اور دقیانوسی سطح پر کبر و غرور کے نشے میں چور ردائے ربوبیت میں ہاتھ ڈالنے والا اس طرح اکڑ کر پیش آتا ہے جیسے واقعاً وہ ان سب کا خالق ولی نعمت رازق و مختارِ کل ہو وہ جس کو نگاہِ کرم سے دیکھ لے وہ اپنے اندر پھولا نہیں سماتا اور جس پر نگاہِ غضب کرے وہ موت سے پہلے مرنے لگ جاتا ہے اگرچہ زبان سے کہنے کی جرأت ان کو نہیں لیکن عمل سے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا ہی اظہار ہوتا ہے۔

بھیڑ چال لوگوں کا گروہ تو ان کے بے ہودہ اطوار پر بھی سر دھننے لگتا ہے ان کو ان کی ہر ادا بھاتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ خوش تو دنیا و آخرت میں کامیابی اور اگر یہ ناخوش تو ہر سُو ناکامی ہے ایسی صورت میں ان کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں اور ناصح کی نصیحت ذرہ بھر اثر نہیں کرتی۔ اس شرک جلی کے بعد بھی وہ مسلمان کہلانے میں ذرہ بھر شرم محسوس نہیں کرتے۔ پیر لوگ اپنے مریدوں میں سے کام کے آدمیوں کو ٹٹول لیتے ہیں اور ان کو ہر قیمت پر اپنا گرویدہ بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھتے کیونکہ ایسوں کا پھنسا رہنا عام بھیڑوں کے پھنسانے کا موجب ہوتا ہے اور ایسوں کا منحرف ہونا دوکان کے پھیکا پڑنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے لہٰذا ایسے لوگوں پر وہ ہر قسم کی نوازش کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

پیر کسی کو اولاد کسی کو مال اور کسی کو فتح و نصرت کی بشارت غرضیکہ جو بھی دربار میں آیا اس کو کچھ نہ کچھ اپنے زعم باطل سے دے ہی دیا کیونکہ وہ یہ باور کراتا ہے کہ خدائی اختیارات میرے قبضہ میں ہیں۔ ممکن ہے فرعون کی طرح یہ لوگ اکیلے ہو کر بارگاہِ ربوبیت میں گریہ کرتے ہوں اور دنیاوی اقتدار کی بقاء کے لئے اس سے مہلت طلب کرتے ہوں۔ ورنہ ظاہری اعتبار سے ہم نے ان کو انتہائی متکبر اور ناخدا ترس اور حرص و ہوس کا بندہ ہی پایا ہے یہ لوگ اپنے مسلک کو ضروری قرار دیتے ہیں اور عوام کو یقین دلاتے ہیں کہ جس کا دنیا میں پیر نہ ہوگا وہ جنت میں قطعاً جا سکتا ہی نہیں۔ حتاکہ بعض ان پڑھ شیعہ لوگ جو اس قسم کے پیر پرست طبقہ کی اکثریت میں بود و باش رکھتے ہیں وہ بیچارے بھی اس عقیدہ سے کافی کُستاثر ہوتے ہیں اور ان کو سمجھانے میں کافی دقت محسوس ہوتی ہے۔

یہ لوگ اپنے مسلک کے اثبات میں قرآن مجید کی بعض آیات کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں بہرکیف مجھے اس بارے میں طول کی ضرورت نہیں خدا کا دین آسان ہے اور توحید کا راستہ صاف ہے خدائی صفات میں کسی کو حصہ دار بنانا شرک ہے جو قطعاً ناقابلِ معافی ہے خدا کے سوا کوئی کسی کو نہ بچہ دے سکتا ہے نہ مشکلیں دُور کر سکتا ہے نہ مصائب کو رفع کر سکتا ہے اور نہ کسی تکوینی امر میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے خواہ وہ پیر و مرشد یا ولی کہلاتا پھرے حتاکہ وہ لوگ جو خدا کی جانب سے عہدۂ نبوت پر فائز تھے یا ولایتِ کاملہ کے حامل تھے انہوں نے بھی اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا البتہ ان کے وسیلہ سے دعا مانگی جائے تو خدا قبول کرتا ہے پس ان کی نصرت و امداد صرف وسیلہ کی حد تک ہے البتہ دین و شریعت کے معاملہ میں وہ ہادیِ کُل اور رہبرِ مطلق ہیں ان کی رضا اللہ کی رضا ہے اور ان کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے۔ خداوند کریم ایسے ظالموں

کی اس طرح تصویر کشی کرتا ہے کہ بروز قیامت وہ کس طرح ذلیل ہوں گے۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ

جب بیزار ہوں گے وہ جن کی پیروی کی گئی (پیر) ان سے جنہوں نے پیروی کی (مرید) اور عذاب کو دیکھ لیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے تو کہیں گے پیروی کرنے والے (مرید) کاش ہمیں واپس پلٹنا ہوتا تو ان (پیروں) سے ہم بھی بیزار ہوتے جس طرح وہ (پیر) ہم سے بیزار ہوئے ہیں اسی طرح دکھائے گا خدا ان کو اپنے اعمال باعث حسرت اور وہ دوزخ سے نہ نکل سکیں گے

(ان) مرید کہیں گے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا اور پیر کہیں گے نہیں بلکہ تم خود گمراہ تھے پس دونو ایک دوسرے پر لعنت و تبرا کریں گے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ دونو عذاب میں برابر کے شریک ہوں گے۔

سورہ اعراف رکوع ۱۱ میں ارشاد قدرت ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

دوزخ میں جب ایک جماعت پہنچے گی تو دوسری جماعت پر لعنت کرے گی حتاکہ جب اس میں سب کے سب پہنچ جائیں گے تو پہلی جماعت کے متعلق کہے گی اے پروردگار ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا لہٰذا ان کو دگنا عذاب دے دوزخ کا تو وہ فرمائیگا ہر ایک کیلئے عذاب دگنا ہے لیکن تم کو خبر نہیں ہے

جس طرح دوسرے مسلمانوں میں دین کی ٹھیکیداری اور جنت کی ارزانی کے لئے پیرو مرشد طبقہ کربستہ ہوا ہے ہمارے ہاں وہی ٹھیکہ اہل منبر طبقہ میں سے بعض نااہل خطیبوں نے لے لیا ہے ان کے ہاں تو البتہ خدا کی اس قدر پاس تھی کہ مساجد آباد اور قرآن کی رونق باقی تھی ان لوگوں نے تو اس قدر جنت دکھائی کہ مسجد و قرآن نمازیوں اور قاریوں کے لئے ترسنے لگ گئے، وہاں کچھ ظاہری طور پر اسلامی شعائر کا لحاظ تھا یہاں تو معاملہ صاف ہے حالانکہ فرمان معصوم میں عالم کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ صحیح عالم وہ ہے جو لوگوں کو

جنت کی پیشکش کر کے ان کو خوفِ خدا سے آزاد کرتے ہوئے گناہوں سے جری نہ کردے اور دوزخ سے ڈرا ڈرا کر ان کو رحمتِ خدا سے مایوس نہ کردے۔

اتنا فرق ضرور ہے کہ وہاں پیروں و مرشدوں نے خود خدائی کا ٹھیکہ لے لیا لیکن یہاں ان لوگوں نے محمد و آلِ محمد علیہم السلام پر ظلم کرتے ہوئے ہر بات ان کی طرف منسوب کردی کسی نے اپنی طرف سے اعلان کیا کہ وہ امورِ تکوینیہ کے مالک ہیں اور کسی نے تجاوز کی حدیں توڑتے ہوئے اور عدل و انصاف کا خون کرتے ہوئے یہ دعویٰ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی طرف منسوب کردیا کہ وہ خود امور الٰہیہ کی انجام دہی کے دعویدار تھے حالانکہ یہ ان کی ذات پر بہتانِ عظیم اور ظلم صریح ہے ان کے اپنے کلمات جن میں سے مشتے نمونہ از خروارے ہم نے نقل کئے ہیں جو توحید کی معرفت میں بلاغت و فصاحت کے دریا بہاتے ہوئے اپنی بندگی کے اعتراف کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ خدا کی قسم ان کی مناجات کے کلمات سن کر پتھر سے پتھر دل بھی پانی ہو جاتا ہے اور توحید کے متعلق جتنا مواد ان کے کلمات میں مل سکتا ہے۔ تمام عالم کے موحدین مل کر بھی ان کا عشر عشیر تک ادا نہیں کر سکتے بہر کیف آئمہ طاہرین کا دامن تمام ایسی آلائشوں سے پاک ہے جو نا اہل لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

محمدؐ و آلِ محمدؐ کا دستور تھا کہ اپنی تمام حاجات اسی ذات سے ہی طلب کرتے تھے کبھی انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم سے حاجات طلب کیا کرو یا ہم تم کو اولاد دیتے ہیں یا ہم بیماروں کو شفا دیتے ہیں حاشا و کلا بلکہ ان کی تعلیم یہی ہے کہ خدا سے مانگو اور ہمیں بطور وسیلہ و واسطہ کے پیش کرو۔ ہماری وجہ سے تمہاری دعائیں قبول ہوں گی اور اسی لئے ضروری ہے کہ انسان دعا سے قبل و بعد محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود بھیجے کیونکہ یہ طریقہ استجابتِ دعا کے زیادہ قریب ہے۔

نا اہل خطیب و واعظ

اس امر میں شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ جب تک دین خوشنودی پروردگار کا ذریعہ اور شرفِ انسانی کے حصول کا وسیلہ رہے اس وقت تک اس کے فرائض کی بجا آوری ذمہ دار افراد کے ہاتھ میں رہتی ہے لیکن جب کسبِ دنیا کا وسیلہ و ذریعہ بن جائے تو وہ ہر قسم کی دعا نمائی کا مرکز و محور بن جاتا ہے قوم یہود میں جب تک تورات حصول شرف کا ذریعہ تھا لوگ اس کے علوم کی

تحصیل میں بڑی کد و کاوش سے کام لیتے تھے اور اس کی آیات تحریف و تصحیف کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ تھیں لیکن جب اسی تورات کو کسب معاش کا ذریعہ سمجھا گیا۔ تو امیروں، خواہش پرستاروں، ہوس صاحبان اقتدار سے منافع حاصل کرنے کی خاطر علمائے تورات کا رویہ مخدوش ہو گیا اور انہوں نے خوشنودی حق کی بجائے رضائے نفس کو مقدم کرتے ہوئے دین کی ناموس کو تباہ کر دیا اور حقائق شرعیہ کو کچلتے ہوئے صحف الٰہیہ کی آیات کو مسخ کرنا اپنا شغلہ بنا لیا۔ چنانچہ قرآن مجید ایسے ظالموں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے ترجمہ: بروہ کتاب (یعنی تورات) کو اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یعنی کتاب میں اپنی طرف سے مطالب جوڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے ان کے بعد نصاریٰ کے پادریوں کا بھی یہی حال ہوا جس کی بدولت شریعت عیسوی کا خوش نما چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا۔

اب ہمارے ہاں بھی یہی حالت بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اور افسوسناک ہے کہ ذکر حسین جب تک دین داری کی حد تک تھا اس وقت تک لوگ اس ذکر مقدس کو ایک ذمہ دارانہ عہدہ سمجھتے تھے اور جب سے، یہ ذکر کسب معاش کا ذریعہ سمجھا گیا ہے اس وادی میں قدم رکھنے والے اپنے آپ کو ایک فن کار اور پیشہ ور سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مذہبی ذمہ داری کی بجائے اگر نظریہ کسب معاش اور پیشہ ہو تو اس میں خلوص کس حد تک ہو گا اور دینی لحاظ کس پایہ تک ہو گا؟

خطیب و واعظ کا مقدس نام ہی اس امر کا غماز ہے کہ وہ ذمہ دار افراد ہوں لیکن میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ بازار میں جس جنس کا نرخ زیادہ ہو لوگ اسی رنگ کو اپنانا ہی کامیابی و کامرانی سمجھتے ہیں پس ذمہ دار واعظوں اور اہل علم خطیبوں کی بجائے "نا اہل لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے ذکر حسین اور فضائل محمد و آل محمد کے بہانہ سے وہ کھیل کھیلا کہ تورات و انجیل میں راہبوں اور پادریوں کو مات کر دیا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں قوم کی جیبیں خوب خالی کیں۔ اور عقائد اسلامیہ کا ایسا ستیاناس کیا کہ الامان اور ظلم بالائے ظلم یہ کہ جب ذمہ دار حضرات نے قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو لادینیت و شرک کے خطرناک بھنور میں جاتے ہوئے دیکھا۔ تو دین کی حفاظت کا علم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حدود توحید کو توڑنے والوں کو متنبہ کیا اور آل محمد کی فرمائشات پڑھ پڑھ کر سمجھانے کی کوشش کی تو فن کار لوگوں نے نہ ماننا تھا اور نہ مانے

بلکہ الٹا علماء کا منہ چڑانے لگ گئے اور انہیں دین کے دشمن کہہ کر خود دین کے علمبردار بن بیٹھے اگر ان کے اس طرزِ عمل کو بے دینی کہا جائے تو فوراً اصلاح کرنے والوں کو عزاداری کا دشمن کہا جاتا ہے اور اگر ان کی اصلاح سے اغماض کر دیا جائے تو معصوم کا فرمان ہے کہ بدعت کو دیکھنے کے بعد اپنے علم کو ظاہر نہ کرنے والا ملعون ہے پس دین کی حالت گندگی میں پڑے ہوئے نوالے کی طرح ہے کہ انسان اس کو اٹھائے تو ہاتھ نجس ہو جاتے ہیں اور رہنے دے تو ضمیر ملامت کرتی ہے پروردگارِ عالم اپنی توحید و عظمت کے صدقہ میں اور بتصدق محمدؐ و آلِ محمدؐ ان لوگوں کو ہدایت فرمائے اور خدا کی قسم ہماری قوم موجودہ خطابت و ذاکری سے ذہنی کوفت محسوس کرتی ہے لیکن انہیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ دین صرف یہی ہے جو تم کر رہے ہو ایسی صورت میں اگر علماء آواز اٹھائیں تو صاحبانِ منبر فوراً ان کا گلا گھونٹنے کی فکر میں رہتے ہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ اگر دین کی تعلیمات اپنے صحیح اصولوں پر ہو گئیں تو ہمارے لقمہ تر کو نقصان پہنچے گا گویا ان کی دین تراشی جیب تراشی کا ذریعہ ہے۔

حضرت علیؑ کی امداد اور کلمہ یا علیؑ مدد

سارے بیان سے آپ اندازہ کریں گے اور اب بھی ببانگ دہل میں اعلان کرتا ہوں کہ علیؑ کی نصرت و امداد کا انکار دینی قدروں کا انکار ہے علیؑ دین کا ناصر قرآن کا ناصر شریعت کا ناصر اور ناموسِ اسلام کا ناصر ہے ہم نے دنیا میں قدم رکھا تو محمدؐ و آلِ محمدؐ کے وجود کی بدولت ہمیں دین و اسلام ملا تو انہی کی طفیل ہم عالم برزخ میں آرام چاہتے ہیں تو انہی کے صدقہ میں ہم نے پل صراط سے گزرنا ہے تو انہی کی ولا سے اسی طرح کوثر لواءالحمد اور جنت انہی کے صدقہ سے ملے گی اور حساب و کتاب کی منزل آسان ہو گی تو ان ہی کی ولا کے صدقہ میں نیز ہماری دعائیں مستجاب ہوتی ہیں تو انہیں کے وسیلہ سے ہمیں رزق و اولاد ملتی ہے تو انہیں کے صدقہ سے غرضیکہ جو کچھ ملتا ہے یا ملے گا یا مل چکا ہے وہ سب انہی کے صدقہ سے ہے فقط فرق یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں دینے والا اللہ ہے اور مدد کرنے والے یہ ہیں ہم اللہ کو معطل نہیں مانتے پس اس نظریہ کے ماتحت یا علیؑ مدد یا عباسؑ اور کبھی یا حسینؑ اور یا رسولؐ اللہ کہنا سب جائز اور درست ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اللہ بالکل معطل ہے یا یہ اللہ کے ساتھ شریک ہیں یا یہ کہ اللہ ان کا محتاج ہے اور بغیر ان کے کوئی کام ہی

نہیں کر سکتا یا یہ کہ اللہ ان کی بات ماننے پر مجبور ہے یا یہ کہ اللہ نے سب کچھ ان کے حوالہ کر دیا اور خود صرف تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے کوئی اختیار باقی نہیں رہا اس قسم کے اعتقادات کفر اور شرک ہیں اور ان عقائد سے آئمہ طاہرین خود بری اور بیزار ہیں جیسا کہ اس سے قبل چند روایات درج کی جا چکی ہیں ۔ لہٰذا شیعوں کی طرف ایسے عقائد منسوب کرنا ظلم ہے۔

یا یوں سمجھئے کہ دینی اور شرعی لحاظ سے ان کی امداد بالذات ہے نیز اخروی شفاعت کے لحاظ سے بھی ان کی امداد بالذات ہے لیکن خلق و رزق و مال و اولاد وغیرہ میں ان کی امداد ۔ وسیلہ کی حیثیت سے ہے یا یہ کہ تشریعی امور میں ان کی مدد ذاتی ہے اور تکوینی امور میں ان کی مدد وسیلہ کی صورت میں ہے لہٰذا جو یہ کہے کہ علماء اعلام حضرت علیؑ کی امداد کے منکر ہیں وہ جھوٹا ہے علماء ایسے شخص کے بہتان و اتہام سے بری الذمہ ہیں اسی طرح جو یہ کہے کہ شیعہ لوگ محمدؐ و آل محمدؐ کو خدا کا شریک مانتے ہیں وہ بھی کذاب و مفتری ہے چنانچہ ہمارا بیان اس کا شاہد بین ہے۔

حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ

ہر وقت ہر آن ہر حیثیت سے حاوی و محیط ذات پروردگار ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں اور ہر شئی کو کلی و جزوی طور پر کما حقہٗ وہی جانتا ہے پس اس طرح حاضر و ناظر صرف اللہ سبحانہٗ ہے اور اس سے کوئی شئی غائب نہیں۔

ہاں محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کی ولا ہر جگہ حاضر ان کی محبت تمام مومنوں کے دلوں میں حاضر ان کا دین حاضر اور ان کی مہربانیاں جو ہم پر انہوں نے کی ہیں وہ حاضر ہیں کیونکہ وہ محسن غائب نہیں جس کی تعلیمات ہر وقت چراغ راہ سعادت بنی ہوئی ہوں اس انداز سے بیشک وہ حاضر ہیں اور ان کو اس رنگ میں حاضر ماننا ایمان ہے اور اس کا انکار ظلم ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اگر ہم ان کو بلائیں تو وہ آسکتے ہیں یا نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اگر خدا چاہے تو ان کو جسم کے ساتھ ہماری مدد کے لئے بھیج دے اور چاہے تو ان کے غلاموں کو بھیج دے جو فرشتے ہیں اور چاہے تو کسی اور ذریعہ سے ہماری مشکل کشائی کر دے یہ خدا کی اپنی مشیت ہے وہ اپنے کاموں میں مختار کل ہے۔ وہ کسی کا پابند ہے نہ محتاج۔

وہ روحانی طور پر ہر وقت ہمارے ساتھ ہیں اور اپنے ہر موالی و محب کے ساتھ ہیں اگر ہم اطاعت کرنے والے ہوں تو ہم سے خوش ہوتے ہیں اور اگر نافرمانی کر رہے ہوں تو وہ روحانی طور پر

ہیں دیکھ کر ناراض ہوتے ہیں اور بیزار ہوتے ہیں اور ان کی روحانی نصرت ہر وقت رہتی ہے جو نصرت کے قابل ہو۔ دیکھئے ہر منبر پر جانے والا بڑے بڑے دعوؤں سے کہتا ہے۔ کہ مجلس میں ارواح معصومین علیہم السّلام آتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ روحانی طور پر ہمارے ساتھ ہیں البتہ وہ جس مجلس میں حاضر ہوں گے اسی مجلس کی حیثیت سے حاضر ہوں گے ـــــــــ پس اگر مجلس حسینیوں کی ہو جن میں حسینی کردار کی جھلک ہو تو وہ حسینی دربار سمجھ کر جائیں گے لیکن اگر مجلس میں یزیدی کردار کا مظاہرہ ہو خود تمیں بے پردہ ہوں منبر کی طرف آنے والے کا حلیہ یزیدی ہو ان کا بیان توہین مذہب پر مبنی ہو۔ وہ نماز کا واقف نہ ہو وضو صحیح نہ ہو ڈاڑھی منڈی ہو زنا کرنے سے بچتا نہ ہو ہر قسم کی آوارگی اس سے عیاں ہو جس کو دیکھ کر شرافت پناہ مانگے دیانت شرم محسوس کرے اور حیا سر چھپانے لگے اور علاوہ ازیں نہ اسے امام حسین کی تاریخ کا علم ہو نہ واقعات شہادت سے کوئی اطلاع ہو تو ایسی مجالس میں ارواح آئمہ کی تشریف آوری محض خوش فہمی ہے۔ اور اگر حاضر و ناظر کا یہ معنی ہے کہ چشم زدن میں بمشیت پروردگار عرش سے فرش تک اور فرش سے عرش تک یا شمال سے جنوب تک اور جنوب سے شمال تک اسی طرح مشرق سے مغرب تک اور مغرب سے مشرق تک پہنچ سکتے ہیں تو اس میں کسی کے لئے مجالِ انکار نہیں۔

خدا کی قسم شرافت اپنا منہ پیٹ لیتی ہے شرم کا شرم سے سر جھک جاتا ہے اور حیا کی پیشانی پر حیا کے مارے پسینہ آ جاتا ہے میں نے کسی رسالہ میں پڑھا تھا کہ مسلمانوں میں دو فرقے ہیں جن میں گانا دین ہے ایک شیعہ اور دوسرے بعض گدی والے اور یہ مصیبت ناقابل برداشت اور انتہائی جان لیوا ہے کہ اپنے اٹھ کر امام مظلوم کے اس مشن کو برباد کریں جس کو امام نے اپنا سب کچھ قربان کر کے بچایا تھا لہٰذا ذاکرین کی خدمت میں گزارش ہے کہ میرے ان سخت الفاظ پر ناراض ہونے کے بجائے اپنے کردار کا جائزہ لیں اور اس کی اصلاح کریں اور بانیان مجلس اور مومنین کرام پر ضروری ہے کہ آداب مجلس کا پورا پورا خیال کریں تاکہ ارواح معصومین علیہم السلام کی تشریف آوری یقینی ہو اور مجلس کی مقبولیت حتمی ہو۔

میرا دل نہیں چاہتا کہ ایسی باتیں زبان قلم سے نکلیں کیونکہ دلوں پر ٹھیس لگنے کا ڈر ہے اور لوگوں کی غلط فہمیوں کا اندیشہ ہے تاہم ایک مسلسل درد کی داستان ہے جو ذہن میں آتی ہے اور قلم مجبوراً لکھنے والے سے صفحہ قرطاس پر اگلتی جاتی ہے خدا کرے آپ میرے بیان کو انصاف کے آئینہ میں دیکھیں اور عدل کے میزان پر پرکھیں۔

علم غیب

اس میں شک نہیں کہ علم صفت کمال ہے اور صفات اللہ کی عین ذات ہیں پس خداوند کریم حاضر و غائب تمام کو جانتا ہے اور علم اس کی عین ذات ہے قرآن مجید میں کسی مقام پر ارشاد ہے کہ سوائے پروردگار کے کوئی بھی غیب پر مطلع نہیں اور کسی مقام پر فرمایا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ یعنی خدا تم کو غیب پر مطلع نہیں کرنے لگا لیکن خدا نبیوں میں سے جسے چن لے یعنی پھر اس کو مطلع فرما دیتا ہے گویا علم غیب کی دو قسمیں ہیں ایک ذاتی جس کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جان سکتا اور دوسرا استفادی جس کو خدا کے برگزیدہ نبیؑ و رسولؐ یا آئمہ طاہرین علیہم السلام جان سکتے ہیں جتنا وہ عطا کرے۔

اس مقصد کو ذہن کے زیادہ قریب کرنے کے لئے میں ایک مضبوط عقلی طریقہ سے واضح کرتا ہوں تاکہ مسئلہ کی حقیقت کھل جائے اور یہ کسی عالم بزرگوار کے کلام سے نہیں بلکہ کتاب آفاق کے مطالعہ سے جو میں نے اخذ کیا ہے اس کا نچوڑ ہے۔ طبقات موجودات میں سے حیوان کو نبات پر فوقیت ہے کیونکہ اس میں ایک حس موجود ہے جس سے وہ تہی دامن ہے اور انسان کو عام حیوان سے برتری حاصل ہے کہ اس میں ایک ایسا جوہر موجود ہے جس سے وہ خالی ہے پس روح نباتی سے وہ شعور غائب ہے جس کو روح حیوان اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اگر روح نباتی کے سامنے شعور حیوانی کو پیدا کیا جائے تو معلوم ہوگا نبات کے مقابلہ میں حیوان کے پاس علم غیب کا ایک بے پناہ ذخیرہ موجود ہے جس کا روح نباتی تصور تک نہیں کر سکتا اسی طرح روح حیوانی کے سامنے روح انسانی کے ادراکات کو بسط دیا جائے تو وہ اس میں علم غیب کا ایک میتہ ہوا دریا پائے گا کیونکہ حیوان صرف کھانے پینے اور جنسی لذات ہی کو جانتا ہے اور انسان کی علوم و فنون میں دسترس، حقلی دنیا میں اس کی عظیم الشان فتوحات تسخیر موجودات میں روز افزوں اقدامات اور ظاہری لحاظ سے ناشدنی امور پہ تسلط وغیرہ حیوانی روح کے سامنے علوم غیبیہ نہیں تو اور کیا ہیں؟ اب اس سے ذرا آگے بڑھئے۔ عام انسانی شعور سے شعور قدسی نبوتی اس قدر بلند ہے جیسے حیوان کے مقابلہ میں انسان تو انسان کے سامنے جب نبوتی شعور کی وسعتیں آئیں تو وہ بجا طور پر علم غیبی کا ایک موجزن سمندر محسوس کرے گا

انبیاء میں سے ہر ایک اپنے مقام پر فرد ہے کوئی ذات کا کوئی قبیلہ کا کوئی قوم کا اور حضرت رسالتمآب تمام عالمین کے نبی تھے لیکن ان کی عقل عالمین کے مقابلہ میں عقل کل ہوگی اور

ان کا شعور عالمی شعور پر حاوی ہوگا لہٰذا ان کے معلومات کی وسعت کا عام انسانی دماغ تصور تک نہیں کر سکتا کیونکہ عام انسانی عقل کے مقابلہ میں ان کا عقل عالمی مفاسد و مصالح پر حاوی ہے پس ان کے ہمہ گیر معلومات تمام انسانی سطح سے چونکہ بلند مقام رکھتے ہیں لہٰذا عام انسان کے ذہن کے سامنے ان کا علم معلومات غیبیہ کا خزانہ ہے جس طرح حیوان کے مقابلہ میں انسان عالم الغیب ہے۔

ماتحت تحجیئے جو مسائل عقدہ لاینحل ہوا کرتے ہیں وہ مافوق کی عادی رفتار ہونے کی حیثیت سے اس کیلئے چنداں تدبر کے محتاج بھی نہیں ہوتے مثلاً نبات کے سامنے حیواناتی ادراکات عقدہ لاینحل ہیں لیکن وہ حیوان کے لئے عادی ہیں اور حیوان کے سامنے انسانی معلومات عقدہ لاینحل ہیں لیکن وہ انسان کے عام مشاغل سمجھے جاتے ہیں اور انسانی عام ترقیاں جہاں تک انتہا کو پہنچتی ہیں اور اسے وہ مسئلہ لاینحل سمجھتے ہیں تو روح نبوتی کے سامنے وہ عام دعاوی ہوا کرتے ہیں اور نبوت کے تمام کمالات کمالات خداوندی کے مقابلہ میں کوئی نسبت ہی نہیں رکھتے اب آسانی سے سمجھ میں آسکے گا کہ خدا کسی کو علوم غیبیہ پر مطلع نہیں فرماتا مگر جسے اپنے رسولوں میں سے منتخب کرلے یعنی ان کو ان چیزوں پر اطلاع دے دیتا ہے جو عام انسانوں کے عقول سے بالاتر ہوتی ہیں اور وہ وہ غیوب ہیں جو زیر طرح نبوتی کی حدود کے اندر ہیں اور ادراک انسانی کی حدود سے باہر اور جہاں فرمایا کہ سوائے میرے اور کوئی غیب نہیں جان سکتا اس سے مراد وہ غیوب ہیں جو شعور نبوتی کی حدود سے بالاتر ہیں۔ اور ذات اقدس الٰہیہ کے شایان شان ہیں اور وہ ہر شیئ پر محیط ہے اور اس کی وسعتیں غیر محدود ہیں اس کی کنہ تک نہ انسان کی رسائی ہے نہ جن و ملک کی اور نہ نبی و مرسل کی بلکہ مخلوق میں سے کوئی بھی اس کی کنہ کا تصور نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کی عقل نارسا کا غلط فیصلہ ہے کہ نبی کل غیب کا علم رکھتا ہے ورنہ علم الٰہی کے مقابلہ میں تو نبی کے علم کو لانا خدا شناسی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

دور حاضر میں علم غیب کا مسئلہ خواہ مخواہ جہال نے اچھال رکھا ہے ورنہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نبی کا علم اس قدر وسیع ہے کہ عام انسان اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا اور خدا کے علم کا اندازہ نبی کے تصور سے بالاتر ہے کیونکہ اللہ کا علم اس کی عین ذات ہے اور اس کی انتہا کو جاننا محالات میں سے ہے پس نبی یا امام کو عالم غیب کہنا اس لحاظ سے کہ خداوند کریم نے ان کو بعض غیب چیزوں کا علم عطا فرمایا جو اس کی مشیت کا تقاضا تھا درست ہے اور اس مسئلہ کو ہم نے تفسیر انوار النجف کی مختلف جلدوں میں آیات کی مناسبت سے بیان کیا ہے۔

پانچواں باب

عقیدۂ نبوّت کا بیان

خداوند کریم اپنے لطف و کرم سے انسانوں کی اصلاح کی خاطر جن برگزیدہ لوگوں کو دینی منشور دے کر بھیجتا ہے وہ نبی و رسول کہلاتے ہیں اور ان کے اس عہدۂ جلیلہ کا نام نبوت یا رسالت ہوتا ہے جس پر وہ من جانب خدا فائز ہوتے ہیں پس خداوندِ قدوس کے وجود و توحید و عدل و باقی صفاتِ کمال کے اعتراف کے بعد نبوّتِ انبیاءؑ پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس عقیدہ کا ثبوت بھی عقلی طریقہ پر نہایت آسان ہے ہم پہلے یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ نبوّت کی ضرورت کیوں ہے؟

(۱) اس سے قبل ہم ثابت کر چکے ہیں کہ حیوان اور انسان میں امتیاز دینے والا انسانوں میں ایک ملکہ موجود ہے جسے عقل کہا جاتا ہے پس جب وہ عقلِ فطری اپنی ابتدائی منازل سے آگے بڑھتا ہے اور غور و فکر کے میدان میں قدم رکھنے کی صلاحیت اپنے اندر پاتا ہے تو پہلا مسئلہ جو فطرتِ سلیم اُسے ڈھونڈنے اور حل کرنے پر مجبور کرتی ہے یہ ہے کہ ہمارا ابتدا کیا ہے اور ان علل و اسباب کی انتہا کہاں تک ہے جسے مبداءِ اوّل اور فیاضِ مطلق کہا جائے اور یہ کہ اس نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے؟ اور یہ کہ اس ناپائیدار مقامِ رہائش کے بعد ہم نے کہاں جانا ہے اور وہاں ہمارا انجام کیا ہوگا؟ پس تحریکِ فطرت پر عقل کی غور و خوض اور دوڑ دھوپ جب مبداءِ اوّل تک پہنچی اور وجودِ خدا اس کی صفات اور اس کی توحید تک سمجھنے کی توفیق مل گئی تو عقل نے فیصلہ کیا کہ میرا کوئی لائحہ عمل ہونا چاہیئے تاکہ بازگشت اور انجام میں بھلائی ہو پس جب فیاضِ مطلق کے لطف نے عقل کو اس حد تک پہنچنے کی توفیق دی۔ تو عقل اس سے آگے بڑھنے سے

معذور تھی۔ پس وہ اس سے مزید ایک لطف کی خواہشمند تھی جو اسے آگے بڑھائے اور مبداء اول کی معرفت کی تفصیلات غرض خلقت کے حقائق اور بازگشت کے متعلق مفصل معلومات فراہم کرے۔ اور ایک ایسا دستور عطا فرمائے جس کی بدولت انسان اپنے فطری و انسانی فرائض ادا کر کے شرف و کمال کے مراتب تک رسائی حاصل کر سکے اور اس لطف کا نام نبوت ہے۔

(۲) انسان اپنے اوپر نعماتِ متکاثرہ کی بارش دیکھ کر عقل کو خود بخود متوجہ پاتا ہے کہ یہ نعمات مجھ پر کیوں ہیں؟ یہ لمبی چوڑی زمین بلند آسمان، آفتاب عالمتاب ماہتاب ہوائیں بارشیں سبزہ اور جماد و نباتات وحیوانات، الغرض کائنات میں بری و بحری تمام قدرتی ذخائر جن سے میں صبح و شام استفادہ کرتا ہوں، نہ مجھے کوئی روکنے والا ہے نہ کوئی پابندی عائد کرنے والا ہے آخر یہ سب احسانات و انعامات جو میرے اوپر ہیں ان کا موجد میں خود تو نہیں ہوں۔ لہٰذا جس نے مجھے یہ عطا فرمائیں وہ کون ہے؟ نیز یہ کہ ان انعامات کے استعمال میں مطلق العنان ہوں یا مجھ پر کچھ حدود کی پاسداری بھی عائد ہے؟ لہٰذا سوچنا پڑتا ہے کہ محسن کے حقوق کیا ہیں اور اس کے شکر کا طریقہ کیا ہے؟ پس ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ مبداء فیاض جس نے میرے اوپر نعمات و احسانات کی اس قدر بارش نازل فرمائی ہے اس کی نعمت ایک یہ بھی ہونی چاہیے کہ اپنا نمائندہ بھیجے جو حقوق اللہ حقوق نفس حقوق منزل اور حقوق تمدن کی حدود سمجھائے تاکہ ہم نعمت کا بدلہ احسان سے دیں اور کفران تک نہ پہنچیں تاکہ زوال نعمات کا موجب نہ بنیں اور مقام بازپرس میں رسوائی سے بچ سکیں

(۳) انسان نے منصۂ شہود پر قدم رکھتے ہی جس فطرت کا اظہار کیا وہ ہے جذب مرغوب و دفع مکروہ۔ یعنی عقل حیوانی کے زمانہ میں فطرتِ انسانیہ مرغوب و مطلوب کی ہوس اور مکروہ سے نفرت کا اظہار کر رہی تھی پھر جب عقل نے آنکھ کھولی تو اس فطرت اولیہ کو مزید تقویت پہنچی اور اس فطری مطلب کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ راہیں ہموار ہونے لگیں اور اسباب و علل کی تلاش کے ذرائع اور وسیع ہو گئے پس عقل طلب کمال دعوتِ نفس کو تمام مرغوبات و مطلوبات میں سے اہمیت دینے لگی۔ حتیٰ کہ باقی سب مرغوبات کو اسی مرغوب کا زینہ قرار دیا اور مطلوب کی تحصیل کے لئے ہر حائل کو سامنے

سے دور کر ابھی ضروری تھا پس انسانی فطرت میں جذب و دفع کے جذبات فساد و فتنہ کا سبب بن گئے پس فطرت کو ایک ایسے ہادی کی ضرورت محسوس ہوئی جو ہر غرائز و رغبات میں حدود بندی کرے جس کی بناء عدل و انصاف کے اصولوں پر ہو اور عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی نظام کی توقع ایسے لوگوں سے نہیں ہو سکتی جو خود جلب منفعت کے دلدادہ ہوں پس فطرت کا تقاضا جس کی عقل ترجمان ہے یہ ہے کہ مبدء فیاض کی ہی جانب سے کوئی نمائندہ ہم پر مسلط ہو جس کے ہاتھ میں اس جانب سے عطا کردہ مکمل دستور انسانی ہو جس کی موافقت سے انسانی کمال و عروج کی منازل کو باہمی تصادم کے بغیر حاصل کر سکے۔

وجوہات مذکورہ بالا کی روشنی میں عقل اسی فیصلہ تک پہنچی کہ ضروری ہے خدا ایسے بندے اپنے نمائندے بنا کر بھیجے جو انسانوں کو صحیح انسانی لائحہ عمل تعلیم کریں جو حقوق اللہ حقوق نفس اور حقوق العباد کے جملہ حدود پر حاوی ہو تا کہ انسان جس طرح مبداء اول اور محسن فیاض کی معرفت کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرے اسی طرح فروعی اعمال کے ضابطہ پر بھی عمل پیرا ہو سکے جس کے نتیجہ میں نوع انسانی جہاں حق نعمت پروردگار کے ادا کرنے پر موفق ہو وہاں جور و اعتساف کجی و انحراف اور ظلم و استبداد کے پر خطر امن سوز اور وحشیانہ انداز سے اجتناب کرتے ہوئے بجائے توحش و بہیمیت کے پر بہار پر سکون اور پر امن زندگی گزار سکے کفران نعمت کے بجائے ادائے حق نعمت ہو اختلاف و انتشار کی جگہ محبت و پیار ہو افتراق اتفاق سے بدل جائے سفاکی و بے باکی صلح و آشتی سے تبدیل ہو جائے بے حیائی کی جگہ حیا اور ظلم و تشدد کی جگہ عدل و مروت لے لے اسی طرح خود غرضی کی جگہ رواداری اور نفس پرستی کی جگہ خوش گری آجائے گویا حیوانیت و درندگی کی بجائے شرافت دیانت امانت اور نجابت رونما ہو پس کرۂ انسانیت کا بول بالا ہو اور زمین خدا عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا گہوارہ ہو

نبوت لطف ہے

لیکن یہ یاد رہے کہ خدا پر نبی و حجت بھیجنے کے وجوب کا یہ مقصد نہیں کہ وہ کسی کا ماتحت یا پابند ہے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ کسی کا جوابدہ ہو گا یعنی ہم جو یہ کہتے ہیں کہ خدا پر نبی کا بھیجنا واجب ہے یا یہ کہ محال کی تکلیف دینا ناجائز ہے یا یہ کہ نیک کو جنت میں بھیجنا واجب ہے وغیرہ تو اس وجوب کا مقصد وہ نہیں جو مخلوق میں ہوا کرتا ہے کہ نہ کرے تو ماخوذ ہو بلکہ اس کے حق میں جہاں بھی وجوب کا لفظ استعمال ہو اس کا معنی لطف و کرم ہوتا ہے یعنی خدا ازروئے لطف ایسا کرتا ہے پس نیک کو جنت میں داخل کرنا اور نبی و امام کا بھیجنا

اس کا لطف ہے جس طرح انسان کو پیدا کرنا اور اس پر نعمات واحسانات کی بارش کرنا اس کا لطف ہے پس جوابدہی کے خوف سے وجوب اور ہوتا ہے جو شانِ ربوبیت کے منافی ہے لیکن ازراہِ لطف وجوب اور ہے جو شان وعظمتِ پروردگار کے شایان ہے لہٰذا اشعری لوگ جس شبہ کی بناء پر حسن وقبح ذاتی کا انکار کرتے ہیں وہ باطل ہے۔

اشتراکیت اور سرمایہ داری

انسان کے مدنی الطبع ہونے کے پیشِ نظر اجتماعی زندگی کے اصول کی تشکیل میں نظریات ہمیشہ سے متصادم رہے ہیں اور ہر دور کے عقلاء انسانی تمدن میں اصلاح وفلاح کے لئے قوانین مرتب کر کے اجتماعی نظام کی بھلائی کا اعلان کرتے چلے آئے ہیں لیکن روزِ اول سے قیامت تک کے لئے اسلام نے اجتماعی زندگی کا جو نظام پیش کیا ہے وہ تمام عقلائی تدابیر اور امکانی مصالح پر حاوی ہے۔

جب انسان کے لئے اختلاف وانتشار کی وادی میں پڑنا جذب ودفع کے فطری تقاضوں کے ماتحت ایک ناگزیر امر تھا تو ازراہِ لطف خدا نے رسولوں کو شریعت وکتاب دے کر بھیجا جو ان کے لئے ضابطہ زندگی اور شاہراہِ امن وسکون ہو۔ لیکن اکثریتی طبقہ ہمیشہ رسولوں اور اسلام کے اصولوں سے برسرِ پیکار رہا ہے کیونکہ اسلام میں جذبات وخواہشات کو کھلی چھٹی نہیں دی جاتی بلکہ جذبات کو رام کر کے انہیں عقل وخرد کے زیرِ پا رکھنے کی تلقین ہوتی ہے تو طاقت ور اور سربرآوردہ ہوشیار لوگ اس کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے جذباتی نعروں سے عوام کو مسحور کر کے انبیاء کی تعلیمات کے سامنے ایک بہت بڑی کفر وانکار کی دیوار کھڑی کر دی۔ اب بڑے بڑوں کی خواہشات اور عیش پرستیوں کا دروازہ کھلا ہو گیا۔ اور عوام میں بغاوت کی روح بیدار ہونے لگی پس انہوں نے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور ان کی آوازوں کو دبانے کے لئے مل جل کر اپنی عیاشیوں وآوارگیوں کی بقاء وحفاظت کیلئے قوانین وضع کرلئے جنہیں تحفظ عامہ کے قوانین کا نام دیا گیا حالانکہ اس خوشنما لیبل کے اندر سب کچھ وہی ہوتا ہے جو برسرِ اقتدار طبقہ کی منشا ہو اور قانونی مراعات بڑوں کی شہوات رانیوں ہوس پرستیوں اور بے راہ رویوں کی حفاظت کی خاطر اور نچلے طبقہ کی نحیف آواز کو دبانے اور انہیں پوری طرح کچلنے کے لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔

اس کی حسی اور واضح مثال یوں سمجھئے جس طرح ایک قافلہ کسی منزل کی طرف کسی مقصد

کے ماتحت روانہ ہو زادِ راہ لوازم سفر حیثیت کے موافق ہر فرد کے پاس موجود ہوں پس اثنائے راہ میں ان کے درمیان اختلافات رونما ہو جانے سے باہمی جنگ عزت، اڑدھاڑ لوٹ گھسوٹ اور قتل و غارت تک نوبت پہنچ جائے اور ان روح فرسا حالات سے متاثر ہو کر ان کے ارباب حل و عقد اکٹھے ہو کر امن و سلامتی کی بحالی کے لئے کوئی لائحہ عمل تشکیل دینا چاہیں تو اس میں جذبات و خواہشات کے ماتحت جو فیصلہ ہوگا وہ دو نظریوں پر منقسم ہوگا۔

ایک نظریہ یہ ہوگا کہ سارے قافلہ میں اختلاف و انتشار کی جڑ کو کاٹ دیا جائے وہ اس طرح کہ ہر منفعت کی شئے سے حق ملکیت اور حق انفرادیت کو اڑایا جائے اور قانون یہ ہو کہ ہر استعمال کی شئے کو استعمال کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے پس نہ شخصی ملکیت ہو اور نہ انفرادی تخصیص ہو اور اس کے نتیجے میں نہ جھگڑا رہے نہ فساد سفر کا وقت امن و اطمینان سے گذر جائے گا اور بعد میں ان چیزوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی اور اس کا نام ہے

اشتراکیت

غالباً اس آواز کے لئے اس طبقہ کو آلۂ کار بنایا جائے گا جو اسباب زندگی میں مفلوک الحال ہوا اور ان کی سانس دوسروں کے رحم و کرم پر ہو۔ پس ان کی تمام ملکیت پر ہی ٹوٹے گی تاکہ تخصیصات ختم ہونے کے بعد بھی ضروریات زندگی میں سے شاید کچھ حصہ عطا ہو لیکن اس نتیجہ کی خبر نہیں کہ اگر ان کی یہ رائے پاس ہو بھی جائے تو جو اس نظریے کے قوانین بنیں گے ان میں کس کی خواہشات و جذبات کا احترام ہوگا اور قانون بنانے والے کون ہوں گے اور پھر قانون کا محافظ و مروج کونسا طبقہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ مفلوک الحال عوام کا طبقہ اس نظریہ پر عمل درآمد ہونے کے بعد اور زیادہ ظلم کے شکنجہ میں جکڑ دیا جائے گا اور اب تو اسے تشدد کی چکی بڑی آسانی سے پیس سکے گی اور ان کی آواز کو دبانا اب بڑا سہل ہوگا۔ کیونکہ اس قانون کے متقن سربراہ اور محافظ یقیناً بڑے طبقہ کے ہی لوگ ہوں گے جن کے پاس عوام کی رائے کو ہموار کرنے کے طرق موجود ہوں۔ لہٰذا اب ان کی دھاندلی پہلے سے کہیں زیادہ ہوگی۔ پس قانون کا ہتھوڑا صرف نچلے طبقہ کا سر پھوڑنے کے لئے ہی استعمال ہوگا۔

دوسرا نظریہ یہ ہوگا کہ ملکیت باقی رہے اور اختصاص بھی باقی رہے، لیکن قانون اس انداز

سے ہو کر بڑوں کی دستبرد سے بھی محفوظ رہے اور چھوٹا طبقہ بھی پُر امن ہو اور کسی کو کسی پر تشدد کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے اور نہ کوئی دوسرے کی مملوکہ چیز کی طرف نظر اٹھا سکے اور اسی کا نام ہے **سرمایہ دارانہ نظام** یہ آواز یقیناً اس طبقہ سے اٹھے گی جو جائز و ناجائز طور پر اسباب زندگی اور اس کی ہر ممکن سہولتیں اپنے پاس رکھتے ہوں اور عیش و عشرت سرمایہ اپنا ہی حق سمجھتے ہوں، اور عوام کو حیوانوں کی طرح اپنا مستقل غلام رکھنے کی فکر میں ہوں کہ نہ وہ ترقی کرکے آگے بڑھ سکیں اور نہ ہماری غلامی سے سرتابی کر سکیں۔ پس وہ قانون کے ذریعے سے اپنا الّو سیدھا کرنے کی فکر میں ہوں گے اگر یہ لوگ کامیاب ہو جائیں تو عوام کے لئے ظلم و تشدد کے آہنی شکنجوں سے بچنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اولاً تو قانون بنانے والے وہی ہوتے ہیں جو عوام کو حیوانی زندگی میں دیکھنا چاہتے ہیں ثانیاً قانون کے محافظ بھی انہی میں سے ہوتے ہیں۔ پس عوام کا جو حشر ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک کی آنکھوں دیکھا ہے۔

وجہ اشتباہ یہ دو نو نظریے صرف دنیاوی لمحات تک محدود زندگی کی راہیں ہموار کرنے کے لئے ہیں اس کے بعد نہ کسی دوسری زندگی کا تصور ہوتا ہے اور نہ اس کی رعایت و پاسداری کا لحاظ۔ اور اسی ناعاقبت اندیشی نے انسان کے عدل و انصاف اور عقل و خرد کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے ورنہ اگر یہ یقین ہو کہ اس فانی دنیا کے بعد بھی ایک لافانی منزل تک پہنچنا ہے اور یہ چند روزہ زندگی منزل سفر ہے نہ کہ مقصود و راہ تو یقیناً انسان کی غیر فطری چالیں اور انسانیت سوز حرکتیں بہت جلد ختم ہو کر رہ جائیں گی اور امن واقعی انسانیت کو پھیلنے اور پھولنے کا اچھا خوشگوار موقعہ دے نہ انسانیت کا دامن بہیمیت و درندگی کے بدنما دھبوں سے داغدار ہو اور نہ امن و سکون کی راہ میں کوئی روڑہ اٹک سکے اور یہ پیغام سوائے دین فطرت یعنی اسلام کے اور کون لا سکتا ہے؟ بالفرض ہر دو نظریے خلوص سے ہی معرض وجود میں آئے ہوں لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ حرص و ہوس جذبات شہویہ اور ہیجانات نفسیہ کسی ضابطۂ عدل یا قانون انصاف کو جور و اعتساف اور ظلم و استبداد کی ناخوشگوار فضا سے ہرگز نکلنے کی اجازت نہ دیں گے اور یہ یاد رکھیے کہ کمزور طبقہ کو کچلا جا سکتا ہے لیکن ان کی محبت و خیر خواہی زور سے حاصل نہیں کی جا سکتی اور قانونی شکنجہ یا اقتدار کا ڈنڈا ان کی آواز اور داد طلبی کی فریاد کو دبا سکتا ہے لیکن ان کی درد بھری آہ کو ختم نہیں کر سکتا اور یہی حالات کبھی بڑے بڑے انقلابات کا پیش خیمہ بن جایا کرتے ہیں اور یہ خاموش آہیں اور ہلکی ہلکی فریادیں ایک نہ ایک دن آگ بھی

ہو کر طوفانی دھماکہ بن کر نمودار ہو سکتی ہیں۔ بہر کیف انسانیت سے بہت پیچھے ہٹ کر حیرانی ماحول اور ان کی طرزِ زندگی کو معمول بنا کر اشتراکیت کا جھنڈا بلند کیا جائے یا سرمایہ دارانہ نظام کو اپنا لیا جائے یا ان دونو کے علاوہ کسی اور جمہوری یا استبدادی طریقہ پر انسانیت و دیانت و شرافت کو باریک پیسنے والی مشین تیار کی جائے تمدنی قوانین کا نقطۂ منظر اور محطِ فکر عوام کے خون کے گارے سے انہی کی لاشوں کے اُوپر اقتدار کے ذریعے عیش و عشرت اور آزادگی کا محل تیار کرنا ہوتا ہے اور اسی بناء پر رائے عامہ کو ہموار کیا جاتا ہے اور قانون چونکہ بڑوں کے جذبات کے احترام کی خاطر بنتا ہے پس اس کا لازمی نتیجہ سامنے ہے کہ وہ نت نئے جنم لیا کرتا ہے اور ہر روز نیا روپ دھار لینے کا عادی بن جاتا ہے پس قانون سازی کی مشین ہر روز اس کے نئے پُرزے تیار کرنے میں مصروف رہتی ہے ایسی صورت میں انسانیت کو سکون کا سانس کیوں نصیب ہو جب کہ ضروریاتِ زندگی میں سے ہر اچھی چیز ہر سہولت اور ہر قسم کا آرام صرف صاحبانِ اقتدار کے لئے مخصوص ہو اچھے محل عمدہ بیویاں خوبصورت لباس اچھے مشروبات نفیس کھانے آرام دہ سواریاں اور قیمتی سامان سب انہی کے لئے ہوں۔ اور لوازمِ زندگی میں سے ردی و ناقص اشیاء عوام کے لئے مخصوص رہیں۔ ایسے حالات قطعاً جذبات میں سکون نہیں لا سکتے بلکہ انسانی دماغ اس قسم کے تشدد و ظلم سے آزادی کی راہیں ڈھونڈنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور امیر و غریب سلطان و گدا کے درمیان یہ امتیاز ان دونو طبقوں میں الفت و انس قطعاً پیدا نہیں ہونے دیتا یہی وجہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ عوام کے سامنے آنے سے کتراتا ہے اور عوام کو ان پر اعتماد نہیں ہوتا پس ظاہری تشدد سے حاصل کردہ امن اندرونی لاوہ کو ختم نہیں کر سکتا جو ایک نہ ایک دن پھٹ کر خشک و تر کے لئے تباہی کا باعث بن جایا کرتا ہے۔

نبی کی ضرورت فطری تقاضا ہے

دنیاوی حکومتوں کے بنے بنائے قوانین میں چونکہ صرف یہی چند روزہ زندگی ملحوظ ہوتی ہے لہٰذا وہ اس کی اصلاح کے بہانے سے قوانین کی داغ بیل ڈالتے ہیں علاوہ ازیں خود قانون دان چونکہ انسانوں کے مصالح و مفاسد سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اگر وہ پوری ایمانداری سے بھی قانون بناتے تاہم ان کا قانون ناقص ہی رہتا چہ جائیکہ وہ قانون بالعموم اقتدار کی پاسداری کی خاطر بنائیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے تو اس میں انصاف و عدل کا کیا مقام ہے

پس انسانی امن کو برقرار رکھنے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو مروج کرنے کے لئے ضروری ہے
کہ قانون وہ بنائے جو کلی و جزوی طور پر تمام مصالح و مفاسد کا علم رکھتا ہو تاکہ وہ بلا رعایت
تمام بنی نوع کے لئے یکساں طور پر مبنی بر عدل ہو اور ایسا مقنن سوائے ذاتِ ذوالجلال
کے اور کوئی نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس قانون کا لانے والا پہنچانے والا سمجھانے
والا چلانے والا بھی ہماری سوسائٹی سے نہ ہو ورنہ وہی خرابیاں پلٹ آئیں گی بلکہ اسی کا اپنا نمائندہ
ہو جس پر اس کو اعتماد ہو۔ پس وہ قانون اسلام ہے اور لانے والا پہنچانے والا سمجھانے والا
اور چلانے والا نبی یا اس کا نائب ہوا کرتا ہے اسلامی قوانین چونکہ خالق کائنات کی طرف سے
وضع شدہ ہیں پس وہ عالمی مصالح پر حاوی ہیں اور جذبات و خواہشات سے بلند و بالا ہیں ان
میں یہ امکان نہیں کہ کسی قانون کی تشکیل کے وقت عمداً یا سہواً جذباتی یا غیر شعوری طور پر کسی
مصلحت کو نظر انداز کیا گیا ہو گا تاکہ ترمیم یا تنسیخ کو سراغ مل سکے البتہ رفتار زمانہ اور گردش دہر
کے پیش نظر بعض مصالح عامہ میں تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے جیسا کہ ادیانِ سابقہ میں یکے بعد
دیگرے جزوی تبدیلیاں واقع ہوئیں حتیٰ کہ نوبت دورِ اسلام تک آ پہنچی چونکہ اب کسی نبی
نے بعد میں آنا نہیں تھا لہٰذا اس کے قوانین میں ایسی پختگی و پائیداری کو ملحوظ رکھا گیا کہ ادوار و ازمنہ
کا تفاوت ان کو قابلِ نسخ نہ بنا سکے۔

یا یوں سمجھئے کہ انسان فطری طور پر تسخیرِ موجودات اور استخدامِ کائنات کا اپنے اندر جذبہ
رکھتا ہے اور اسی کے ماتحت وہ شب و روز جد و جہد میں مصروفِ عمل ہے اور اس سلسلہ
میں اس کا قدم ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا چلا آیا ہے کہاں دورِ سابق کی غاروں و پہاڑوں کی زندگی
اور کہاں موجودہ دور کی آسمانِ رفعت پر بلند پروازی نہ معلوم اس کے بعد یہ ترقی کہاں تک جائے
میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جذبہ کے ماتحت انسان نے اپنے مطلب کی ہر شئے
کو فتح کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور ہر آنے والی راستہ کی رکاوٹ کو پوری طرح سے ہٹانے
کے درپے ہوتا ہے اور اسی جذبِ منفعت اور دفعِ نقصان کا جذبہ ہی باہمی آویزش کا موجب
ہوتا ہے پس اجتماعی پُرامن زندگی اور تمدنی بقاء کے لئے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جن
کی پابندی انسان کو کمال و سعادت پر فائز کر سکے پس ایسے قوانین کی تشکیل یا تو فطرت
خود کرے گی یا کوئی ایسی ذات کرے گی جو فطرت کے تقاضوں کو جاننے والی ہو اور اس کی تمام
نزاکتوں پر اس کی نظر ہو تو ظاہر ہے کہ فطرت جو خود منبع اختلافات ہے وہ رفع اختلاف

کا قانون اپنے پاس نہیں رکھتی ورنہ انسانوں میں تصادم و تزاحم سرے سے رونما ہی نہ ہوتا
لہٰذا ضروری ہے کہ ان قوانین کی تشکیل کوئی ایسی ذات کرے جو تمام مصالح کو جانتی ہو اور سوائے
خالقِ کائنات کے اور کوئی ہو نہیں سکتا اور اس کے بعد ضروری ہے کہ خدا خود اپنی مرضی و مصلحت
سے ایسے افراد کو اصلاحِ خلق کے لئے مامور فرمائے جس کو ان قوانین کا پورا پورا علم دیا گیا ہو اور
وہ ان قوانین کی ترویج میں پوری جرأت سے اپنی خدمات پیش کرنے والے ہوں پس نبوّت
وہ عہدۂ جلیلہ ہے جو خدا اصلاح خلق کے لئے کسی اپنے خاص بندے کو عطا فرماتا ہے اور نبی
وہ ہے جو اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو کر ہماری اصلاح کا علمبردار ہو۔

پس یہ عقیدہ واضح ہو گیا کہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے نبوّت کا دروازہ کھٹکھٹائے
بغیر چارہ نہیں چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ
اللّٰهُ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھنا چاہتے ہو تو اس کی صورت فقط یہ ہے کہ تم
میری اتباع کرو تاکہ تمہیں اللہ اپنا محبوب بنا لے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ
فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا یعنی جو کچھ تمہیں احکامِ شریعت میں سے رسول دے
اس کو لے لو اور جس کام سے تم کو منع فرمائے اس سے رُک جاؤ ایک اور مقام پر بطور تنبیہ
ارشاد فرماتا ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان کا دعویٰ بھی کریں تو قطعاً یہ مومن نہیں کہلا سکتے حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ
فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ۔ جب تک کہ باہمی اختلافات میں آپ کے فیصلوں کے سامنے جھک
نہ جائیں اس مطلب پر احادیث بکثرت دلالت کرتی ہیں پس عقیدۂ توحید کے بعد انسان کا جب
تک نبی پر اعتقاد صحیح نہ ہو۔ اس کا صرف اللہ پر ایمان لانا نجات کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

بنا بریں دورِ جدید کے منقلب اذہان میں جو یہ بات سمائی ہے کہ اللہ کو صرف عمل نیک
سے راضی کیا جا سکتا ہے خواہ عامل کا تعلق کسی مذہب و ملّت سے ہو بالکل لغو اور بے ہودہ
خیال ہے کیونکہ اوّلاً تو کوئی آدمی ملنا بہت مشکل ہے جو بغیر ہادیِ کامل کے خود اپنی نجات
کا راستہ معین کر سکے اور اگر کائناتِ عالم میں کوئی ایسا فرد ہو بھی تو اس پر پوری نوع کو قیاس
نہیں کیا جا سکتا لہٰذا نوعِ انسانی کی نجات عقیدہ نبوت پر ہی منحصر ہے اگر بالفرض ایسا آدمی
مل جائے جو بغیر ہادیِ کامل کے جملہ نیکیوں کو بجا لائے اور جمیع شرور سے بچے وہ حضور کی نبوت
و رسالت کا انکار کیسے کرے گا۔ بلکہ اس کی فطرتِ صحیحہ خود بخود اسے حضورؐ کے قدموں میں کھینچ
لائے گی پس اس قسم کے بیہودہ خیالات ایسے لوگوں کے لائے ہوئے ہیں جو دل و جان سے

دین و مذہب کا قلاوہ گردنوں سے اتار پھینکنے کی فکر میں ہوتے ہیں تاکہ ان کی تعیش مزاجی پر قدغن نہ کیا جا سکے۔

وحی کے متعلق عقیدہ

جب یہ ثابت ہو گیا کہ خدا از راہ لطف انسانوں کو طریقہ نجات سمجھانے اور قوانین دین پہنچانے کے لئے اپنی طرف سے علم دے کر انبیاء کرام کو بھیجتا ہے تو یہ بات بھی روز روشن کی طرح واضح و عیاں ہو گئی کہ خدا اور نبی و رسول کے درمیان کوئی مخصوص رابطہ ہو جس کی بدولت نبی و رسول اللہ سے دینی حقائق لے کر باقی مخلوق تک پہنچائیں پس بندوں کے ساتھ تو ان کا رابطہ معلوم ہے کہ وہ انہی جیسی شکل و صورت، و قوم و ملک زبان و طرز رہائش وغیرہ رکھتے تھے اور بندوں کو اپنی باتیں ان ہی لہجہ میں سمجھا سکتے تھے لیکن وہ رابطہ جس کی بدولت وہ اللہ سے کسی مخصوص انداز کے مطابق مطالب حاصل کریں تو وہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہی ہونا چاہیئے اور اسی مخصوص تعلق و رابطہ کا نام وحی ہے۔

وحی کی پانچ قسمیں ہیں۔ کلام، الہام، ہتف غیب خواب اور نزول ملک۔

اللہ کا کلام کرنا

جس طرح حضرت موسیٰ سے بات درخت کے ذریعہ ہوئی یا شب معراج حضرت رسالتمآبؐ سے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے لہجہ میں ہوئی اور ارشاد ہوا کہ چونکہ علیؑ سے زیادہ تجھے کوئی محبوب نہیں لہذا میں کلام کر رہا ہوں لیکن لہجہ علیؑ کا ہے یہ روایت شیعہ و سنی دونوں کتب میں موجود ہے مثلاً تفسیر البرہان، ینابیع المودۃ وغیرہ۔ پس وہاں وحی بصورت کلام تھی۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند کریم ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ الآیہ

ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجات بلند کئے اور عیسیٰ ابن مریم کو واضح دلیلیں عطا فرمائیں الآیۃ

اس آیت میں صاف ارشاد ہے کہ بعض رسولوں سے اللہ نے کلام کیا اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا یعنی کسی بشر کیلئے سزاوار نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر یا تو بصورت وحی یعنی خواب یا الہام یا پس پردہ جیسے ہتف غیب یا فرشتہ بھیج کر، بہرحال یہاں آیت مجیدہ میں کلام کی صاف نفی ہے تو ظاہری طور پر ان دونوں آیتوں میں تنافر پایا جاتا ہے

اس کا جواب ایک تمہید پر موقوف ہے تاکہ مقصد اچھی طرح واضح ہو جائے۔

کلام کی حقیقت

انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اور باہمی افہام وتفہیم کے لئے ایک ذریعے کا محتاج ہے اور سوائے کلام کے زیادہ مفید اور کارآمد کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ لہٰذا انسان اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کیلئے کلام کا محتاج ہے ورنہ اگر اجتماعی وتمدنی زندگی نہ ہوتی تو کلام کی بھی ضرورت نہ ہوتی حیوانات میں سے بعض حیوان دوسرے بعض حیوانات کو اپنے مافی الضمیر سے مطلع کرتے ہیں لیکن وہ حروف سے مرکب الفاظ کے ذریعے سے نہیں بلکہ مہمل سی آوازوں سے یا آنکھوں کے اشاروں سے یا قوتِ شامہ کے ذریعے سے وعلیٰ ہذا القیاس اور ان کا یہ طریقہ ان کا کلام کہا جا سکتا ہے اسی طرح جنّات وملائکہ کا باہمی کلام ان کی اپنی نوعیت سے ہوگا پس موجوداتِ عالم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ کا کلام کرنا ان کی اپنی نوعیت اور جداگانہ استعداد کے لحاظ سے ہے بعض خطابات میں اس کے قول وکلام سے مراد امر تکوینی ہے جس طرح زمین وآسمان یا ان جیسی رُوح وارادہ سے خالی مخلوق سے عہدِ اطاعت طلب کرنا پس ان کا جواب دینا یا قبول کرنا بھی اطاعت تکوینیہ ہے لیکن صاحبانِ رُوح وارادہ اور اربابِ عقل ودانش مثلاً جنّات وملائکہ وانسان وغیرہ سے ان کے کلام کرنے سے مراد ہر وہ طریقہ ہے جس سے ان کے اوامر ونواہی کا مطلب سمجھا جاسکے پس انسانوں سے اس کا کلام حروف سے مرکب ہونے والے الفاظ کے ذریعہ سے ہی ہوگا جو ان کی تفہیم کے لئے کارآمد ہے۔ بہرکیف موجوداتِ عالم کی ہر صنف ونوع سے کلام ان کی انفرادی حیثیت سے ان کے مخصوص انداز میں مقصد کی تفہیم کا نام ہے پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلیم اللہ ہونا باعتبارِ مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے اور ان کے ساتھ کلام کرنے سے خواب والہام یا نزولِ ملک کے ذریعہ سے کلام کرنا نہیں ورنہ حضرت موسیٰ کی خصوصیت نہ رہے گی کیونکہ باقی انبیاء بھی ان طریقوں سے نوازے گئے تھے البتہ یہ جائز نہیں کہ اس کا کلام زبان سے نکلے ہوئے حروف ہوں کیونکہ ایسی صورت میں حدوث لازم آتا ہے اور خدا اس سے پاک ہے بلکہ یہاں کلام کرنے سے مراد ہے کلام کا ایجاد کرنا خواہ اس کا طریقہ اور لب ولہجہ کوئی ہو اور نیز اس کے کلام کی کنہ کو جاننا اور اس کی کماحقہٗ کیفیت سے مطلع ہونا امکان سے باہر ہے البتہ یہ صفت صفاتِ ذات سے نہیں جس طرح علم قدرت حیات وغیرہ بلکہ صفتِ فعل ہے جو کہ محدث ہے چنانچہ قرآن کو بھی اللہ کا کلام کہا

جاتا ہے۔ بہرکیف جہاں یہ فرمایا ہے کہ اللہ کسی بشر سے کلام نہیں کرتا اس سے غالباً زبان سے کلام کرنا مقصود ہے اور جہاں یہ ہے کہ موسیٰ سے اس نے کلام فرمایا یا حضور سے شبِ معراج کلام ہوا اس سے مراد کلام کا ایجاد کرنا ہے خواہ کسی شیئ سے ایجاد کرے خواہ کوئی بھی لہجہ اختیار کیا گیا ہو پس دونوں آیتوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

الہام یا القاء

انبیاء کو بعض اوقات الہام یا القاء کی قسم کی وحی بھی ہوتی تھی۔ اور جہاں شیاطین کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو وحی کرتے ہیں۔ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَوْلِیٰٓئِهِمْ اس شیطانی القاء کا نام وسوسہ ہے پس وسوسہ اور الہام میں فرق جاننا ضروری ہے۔ تفسیر کبیر رازی میں احیاء العلوم غزالی سے منقول ہے کہ دل ایسے گنبد کی مثل ہے کہ متعدد دروازوں کے ذریعے سے اس میں حالات و واقعات کی آمد ہو یا ایسے نشانے کی مانند ہے جس پر ہر جانب سے تیر پڑ رہے ہوں یا اس شیشے کی طرح ہے جس پر یکے بعد دیگرے مختلف شکلوں اور صورتوں کا نقش ہوتا ہو یا اس تالاب کی مثل ہے۔ جس میں ہر طرف سے نالیوں کے ذریعے سے پانی جمع ہوتا ہو۔ بنا بریں دل میں حالاتِ مختلفہ کا ورود یا تو ظاہری راستوں سے ہوگا جو حواسِ خمسہ کہلاتے ہیں یا باطنی راستوں سے جیسے قوتِ خیالیہ و شہویہ و غضبیہ وغیرہ پس ان مختلف راستوں سے آنے والے واقعات کا دل پر اثر ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے تاثرات بدلتے رہتے ہیں اور دل آثارِ مختلفہ کی آماجگاہ بنا رہتا ہے ان میں بعض تاثرات دیرپا اور بعض فوری ہوتے ہیں جو آئے اور گئے اور یہی خیالات انسان کی عملی قوتوں کی تحریک کرتے ہیں اور ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی دعوت دیتے ہیں پھر ان کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ جو برائی کی تحریک کرتے ہیں یا جن کا نتیجہ دنیاوی و اخروی خسارہ ہوتا ہے۔

دوسرے وہ جو اچھائی کی تحریک کرتے ہیں یا جن کا نتیجہ دنیاوی یا اخروی فائدہ ہوتا ہے۔

پہلے خیال کا نام وسوسہ ہے اور دوسری قسم کے خیال کا نام الہام ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ان خیالات کو لاتا کون ہے؟ یقیناً انسان تو نہیں لاتا کیوں کہ ہر انسان جانتا ہے کہ دل پر وارد ہونے والے خیالات غائبانہ آجاتے ہیں اور ہزار کوشش کرنے کے باوجود بھی دور نہیں ہوتے اگر اپنے لائے ہوئے ہوتے تو ہٹانے سے ہٹ جاتے بعض اوقات ساری رات بیداری میں کٹ جاتی ہے اور وہ جان نہیں چھوڑتے معلوم ہوا کہ ان کا فاعل کوئی اور ہے اور وہ بھی اپنے جیسا کوئی دوسرا انسان تو ہو نہیں سکتا۔ بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کی دل

تک رسائی ہو تو اب اس کا فاعل یا خدا ہے یا شیطان۔ پس اگر وہ خیالات اچھائی کی طرف محرک ہیں تو یقیناً ان کا فاعل اللہ ہے کیونکہ شیطان نیکی کا محرک نہیں ہوتا اور اس سے یہ توقع بالکل بے کار ہے اور اگر وہ خیالات برائی کی طرف محرک ہیں تو ان کا فاعل شیطان ہوگا کیونکہ خدا برائی کی دعوت نہیں دیتا پس الہام خدا کی طرف سے اور وسوسہ شیطان کی جانب سے ہوتا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر تنبیہ ضروری ہے کہ بعض لوگ جو اعلانیہ شرعی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور بعض باتیں لوگوں کو ایسی باتیں بتاتے ہیں جو ظاہری اسباب سے ان کو حاصل نہ ہوں تو اس کو الہام سے تعبیر نہ کرنا چاہیے کیونکہ ایسے گمراہ لوگوں کو دوسرے عوام کے بہکانے کے لئے شیطان وحی کرتا ہے اگرچہ نیکی کی بات کیوں نہ ہو کیونکہ مقصد عوام کا بہکانا ہوتا ہے

ہتف غیب اس طرح کہ کسی کی شکل نہ دکھائی دے اور آواز کا آنا شروع ہو جائے یہ بھی وحی کی ایک قسم ہے۔

خواب (رویائے صادقہ) جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کا حکم اسی ذریعہ سے ہوا تھا۔

نزولِ ملک یعنی فرشتے کا حکم خداوندی لے کر آنا جس طرح جبرئیل بالعموم دحیہ کلبی کی شکل میں تشریف لایا کرتے تھے۔

اس مقام پر رئیس العلماء الامامیہ حضرت شیخ صدوق قدس سرہٗ عقائد میں تحریر فرماتے ہیں کہ امر و نہی کے بارے میں خداوند کریم کی جانب سے وحی ہونے کی کیفیت کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسرافیل کے منہ کے سامنے ایک لوح موجود ہے جب خدا وحی کرنا چاہتا ہے تو وہ لوح اسرافیل کی پیشانی پر لگتی ہے تو وہ اس کو پڑھ کر میکائیل کو اطلاع دیتا ہے اور وہ جبرائیل کو خبر دیتا ہے اور پھر جبرئیل انبیاء تک پہنچا دیتا ہے اور وہ غشی جو حضور کو بوقتِ وحی طاری ہو جایا کرتی تھی وہ اس وقت جبکہ خود ذات حق سبحانہٗ کا حضور سے خطاب ہوتا تھا یہاں تک کہ آپ کا جسم مبارک بھاری اور اس پر پسینہ جاری ہو جاتا تھا کیونکہ جبرئیل تو اجلال و اکرام کی خاطر اذن کے بغیر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہی نہیں ہو سکتا تھا اور آپ کی خدمت میں جب حاضر ہوتا تو سامنے اس طرح بیٹھتا تھا جس طرح غلام آقا کے سامنے بیٹھا کرتے ہیں۔

بہرکیف وحی کی کیفیت جو بھی ہو نزول ملک کی صورت ہو یا خطاب سبحانی کی صورت میں ہو نہ تو شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہٗ کی اس مقام پر پیش کردہ روایت ہمارے ناقص فہم

میں آسکتی ہے اور نہ خطاب رب العزت کی کنہ تک ہم پہنچ سکتے ہیں بس اتنا اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ چونکہ باقی انبیاء کے یہ سردار ہیں لہٰذا ان کا یہ رابطہ اللہ سے زیادہ مضبوط تھا۔ بلکہ یقیناً حضرت موسیٰؑ سے مکالمہ کی بہ نسبت حضورؐ سے ذات حق سبحانہٗ کا مکالمہ بہت زیادہ رہا ہے لیکن ان کا لقب حبیب اللہ ہے کلیم اللہ نہیں۔ اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ باقی انبیاء کے مقابلہ میں ان سے سلسلہ کلام زیادہ جاری رہا۔ اس لئے ان کو کلیم اللہ کہا گیا اور حضورؐ چونکہ اس بارہ میں حضرت موسیٰؑ سے افضل و اشرف تھے اور حضرت حق سبحانہٗ کا کسی سے ہمکلام ہونا محبت کی فرع ہے پس حضرت موسیٰؑ کو فرعی خطاب سے نوازا گیا اور کلیم اللہ کا لقب ملا اور حضورؐ کو اصلی خطاب عطا ہوا کہ نبیوں میں کوئی بھی سوائے آپ کے حبیب اللہ نہ بن سکا۔

تعدادِ انبیاء علیہم السلام

تعداد انبیاء کے متعلق اس قدر عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ وہ بنا بر مشہور ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے اوّل حضرت آدم علیہ السلام اور سب سے آخر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان میں سے تھوڑے رسول تھے اور اکثر صرف نبی تھے بعض انبیاء کی نبوت بالکل محدود تھی اور بعض قوم و قبیلہ کے نبی تھے چنانچہ کتب قصص میں بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء کا ذکر ملتا ہے جو گوشہ تنہائی میں عبادت پروردگار بجالاتے تھے گویا وہ اپنی ذات کے لئے ہی تھے یا اپنے خاندان کے لئے تھے قرآن مجید میں بہت کم نبیوں اور رسولوں کا ذکر آیا ہے مذکورہ تعداد احادیث کی رو سے بیان کی جاتی ہے اسی طرح پانچ نبیوں کو اولوالعزم کہا جاتا ہے ان کے نام نامی یہ ہیں۔

حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیمؑ تک جس قدر نبی درمیان میں مبعوث ہوئے وہ حضرت نوحؑ کی شریعت کے عامل و مبلغ تھے سوائے کسی معمولی جزوی فرق کے اور کوئی فرق نہیں تھا پھر حضرت ابراہیمؑ سے حضرت موسیٰؑ تک تمام نبی شریعت ابراہیمی پر رہے اور ملتِ ابراہیمی میں چند ایسی باتیں ہیں جو کسی شریعت میں منسوخ نہ ہو سکیں اور حضرت موسےٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک لوگ حضرت موسیٰؑ کی شریعت پر رہے اور حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسوی دین رہا حتیٰ کہ حضور رسالتمآبؐ مبعوث ہوئے تو سابق دین منسوخ ہو گئے اور اسلام ہی قابل قبول دین رہا۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ سارے نبی برحق تھے اور خداوند کریم کے مشام

کے مطابق اسلام کی ہی تبلیغ فرماتے تھے اور ہر نبی کا اپنے زمانہ کے لوگوں سے اشرف و افضل ہونا ضروری ہے نیز سب کے سب صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے معصوم تھے ہم ان تمام نبیوں سے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو افضل سمجھتے ہیں جس طرح ملائکہ سے تمام انبیاء کو افضل جانتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ کوئی زمانہ حجت خدا سے خالی نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ زمانہ فترت بھی انبیاء سے خالی نہ تھا اور اس زمانہ میں جو نبی تھے وہ حضرت عیسیٰ کی شریعت کے مروج تھے اور اہل فساد کے خوف سے تقیہ کی زندگی بسر کرتے رہے

شیخ صدوق عقائد میں تحریر فرماتے ہیں کہ انبیاء کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے اور ان کے اوصیا بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے اور ہر نبی کا ایک ایک وصی تھا۔ یہاں بلافصل وصی مراد ہے ورنہ ہمارے نبی کے اوصیاء کی تعداد بارہ ہے اور وصی بلافصل صرف حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔

نبی اور رسول میں فرق

رسول اور نبی میں جو فرق عام طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول وہ ہے جو صاحب کتاب و صاحب شریعت ہو اور نبی وہ ہے جو تبلیغ احکام خداوندی پر مامور ہو خواہ صاحب کتاب ہو یا نہ ہو بنا بریں عہدۂ رسالت کو نبوت سے خاص و عام مطلق کی نسبت حاصل ہے لیکن صاحب میزان نے نبی و رسول کے درمیان فرق کا جو میزان بتایا ہے وہ یہ ہے کہ نبوت و رسالت الگ الگ منصب ہیں نہ ان کا یکجا ہونا ضروری ہے اور نہ ان کا الگ الگ رہنا لازمی ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نبی ہو اور رسول نہ ہو اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول ہو اور نبی نہ ہو نیز یہ بھی ممکن ہے کہ نبی اور رسول ہو۔ پس ان دونوں کے درمیان نسبت عام و خاص من وجہ کی ہوگی۔

نبوت احکام الٰہیہ کی عمومی تبلیغ کا عہدہ ہے اور رسالت ایک خصوصی سفارت کا منصب ہے کہ اس کا رد کرنا ہلاکت و عذاب کا موجب ہو اور قبول کرنا نعمت و رحمت کا باعث ہو یعنی نبی وہ انسان ہے جو لوگوں پر تبلیغ دین خدا کے لئے مبعوث ہوا ہو اور رسول وہ انسان ہے جو بعض ایسے مخصوص احکام کے لئے مبعوث ہو جن کی تردید عذاب الٰہی کا پیغام ہو۔ اور اس کا قبول کرنا انعام خداوندی کا مژدہ اور قرآن مجید میں انبیاء کے قصص سے رسالت کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے چنانچہ حضرت نوحؑ حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ اور حضرت شعیب وغیرہ جس قدر رسول ہو کر آئے ان کے واقعات اس مطلب کے شاہد ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں

پس ضروری نہیں کہ جو شخص ایک قوم کی طرف رسولؐ ہو وہ اس قوم کا نبی بھی ہو۔ پس ہو سکتا ہے کہ قوم کا رسول اس کا نبی بھی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم کا رسول ہو لیکن نبوت اس کی متعدد اقوام کے لئے ہو یا چند قوموں کا رسول ہو اور نبوت عامہ کا حامل ہو۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام یہ دونو نبی نبوت عامہ کے عہدہ دار تھے لیکن رسالت ان کی صرف بنی اسرائیل تک ہی محدود تھی اور قرآن مجید میں اسی معنی کی تائید ملتی ہے۔

ایک فرق نبی و رسول میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ نبی وہ ہے جو عالم خواب میں فرشتہ کو دیکھے اور اس کی آواز سُنے لیکن بیداری میں اس کو نہ دیکھ سکے اور رسول وہ ہے جو خواب اور بیداری دونو حالتوں میں فرشتہ کو دیکھ سکتا ہو۔ اس قسم کی متعدد احادیث کافی سے منقول ہیں اور صاحب تفسیر میزان نے جو فرق بیان کیا ہے اس کی اس آخری فرق سے تطبیق ہو سکتی ہے اور قرآنی واقعات کی رُو سے اس فرق کی سمجھ بھی آتی ہے پس میرے خیال میں صاحب میزان کا نظریہ کسی حد تک درست ہے لیکن یہ فرق اس قسم کا نہیں کہ اس کا عقیدہ ضروریات مذہب میں سے ہو اور اس کے منکر کو خارج از اسلام کہا جا سکے ہاں ان تمام نبیوں اور رسولوں پر مجموعی طور پر اس قدر ایمان لانا ضروری ہے کہ وہ نبی یا رسول من جانب اللہ تھے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام

مذہب شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰؐ تک تمام انبیاء جمیع خصال حمیدہ کے لحاظ سے اپنی اپنی امتوں کے جمیع افراد سے اکمل واشرف تھے علمی و عملی فضیلت کے علاوہ وہ اپنے جملہ اقوال و افعال و احوال میں بچپنے سے دم آخر تک قبل از بعثت و بعد از بعثت تمام گناہان صغائر و کبائر سے معصوم تھے اور علمائے اعلام نے بہت کافی دلیلیں ذکر فرمائی ہیں حتیٰ کہ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں ہم نے آسان اور عام فہم انداز سے چند دلیلوں کا ذکر مناسب سمجھا ہے تاکہ استفادہ میں آسانی ہو اور ہر شخص مطلب کی تہہ تک آسانی سے پہنچ سکے۔

۱. اگر نبی معصوم نہ ہو تو اس کی تبلیغ قابل قبول نہ ہو گی۔ کیونکہ عصمت کے بغیر اس کی ہر بات میں جھوٹ کا احتمال ہو گا۔

۲. نبی کے لئے دعویٰ نبوت کا اثبات بغیر عصمت کے محال ہے کیونکہ اگر اس سے

گناہوں کا سرزد ہونا جائز ہو تو من جملہ گناہوں کے ایک جھوٹ بھی ہے جب اس کی ہر بات میں جھوٹ کا احتمال ہوگا تو دعویٰ نبوت میں بھی یہی احتمال رہے گا۔ لہٰذا اس کی نبوت ثابت نہ ہو سکے گی۔

③ اگر نبی گنہگار ہو یعنی اپنے تمام اقوال و افعال میں اللہ کا فرمانبردار نہ ہو تو عام رعایا پر اس کی تبلیغ کا اثر کچھ نہ ہوگا بلکہ اس کی بات باعثِ تضحیک ہوگی۔

④ جو شخص عامل نہ ہو لوگوں کے دلوں سے اس کا وقار اٹھ جاتا ہے پس اس کی بات کا اثر نہیں رہتا۔ لہٰذا ایسے شخص کو نبی بنانا مضحکہ خیز ہوگا۔

⑤ بعثتِ انبیاء کی غرض اصلاح ہے تو جو شخص خود گنہگار ہو اس کو لوگوں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کی ضرورت ہوگی اب اس کی اصلاح یا تو امت کرے گی حالانکہ یہ ناممکن ہے کیونکہ وہ اس جیسے خطاکار ہیں یا کوئی اور نبی آئے گا اور وہ بھی اگر معصوم نہ ہو تو اس کے لئے کوئی اور نبی لانا پڑے گا وعلیٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا۔

⑥ اگر نبی معصوم نہ ہو اور گنہگار ہو تو باقی امت جیسا ہوگا۔ پھر اس صورت میں اس کو نبی بنانا ترجیح بلا مرجح ہوگی جو عدل کے منافی ہے۔

⑦ اگر نبی خود گنہگار ہو تو اس کے لئے عین ممکن ہے کہ امت کے ساتھ شریک گناہ ہو جائے اور یہ مصلحت خداوندی کے خلاف ہے۔

⑧ اگر گناہ گار ہوگا تو امت کے اختلافی مسائل میں اس کے عدل پر اعتماد نہ ہوگا۔ بلکہ ظلم کا امکان رہے گا اور یہ تمدنی اصلاح کے منافی ہے۔

⑨ جس نے بعد میں لوگوں کو منع کرنا ہو اگر وہ بعثت سے پہلے خود کرتا رہے تو امت اس کی بات کو قبول نہ کرے گی اور لوگ کہیں گے ——— کہ کل تک تو وہ خود یہ کام کرتا رہا ہے اب ہمیں روکنے کا اس کو کیا حق ہے؟

⑩ جو شخص گناہ کرتا ہو خواہ گناہ صغیرہ ہی ہو اور وہ بھی قبل از بعثت سہی تاہم اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کی طبیعت میں گناہوں کی طرف اقدام کی جرأت موجود ہے پس ایسے شخص سے بعد میں بھی گناہ کا امکان ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے موعظہ کا اثر نہ رہے گا اور لوگوں کے دلوں میں اس کا وقار نہ ہوگا نیز اس کی بات مضحکہ خیز بن جائے گی۔ لہٰذا ایسے شخص کا نبی بنانا مصلحت خداوندی کے خلاف ہے۔

میں نے اس مقام پر دس دلیلوں پر اکتفا کی ہے اور انبیاء کی عصمت کے اثبات میں اسی قدر کافی ووافی ہے پس ثابت ہو گیا کہ انبیاء سب کے سب صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے قبل از بعثت وبعد از بعثت پاک وپاکیزہ تھے ہم نے ضرورتِ دین ضرورتِ نبوت اور دیگر مختلف عناوین کے ماتحت بھی یہ ثابت کیا ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لئے خدائی قوانین کے ساتھ ساتھ ایک خدائی نمائندہ بھی ضروری ہے یعنی اسلامی قوانین کے ہمراہ خدا کی جانب سے نبی کی ضرورت بھی ہے جو اس قانون کا علم رکھتا ہو اور اس کا مبلغ ومروج ہو تو ایسے شخص کا معصوم ہونا عقلاً ضروری ہو جاتا ہے پس اسکی کے لئے مزید اوکہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور خدا کی شان سے بعید ہے کہ ایک غلط کار انسان کو دوسرے غلط کاروں کی اصلاح کا علمبردار بنا دے۔

پس جب نبی کا معصوم ہونا قطعی دلیلوں سے ثابت ہو گیا تو قرآن کی آیتیں صرف تائید مطلب کے لئے ہی ہیں اور ارشادی حیثیت رکھتی ہیں جیسے کہ فرمایا میں نے ان کو چن لیا۔ یا یہ کہ وہ میرے برگزیدہ بندے ہیں یا یہ کہ ہم نے اپنے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے یا یہ کہ وہ میرے مخلص ہیں وعلی ہذا القیاس اور با ایں ہمہ اس قطعی ثبوت کے بعد اگر کہیں ایسے واقعات مل جائیں جو بظاہر ان کی عصمت کے منافی ہوں تو اگر وہ روایت متواترہ سے ثابت ہوں یا قرآن میں موجود ہوں جن کو رد نہ کیا جا سکتا ہو تو ان کی تاویل واجب ہے جس طرح خدا کے تجسم کے بطلان کے بعد قرآن میں واقع ہونے والے الفاظ ید ساق اور وجہ وغیرہ کی تاویل کی جاتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق چونکہ قرآن کی بعض آیات سے اشتباہات واقع ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی معقول اور اچھے طریقہ سے تاویل کرنی چاہیئے اور سب نبیوں میں سے حضرت آدمؑ پر کئے جانے والے شبہات نہایت سخت ہیں ان کے متعلق ہم نے اپنی تفسیر انوار النجف کے مقدمہ میں اور تفسیر کی دوسری جلد اور چھٹی جلد میں مفصل توضیحات عقلی ونقلی طریقہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتبِ سماویہ

خداوندِ عالم نے جس قدر انبیاء مبعوث فرمائے ہیں ان میں سے بعض کو صاحبِ کتاب بنایا ہے اور بعض انبیاء پر صحیفے نازل فرمائے پس ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انبیاء پر جس قدر صحیفے نازل فرمائے اس وقت کے لحاظ سے وہ معاشرہ انسانی کی اصلاح کا مکمل کورس تھے اور خدا نے جس قدر کتابیں اُتاریں حضرت موسیٰؑ کی توراۃ

حضرت داؤد کی زبور اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل یا باقی انبیاء سابقین کے صحیفے سب برحق تھے لیکن اس وقت تک کہ تحریف و تصحیف کی وجہ سے ان کی تعلیمات و آیات کو بدل نہ دیا گیا تھا موجودہ کتب جن کو تورات یا انجیل یا زبور کا نام دیا جاتا ہے یہ تحریف شدہ کتابیں ہیں جن کے مضامین اکثر ناقابلِ قبول ہیں پس ان پر ہمارا کوئی اعتقاد نہیں ہے اور اصل کتابوں پر بھی اعتقاد رکھنا اجمالی طور پر کافی ہے۔ اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید ان کتب سماویہ کے علوم کی جامع کتاب ہے اور ان کی ناسخ اور ان سے افضل و اکمل کتاب ہے۔

انبیاء کا معیارِ صداقت

نبی کے دعوائے نبوت کے بعد اس کا معیارِ صداقت یہ ہے کہ وہ تمام فضائل و کمالاتِ انسانیہ کی جامعیت میں اپنی امت سے افضل و اکمل ہو علم و فضل کمال شرافت۔ دیانت امانت صداقت اور عزتِ نفس وغیرہ میں ان سے ممتاز ہو۔ زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ ہو اور اپنے دعوائے نبوت کے ساتھ طلب کرنے پر معجزہ بھی دکھا سکتا ہو اور اپنے مقصد کو واضح طور پر ثابت کرنے کی جرأت بھی کر سکتا ہو اس کو نہ دولت مرعوب کر سکے اور نہ کلمۂ حق کے کہنے میں حکومتِ وقت سے مرعوب ہو وہ جذباتی لہجہ کے بجائے اعتراضات سُن کر نہایت سکون و اطمینان سے مطالب کے چہرہ سے غبار اٹھانے کی پوری پوری اہلیت رکھتا ہو اس کو اس مطالب کی تبلیغ و ترویج میں کوئی دنیاوی لالچ و حرص یا خواہش نہ ہو مہر کیف ڈھونڈنے والے حقیقت اور تصنع میں واضح فرق معلوم کر سکتے ہیں اور معجزہ جو اس زمانہ کی رفتار ترقی سے معیار بلند رکھتا ہو وہ دعوائے نبوت کی تصدیق میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

معجزہ اور جادو میں فرق

چونکہ نبی کی صداقت کو سمجھنے کے لئے معجزہ کا صدور ایک اہم چیز ہے اور معجزہ ایک خارقِ عادت امر کے ظہور کا نام ہوتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں جادوگر بھی جادو کے ذریعہ سے خارقِ عادت اشیاء کو ظاہر کر دیا کرتا ہے بناءً بریں ان دونوں میں فرق بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

① جادو ایک فن ہے جو سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے اور معجزہ فن نہیں بلکہ نبی و رسول یا ولی و امام کے ارادے یا دعا سے بمشیتِ و اذنِ پروردگارِ عالم کوئی چیز اپنی عادی رفتار کو تبدیل کر کے غیر عادی صورت میں رونما ہوتی ہے۔

② جادو کے اثر سے جو عجائبات ظاہر ہوتے ہیں ان سے ان کے منقلب وجود کے

نوعی اثرات وخواص مفقود ہوتے ہیں مثلاً حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں جو فرعونی جادوگروں نے سانپ بنائے تھے ان سانپوں سے سانپوں کے اثرات وخواص ناپید تھے وہ کسی کو ڈس نہیں سکتے تھے لیکن بخلاف اس کے جو معجزہ ہوتا ہے اس میں منقلب وجود کے نوعی اثرات وخواص بھی موجود ہوتے ہیں جیسے حضرت موسیٰؑ کا اژدہا وہ جب تک اژدہا ہوتا تھا۔ اس میں پورے پورے اژدہا کے خواص تھے یا حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حکم سے تصویر کا شیر بن جانا وہ بھی واقعی شیر بن کر اپنے نوعی خاصہ کا مظہر بنا تھا یا حضرت صالحؑ کی ناقہ جو اپنے نوعی خاصہ کی مظہر تھی۔ بہرکیف معجزہ میں شیٔ بالکل حقیقۃً ثانوی اثرات کی حامل ہو جاتی ہے اور یہ چیز جادو میں نہیں ہوتی۔

(۳) جادو کردہ چیز سے خود جادوگر متاثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس میں ثانوی خواص نہیں ہیں بلکہ حقیقت اولی بعینہٖ باقی ہے لیکن معجز نما اپنے معجزہ سے خود بھی متاثر ہوتا ہے کیونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ اس میں ثانوی خواص موجود ہیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جادوگر اپنے بنائے ہوئے سانپوں سے نہ ڈرتے تھے اور حضرت موسیٰؑ اژدہے سے ڈر گئے تھے جس کی بناء پر وہ جادوگر بھی سمجھ گئے کہ ہمارا کمال جادو تھا اور موسیٰؑ کا کمال جادو نہیں بلکہ وہ معجزہ ہے اور اس اژدہا میں اثر ثانوی بدرجہ اتم موجود تھا جبھی تو فرعون پر لپکا اور اس کے شاہی ناز و دبدبہ کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اس کا پاخانہ نکل گیا اور لوگوں کے سامنے اس کی خدائی کا جنازہ نکل گیا کیونکہ وہ حاجات ضروریہ کو چھپایا کرتا تھا۔

(۴) بعض اشیاء میں خداوند عالم نے کچھ خواص واثرات رکھے ہیں جو عام طور پر لوگوں سے مخفی ہیں پس فن جادو میں ان ہی مخفی اثرات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ سامری نے حضرت جبریلؑ کی گھوڑی کے سموں کی خاک اٹھا کر اپنے پاس رکھی ہوئی تھی اور حضرت موسیٰؑ کے کوہ طور پر جانے کے بعد زیورات اکٹھے کر کے آگ میں پگھلا کر بچھڑے کی شکل بنائی اور اس میں وہ خاک ڈال دی۔ جو آواز کرنے لگی کیونکہ وہ حضرت موسیٰؑ کی زبانی کہیں اس کا اثر سن چکا تھا۔ بہرحال عام جادوگروں کا یہی دستور ہے کہ مخفی آثار سے عوام کے سامنے عجائبات کا اظہار کیا کرتے ہیں اور فرعونی جادوگروں نے بھی یہی چال چلی تھی۔ جو حقیقی سانپ کے مقابلہ میں ناکام ہوگئے

معجزہ میں مخفی اثرات کے اظہار سے دھوکہ دینا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک شئی کی حقیقی نوعی تبدیلی واقعاً کردی جاتی ہے اور اس میں واقعی ثانوی آثار آجایا کرتے ہیں۔

⑤ جادو میں لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا جاتا ہے اور معجزہ دھوکا نہیں ہوتا جیسے کہ بیان ہوچکا ہے۔

⑥ جادو کا مقابلہ ہوسکتا ہے کیونکہ جادو کردہ شیئ میں حقیقت ثانوی تو آنہیں جاتی۔ لہٰذا دوسرا جادوگر اس سے زیادہ کا اظہار کرکے یا اس کی نقیض و ضد کو عمل میں لاکر پہلے جادو کو توڑ سکتا ہے لیکن معجزہ اس قسم کے معارضات سے بالاتر ہوتا ہے۔

⑦ جادو کا اثر زمین تک محدود ہے اور معجزہ کا اثر فلکیات تک جاسکتا ہے کیونکہ وہ فعل خداوندی ہے اور خدا ہر شئی پر قادر ہے چنانچہ شق القمر اور ردشمس اسی کے ماتحت ہیں۔ بنابریں شعبدہ کی حقیقت بھی کھل گئی کیونکہ شعبدہ میں صرف ہاتھ کی پھرتی اور آنکھوں کا دھوکا ہی ہوا کرتا ہے اور معجزہ ایک زندہ حقیقت کا نام ہے۔

معجزہ فعلِ خدا ہے یا فعلِ معصوم

اولاً تو یہ فرق کرنا مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ معصوم ہوتا ہی وہی ہے جو مشیت پروردگار کے بغیر کوئی کام نہ کرسکے خواہ عام تمدنی و معاشرتی مشاغل کی صورت میں ہو یا اعجاز نمائی کے رنگ میں ہو تو جب معصوم کا عام قول و فعل جو اعجازی حیثیت سے نہ ہو اس کو بھی خدا اپنی جانب سے منسوب فرماتا ہے۔ مثلاً مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ اپنی مرضی سے نہیں بولتا بلکہ یہ تو وحی الٰہی ہوا کرتی ہے چونکہ منافقوں نے حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کی خلافت کے لئے نامزدگی پر چہ مے گوئیاں کی تھیں پس ان کی تردید میں یہ آیت اتری۔ اسی طرح فرمایا مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ جو تو نے تیر یا سنگریزے مارے وہ تجھ نے نہیں بلکہ اللہ نے مارے تھے يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں پر آپ کا نہیں بلکہ اللہ کا ہاتھ تھا ان آیات کے ذکر کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ معصوم کے تمام افعال جو اعجاز نمائی کے لئے نہیں ہوتے خدا ان کو بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ ان کا کوئی کام بغیر مشیت پروردگار کے نہیں ہوتا تو معجزہ جو خداوندکریم کی مخصوص مشیت سے ظہور پذیر ہوتا ہے اگر اس کو فعل خدا کہا جائے تو اس میں کیا حرج ہے ہاں وہ معصوم کے دستِ حق پرست پر ظاہر ہونے کی وجہ سے

معصوم کا فعل بھی کہا جا سکتا ہے اور ہر دو صورتیں معصوم کی عظمتِ شان کی بولتی ہوئی زبانیں ہیں۔

خارقِ عادت کی وضاحت

موجوداتِ عالم میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک خداوند کریم نے ہر مخلوق کو ذاتی اور خلقی طور پر کچھ خواص دے رکھے ہیں جو اس کی پہچان کے ذرائع اور اس کی بود و باش کے اسباب ہیں جن کے بغیر نہ وہ پہچانا جاتا ہے اور نہ میدانِ عمل میں قدم رکھ سکتا ہے پس ہر شیئ کا اپنے فطری خواص و افعال کے ساتھ منصۂ شہود پر آنا اور باقی رہنا اس کی عادت و فطرت ہے جمادات کا نہ بڑھنا نباتات کا بڑھنا حیوانات کا بڑھنے کے علاوہ چلنا پھرنا پرندوں کا اڑنا درندوں کا پھاڑنا اور انسانوں کا بولنا وغیرہ یہ سب عاداتِ فطریہ ہیں۔ ان عادات کی تبدیلی دو طرح سے ہوتی ہے ایک کسی سبب سے کہ وہ ایک عادت کو چھوڑ کر کسی سبب یا آلہ کے ذریعے سے غیر عادی فعل کا مظہر بن جائے مثلاً کسی تربیت یا آلہ کی وجہ سے درندہ درندگی کو ترک کرے یا انسان سے قوتِ گویائی مثلاً مسلوب ہو جائے تو اس کو معجزہ نہ کہا جائے گا۔ دوسری یہ کہ بغیر آلہ کے تبدیلی ہو پس معجزہ وہ ہے کہ یہ فطری و عادی رفتار کسی خارجی سبب و آلہ کے بغیر منصۂ شہود پر تبدیل ہو کر سامنے آئے لہٰذا درخت کا چلنا بولنا پرندوں کا کلام کرنا اور درندوں کا تابع ہو جانا اور انسانوں میں اڑنے کی طاقت کا پیدا ہونا یا اس قسم کے افعال کا عادی رفتار کو چھوڑ کر ظاہر ہونا معجزہ ہے بنا بریں نبات کا بڑھنا معجزہ نہیں بلکہ اس کی عادی رفتار ہے اسی طرح نبی کو جو فطری خواص دیئے گئے ہیں کہ ان کا پسینہ خوشبودار ہوتا تھا یا وہ نیند میں بھی غافل نہ ہوتے تھے یا سامنے کی طرح پس پشت بھی دیکھا کرتے تھے یہ ان کے ذاتی و عادی خواص تھے معجزہ نہ تھے اگرچہ عام انسان جو اس نکتہ سے غافل ہوں وہ اس کو بھی معجزہ سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں۔ پس جو چیز فطرت و عادت یا اپنی اختیاری طاقت سے صدور میں آئے وہ معجزہ نہیں ہوتا بلکہ عادی کہا جاتا ہے پس خارقِ عادت وہی ہو گا جو اپنی ذاتی طاقت سے نہ ہو اور عادی رفتار سے بالاتر ہو اور اسے معجزہ کہیں گے اور خدا ان کی دعاؤں کو مستجاب فرماتے ہوئے اشیا کی عادی رفتار کو بدل دیتا ہے بلکہ بعض اوقات دعا مانگے بغیر بھی خارقِ عادت امور ان کے ارادوں سے صادر ہو جایا کرتے تھے اور خدا ان کے ارادہ سے تقدیر کو بدل دیتا ہے جس طرح بتولِ معظمہ کے ارادہ سے فرشتہ کا درزی بن کر کپڑے لانا اور امام کے حکم سے تصویر کا شیر بننا وغیرہ

تمام معجزوں میں سے معراج جناب رسالتمآبؑ کا بہت بڑا معجزہ ہے لیکن خود نہیں کیے بلکہ قرآن کہتا ہے اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ یعنی خدا لے گیا اور قرآن مجید ایک پائیدار معجزہ ہے لیکن ان کا اپنا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے۔

افعال کی خدا کی طرف نسبت

انسان کے عام افعال جو اس کے اختیار سے صادر ہوتے ہیں ان کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا حالانکہ بنیادی طاقتوں کے دینے والا وہی ہے مثلاً زبان اور قوتِ گویائی اس کی عطا کردہ ہے اور بولنا ہمارے بس میں ہے قوتِ باصرہ اس نے دی ہے اور دیکھنا ہمارے اختیار میں ہے اور چلنے کی طاقت اس نے دی ہے۔ اور چلنا ہمارے بس میں ہے وعلیٰ ہذا القیاس اور یہ بس اور اختیار بھی اسی نے ہی دیا ہے صرف استعمال کا حق ہمیں عطا فرمایا ہے گویا پوری مشنری اور اس کو چلانے کی قوت و اختیار سب اس کا عطیہ ہے تاہم فعل ہماری طرف ہی منسوب ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر و طبیب مریض کا ہر ممکن علاج کریں اور بڑی کوشش و محنت کے بعد کامیاب بھی ہو جائیں تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کو ہم نے شفا دے دی۔ اسی طرح ان کے فعل کو بھی خدا کا فعل نہیں کہا جا سکتا مثلاً یہ نہیں کہہ سکتے کہ علاج خدا نے کیا یا اپریشن خدا نے کیا کیونکہ یہ بندہ کا اپنا اختیاری فعل ہے لیکن جو فعل بندہ کی موجودہ قوت سے بالاتر ہو اور اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہو اس کو خدا کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے جس طرح شفا وغیرہ اور معجزہ کی بعینہٖ یہی صورت ہے کیونکہ وہ چیز اگر ان کے عام اختیارات میں داخل ہو تو نہ خارقِ عادت ہے نہ معجزہ اور نہ وہاں دعا کی ضرورت ہے جس طرح ڈاکٹر علاج اپنی مرضی و اختیار سے کرتے تھے اور خارقِ عادت کیلئے دعا مانگتے تھے البتہ ان کی خدا کے نزدیک عظمت و منزلت کے پیشِ نظر اس قسم کے واقعات تاریخ میں بہت زیادہ ملتے ہیں کہ انہوں نے چاہا اور چیز ہو گئی یہ ان کے انتہائی قرب و محبوبیت کی دلیل ہے کہ انہوں نے ارادہ کیا اور دعا کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے کہ خدا نے دعا سے پہلے ان کے ارادہ کو پورا کر دیا تاہم آئمہ نے کبھی ایسی صورت میں اس شئی کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا تھا بلکہ وہ خدا کی طرف منسوب فرماتے تھے

معجزہ خدا اس لئے اپنے کسی نبی یا ولی کو عطا فرماتا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ لوگوں کو توحید کی طرف دعوت دیں۔ پس اگر معجزہ کو ان کا اپنا فعل سمجھ لیا جائے تو وہ ہرگز اقرار

توحید کا ذریعہ نہیں بنے گا بلکہ الٹا منافی ہو جائے گا مثلاً اگر صالحؑ یہ فرمائیں کہ ناقہ کا پتھر سے پیدا کرنا میرا فعل ہے تو یہ توحید کی دعوت نہ ہو گی بلکہ ایسی صورت میں تو مقصد توحید ہی ختم ہو جائے گا لوگ اسی کو خالق ماننے لگے جو کر کے دکھا رہا ہو گا اسی طرح توحید کی دعوت کے سلسلہ میں اگر خلق طیر یا مبروص و مجذوم کی صحت یا اندھے کی بصارت یا احیائے موتیٰ کو حضرت عیسیٰؑ اپنی طرف منسوب کرتے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ بجائے موحدین کی جماعت پیدا کرنے کے ایک مشرکین کا گروہ پیدا کر جاتے حضرت عیسیٰؑ فرماتے رہے کہ میں صرف وسیلہ ہوں۔

درحقیقت پرندہ کا پیدا کرنا بیماروں کی شفایابی اور مردوں کی زندگی سب اذن پروردگار سے ہے تاہم مشرکین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جنہوں نے ان کو وسیلہ سمجھنے کی بجائے خود فاعل سمجھ لیا اسی لئے تو اتمام حجت کے طور پر قرآن مجید میں ذکر فرمایا تاکہ لوگ معجزات کو نبی یا امام کا فعل کہہ کر ان جیسے شرک میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو خدا فرماتا ہے ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا مان لو؟

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے دل میں عصا کو اژدہا بنانے کے بعد خوف ڈال دیا کہ وہ پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ دعوت توحید الٹا شرک نہ بن جائے چنانچہ جب جادوگروں نے دیکھا کہ اژدہا ان کے بنے ہوئے سانپوں کو کھا گیا تو اگر حضرت موسیٰؑ خود نہ ڈرتے تو وہ یہ سمجھتے کہ یہ سارا کمال اسی کا اپنا ہے لیکن ان کے خوف کھانے سے وہ بھانپ گئے کہ یہ اللہ کا فعل ہے پس وہ فوراً خدا کے وجود کا اقرار کر گئے ورنہ وہ موسیٰؑ کا اپنا کمال سمجھ کر شاید اس کو ہی خدا تسلیم کر لیتے جو انقلاب حقیقت پر قادر ہے پس معجزہ کا فائدہ ضائع ہو جاتا اور توحید کی بجائے شرک کا قدم آگے بڑھ جاتا اور اسی معجزہ کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی تو نصیری مشرک ہوئے ورنہ اگر حضرت علیؑ کے معجزہ کو وہ فعل خدا سمجھتے اور حضرت علیؑ کو اس کا وسیلہ اور معجزہ نما جانتے تو کیوں غلطی کرتے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بھی معجزہ تھی

چونکہ موجودات عالم کی عادی رفتار کا بدلنا ہی معجزہ ہے اور خارق عادت کا ظہور اسی نوع سے ہے تو بنا بریں چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عادی رفتار کے خلاف تھی اور وہ باپ کے بغیر پیدا ہوئے جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی صراحت موجود ہے

پس ان کی ولادت معجزہ ہے بنابریں حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کو قرآن کی زبان میں معجزہ کہا گیا۔ جَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَتَيْنِ ہم نے مریمؑ اور اس کے فرزند کو معجزہ بنا دیا اور عام زبان میں اسی کو امری خلقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

معجزہ کی حقیقت

معجزہ کی حقیقت سمجھنے سے پہلے ایک مقدمہ کی وضاحت ضروری ہے تاکہ مطلب کے سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ یہ کہ محال کی چار قسمیں ہیں۔

محالِ ذاتی، محالِ عقلی، محالِ عادی اور محالِ شرعی۔

- محالِ ذاتی وہ ہے جس کی ذات عدم کی مقتضی ہو جیسے شریک الباری۔
- محالِ عقلی وہ ہے جس کا وجود عدم کو مستلزم ہو جیسے دور و تسلسل وغیرہ
- محالِ عادی جس کا وقوع عادتِ جاریہ کے خلاف ہو مثلاً موجوداتِ عالم میں سے کسی شیٔ کا بغیر سبب کے واقع ہو جانا۔
- محالِ شرعی کسی شرعی حکم کا شارع کے تصرف کے بغیر اپنی نوعیت کا تبدیل کر لینا جیسے آبِ مضاف کا مطہر ہونا، یا آبِ مطلق جاری یا کر کا نجس ہونا وغیرہ

پس محالِ ذاتی اور محالِ عقلی کا وقوع پذیر ہونا مقدوریت کے دائرے سے باہر ہے اور محالِ شرعی شارع کے تصرف سے ممکن ہو سکتا ہے جسے نسخ کہا جاتا ہے پس معجزہ کا تعلق صرف محالِ عادی سے ہی ہے اسی لئے اس کو خارقِ عادت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہم نے مقدمہ تفسیر انوار النجف میں اس کی دس قسمیں ذکر کی ہیں، لہذا تفصیل کے لئے وہاں رجوع فرمائیں، پس موجوداتِ عالم میں سے کسی شیٔ کا ظاہری اسباب و آلات کے بغیر غیر متوقع صورت میں کسی نبی یا امام کی دعا یا برکت سے منصۂ شہود پر ظاہر ہونا ہی معجزہ کہلاتا ہے۔

اب یہ سمجھنا یا سمجھانے کی کوشش کرنا کہ معجزہ جس طرح ظاہری طور پر اسباب و آلات کے بغیر ظاہر ہوا ہے آیا واقعاً ہی علل و اسباب سے بے نیاز ہے یا واقع میں وہ اپنے مخصوص اسباب رکھتا ہے جن کا ہمیں علم نہیں؟ تو میرے خیال میں ایک ٹیڑھا سا سوال ہے اور اس میں پڑنا اور ایسے جھمیلوں میں الجھنا یقیناً ہمارے لئے نتیجہ خیز نہ ہو گا کیونکہ ہماری محدود بشری صلاحیتیں ماوراء البشریت امور کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ لہذا اس کے متعلق کوئی ٹھوس نظریہ قائم کرنا بہت مشکل ہے لیکن قادرِ مطلق خدا چونکہ اپنے افعال میں آلات و اسباب کا محتاج نہیں اور نہ وہ

طبیعت کا حاجتمند ہے تو جس طرح اس لمبے چوڑے عالمی وجود کو ارادۂ کن سے منصۂ شہود
و وجود پر لانے کی قدرتِ تامہ رکھتا ہے۔ اس قسم کے جزوی امور کے لئے مادہ و طبیعت
کی حرکاتِ مخصوصہ یا آلات و اسباب لائقہ کی اسے کیا ضرورت ہے؟ پس چونکہ معجزہ کا
صدور اسی ذات کی ہی قدرت کا ادنی سا کرشمہ ہے لہذا اس مقام پر تردد کی کوئی ضرورت نہیں
کہ معجزہ خارق عادت امور کے صادر ہونے کا نام ہے نہ ظاہراً اس کی کوئی علت ہے اور
نہ واقعاً وہ علت کا مرہونِ منت ہے اور یہی اعتقاد درست ہے اگر مادہ و طبیعت
کے پرستار اور علل و اسباب کی موجودہ روش کے قیدی اذہان مطمئن نہ ہوں تو انہیں اس
قدر جملہ کہہ کر خاموشی کو اختیار کر لوں گا کہ وہ مادہ یا طبیعت جو علل و اسباب کی دنیا میں
علۃ العلل اور مبداء المبادی کی حیثیت رکھتا ہے کیا وہ حادث ہے یا قدیم اگر قدیم کہیں
تو اس کے روزمرہ کے تغیرات اور روز افزوں تطورات اس نظریہ کو ہنسنے کی اجازت
نہیں دیں گے پس حادث ہی ماننا پڑے گا تو پھر کیا وہ اپنا موجد خود ہے یا کسی قادر مطلق کی
ایجاد کا محتاج ہے یہ بدیہی ہے کہ شیٔ اپنی خالق خود نہیں ہو سکتی پس ماننا پڑے گا کہ خالق
کی ایجاد کا محتاج ہے پس ہم کہیں گے کہ جس خالق نے اس علۃ العلل اور مبداء المبادی کو بغیر
مبداء و علت کے پیدا کر دیا ہے وہ اس کے باقی شوؤن و تصرفات میں بھی مادہ و علت کا
محتاج نہیں ہے وہ جب چاہے جس طرح چاہے ایجادِ مخلوق پر کلی طور پر قادر ہے اس
کی قدرت کی کوئی حد نہیں اس نے تمام کائنات کو علل و اسباب کا ایک دستوری رنگ
دے دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اب مجبور ہو گیا ہے بلکہ یَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
وَيُثْبِتُ کا مصداق ہے پس اسی طرح معجزہ بھی اس کی قدرت کا کرشمہ ہے جو بغیر ظاہری
و واقعی اسباب کے منصۂ شہود پر ظاہر ہوتا ہے۔

معجزہ کی ضرورت

چونکہ مادہ و طبیعت کی پرستار ذہنیتیں ہمیشہ پیغامِ توحید سے برسرِ پیکار
رہی ہیں وہ ہر شیٔ کو علل و اسباب ظاہریہ کی مخلوق سمجھتی ہیں پس
داعیانِ توحید کے لئے ضروری تھا کہ ان آفت زدہ اذہان کو خالق کائنات کی طرف
اس طریقہ سے دعوت دیں کہ وہ مادہ و طبیعت کی قید و بند سے آزاد ہو کر ذاتِ واجب
الوجود کی معرفت کا درس حاصل کر سکیں جو نہ خلق میں مادہ کا محتاج ہے اور نہ نظام اکملِ
کائنات میں طبیعت کا مرہونِ احسان ہے۔

اور بہت ممکن ہے کہ مادہ پرستوں کی جانب سے انبیاء پر یہ سوال کیا جاتا ہو کہ مادہ کے بغیر کس طرح کوئی شئی زیورِ وجود سے آراستہ ہو سکتی ہے یا طبیعت کے بغیر کس طرح نظامِ کائنات برقرار رہ سکتا ہے تو ان کے لئے صرف لفظوں میں جواب دینا کافی نہ تھا بلکہ عملی طور پر واضح کرنے کیلئے انبیاء کو ایسی قوت کا عطا کرنا ضروری تھا جس کے استعمال سے ہر دور کا مہذب گروہ اور ترقی یافتہ طبقہ وجود ذاتِ اقدس خداوندی کی دلیلوں کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کر سکے اسی بناء پر جس دور کے ترقی یافتہ لوگوں کے نزدیک کوئی فعل علل و اسباب ظاہرہ کے لحاظ سے عروج و کمال کی انتہائی منزل پر پہنچا ہوا ہوتا تھا اور اس دَور کے مفکرین و علوم جدیدہ کے مالک اس سے اوپر قدم رکھنا مافوق البشر طاقت کا کام سمجھتے تھے تو اس دَور میں اللہ نے جو نبی بھیجا اسی مناسبت سے وہ قوت لے کر آیا جس نے اس دَور کے ماہرینِ علوم کی گردنیں جھکا دیں اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ ہماری افکار و انظار سے بلند و بالا ایک ایسی طاقت موجود ہے جو خلق میں مادہ سے اور انتظام میں طبیعت سے بے نیاز ہے چنانچہ لوہے کی صنعتِ عامہ کے پیشِ نظر حضرت داؤدؑ کو ایسا کمال دیا کہ اس دَور کے ماہرین نے گھٹنے ٹیک دیئے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جادو کا زور تھا اور اس فن میں لوگ کافی ترقی یافتہ تھے تو عصائے موسیٰؑ کے حیرت انگیز انقلاب نوعی نے ان کے حوصلے توڑ دیئے فنِ طب کے کمال پر حضرت عیسیٰؑ نے خطِ تنسیخ پھیر دیا پس گویا انبیائے کرام کے معجزے اسی طرح تبلیغ کے سلسلہ کی اہم کڑیاں تھیں۔ نیز یہ بات بھی تاریخی مسلمہ ہے کہ دعوتِ توحید کو منوانے کے لئے جہاں معجزہ کی ضرورت اہم ہوتی تھی۔ وہاں قوتِ بیان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اپنے مطلوب کے منوانے کے لئے سب سے بڑا طریقہ صداقت و دیانت کے اصولوں پر مبنی زور دار بیان ہے لہذا شکوک و شبہات کا حل صرف دلائل و براہین کے پاس ہوتا ہے پس نبی کے لئے اس ملکہ کا ہونا لازمی ہے اور ضدی مزاج طبقہ دلائل و براہین سے آنکھیں بند کر لے تو ان کو معجزہ دکھا کر اتمام حجت کی جاتی ہے اسی لئے قرآن مجید میں بار بار تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے اور معجزہ کو ثانوی حیثیت پر رکھا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہود چونکہ اس معیار کو سمجھتے تھے لہذا انہوں نے حضورؐ کی صداقت کا معیار دلائل و براہین کو قرار دیا تھا۔ لیکن جب مشرکین مکہ کی پہنچ اعجاز نمائی تک تھی لہذا وہ معجزہ طلب کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ دلیل کا طالب دلیل حتمی سے مطمئن ہو جاتا ہے اگر فہم مستقیم و عقل

سلیم رکھتا ہو لیکن معجزہ کے طالب کو ذہنی سکون حاصل نہیں ہوتا وہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا معجزہ طلب کرتا ہی رہتا ہے چنانچہ مشرکین کا یہی دستور تھا۔ آپ فلاں کام کر دکھائیں وہ ہو گیا تو اور مطالبہ کر دیا مثلاً چاند کو دو ٹکڑے کر دکھائیں وہ جب ہو گیا تو اچھا فلاں فلاں ہمارے بزرگوں کو زندہ کریں گویا ان کا سلسلہ سوالات ختم ہی نہیں ہوتا تھا اور اسی بناء پر قرآن مجید میں ان کو بہت زیادہ سرزنش کی گئی ہے کہ ان کو معجزہ دکھانے سے ان کی تسلی نہیں ہو گی ان کو تدبر و تفکر کی دعوت دو۔

معجزۂ قرآن انبیاء کے تمام معجزوں سے بڑھ کر ہے

پہلے بیان کیا جا چکا ہے

کہ ہر نبی کو معجزہ ایسا ملا جو اس زمانہ کے اہل کمال لوگوں کی گردنیں جھکا دے بنا بریں جناب رسالتمآبؐ کے زمانہ میں چونکہ فن شعر و شاعری اور خطابت میں فصاحت و بلاغت کا زبردست چرچا تھا اور اسی لئے عرب لوگ باقی تمام ممالک کے لوگوں کو گونگا سمجھتے تھے اور اسی بناء پر اپنا نام عرب یعنی اپنے مافی الضمیر کو ادا کر سکنے والے اور دوسروں کا نام عجم انہوں نے تجویز کر لیا تھا اور اس زمانہ میں جملہ ممالک سے مہذب ترین قوم بھی یہی تھی انہی کی سیاست و تجارت و صنعت کا دیگر ممالک میں عام شور تھا پس اس دور کے مہذب طبقہ کو ایسے انداز سے پیغام خدا پہنچانے کی ضرورت تھی جو ما فوق العادہ کلام کے ذریعے فصحاء و بلغاء تو بجائے خود فصاحت و بلاغت کو اپنے قدموں میں جھکا دے پس خدائے علام نے اسی لئے جناب رسالتمآبؐ کو قرآن بطور معجزہ عطا فرمایا تاکہ دستور بعثت کے ماتحت دور حاضر کے مفکرین کو مقصد توحید کے سمجھانے میں زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو سکے اور قرآن لے آتے ہی چیلنج پہ چیلنج شروع کر دیا کہ اگر یہ بشر کا کلام ہے تو بے شک سب کے سب مل کر اس کا اس کی ایک سورت کا اس کی دس آیتوں کا حتیٰ کہ ایک آیت کا مقابلہ کر کے اس جیسا کلام لے آؤ لیکن وہ سب کے سب مقابلہ میں گنگ رہے پس حضورؐ کا معجزہ تمام نبیوں کے معجزوں سے بڑا معجزہ ہے کیونکہ ان کے معجزات ایک محدود وقت تک محدود قوموں کے لئے تھے اور یہ معجزہ قیامت تک کے لئے ہے وہ معجزے آنی ہوتے تھے کہ ظاہر ہونے کے فوراً بعد ختم ہو گئے لیکن قرآن مجید وہ معجزہ ہے جو دائمی ہے اور ہر زمانہ میں یہ زندہ معجزہ ہے حتیٰ کہ علوم و فنون میں مہارت رکھنے والا ہر انسان اس معجزہ کو سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے

اور اسلام کی تصدیق میں جو مؤثر کردار قرآن نے ادا کیا ہے وہ اور کسی ظاہری طاقت سے نہ ہو سکا ہم نے تفسیر انوار النجف کے مقدمہ میں قرآنی اعجاز کے بارہ پہلو ذکر کئے ہیں۔ یعنی یہ بارہ طریقوں سے معجزہ ہے پس جس کو تفصیل کی ضرورت ہو ہماری تفسیر کا مطالعہ کرے

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق عقیدہ

ہمارا حضرت عیسیٰؑ کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ آپ رُوح اللہ تھے اور حضرت مریمؑ کے شکم اطہر سے بغیر باپ کے اللہ کے امر سے پیدا ہوئے جو لوگ ان کی ولادت پر یا ان کی معصومہ بتول ماں حضرت مریمؑ پر زبان طعن دراز کریں وہ ہمارے نزدیک کافر و نجس ہیں نیز آپ صاحب شریعت صاحب کتاب انجیل صاحب اعجاز اولوالعزم پیغمبر تھے یہودیوں میں سے جن لوگوں نے آپ کی بتول والدہ پر اتہام لگایا تھا خداوند کریم نے حضرت عیسیٰؑ کی دُعا سے ان کو خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیا تھا جیسا کہ ہم نے تفسیر انوار النجف جلد چہارم ص۲۹۰ میں مفصلاً لکھا ہے بروایت اکمال حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے بیت المقدس میں تینتیس برس تبلیغ فرمائی۔ ہم باقی انبیاء کی طرح ان کو معصوم مانتے ہیں بلکہ ان کی والدہ ماجدہ کو بھی ہم معصوم مانتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ان پر تاحال موت نہیں آئی بلکہ ان کو زندہ اٹھا لیا گیا۔

سب مسلمان اسی عقیدہ پر قائم رہے حتیٰ کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی بننے کی شوق دامنگیر ہوئی تو اس نے حضرت عیسیٰؑ کی موت کا اعلان کیا اور یہودیوں سے نچ مچ مراد حاصل کر کے ان کی موت کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ کشمیر میں ان کی ایک مفروضہ قبر بھی بنا دی۔ جس کو نہ کوئی تاریخ قبول کرتی ہے اور نہ از راہ حدیث اس کی کوئی حقیقت ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی موت پر اپنی مسیحیت کا محل تعمیر کرنے کے درپے تھا اور آخرکار کر دیا۔ بہر حال یہ لوگ اس کے پیچھے ہو لئے اور آج وہ پاکستان کے مسلم شہری ہیں ان کی تنظیم سب سے بڑھ کر ہے قرآن مجید کی لفظ توفّی جو سورہ آل عمران میں آیا ہے سے ہی وہ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں حالانکہ توفّی کا معنی ہے لے لینا بعض مقامات پر موت پر بھی اس کا اطلاق ہو جاتا ہے جس طرح موت پر ارتحال کا ہماری زبان میں اطلاق ہوتا ہے لیکن ارتحال موت سے عام ہے اور سورۂ نساء میں خدا خود اس معنی کی تردید فرماتا ہے کیونکہ یہودیوں نے آپ کے قتل و سولی کی خبریں عام کی ہوئی تھیں تو ارشاد ہے وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ

ف ۱۹۷۴ء میں حکومت پاکستان کی مرکزی اسمبلی نے فرقہ مرزائیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا اور یہ اسلام کی بہت بڑی فتح ہے

لَهُمْ نہ ان کو انہوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر لٹکایا بلکہ ایک شبہ میں ان کو مبتلا کیا گیا تھا اس کی تفصیل ہم نے تفسیر انوار النجف کی تیسری جلد صفحہ ۲۳۲ تا صفحہ ۲۳۶ کر دی ہے۔

اور ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ چرخ چہارم پر تا حال زندہ و سلامت موجود ہیں اور جب حضرت قائم آل محمد علیہ السلام تشریف لائیں گے تو وہ بھی اتر آئیں گے اور حضرت قائم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھیں گے اور یہ عقیدہ ختم نبوت کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کریں گے صفحہ ۲۰۰ پر سوال و جواب کے رنگ میں ملاحظہ ہو۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سید الانبیاء ہیں

تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ سے افضل و اشرف ہیں اور تمام نبیوں اور رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہیں سورۂ آل عمران آیت ۸۱ پارہ ۳ میں قرآن کا صاف و صریح ارشاد ہے کہ خداوند کریم نے تمام انبیاء سے عہد لیا تھا کہ میں جب تم کو کتاب و حکمت دوں اور پھر تمہارے پاس میرا رسول آئے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنا اور تمام نبیوں نے یہ عہد کیا تھا۔ حضرت رسالتمآبؐ سے منقول ہے فرمایا تمام اولاد آدمؑ کا میں سردار ہوں حدیث قدسی مشہور ہے لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ مقصد یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو اور کچھ نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں دلیلیں ان کی اشرفیت و افضلیت پر بہت سی ہیں۔

(۱) باقی انبیاء کا حلقۂ اثر مختصر ہوتا تھا عرض کے لحاظ سے کوئی ایک قبیلہ کا کوئی قوم اور کوئی ملک کا اور طول کے لحاظ سے ایک مدت معینہ تک کیونکہ بعد میں آنے والے نبی صاحب شریعت ان کے ناسخ ہوا کرتے تھے لیکن حضورؐ کا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہے عرض کے لحاظ سے تمام کائنات اور طول کے لحاظ سے تا قیام قیامت چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ عالمین کے لئے نذیر بنے۔

(۲) آپ کی شریعت تمام شرائع سابقہ سے جامع تر ہے لہذا کل شریعت کا مالک جزوی شرائع والوں سے اشرف ہے۔

(۳) آپ کی کتاب تمام کتب انبیاء کے علوم کا مجموعہ ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے اور علم میں کمال اعلم کے افضل ہونے کی دلیل ہے۔

(۴) آپ کو معراج کا شرف ملا جو کسی نبی کو نصیب نہ ہوا۔
(۵) آپ تمام انبیاء کے کمالات کے جامع تھے بلکہ آپ نے تو اپنے وصی کے متعلق فرمایا تھا کہ اگر گزشتہ انبیاء کے کمالات دیکھنے ہوں تو علیؑ کو دیکھیں جس کے وصی میں تمام انبیاء کے کمالات موجود ہوں تو اس کی ذات تو اس سے بڑھ کر ہوگی۔
(۶) آپ نے فرمایا تھا اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ میرے حسن وحسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں اور ان کا باپ ان سے افضل ہے پس جب حسنین باقی انبیاء سے افضل ہوں تو حضورؐ کی افضلیت میں شبہ ہی کوئی نہیں رہتا۔
(۷) آپ نے فرمایا تھا کہ شبِ معراج تمام انبیاء نے بیت المعمور پر میرے پیچھے نماز پڑھی تھی اور یہ بھی افضلیت کی دلیل ہے کیونکہ مقتدار کا مقتدی سے افضل ہونا ضروری ہے۔
(۸) جب حضرت عیسٰیؑ حضرت مہدیؑ کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو حضرت مہدیؑ حضرت عیسٰیؑ سے افضل ثابت ہوئے تو حضرت رسالتمآبؐ کے افضل ہونے میں کیا شک رہتا ہے؟

ختم نبوت کا عقیدہ

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفٰیؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم ہے لہٰذا ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ نہ کلی نہ جزوی نہ ظلی نہ بروزی پس آپ کے بعد جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے اور کافر ہے اور اس کو نبی ماننے والے دائرہ ایمان سے خارج ہیں۔ اس کا مفصل بیان یہ ہے کہ ہر قوم ہر ملت اور ہر تحریک ابتداء میں اس نرم وکمزور زمین سے اُگنے والی کونپل کی طرح ہوتی ہے جو کسی معمولی سے معمولی خارجی قوت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی اور اسے معمولی ہوا کا جھونکا جھکانے کے لئے کافی ہوتا ہے اسی طرح نشوونما انسانی کی یہی حالت ہے جس طرح وہ نرم کونپل نرم وسخت گرم وسرد ہواؤں کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے بعد آخرکار ایک کامل درخت بن جاتا ہے اور پھر بڑی سے بڑی آندھی بھی اس کو نہیں جھکا سکتی اسی طرح انسانیت ابتداءً کمزور تھی پس رفتہ رفتہ ترقی کرنے کے بعد اس منزل ارتقاء تک پہنچی ہے کہ آج کا انسان اگر دو ہزار سال پہلے کے انسان کو دیکھے تو اس کو اس کی انسانیت حیوانات سے بہت مشابہ نظر آئے گی اور اسے انتہائی عبرت ناک وحیرت ناک نگاہ سے دیکھے گا اسی طرح وہ بھی اس کو ایک اپنے سے بہت بہتر و برتر مخلوق تصور کرے گا کہاں وہ انسان جو گھاس پھونس کھا کر غاروں اور درختوں کی گھاٹیوں میں سر چھپاتا تھا اور کہاں یہ انسان

جو فضائے عالم کو مسخر کئے ہوئے دوشِ ہوا پر سوار ہے۔

تو جس طرح انسانی اذہان تدریجی ترقی سے اس منزل تک پہنچے ہیں اسی طرح خدائی جانب سے انبیاء ہر ماحول کے مطابق نصاب تعلیم لے کر تشریف لائے پس حضرت آدمؑ کا تبلیغی کورس اسی انداز سے ہوگا جو معیار اس زمانہ کے انسان کا ہونا چاہیئے اور پھر حضرت نوحؑ تک چونکہ معیار بدل گیا تو نصاب تبلیغ میں بھی اسی لحاظ سے فرق آگیا پس جوں جوں انسانیت منازل ارتقا میں قدم آگے بڑھاتی رہی اسی انداز سے خدائی نمائندے تبلیغی کورس لے کر آتے رہے توحید کا عقیدہ اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ میں فرق نہ آیا لیکن باقی جزوی احکام اور طرقِ عبادت میں کم و بیش تغیر ضروری ہوتا رہا ہے پس حضرت ابراہیمؑ اپنا نصاب لائے ان کے بعد حضرت موسیٰؑ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام امتوں کی استعداد کے مناسب احکام شرعی کے مبلغ بن کر آئے۔

جوں جوں انسان ذہنی عقلی فکری نظری اور استعدادی ترقی کے منازل عبور کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ان کے معیار کے مطابق احکام شرعیہ نیا نیا جامہ پہن کر آتے رہے تھے اگرچہ بنیادی نقطہ نظر ایک ہی رہا جسے اسلام کہتے ہیں جب انسانیت ترقی کی منازل طے کر چکی اور اپنے معراج کمال تک پہنچ گئی۔ پس خداوند کریم نے ایک جامع نصاب تبلیغ بھیج کر نبوت کا سلسلہ بند کر دیا کیونکہ نبوت کی ضرورت نئے نصاب لانے کے لئے تھی جب آخری نصاب کی جامع کتاب قرآن پہنچ گئی تو پھر نئے نبی کی ضرورت ہی کیا رہی؟ چنانچہ فرمایا اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ یعنی یہ قرآن انتہائی سیدھے اور زیادہ مضبوط راستہ کی ہدایت فرماتا ہے اندازہ کیجئے جس کو خود خدا انتہائی سیدھا افعل التفضیل کے صیغہ سے تعبیر فرمائے تو اس میں تغیر و تبدل کا امکان ہی کیا ہو سکتا ہے تو جب قرآن آخری کتاب ہو اور تکمیل نفوس انسانیہ کا آخری کورس ہو تو اس کے لانے والا نبی بھی کمالاتِ انسانیہ میں آخری حدِ امکان پر فائز ہو کر نوعِ انسانی کا آخری معلم و مدرس ہوگا جس کا طرزِ تعلیم اور طرقِ تبلیغ تاثیر کے لحاظ سے اس قدر ہمہ گیر ہوگا کہ نوعِ انسانی کی آخری صف تک تفاوتِ استعدادات و اختلافِ اذہان کے باوجود سب کے لئے قابلِ پذیرائی ہو ورنہ دامنِ انتخاب ذاتِ علیم و قدیر پر جہل یا عجز کا بدنما داغ لگ جائے گا جو شانِ علم و قدرت کے خلاف ہے پس اس نے نبی وہ بھیجا جس کے متعلق ارشاد فرمایا تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ

عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر فرقان کو نازل کیا تاکہ وہ سب جہانوں کے لئے نذیر ہو تو معلوم ہوا کہ ان کی نبوت عالم امکان کی آخری حد تک ہے کیونکہ قرآن کی تعلیمات سے بڑھ کر نہ انسانوں میں صلاحیتیں ہو سکتی ہیں اور نہ قرآن کے معیار سے اوپر صلاحیت کا امکان ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی تعلیم اقوم ہے اور اقوم کا معنی ہے درستی اور مضبوطی کی آخری حد پس حضرت رسالتمآب نوعِ انسانی کے ارتقائی آخری نصاب کے آخری مدرس ہیں اور ان کے بعد نہ کسی کی گنجائش ہے نہ امکان بس آپ خاتم الانبیاء ہیں مرزا غلام احمد قادیانی کو چونکہ نبی بننے کا شوق تھا لہٰذا اس نے جب دلائل کے لحاظ سے بھانپ لیا کہ یہاں نبوت کی کوئی گنجائش نہیں تو اس نے عوام کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے اس میں ایک تھوڑی سی ترمیم کر دی کہ مستقل نبی نہیں آ سکتا ظلی بروزی یا امتی نبی کے آنے میں کوئی حرج نہیں اور میں وہی ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب نئی شریعت کی گنجائش نہیں اور حضورؐ کی شریعت کی ہی توضیح و تشریح کا فریضہ ادا کرنا ہے تو آپ کے بعد آپ کے اوصیاء و خلفاء طاہرین علیہم السلام اور ان کے بعد امت کے تمام علماء پر یہ فریضہ عائد ہے تاہم ان میں سے کسی کو نبی کا لقب نہیں دیا جا سکتا اور جناب رسالتمآب کا لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کا فرمان کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا کسی ظلی بروزی اور امتی نبی کیلئے قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتا نیز جزوی نبی کا آنا تدریجی طرزِ تعلیم کے بھی منافی ہے کیونکہ ایک بڑے کالج سے اس کے انچارج کے چلے جانے کے بعد ایک ادنیٰ طالب علم اس کی جگہ پر نہیں کھڑا کیا جا سکتا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری کس حیثیت سے ہو گی اگر وہ بحیثیت نبی تشریف لائیں گے تو عقیدۂ ختم نبوت باطل ہوتا ہے اور اگر بحیثیت نبی نہیں بلکہ عام امتی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے تو عہدۂ نبوت کہاں جائے گا کیا ایک نبی سے عہدہ نبوت بلا قصور لیا جا سکتا ہے؟ اور اگر نہیں تو پھر امتی بن کر کیسے آئیں گے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بے شک تشریف لائیں گے اور بیت اللہ کی زمین ان کے لئے چشم براہ ہو گی، بیت اللہ کی چھت پر سے اتریں گے اور حضرت مہدی علیہ السلام کے پیچھے نماز بھی پڑھیں گے لیکن جس طرح حضرت موسیٰؑ کا خضرؑ کی شاگردی اختیار کر لینا۔ نہ ان

کی توہین تھا اور نہ منافی نبوت تھا۔ یہاں بھی ان کا حضرت قائم علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھنا نہ منافیٔ عزت ہے اور نہ باعث توہین ہے اور بطریق حل یوں سمجھئے کہ ایک چھوٹے مدرسہ کا مدرسِ اعلیٰ ایک بڑی یونیورسٹی میں اگر آجائے تو اس کی مدرس اعلیٰ کی حیثیت وہاں کوئی وقعت نہیں رکھتی بلکہ بڑی یونیورسٹی کے طالب علم بھی استعداد میں اس سے زیادہ ہوا کرتے ہیں پھر جائیکہ وہاں کے پروفیسر یا پرنسپل۔ بنابریں حضرت عیسیٰؑ ایک قوم کے مدرس دین تھے اور مبلغ اسلام اور حضرت مہدی علیہ السلام بسلسلۂ نیابت خاتم الانبیاء پوری عالمی یونیورسٹی کے چانسلر ہوں گے پس اس صورت میں حضرت عیسیٰؑ اگر ان کا امتی ہو تو ان کی ذات میں کونسا نقص یا کونسی توہین ہوگی۔ یہ اس طرح سے ہے جس طرح مڈل سکول کا مدرس اعلیٰ یونیورسٹی کے چانسلر کے مقابلہ میں طالب علم ہوتا ہے بلکہ ان کیلئے ان کے پیچھے نماز پڑھنا باعثِ فخر ہوگا اور یہ ان کی ترقی ہے نہ کہ تنزلی اور صاحبانِ عقل و دانش خود ہی اس میں بنظرِ انصاف غور کریں تو بات کے سمجھنے میں نہ کوئی گنجلک ہے نہ دشواری۔

نیز ان کا حضرت مہدیؑ کے پیچھے نماز پڑھنا بھی ایک بہت بڑی قوم کے لئے تبلیغ ہوگی کیونکہ وہ نصاریٰ جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی محبت میں دیوانے ہو کر حضرت رسالتمآبؐ کی تبلیغ کو قبول نہیں کیا تھا اب جو دیکھیں گے کہ ہمارا رسولؑ آخری نبیؐ کے آخری وصیؑ کے بھی پیچھے ہے تو ان کے لئے ہدایت کا راستہ واضح ہو جائے گا اور حضرت رسالتمآبؐ کی عظمت ان کے دلوں میں آجائے گی پس وہ دولت ایمان حاصل کرلیں گے اور یہ حضرت عیسیٰ کی ایک بہت بڑی تبلیغ ہوگی گویا حضرت مہدیؑ کے پیچھے ان کا نماز پڑھنا بھی ایک بہت بڑی قوم کو تبلیغ کرنے کے لئے ہوگی اور اسی بناء پر ارشاد ہے کہ کوئی اہل کتاب نہ رہے گا مگر یہ کہ آپ پر ایمان لائے گا۔

نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے پیچھے ان کا نماز پڑھنا اس قوم کے لئے بھی ہدایت ہوگا۔ جنہوں نے ان کو خدا یا خدا کا بیٹا سمجھ رکھا تھا پس انکی اقتدا سے وہ خود اپنی غلطی کو جان لیں گے کہ اگر خدا یا خدا کا بیٹا ہوتا تو کسی کی اقتدار کیوں کرتا۔ پس اس اقتدا میں ان کی تبلیغ کا راز مضمر ہے۔ پس آخری نبی کے امتی بن کر اپنی امت کے لئے نبوت کا فریضہ انجام دیں گے اور اپنی امت کو صحیح اسلام کا راستہ دکھائیں گے۔

نیز ایک طرح سے وہ مسلمانوں کو بھی درس دیں گے کہ جس نبی کے آخری جانشین کے

پیچھے میں نماز پڑھ رہا ہوں اس نبی کے پہلے جانشین کو پسِ پشت ڈالنا غلطی ہے حضرت کی جانشینی کا حق صرف اسی خاندان کو ہی حاصل ہے جو دولت عصمت اپنے دامن میں رکھتا ہو

انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں

شیخ صدوق قدس سرہٗ نے عقائد میں انبیاء کی افضلیت ملائکہ پر مذہب شیعہ کا اعتقاد بتایا ہے اور اسی پر ہمارا ایمان ہے صدوق نے متعدد دلیلیں ذکر کی ہیں۔ جن کا مضمون ہم اپنے انداز سے بیان کرتے ہیں۔

(۱) ملائکہ خواہشات وشہوات وآلائشاتِ جسمانیہ سے پاک وصاف ہیں اور وہ خلقی طور پر معصوم ہیں نسیم عرش پر ان کی زندگی کا دار ومدار ہے اور تسبیح پروردگار ان کی غذا ہے۔ وہ روحانی مخلوق ہے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ دکھ نہ بیماری نہ جوانی نہ بڑھاپا۔ پس اللہ کی اطاعت ان کا شیوہ ہے اور مخلوقاتِ خداوندی کی وہ حفاظت کرتے ہیں گویا ان کا گروہ ایک ایک صنفِ مخلوق کے لئے محافظ مقرر ہے یعنی ان میں پروردگار کی نافرمانی کا مادہ ہی نہیں بلکہ يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ کے مصداق ہیں جو حکم ہوتا ہے بجالاتے ہیں۔ بخلاف اس کے انبیاء طاہرین علیہم السلام میں تمام جذبات خواہشاتی نفسیاتی شہواتی موجود ہیں اور روحانیت کا ملکہ بھی ہے پس یہ اپنے اختیار وارادہ سے مادی پہلو کو ترک کر کے روحانی پہلو کی طرف آتے ہیں اور جذبات کی قربانی کر کے معراج کمال کی طرف اقدام کرتے ہیں لہٰذا ان کی عبادت علم شرف اور کمال کی قدر ومنزلت ملائکہ سے افضل واتم واہم ہے بنا بریں وہ ملائکہ سے افضل ہیں۔

(۲) جس وقت خداوند علام نے ملائکہ کو حضرت آدمؑ کی خلافتِ ارضیہ کی اطلاع دی تو ملائکہ نے بارگاہ ربوبیت میں اپنی تسبیح وتقدیس کے سہارے پر گذارش کی تھی کہ ایسے شخص کو کیوں خلیفہ بناتا ہے جس سے زمین میں فساد وخونریزی ہوگی گویا دبی زبان میں اپنی خواہش کا اظہار تھا پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کا مرتبہ ان کے ہاں ایک بلند ومرتفع درجہ تھا ورنہ پست درجہ کی خواہش کون کرتا ہے؟ اسی وجہ سے تو تقدیس وتسبیح گذاری کی سند کو اپنی درخواست میں ساتھ ضم کر دیا تھا۔ لیکن بالآخر ٹھکرا دی گئی اور انہیں اس مقام کے لئے نامزدں قرار دیا گیا اور علم کو خلافت کا دار ومدار سمجھا گیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تسبیح وتقدیس سے علم کا درجہ بلند تر ہے اور اسی بناء پر وارد ہے کہ عالم کا ایک گھنٹہ

کا علم میں تفکر ستر سال کی عبادت سے افضل ہے یا عالم کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھنا شہید کے جنازہ میں شرکت سے افضل ہے یہ واقعہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ خالی تقدس و تسبیح جو علم و معرفت سے الگ ہو اس سے خالی علم جو تقدس و تسبیح سے الگ ہو افضل ہے

(۳) حضرت آدمؑ کی پیدائش کے بعد تمام ملائکہ کو اس کے سامنے سربسجود ہونے کا حکم دیا یہ بھی حضرت آدمؑ کی فرشتوں پر افضلیت کی دلیل ہے کیونکہ مفضول کے سامنے افضل کو جھکانا شان توحید کے شایان نہیں اور فرشتوں نے سربسجود ہو کر ان کی فضیلت کا اقرار کر لیا۔ نیز فرشتوں کا یہ سجدہ اللہ کے لئے تھا اور آدمؑ کا اکرام و اعظام ملحوظ تھا کیونکہ ان کی صلب میں محمدؐ و آل محمدؐ کے انوار تھے۔

(۴) جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا تھا میں جبرئیل میکائیل اسرافیل اور جمیع ملائکہ سے افضل ہوں اور میں تمام مخلوق سے افضل ہوں اور آدمؑ کی جملہ اولاد کا سردار ہوں اگرچہ اس روایت میں حضورؐ نے اپنی ہی فضیلت بیان فرمائی لیکن معیار کے لحاظ سے تمام انبیاء کی ملائکہ سے افضلیت ثابت ہو گئی

(۵) ملائکہ اور حضرت آدمؑ کے مقابلہ میں جب ملائکہ جواب نہ دے سکے اور علمی میدان میں اپنی ہار تسلیم کر چکے تو خدا نے آدمؑ کو فرمایا اَنْبِئْهُمْ اور نبوت اسی مادہ سے ہی ہے یعنی تو ان کا نبی بن اور ان کو خبر دے پس حضرت آدمؑ نے ان کا نبی بن کر ان کو وہ مطالب سمجھائے جن سے وہ بے خبر تھے پس انہوں نے اپنی درخواست واپس لے لی اور حضرت آدمؑ کے سامنے جھک گئے۔

(۶) ملائکہ میں ترقی و کمال کا ملکہ نہیں بلکہ وہ جو کچھ ہیں انہوں نے اسی قدر ہی رہنا ہے نہ مقام عبادت میں اور نہ مقام معرفت میں وہ آگے بڑھ سکتے ہیں بخلاف اس کے انبیاء چونکہ ملکہ ترقی و کمال رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ ان سے افضل ہیں۔

ان ادلہ مذکورہ میں سے صدوقؒ نے بعض کو صراحتاً ذکر فرمایا ہے اور بعض کی طرف صرف اشارہ سے کام لیا ہے جن کی ہم نے وضاحت کر دی ہے اور ملائکہ پر انبیاء کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے اسی قدر ہی کافی ہے۔

(۷) علاوہ ازیں جب ملائکہ تمام مخلوقات کی حفاظت کے لئے الگ الگ گروہ کی صورت میں متعین ہیں اور انسان تمام باقی مخلوقات میں سے مقصود اعلیٰ و اشرف کی حیثیت رکھتے

ہیں اور نبی انہی میں سے ایک معصوم گروہ کا نام ہے تو ان کی افضلیت میں کیا شک رہ جاتا ہے

⑧ نیز ملائکہ کی عصمت تکوینی و اضطراری ہے اور انبیاء کی عصمت تشریعی و اختیاری ہے۔ وَبَيْنَهُمَا بَوْنٌ بَعِيْدٌ

⑨ ملائکہ نظام تکوینی کے محافظ ہیں اور انبیاء نظام تشریعی کے محافظ و مبلغ ہیں اور سابق میں بیان ہو چکا ہے کہ نظام تشریعی نظام تکوینی سے افضل و اشرف ہے۔ معتزلہ فرقہ کے نزدیک چونکہ فرشتے انبیاء سے افضل ہیں لہٰذا وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شیطان نے حضرت آدمؑ کے دل میں وسوسہ ڈالتے ہوئے جب درخت ممنوع کے پھل کھانے پر آمادہ کیا تو کہا تھا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ یعنی یہ کہ اس درخت کا پھل کھانے سے تم ملک بن جاؤ گے یا ہمیشہ کی زندگی پاؤ گے تو اگر ملائکہ انبیاء سے افضل نہ ہوتے تو ابلیس یہ وسوسہ کیوں ڈالتا اور حضرت آدم اس کو کیوں قبول کرتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے حضرت آدم اپنے پروردگار کا خطاب بھی سن چکے تھے لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ اس درخت کے قریب نہ جاؤ ورنہ خسارہ پاؤ گے اور معمولی سے معمولی دماغ کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ خسارہ کا معنی ترقی مدارج اور بلندیٔ مراتب نہیں ہوتا بلکہ تنزل ہوا کرتا ہے گویا ابلیس نے تنزلی اور خسارہ کے دو پہلو حضرت آدم کو بتائے تھے کہ بصورت تناول شجرہ تمہیں یا تو ملک بنا دیا جائے گا یا اسی جگہ کی رہائش تمہارے لئے دائمی قرار دی جائے گی اور جس عہدۂ خلافت کی تمہیں پیش کش کی گئی ہے اس سے برطرفی کی صرف یہی دو صورتیں ہی ہیں۔ لہٰذا ابلیس کا وسوسہ بھی انبیاء کی ملائکہ پر افضلیت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے اور ہم نے تفسیر کی جلد ۲ میں اس کی وضاحت کی ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

حصہ دوم

چھٹا باب

ماجاءَ بہٖ مُحمّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

سیّد الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ کی نبوّت کاملہ

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جناب رسالتمآب کی نبوت و رسالت بلکہ ان کی جملہ انبیاء و مرسلین پر سیادت و افضلیت بلکہ تمام کائنات خداوندی پر شرف و فضیلت کے اقرار کے بعد اس بات کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ انہوں نے خداوند علام کی جانب سے جو کچھ ہم تک پہنچایا وہ حق ہے ان کے کسی حکم پر اعتراض ان کی نبوت کے انکار کرنے کے مترادف ہے جس چیز کو آپ نے حلال کیا وہ قیامت تک حلال رہے گی اور جس کو انہوں نے حرام کیا وہ تاقیامت حرام رہے گی ان کی شریعت گذشتہ انبیاء کی شریعتوں کی ناسخ ہے لیکن اسلام چونکہ ایک مکمل دستورِ انسانیت ہے لہٰذا اس کو کبھی نسخ لاحق نہ ہوگی اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اگر کوئی دعویٰ کرے گا تو وہ جھوٹا ہوگا۔ انہوں نے جس حکم کی جو حد بیان فرمائی وہی درست ہے جس کو واجب کیا وہ واجب جس کو مستحب و سنت فرمایا وہ مستحب و سنت جس کو حرام مکروہ یا مباح کہا وہ حرام مکروہ یا مباح ہی رہے گا کسی زمانہ میں ان کے فرمان کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا لہٰذا یہ کہنا کہ زمانہ کے تقاضوں سے اسلامی احکام میں تغیر آسکتا ہے محض دین دشمن عناصر اور مغربی فریب خوردہ اذہان کی مذہب سے آزادی کا ہی شاخسانہ ہے حضور ایک مکمل اور ناقابلِ ترمیم و تنسیخ شریعت کے مالک ہیں جس کی بقاء انسانیت کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔

ہم چونکہ تمام انبیاء کی عصمت کے قائل ہیں اور حضورؐ تمام انبیاء کے سید و سردار ہیں تو ان کی عصمت بدرجۂ اولیٰ ان سے اتم و اکمل تھی۔ لہٰذا قرآن مجید کی جن آیات سے ان کے خلاف وہم پڑتا ہے وہ سب قابل تاویل ہیں چنانچہ سورہ فتح میں جہاں آپ کی طرف ذنب کی

نسبت ہے وہاں یا تو ذنب سے مراد اُمّت کے گناہ ہیں اور یا یہ مراد ہے کہ ہم نے تجھے فتح مبین عطا فرمائی تاکہ آپ کی سابق ولاحق تمام کمزوریاں ختم ہوں اور اقتدارِ ظاہری آپ کے قدموں میں ہو۔ شیعہ وسُنّی علماء نے آیتِ مجیدہ کی تاویل اپنے اپنے اندازِ فکر سے کی ہے لیکن سب سے بہتر یہ ہے کہ کہا جائے مشرکین مکّہ کی نگاہوں میں جو چیزیں آپ کی گناہ کی حیثیت رکھتی تھیں اب فتح کے بعد وہ منظر یئے ختم ہو جائیں گے اور ان کی نگاہوں میں آپ کی سابقہ ولاحقہ غلطیاں نیکیوں کا رنگ اختیار کر لیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور وہی لوگ جو آپکے جانی ومالی دشمن تھے آپ کے ممنونِ احسان ہوئے اور ان کی نظروں میں جو پہلے حضورؐ سے وارد ہونے والے عقائد وافعال گناہ تھے وہ اب حسنات سے بدل گئے اس کی تفصیل تفسیرِ انوار النجف کی جلد ۱۳ میں ملاحظہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ حضورؐ کی ذاتِ جامعہ جمیع کمالاتِ انسانیہ تھی۔ صغیرہ یا کبیرہ گناہ ان سے کبھی صادر نہیں ہُوا نہ قبل از بعثت نہ بعد از بعثت نیز شقِ صدر ہمارا عقیدہ نہیں ہے بلکہ جو لوگ انبیاء کی عظمت کے قائل نہیں اور ان کو اپنے جیسا انسان سمجھتے ہیں وہ اسی قسم کی بے تکی باتیں کرتے ہیں ہم چھوٹے سے چھوٹے نبی کے متعلق بھی شقِ صدر کے قائل نہیں۔ چہ جائیکہ خاتم الانبیاء سید المرسلینؐ کے متعلق ہم اس قسم کے بے ہودہ خیالات ذہن میں لائیں اور جو کچھ ضروری طور پر حضورؐ کے دین میں سے ثابت ہو ہم اس کے منکر کو کافر سمجھتے ہیں۔

یہ ہے اجمالی عقیدہ۔ پس جملہ عباداتِ نماز، روزہ وغیرہ اور جملہ معاملات بیع و رہن وغیرہ اور جملہ عقود نکاح وطلاق وغیرہ اور جملہ تعزیرات جو حضورؐ نے ہم تک پہنچا دیں ان میں سے کسی کا انکار اسلام سے خارج کر دیتا ہے پس اسلام کے جملہ احکام خواہ ان کا تعلق اصلاحِ نفس سے ہو یا اصلاحِ معاشرہ سے ہو ان کا تسلیم کرنا واجب ولازم ہے ان میں سے کسی کا انکار یا رد موجب کفر ہے اور تسلیم کے بعد مقامِ عمل میں خلاف ورزی موجب فسق ہے۔ جس سے توبہ کرنا واجب ہوتا ہے۔

آپ کی جسمانی خصوصیات

(۱) جس طرح آپ سامنے دیکھتے تھے اسی طرح پیچھے کی چیز کو دیکھ سکتے تھے۔

(۲) آپ کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن دل بیدار رہتا تھا۔

(۳) آپ کا سایہ زمین پہ نہیں پڑتا تھا۔

(۴) مکھی آپ کے جسم پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

(۵) زمین آپ کے فضلات کو نگل جاتی تھی۔

(۶) ہر کسے سے بڑا قد آور جب آپکے سامنے کھڑا ہوتا تو آپ کا قد اس سے زیادہ نظر آتا تھا۔

(۷) آپ کے شانوں کے درمیان مہر نبوت کا واضح نشان موجود تھا

(۸) جس مقام سے آپ کا گذر ہوتا تھا خوشبو کی مہک باقی رہتی تھی جس سے لوگوں کو آپ کے گزر جانے کا علم ہوتا تھا۔

(۹) شب تاریک میں آپ کے چہرہ کا نور روشنی کا موجب ہوا کرتا تھا۔

(۱۰) آپ ختنہ شدہ متولد ہوئے تھے

(۱۱) دھوپ میں آپ کے جسم پر بادل سایہ فگن رہتا تھا۔

(۱۲) آپ کے ہشاش بشاش چہرہ میں اور آپ کے اخلاق میں اس قدر کشش تھی کہ جو بھی ایک دفعہ پاس آکر بیٹھ جاتا پھر اس کا دل اٹھنے کو نہ چاہتا تھا وغیرہ اور تفسیر انوار النجف جلد ۱ صفحہ ۸ پر ہم نے کتاب مَنْ لَا یحضرہ الفقیہ سے ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے مروی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سوائے مہر نبوت کے باقی خصوصیات میں آئمہ طاہرین حضور کے شریک تھے اور عقل سلیم کے لئے اس میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ سب ایک ہی نور کے حصے ہیں۔

حضورؐ کی بعثت

حضورؐ چالیس برس کی عمر رکھتے تھے جب بعثت ہوئی۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اب سے نبی بنائے گئے۔ بلکہ شیخ صدوق رح نے عقائد میں ذکر فرمایا ہے۔

اِنَّ اللہَ بَعَثَ نَبِیَّہٗ مُحَمَّدًا لِلْاَنْبِیَاءِ فِی الذَّرِّ وَاِنَّ اللہَ عَزَّ وَجَلَّ اَعْطٰی کُلَّ نَبِیٍّ عَلٰی قَدْرِ مَعْرِفَتِہٖ وَمَعْرِفَۃِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَسَبْقِہٖ اِلَی الْاِقْرَارِ بِہٖ وَنَعْتَقِدُ اَنَّ اللہَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی خَلَقَ جَمِیْعَ الْخَلْقِ لَہٗ وَلِاَھْلِ بَیْتِہٖ وَاِنَّہٗ

تحقیق اللہ نے عالم ذر میں حضورؐ کو نبیوں کے لئے مبعوث فرمایا اور تحقیق اللہ نے جو کچھ بھی کسی نبی کو عطا فرمایا وہ اللہ کی معرفت اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت اور اس اقرار میں سبقت کی بناء پر ہی تھا اور ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے تمام مخلوق کو ان

لَوْلَاهُمْ لَمَا خَلَقَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَلَا الْجَنَّةَ وَلَا النَّارَ وَلَا آدَمَ وَلَا حَوَّا وَلَا الْمَلَائِكَةَ وَلَا شَيْئًا مِمَّا خَلَقَ۔

کے لئے اور ان کی اہلبیتؑ کے لئے خلق فرمایا اگر یہ نہ ہوتے تو خداوند کریم نہ آسمان و زمین کو پیدا کرتا نہ جنت و نار کو نہ آدم و حوا کو اور نہ کسی فرشتہ کو بلکہ مخلوقات میں سے کسی شیٔ کو بھی پیدا نہ کرتا۔

اسی بناء پر ایک حدیث حضورؐ کی جانب منسوب ہے کُنْتُ نَبِیًّا وَّ آدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ میں اس وقت نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ بہرکیف چالیس برس کے بعد نبی علیہ السلام مبعوث ہوئے ورنہ نبی پہلے سے تھے جب عالم ظاہر میں تشریف لائے تو نبی تھے جب عالم ازل میں تھے تو نبی تھے خلاصہ یہ کہ آپ جب سے تھے نبی تھے۔

ہمارے عقیدہ میں نبوت کا عہدہ وہبی ہے یعنی عطیہ پروردگار ہے ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے عطا کرے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی گہوارہ میں جھول رہے تھے حضرت مریمؑ بتول پاس بیٹھی جھولا جھلا رہی تھیں یہودیوں نے اعتراضات کی بوچھاڑ کردی اور سخت و درشت الفاظ سے اپنی زبانوں کو ناپاک کرنا شروع کیا۔ یَا اُخْتَ هَارُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا اے ہارون کی بہن تیرا باپ برا نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہ تھی تو نے یہ کیا ظلم کیا ہے کہ بغیر شوہر کے صاحب اولاد ہو گئی تو ان کی بدکلامی سے متاثر ہو کر آخر جھولے میں سونے والے بچے کی طرف اشارہ فرمایا کہ اس سے خود دریافت کرلو فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ کیونکہ حضرت مریمؑ کو پہلے سے بشارت دی گئی تھی کہ ہم جو تجھے بچہ دیں گے وہ رسول ہو گا اور صاحب اعجاز ہو گا۔ جیسے کہ روح القدس کے الفاظ قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ اسی بناء پر اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا اور ان کو معلوم تھا کہ جو حجت خدا ہوتا ہے وہ بچپنے میں بھی حجت کے فرائض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ نااہل کہنے لگے جو حجت خدا کی معرفت سے کورے تھے كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ہم اس سے کیسے بات کریں جو گہوارے میں ہے اور بچہ ہے۔ پس یہ سن کر حضرت عیسیٰ بول اٹھے جو ابھی تین دن کے تھے اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب بھی دی

ہے اور نبی بھی بنا کر بھیجا ہے۔

جو بات خارق عادت ہو مادہ و طبیعت کے قیدی اپنی نارسا عقول اور فریب خوردہ اذہان سے حقیقت کی تہہ تک نہ پہنچنے کے باعث دھوکا کھا جاتے ہیں اور جس سے ایسی بات ظاہر ہو اُسے ہی اس کا سببِ تام اور علتِ وجود ماننے پر تل جاتے ہیں چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا یا خدا کا بیٹا کہنے والوں کی جماعت پیدا ہو گئی اسی خدشہ کو خود اللہ کا رسول محسوس کر رہا تھا اگرچہ وہ ابھی تین دن کا بچہ تھا کہ مبادا خارق عادت فعل سے دھوکہ کھائیں پہلے سے ہی وضاحت کر دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس کے بعد کہا مجھے خدا نے کتاب دی ہے اور نبی بنا کر بھیجا ہے خداوند کریم نے بھی حضرت عیسیٰؑ کی عبدیت کا اعلان فرمایا لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ یعنی نہیں سرتابی کرتے حضرت عیسیٰؑ اس بات سے کہ وہ اللہ کے عبد ہوں اس واقعہ سے میں نے صرف یہ بات پیش کرنی ہے کہ حضرت مریمؑ کو ولادتِ عیسیٰؑ سے قبل حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و رسالت و اعجاز نمائی کی خبر دی گئی تو حضرت مریمؑ کو بچہ کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہی یقین تھا۔ چنانچہ قوم یہود کے اعتراضات کے بعد بچہ کی طرف اشارہ کر دیا اور حضرت عیسیٰؑ نے پھر اپنے عمل سے مہر تصدیق ثبت کر دی کہ پہلے اپنی عبدیت کا اعتراف کیا تاکہ مجھے قبل از وقت بولنے پر خدا نہ مان لیں اور پھر اپنا صاحب کتاب ہونے کا دعویٰ کیا اور نبوت کا اعلان فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب فرشتہ کی تدریجی آمد سے عطا نہیں ہوتی بلکہ نبی کو یکمشت اس کا علم دیا جاتا ہے پھر حسبِ مصلحت موقعہ موقعہ پر اس کی تفصیل بصورت آیات اعجازی شکل میں یا عام لباس میں پیش کی جاتی ہے اسی بنا پر حضرت عیسیٰ صاحب کتاب کا دعویٰ کر رہے تھے اور نبوت کا بھی اعلان اسی قسم کا تھا کہ مجھے نبی بنایا نہیں جائے گا بلکہ نبی بنا کر مجھے بھیجا گیا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ نبی اگر نہیں بنتے بلکہ بنا کر آتے ہیں پہلا نبی حضرت آدمؑ وہاں سے بن کر آیا اور فرشتوں کا بھی معلم بن کر آیا ایسا نہیں کہ یہاں آکر بنا ہو پس گذشتہ نبیوں میں پہلے نبی آدمؑ اور آخری نبی عیسیٰؑ جب بن کر آئے اور اس کا قرآن شاہد ہے تو درمیان والے سارے نبیوں کا یہی حال ہے پس جب دستورِ نبوت ہی یہی ہے تو جناب رسالتمآبؐ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ یہاں آکر چالیس سال گذرنے کے بعد نبی بنائے گئے دستورِ نبوت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے ہاں استعداد کے لحاظ سے وہ نبی بن کر آئے البتہ تبلیغ نبوت پر چالیس برس کے

بعد مامور ہوئے۔

پس یہاں بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح یہ بھی کتاب لے کر اور نبی و رسول بن کر تشریف لائے ہیں البتہ تفصیلاتِ کتاب حسبِ موقعہ و مصلحت آیات کی شکل میں وقتاً فوقتاً اترتی رہیں اور وہ وہی کتاب ہے جس کے متعلق ارشاد قدرت ہے۔

ہم نے اس کو تیرے دل پر نازل کیا ہے یا یوں سمجھئے کہ نبی کا سینہ جو علوم نبویہ کا خزینہ ہے وہ علوم و معارفِ الٰہیہ کی مقدس کتاب ہے پھر ظاہری طور پر اعلان نبوت کے بعد اس کتاب کے علوم تین طریقوں سے معرضِ اظہار میں آئے۔ کچھ حصّہ معجزہ کی شکل میں خداوند کریم کی جانب سے بذریعہ جبرئیلؑ آیات قرآنی کا لباس پہن کر سامنے آیا اور کچھ حصّہ خدا کے مکالمہ خصوصی کے ذریعے یا جبرئیلؑ کی وساطت سے حدیث قدسی کا لبادہ اوڑھ کر ظاہر ہوا اور تیسرا حصّہ معالم وغیرہ اور شعائر اسلامیہ نیز اخلاق معاشرہ و تمدن پر مشتمل حقوق اللہ و حقوق الناس کی تفصیل لے کر زبانِ وحی ترجمان سے حدیث نبوی کی شکل میں ہم تک پہنچا اور ان سب کے متعلق خدا کی جانب سے سند یہ ہے۔ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا الخ

آپؐ کی خلقتِ نوری

اس کتاب میں اس قدر تفاصیل میں جانا میرے عہدہ سے خارج ہے لیکن وہ لوگ جو رسولؐ اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کو اپنے نفسوں پر قیاس کرتے ہیں ان کے افادہ کے لئے اور مخلص لوگوں کی زیادتی ایمان کے لئے ایک روایت درج کرتا ہوں حالانکہ اس سلسلہ میں اگر روایات کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بھی شاید کافی نہ ہو سکے بروایت امالی شیخ کتاب مصباح الانوار سے منقول ہے حضورؐ نے اپنے چچا عباس سے خطاب فرمایا (جب اس نے کہا تھا کہ میں علیؑ حسنؑ حسینؑ و فاطمہؑ اور آپ سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں) آپ ہنس پڑے اور فرمایا یہ درست ہے کہ ظاہری خلقت میں ہم ایک درخت سے ہیں لیکن اے عم! خدا نے مجھے اور علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کو خلقتِ آدمؑ سے قبل خلق فرمایا جبکہ نہ گنبد آسمان کی بنا تھی نہ فرش تھا نہ ظلمت و نور کا وجود تھا اور نہ جنت و نار کی تخلیق تھی۔ نہ سورج کی ضیا پاشی تھی اور نہ چاند کی چاندنی تھی عباس نے تفصیل دریافت کی تو آپ نے فرمایا جب اللہ نے ہماری تخلیق کا ارادہ کیا تو نور کو پیدا کیا اور پھر روح کو خلق فرمایا اور ان دونوں کو آپس میں ملا دیا پس مجھے اور علیؑ کو اور فاطمہؑ و

حسنؑ و حسینؑ کو اس سے پیدا کیا۔ اس وقت ہم ہی تسبیح گذار تھے جبکہ تسبیح نہ تھی (یعنی تسبیح کرنے والا کوئی نہ تھا) ہم ہی تقدیس کرنے والے تھے۔ جبکہ تقدیس نہ تھی پھر جب باقی مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو میرے نور سے عرش کو پیدا کیا پس عرش کا نور میرے نور سے ہے۔ اور میرا نور عرش سے افضل ہے پھر علیؑ کے نور سے ملائکہ کو پیدا کیا پس ملائکہ کا نور علیؑ کے نور سے ہے اور علیؑ کا نور اللہ کے نور سے ہے لہٰذا ملائکہ کے نور سے علیؑ کا نور افضل ہے پھر زمین و آسمان کو فاطمہؑ کے نور سے پیدا کیا لہٰذا زمین و آسمان فاطمہؑ کے نور سے ہیں پس فاطمہؑ کا نور زمین و آسمان کے نور سے افضل ہے پھر حسنؑ کے نور سے شمس و قمر پیدا ہوئے تو شمس و قمر کا نور حسنؑ کے نور سے ہے اور حسنؑ کا نور اللہ کے نور سے ہے اور حسنؑ شمس و قمر سے افضل ہے پھر حسینؑ کے نور سے جنت و حور العین کو پیدا کیا تو جنت و حور العین کا نور حسینؑ کے نور سے ہے اور حسینؑ کا نور اللہ کے نور سے ہے پس حسینؑ جنت و حور العین سے افضل ہے پھر ظلمات کو حکم دیا کہ چھا جائیں چنانچہ آسمانوں پر تاریکی چھا گئی اور ملائکہ تسبیح و تقدیس کے ذریعے بارگاہ رب العزت میں بصد عجز و نیاز عرض گذار ہوئے۔ اے ہمارے اللہ و سید جب سے تو نے ہمیں خلق فرمایا اور ان پاک انوار کی معرفت عطا فرمائی آج تک ہم نے ایسی مصیبت نہیں دیکھی پس ان انوار کے صدقہ سے ہماری اس ظلمت کو دور فرما چنانچہ خدا نے نور فاطمہؑ سے ایک قندیل نور کو زیر عرش آویزاں کیا جس سے آسمان و زمین منور ہو گئے اور اسی لئے اس کو زہرا کہا جاتا ہے ملائکہ نے عرض کی اے پروردگار یہ نور زاہر کس کا ہے جس سے زمین و آسمان منور ہو گئے ہیں تو جواب ملا کہ یہ نور میں نے اپنے جلال سے خلق فرمایا ہے۔ میری کنیز میرے حبیب کی دختر میرے ولی کی زوجہ اور میرے برگزیدہ آئمہ کی ماں ہے یہ اس کا نور ہے تمہیں گواہ کر کے کہتا ہوں۔ اے ملائکہ تمہاری تمام تسبیح و تقدیس کا ثواب اس پاک بی بی اور قیامت تک اس کے شیعہ و محب لوگوں کے لئے ہوگا پس جب آپ یہاں تک پہنچے تو عباس اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت علیؑ کی پیشانی کا بوسہ لے کر عرض کرنے لگے۔ یا علیؑ خدا کی قسم خدا اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کے لئے تو ہی حجت بالغہ ہے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سیر ملکوت میں کچھ انوار دیکھے اور پوچھا تو ارشاد ہوا یہ علیؑ کے شیعوں کے نور ہیں ہم نے یہ روایت تفسیر انوار النجف جلد ۵ صفحہ ۲۳۲ پر مفصلاً ذکر کی ہے۔ بہرکیف ان [illegible] نوری کے متعلق روایات حد تواتر کو پہنچی ہوئی

ہیں۔ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُورِی نیز اَنَا وَعَلِیٌّ مِّنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ اور اس قسم کی دیگر حدیثیں کتب فریقین میں موجود ہیں۔

احادیث نور کی وضاحت

احادیث نور میں بعض جگہ کافی اشتباہ ہوتا ہے۔ لہٰذا حتی الامکان ان کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔

① یہ جاننا ضروری ہے کہ نور ایک بسیط شیٔ ہے جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی بنابریں جہاں جہاں اس کی تقسیم کے متعلق الفاظ آجائیں کہ مثلاً خدا نے اس نور کو اتنے حصوں پر تقسیم کیا تو ایسے مقامات پر تقسیم حقیقی سمجھنا ناجائز ہے بلکہ نور سے مراد اس کی خاص نوع ہوگی جس کے وہ افراد ہوں گے۔

② نور ایک عرض ہے اور محمدؐ و آل محمدؐ اعراض نہیں بلکہ جواہر و حقائق ہیں بلکہ تمام جواہر سے افضل و اشرف ہیں تو نور کا کوئی خاص معنی لینا ہوگا اور احادیث جو اوّل مخلوق کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان کے الفاظ میں اختلاف ہے بعض میں ہے اوّل مخلوق عقل ہے اور بعض میں ہے کہ اوّل مخلوق پانی ہے اور بعض میں اوّل مخلوق نور محمدؐ و آل محمدؐ کو بتایا گیا ہے تو چونکہ کلام کی منافرت کو رفع کرنے کے لئے توجیہہ کی ضرورت ہے جس سے معنی کھل جائے اور سب احادیث کا مقصد واضح ہو جائے۔ بنابریں نور سے مراد ایک حقیقت ہے جس کی کنہ کو ذاتِ خالق کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا اور وہ وہ حقیقت ہے جو تنویر عالم موجودات کا سرچشمہ اور تمام کمالاتِ انسانیہ کا منبع و ماخذ ہے اور اسی کو ہی عالمین کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے یعنی وہ عالمین کی اس قدر منور ہے کہ گویا سراپا نور مجسّم ہے جس طرح عادل کو مبالغہ آمیز لہجہ میں عین عدل اور عالم کو عین علم کہا جایا کرتا ہے بنابریں اس کو عقل کہنا بھی درست ہے کیونکہ وہ عالمین کے لئے عقل کل کی حیثیت رکھتے ہیں اور پانی کہنا بھی مجاز کے رنگ میں درست ہے کہ خدا فرماتا ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ کہ ہم نے پانی ہی سے ہر شیٔ کو حیات بخشی اور بادیٔ کل ہر ذی روح کی روحانی حیات کا باعث ہی ہوتا ہے

③ بعض احادیث میں اس کی تعبیر تمثیل کے رنگ میں ہے کہ ہمارا نور اللہ کے نور سے اس طرح ہے جس طرح شعاع سورج سے پھوٹتی ہے ہم صوفیاء کے فرقہ سے متفق نہیں ہیں جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور یہ حدیث اسی وحدۃ الوجود کے نظریہ کو ہی ثابت کرتی ہے

کیونکہ شعاع کا سورج کے جسم کے علاوہ اور کوئی وجود نہیں ہے وجود صرف ایک سورج کا ہی ہے اگر یہ کہا جائے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ شمس توحید کی شعاعیں ہیں تو وحدۃ الوجود کا نظریہ قائم ہو جائے گا اور وہ قطعاً غلط ہے پس یہاں بھی یہی کہنا ہوگا کہ خدا نے ایک نور کی نوع پیدا کی ہے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ اس نوع کے اشرف افراد ہیں اور تمثیل مذکور صرف افہام و تفہیم کے لئے مجازی مثال ہے نہ کہ ترجمانِ حقیقت جیسا کہ بعض نااہل سمجھ بیٹھتے ہیں۔

④ عرش کرسی آسمان زمین شمس و قمر ملائکہ و جنت و حور وغیرہ کا ان انوار سے پیدا ہونے کا مقصد یا تو یہ ہے کہ یہ بھی اسی نوع کے افراد ہیں لیکن کمزور افراد جو ان اشرف افراد سے فیضان حاصل کرتے ہیں پس ان کی تخلیق کا مادہ مجاز کے رنگ میں ان کو ظاہر کیا گیا یا یہ کہا جائے کہ ان کی وجہ سے پیدا ہوئے جس طرح کہ باقی ساری کائنات ان کی بدولت خلق ہوئی۔ لیکن عرش کے ساتھ حضورؐ کو ملائکہ سے حضرت علیؑ کو آسمان و زمین سے خاتون معظمہؑ کو شمس و قمر سے حسنؑ کو اور جنت و حور سے حسینؑ کو خصوصی تعلق ہے گویا پورے نظام کائنات کا خلاصہ یہ ہیں کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کا مصداق خالق کائنات حضرت حق سبحانہٗ ہے جس کی عرش پر جلوہ گری اور حکومت ہے اور وہ عرش مظہر جلال و جمال محمدی ہے اور ملائکہ جو نور علیؑ کا مظہر ہیں وہ عرش کی زینت ہیں ملائکہ کا مسکن یعنی جائے سکون آسمانوں کی بلندی سے لے کر زمین کی گہرائیوں تک ہے جو مظہر اطاعت فاطمیہ ہیں اور شمس و قمر جو مظہر نور حسنؑ ہیں۔ وہ آسمانوں و زمین کی زینت و رونق ہیں اور تمام موجودات کا اشرف نتیجہ جو جنت و حور العین کی تعبیر ہے وہ حضرت حسینؑ کی مظہریت کا نشان ہے اور کل تخلیق کے بعد تاریکی و ظلمت کا چھا جانا اور فاطمہؑ کے نور سے اس ظلمت کا انکشاف شاید تاریخ اسلام میں اس کی تعبیر یہ ہو کہ نور محمدؐ سے جس قدر دنیا میں اجالا ہوا تھا اس پر یزیدیت کی ظلمتیں اور تاریکیاں چھا گئی تھیں حتیٰ کہ ملائکہ بھی اس تاریکی کو برداشت نہ کر سکے اور عالم بالا میں اس کی تاریکی کو سخت محسوس کیا جانے لگا پس نور فاطمہؑ کی شعاعوں نے میدان کربلا میں ایسا اجالا کیا کہ تاحشر اجالا ہی رہا۔

افراط و تفریط

حضورؐ کی ذات بابرکات کے متعلق افرادِ امت نے بہت گل کھلائے بعض لوگ افراط کر کے آگے نکل گئے اور بعض تفریط کر کے بہت

پیچھے رہ گئے اور درحقیقت معرفت حقیقی کی لذت و سرور کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ افراط کرنے والے غلو میں چلے گئے اور تفریط کرنے والے ناشناس آپ کو مقام نبوت سے بھی ہٹانے گئے اسی گروہ کے عقیدہ کو وہابیت کے نام سے آج کل پکارا جاتا ہے غالیوں نے جہاں ان کو مقام ربوبیت پر جا کھڑا کیا ان کے مقابلہ میں وہابیوں نے اپنے جیسا عام بشر کہہ کر ان کے وسیلہ ہونے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ متذکرہ بالا حدیثوں کے متعلق بھی اسی قسم کے اختلافات ہیں وہابی لوگ اس قسم کی نوری احادیث کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور غالی تسلیم کرتے ہوئے ان کی بشریت کا انکار کر دیتے ہیں۔

وہابی فرقہ اور ختم نبوت

جو لوگ حضورؐ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مثلاً پہلے نبی نہ تھے اور چالیس برس کے بعد نبی بنے اس سے قبل ان سے اغلاط سرزد ہوتی تھیں یا ہو سکتی تھیں بلکہ نبوت کے بعد بھی اُن سے غلطی کے صدور کا امکان تھا اور جبرئیل نے اپریشن کے ذریعے سے گندہ مواد خارج کر کے حضورؐ کے باطن کو نبوت کے علوم کے قابل بنایا جبرئیل بحیثیت معلم و استاد کے تھے پس ملکہ فاضلہ کسب کر کے نبی بنے یعنی ان کے نزدیک نبوت کا عہدۂ جلیلہ کسبی تھا اس اعتقاد والا فرقہ وہابی کہلاتا ہے اور جس فرقہ میں نبوت کی یہ پوزیشن ہو اس فرقہ کے ہر آدمی کے دل میں یہ جذبہ ہونا چاہیئے کہ چلو ہم بھی محنت کر کے آگے بڑھیں پس نبوت کا درجہ لیں اب ہزار مرتبہ اور کروڑ دفعہ ختم نبوت کی رٹ لگاتے رہیئے کون مانے گا۔ جو شخص ایک درجہ پر فائز ہو سکتا ہے اور ایک کمال تک پہنچ سکتا ہے وہ کیوں نہ پہنچے اب نبوت کا دروازہ بند ہو کیسے سکتا ہے اور اس کو بند کر کون سکتا ہے اللہ تو اس لئے بند نہیں کر سکتا کہ وہ تو عادل ہے اور نبوت کے درجہ تک محنت کر کے اگر کوئی پہنچ جائے تو وہ عہدہ کیوں نہ دے جب ایک شخص ایک امتحان میں اپنی ہمت سے کامیاب ہو جائے تو اسے سند دینی چاہیئے ہاں ظالم ہوتا تو باوجود محنت اور کوشش کے بھی کسی کا حق روک لیتا۔ اب اگر اس دروازہ کو رسول بند کرے تو کیونکہ وہ تو بقول اُن کے ہم جیسا آدمی ہے اگر وہ ایک طرح کوشش کر کے نبوت کا عہدہ لے بیٹھیں تو ان کو یہ حق کب پہنچتا ہے کہ دوسروں کے لئے دروازہ ہی بند کر دیں پس انہی خیالات نے آگے بڑھ کر مرزا غلام احمد قادیانی کو نبوت کی اسٹیج پر لا کھڑا کیا اب ہزاروں چلاتی رہے دنیا اس کو کون پیچھے ہٹا سکتا ہے جب

نبوت کا کوئی معیار ہی نہ ہو تو ہر آدمی کا اچھے عہدہ کے لئے دل للچا ہی جاتا ہے۔ پس نبوت کے کسبی ہونے کی صورت میں یہ خرابیاں ضروری ہیں۔ جن کا کوئی سدباب نہیں لہذا نبوّت کے کسبی ہونے کا نظریہ سراسر غلط اور نبوّت کے مقام کو نہ پہچاننے کے سبب سے ہے۔

عہدہ نبوّت کسبی نہیں ہے

ہم نے سابقہ بیانات سے واضح کیا ہے کہ نبوّت کا عہدۂ جلیلہ کسبی نہیں وہبی ہے پس نظامِ شریعت کو عام انسانوں تک پہنچانے اور اس کے چلانے کے لئے خدا از راہِ لطف خود ہی اپنا نمائندہ مقرر کرتا ہے اور اسے استعداد دے کر بھیجتا ہے پس وہ تمام کمالاتِ نبوّت کا جامع ہو کر نبوّت کی سٹیج پر قدم رکھتا ہے اس میں ایسا ملکۂ فاضلہ ہوتا ہے جس کی بدولت وہ تمام ان نقائص و عیوب سے منزہ ہوتا ہے جو انسانیت کے وقار کے منافی ہوں اور منشاء پروردگار کے خلاف ہوں پس خدا نبی بنا کر بھیجتا ہے یہاں آکر نہ کوئی نبی بنا ہے نہ بن سکتا ہے وہ اپنے علم میں دنیا والوں کا محتاج نہیں ہوتا اور چونکہ فرشتوں سے نبی کی شخصیت اور اس کا مرتبہ بلند و بالا ہے لہذا فرشتہ ان کا استاد و معلّم نہیں ہو سکتا جب نبوّت کے پہلے فرد حضرت آدمؑ کے علمی وقار کے سامنے تمام ملائکہ ہار مان کر سجدہ کرنے پر رضامند ہو گئے تھے تو نبوّت طے منازل کے بعد جب اپنی آخری سٹیج پر پہنچی تو اس کے ملائکہ استاد و معلّم کیسے بن سکتے ہیں؟ جب حضورؐ سے کم مرتبہ کا نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰؑ تو حضورؐ جو سیّد الانبیاء ہیں یہ چالیس سال کیسے علم و کتاب سے محروم رہ سکتے ہیں اور اگر نبی سے غلطی سرزد ہو تو دامنِ انتخاب پروردگار پر بدنما عیب لگ جاتا ہے کہ اس نے ایسے کو نبی بنایا جس سے خود غلطی سرزد ہو سکتی ہے پھر ایسا شخص اصلاح خلق میں کونسا اچھا کردار ادا کر سکتا ہے؟ اور کسی کو اپریشن کے ذریعہ سے مومن کامل یا نبی و مرسل بنایا جا سکتا ہے۔ تو باقی مخلوق کو بذریعہ نبی و مرسل دین سکھانے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ خدا کی وسیع زمین میں ملائکہ حد و حساب سے زیادہ ہیں ہر انسان پر دو دو فرشتے نیک و بد لکھنے کے لئے مسلط ہیں تو ان کے ذریعے سے ہر انسان کا اپریشن کر کے اسے کم از کم ایمان کی نورانیت سے بھر دیا جاتا پس سلسلۂ نبوّت و رسالت و شریعت و تکلیف کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ لوگ اپریشن کے بعد خود بخود اچھے ہو جاتے

بہرکیف نبوّت کو کسبی کہنے والوں نے اسلام کے دامن کو اپنی گندہ دہانی سے ملوّث کر کے اپنی بد باطنی کا ثبوت دیا ہے اور اسی نظریہ بد کی وجہ سے تو آج کل کی نئی تہذیب میں گودِ مغرب کے پروردہ لوگ جو دین و مذہب کی قیود سے آزاد ہیں بانگِ دہل کہتے پھرتے ہیں کہ محمدؐ نے کلام خدا کو اپنے ذہن کے مطابق سمجھا تھا اور ہم اپنے ذہن کے مطابق سمجھ سکتے ہیں انہوں نے اس سے وہ استفادہ کیا جو اس دور کے انسانوں کے مزاج کے مطابق تھا اور ہم اس سے وہ کچھ سمجھتے ہیں جو دورِ حاضر کے ترقی یافتہ انسانوں کے مزاجوں کے مطابق ہے۔ حتاکہ غلام محمد پرویز جیسوں نے قرآنی تعلیمات کا حلیہ تک بگاڑ کر رکھ دیا اور دینی تعلیمات کو پائے تحقیر سے ٹھکراتے ہوئے حقیقی اسلام کے علمبردار خود بن بیٹھے ان کی نظروں میں سرکارِ رسالتؐ کی تعلیمات صرف تاریک ذہن کے لوگوں کے لئے تھیں پس صحابہؓ کرام و دیگر مجاہدینِ اسلام جنہوں نے اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا اور ہم تک اسلام کی مقدس امانت کو پہنچا کر ہم پر احسانِ عظیم کیا تھا۔ آج انہیں تاریک ذہن اور پس ماندہ ذہنیت کہہ کر اور اپنے آپ کو روشن خیال اور ترقی یافتہ مسلمان سمجھ کر قرآن و اسلام کی صورت و شکل کو مسخ کرنے کا نام قرآن فہمی قرار دیا ہے اور خدا کی قسم دین پر مصیبت صرف اسی تاریک نظریہ کی پیداوار ہے کہ قرآن ہمیں کافی ہے اور رسول ہم جیسے تھے اور ان کے کمالات کسبی تھے حتیٰ کہ نبوت بھی ایک کسبی عہدہ کا نام ہے پس ان لوگوں نے حضورؐ کے متعلق خلقت نوری کی تمام حدیثیں قابلِ تاویل قرار دے دیں اور آپ کی نوری حیثیت کا انکار کر دیا۔

نور و بشر

جب وہابیوں نے پیغمبر کی شانِ اقدس میں گستاخانہ لہجہ استعمال کیا۔ اور انہیں اپنے جیسا کہہ کر غیرتِ اسلامی کو للکار کر تو جذباتی لوگ اس نعرہ کی تاب برداشت نہ لاتے ہوئے آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے حضورؐ کے کمالاتِ نبوّت کو وہبی کہتے کہتے ان کی بشری حیثیت کا سرے سے انکار کر دیا۔ بعضوں نے تو الوہیت و ربوبیت کی مسند پر جا کر بٹھا دیا اور بعضوں نے کہا کہ وہ نہ تو بشر ہیں نہ جن نہ ملک ان سب سے افضل ہیں۔ پس وہ نور ہیں۔ قرآن کی زبان سے خدا کہتا ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اے محمدؐ کہہ دو میں تم جیسا بشر ہوں کہ مجھے وحی ہوتی ہے یعنی کمالات کے لحاظ سے میں تم جیسا نہیں ہوں صرف بشر ہونے میں تمہاری جنس صنف قوم سے ہوں لیکن جہاں وہابی گروہ نے جنس و قوم میں بشر کہتے کہتے کمالاتِ نبوّت میں

بھی اپنے جیسا سمجھ لیا دوسروں نے کمالات میں وہبی کہتے کہتے قوم و جنس و بشر کا بھی انکار کر دیا پس انہوں نے بشر کہہ کر نور کا انکار کر دیا اور انہوں نے نور کہہ کر بشر کا انکار کر دیا حالانکہ راستہ وہی درست ہے جو ان دونو کے درمیان ہے کہ جنس و قوم کے لحاظ سے بشر ہیں اور کمالاتِ نبوت کے اعتبار سے وہ نور ہیں یعنی وہ نورانی بشر ہیں پہلے لحاظ سے تمام لوازم بشریہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور دوسرے اعتبار سے تمام کمالاتِ انسانیہ و فضائل امکانیہ کے حامل ہیں اور اسی لحاظ سے وہ تمام کائنات سے افضل و برتر ہیں حتاکہ باقی انبیاء بھی اور ملائکہ بھی ان ہی کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والے ہیں، پس جہاں انہیں اپنے جیسا سمجھ بیٹھنا گمراہی ہے وہاں ان کو حدودِ بشریت سے ڈھاکر الوہیت و ربوبیت تک لے جانا بھی گمراہی ہے اور صراطِ مستقیم وہی ہے جو ان دونو کے درمیان ہے۔

سورہ ہود میں حضرت نوحؑ کے ذکر میں خدا ارشاد فرماتا ہے کہ جب نوحؑ نے قوم کو توحید کی دعوت دی تو انہوں نے ان الفاظ میں ان کی بات کو ٹھکرایا۔ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا یعنی ہم تو تجھے اپنے جیسا ہی بشر سمجھتے ہیں اور آگے چل کر فرماتا ہے وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ اور ہم تمہاری اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں جانتے ان لوگوں نے نبی کی بشریت کا نعرہ لگاتے ہوئے ان کے وہبی فضائل کا بھی انکار کر دیا تھا وَعَلٰى هٰذَا الْقِيَاسِ۔

آبائے نبی کا اسلام

شیخ صدوقؒ نے عقائد میں فرمایا ہے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عبداللہؑ تک آپ کے آباء کا سلسلہ سب مسلمان تھا اور جناب آمنہ والدۂ ماجدہ حضورؐ بھی مسلمہ تھیں اور حضورؐ نے فرمایا تھا کہ سلسلہ آباء میں آدمؑ سے لے کر آخر تک میری ولادت نکاح سے رہی ہے۔ حضرت ابوطالب بھی مسلمان تھے اور ایک یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت عبدالمطلب حجت خدا تھے اور حضرت ابوطالب ان کے وصی تھے۔

حضرت رسالتمآبؐ کے آباء طاہرینؑ کا سلسلہ سب کا سب مسلمان ہونا متواتر روایات سے ثابت ہوتا ہے اور یہ سب ملتِ ابراہیمی پر تھے کیونکہ حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ صرف بنی اسرائیل پر مبعوث برسالت ہوئے تھے جو حضرت اسحٰقؑ کی اولاد تھے اور اسماعیلؑ کی اولاد کے لئے سنتِ ابراہیمی ہی نافذ العمل تھی اور حضرت عبدالمطلب کا حجتِ خدا ہونا بھی اسی سنت کے ماتحت تھا۔

قرآن مجید کی آیت تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ سورۂ شوریٰ میں تمام منصف مزاج مفسرین
حتیٰ کہ اہلسنت کے آئمہ تفسیر بھی اس امر کا اعتراف رکھتے ہیں کہ اس آیت میں حضرت
رسالتمآبؐ کے آباء طاہرینؑ کا ساجد ہونا مذکور ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر سے منقول ہے کہ اس
کی تفسیر میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا مجھے ہمیشہ خدا پاک صلبوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل
فرماتا رہا حتیٰ کہ میں تمہارے سامنے آگیا اور دیگر تفاسیر سے بھی یہی مضمون ملتا ہے۔
نیز مظروف کے لئے ظرف کی موافقت ضروری ہے کوئی شریف کسی مشروب کو اس کے
نامناسب ظرف میں ڈالنا پسند نہیں کرتا اور کسی پاکیزہ چیز کو کسی نجس برتن میں رکھنا فاعل مختار
و دانا سے بعید بلکہ ناممکن ہے تو ذاتِ ایزد متعال سے ناممکن ہے کہ اشرف الانبیاء کے
نور مقدس کو نجس ارحام یا کافر اصلاب میں ایک وقت مدید تک ساکن بنائے رکھتے یہ عجز الٰہی
یا اس کے جہل کا کاشف ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ البتہ جو لوگ نبوت کو کسبی کہتے ہیں
اور نبی کو اپنے جیسا خیال کرتے ہیں وہ جو بھی چاہے کہتے رہیں۔ دیکھئے قرآن مجید جو ہمارے
نزاعات کے حل کی آخری امیدگاہ ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے تذکرہ میں ہے۔
جب حضرت موسیٰؑ صندوق میں بند کر کے دریا سپرد ہوئے اور آخر کار فرعون کے گھر پہنچے۔ تو
حضرت آسیہ نے سفارش کی اور ان کو قتل سے محفوظ رکھا گیا پھر دودھ دینے کے لئے
دایہ کی تجویز ہوئی تو آپ کسی کا دودھ قبول نہ کرتے تھے پس آپ کی بہن جو صندوق کے
ساتھ ساتھ یا بعد میں اطلاع پا کر وہاں پہنچی اور دیکھا کہ میرا بھائی کسی عورت کا دودھ قبول نہیں
کرتا تو بڑھ کر کہا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ کیا میں ایسے خاندان کا پتہ دوں
جو اس کی کفالت کر سکتے ہیں پس اپنی ماں کو ساتھ لائی اور حضرت موسیٰؑ جونہی اپنی ماں کی گود
میں پہنچے تو اپنی ماں کا دودھ قبول کر لیا۔ دنیا یہ ماجرا دیکھ کر حیران رہی اور واقع کا کسی کو پتہ
نہ تھا کہ یہ اس کی ماں ہے خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے۔ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ
ہم نے موسیٰؑ پر اس سے پہلے دوسری عورتوں کا دودھ حرام کر رکھا تھا اس لئے کہ وہ کافرہ تھیں
اور خدا نہیں چاہتا تھا کہ میرے کلیم کی غذا نجس دودھ بنے جب کلیم اللہ کے لئے کسی کافرہ
عورت کی تربیت اور رضاع کو اللہ نے پسند نہ فرمایا تو فخر موسیٰؑ سید الانبیاء کی تربیت و رضاع
تو بجائے خود نجس رحموں اور نجس صلبوں میں ایک مدت مدیدہ تک رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے
بنا بریں یہ بات قابل تسلیم ہے کہ تمام انبیاء طاہرینؑ کے آباء کرام مسلمان ہوا کرتے تھے اور

حضرت ابراہیمؑ کے باپ کے متعلق جو جھگڑا ہے وہ بھی ظاہری لفظ کا دھوکا ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کا والد تارخ تھا اور آذر ان کا چچا تھا۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور چچا باپ کے بھائی کی حیثیت سے باپ کا قائمقام تھا اس لئے ان کو اب کہہ کر پکارتے تھے اور قرآن نے بھی وہی لفظ اب کا استعمال فرمایا ہے۔

حضرت ابوطالبؑ کا ایمان

ہمارا اعتقاد ہے کہ حضرت ابوطالبؑ اور ان کی زوجہ جناب فاطمہ بنتِ اسد مومن تھے۔ اور آئمہ طاہرین کا سلسلہ آباد بھی ہمیشہ مسلمان رہا کیا اہلِ تاریخ وسیر کا اتفاق ہے کہ مکہ میں حضورؐ کا حضرت ابوطالبؑ کے علاوہ کوئی ناصر و مددگار ان سے بڑھ کر نہ تھا بلکہ مکہ میں جس قدر لوگوں نے اسلام کا شرف حاصل کیا وہ سب حضرت ابوطالب کی نصرت کے صدقہ میں تھا ورنہ مشرکین مکہ کی اکھڑ مزاجی کے پیشِ نظر کوئی بھی حلقۂ اسلام میں داخل نہ ہو سکتا اگر یہ نہ ہوتے۔

طبری و سیرت حلبیہ و دیگر کتب سیر و تاریخ میں ہے کہ دعوتِ عشیرہ کے موقعہ پر آپ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر آواز دی تو لوگ اکٹھے ہو گئے آپ نے فرمایا اگر میں کہوں کہ پہاڑ کے دامن سے کوئی دشمن کا لشکر آرہا ہے تو مان لوگے؟ کہنے لگے جی ہاں! کیونکہ ہم نے آپ کو کبھی جھوٹا نہیں پایا۔ آپ نے فرمایا قیامت کے عذاب سے ڈرو۔ فوراً ابولہب نے بات کاٹ دی اور چند باتیں کہہ کر لوگوں کو منتشر کر دیا۔ پھر آپ نے دوبارہ دعوت دی اور خطبہ توحید کے بعد اپنی رسالت کا اعلان فرمایا تو ابوطالب نے کہا ہم آپ کے مددگار اور نصیحت کو قبول کرنے والے ہیں اور آپ کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ یہ سب خاندان آپ کا ہے اور میں اس کا ایک فرد ہوں لیکن سب کی بہ نسبت آپ کی بات کو جلدی قبول کرنے والا ہوں۔ بے شک آپکو جو حکم ہوا ہے اُسے پورا کیجئے۔ خدا کی قسم میں آپ کا جانثار ہوں گا اور آپ کی پوری پوری حفاظت کروں گا۔ ہاں بے شک میرا جی حضرت عبدالمطلب کے دین کو چھوڑنا قطعاً گوارا نہیں کرتا دگریا جس طرح وہ خدا پرست اور موحد تھے ہم بھی خدا پرست اور موحد ہیں نہ ہم مشرک ہیں اور نہ مشرکوں کے ساتھی ہیں پس آپ جو کچھ فرماتے ہیں درست اور سچا ہے) ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ابولہب یہ باتیں سن کر سٹ پٹا گیا لیکن حضرت ابوطالب نے فرمایا خدا کی قسم جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم ان کی ضرور حفاظت کریں گے اور

حضرت ابراہیمؑ کے باپ کے متعلق جو جھگڑا ہے وہ بھی ظاہری لفظ کا دھوکا ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کا والد تارخ تھا اور آذر ان کا چچا تھا۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور چچا باپ کے بھائی کی حیثیت سے باپ کا قائمقام تھا اس لئے ان کو اب کہہ کر پکارتے تھے اور قرآن نے بھی وہی لفظ اب کا استعمال فرمایا ہے۔

حضرت ابو طالبؑ کا ایمان

ہمارا اعتقاد ہے کہ حضرت ابو طالبؑ اور ان کی زوجہ جناب فاطمہ بنت اسد مومن تھے۔ اور آئمہ طاہرینؑ کا سلسلہ آباد بھی ہمیشہ مسلمان رہا گیا اہل تاریخ و سیر کا اتفاق ہے کہ مکہ میں حضورؐ کا حضرت ابو طالبؑ کے علاوہ کوئی ناصر و مددگار ان سے بڑھ کر نہ تھا بلکہ مکہ میں جس قدر لوگوں نے اسلام کا شرف حاصل کیا وہ سب حضرت ابو طالب کی نصرت کے صدقہ میں تھا ورنہ مشرکین مکہ کی اکھڑ مزاجی کے پیشِ نظر کوئی بھی حلقۂ اسلام میں داخل نہ ہو سکتا اگر یہ نہ ہوتے۔

طبری و سیرت حلبیہ و دیگر کتب سیر و تاریخ میں ہے کہ دعوت عشیرہ کے موقعہ پر آپ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر آواز دی تو لوگ اکٹھے ہو گئے آپ نے فرمایا اگر میں کہوں کہ پہاڑ کے دامن سے کوئی دشمن کا لشکر آ رہا ہے تو مان لو گے؟ کہنے لگے جی ہاں کیونکہ ہم نے آپ کو کبھی جھوٹا نہیں پایا۔ آپ نے فرمایا قیامت کے عذاب سے ڈرو۔ فوراً ابو لہب نے بات کاٹ دی اور چند باتیں کہہ کر لوگوں کو منتشر کر دیا۔ پھر آپ نے دوبارہ دعوت دی اور خطبہ توحید کے بعد اپنی رسالت کا اعلان فرمایا تو ابو طالب نے کہا ہم آپ کے مددگار اور نصیحت کو قبول کرنے والے ہیں اور آپ کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ یہ سب خاندان آپ کا ہے اور میں اس کا ایک فرد ہوں لیکن سب کی بہ نسبت آپ کی بات کو جلدی قبول کرنے والا ہوں۔ بے شک آپکو جو حکم ہوا ہے اُسے پورا کیجئے۔ خدا کی قسم میں آپ کا جانثار ہوں گا اور آپ کی پوری پوری حفاظت کروں گا۔ ہاں بے شک میرا جی حضرت عبدالمطلب کے دین کو چھوڑنا قطعاً گوارا نہیں کرتا دگر یا جس طرح وہ خدا پرست اور موحد تھے ہم بھی خدا پرست اور موحد ہیں نہ ہم مشرک ہیں اور نہ مشرکوں کے ساتھی ہیں پس آپ جو کچھ فرماتے ہیں درست اور سچا ہے) ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ابو لہب یہ باتیں سن کر سٹ پٹا گیا لیکن حضرت ابو طالب نے فرمایا خدا کی قسم جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم ان کی ضرور حفاظت کریں گے اور

سیرت حلبیہ میں ہے کہ یہ دعوت ہی حضرت ابوطالبؑ کے گھر میں منعقد ہوئی تھی نیز طبری میں ابن الاعرابی سے یہ لفظ بھی منقول ہیں کہ جب ابولہب نے شرارت کا ارادہ کیا تو ابوطالب نے جھڑک کر کہا۔ او یک چشم خاموش۔ تجھے ان سے کیا واسطہ؟ پھر عوام سے فرمایا۔ خبردار کوئی نہ اٹھنے پائے چنانچہ مرعوب ہوکر سب بیٹھ گئے تو حضرت ابوطالب نے کہا میرے سردار جو طبع چاہے ارشاد فرمائیے اور اپنے پروردگار کی رسالت پہنچائیے کیونکہ آپ صادق و مصدق ہیں اور اس قسم کی روایات متواترہ موجود ہیں جن کا ایک ایک لفظ حضرت ابوطالب کے ایمان کا سچا گواہ ہے۔

خدائے قدوس کی قسم اگر حضرت ابوطالبؑ کی ہمت نہ ہوتی اور ان کا رعب و جلال نیز حضورؐ کے مشن سے ہم آہنگی نہ ہوتی تو اسلام کی آواز کو پہلے دن سے دبا دیا جاتا۔ اور جن لوگوں کے سابق الایمان ہونے کے بڑے بڑے دعوے کئے جاتے ہیں ان کو تو مکہ کی زمین میں پوچھنے والا بھی کوئی نہ تھا جن لوگوں کی جنگوں اور شجاعتوں کے بڑے بڑے تذکرے اور بڑے طمطراق سے قصیدہ خوانیاں ہوتی ہیں کہ وہ نہ ہوتے تو اذان باواز بلند نہ ہو سکتی۔ خدا کی قسم تاریخ ان کو نسیاً منسیاً سمجھتی ہے اور ابوطالبؑ کی نصرت و ہمت ہی اسلام لانے والوں کی پشت پناہ تھی۔ ورنہ جب ان کا انتقال ہوا تو اسی سال ہی سب گروہوں نے مل کر راتوں رات آپ کے قتل کی تجویز ٹھان لی اور شب تار میں آپ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ بڑے دعوے کرنے والوں کو کسی نے نہ پوچھا کہ وہ کس باغ کی مولی ہیں۔ ورنہ ہجرت کی نوبت کے ظاہری اسباب اس قدر افسوسناک اور خطرناک نہ بنتے۔

مجھے اس بات میں طول کرنے کی ضرورت نہیں جن لوگوں نے حضورؐ کے ماں باپ کو کافر کہہ دیا ان کے لیے حضرت علیؑ کے والدین کو کافر کہنا کوئی مشکل امر نہیں آخر میں میں بعض اہل سنت کے علماء کے چند اقوال پیش کرتا ہوں جو کسی حد تک انصاف و عدل کی ناموس کو سمجھتے تھے۔ احمد بن حسین موصلی حنفی نے شرح شہاب الاخبار میں لکھا ہے علی ما نقل عنہ اِنَّ بُغْضَ اَبِیْ طَالِبٍ كُفْرٌ تحقیق ابوطالب سے بغض رکھنا کفر ہے اسی طرح ابن اثیر سے جامع الاصول میں منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے چچوں میں سے صرف تین ہی مشرف باسلام ہوئے تھے حضرت عباس حضرت حمزہ اور حضرت ابوطالب بنابر قول اہلبیت علیہم السلام بروایت عکرمہ ابن عباس سے منقول ہے کہ مجھے اپنے باپ نے خبر دی۔ اِنَّ اَبَا طَالِبٍ شَهِدَ عِنْدَ

اَلْمَوْتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ یعنی حضرت ابوطالب نے موت کے وقت کلمہ شہادتین زبان پر جاری کر دیا تھا۔ (ضیاء العالمین)

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام سے حضرت ابوطالب کے ایمان کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا بفرمانِ خدا کوئی مسلمان عورت کافر کے نکاح میں باقی نہیں رہ سکتی اور حضرت فاطمہ بنتِ اسد جو عورتوں میں سے پہلی اظہارِ اسلام کرنے والی تھیں ان کا حضرت ابوطالب کے نکاح میں رہنا حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی دلیل ہے ورنہ حضورؐ قطعاً نہ برداشت کرتے۔ حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ہے آپ نے فرمایا تمام مخلوق کا ایمان ترازو کے ایک پلڑے میں ہو اور حضرت ابوطالب کا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو حضرت ابوطالب کا پلڑا جھک جائے گا (روایت میں تمام مخلوق سے مراد غیر معصوم مخلوق ہے یعنی انبیاؑ و آئمہ کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے ایمان سے حضرت ابوطالب کا ایمان زیادہ وزنی ہے۔

بہرکیف اس بارہ میں زیادہ روایات نقل کرنے کی ضرورت نہیں آپ کی نصرتِ رسول آپ کے اقوال آپ کے اشعار اور آپ کی وصیتیں سب بالتواتر آپ کے ایمان کامل کی شاہد ہیں اور آئمہ کی روایات سے ان کا معصوم ہونا بھی ثابت ہوتا ہے چنانچہ شیخ صدوق کی گزشتہ مرسل روایت میں ہے کہ حضرت عبدالمطلب حجتِ خدا تھے اور حضرت ابوطالب ان کے وصی تھے اور حجتِ خدا اور اوصیاء کا معصوم ہونا لازمی ہے جس طرح ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں۔

بہرکیف کتبِ سیر کے مطالعہ سے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان اور اس کی پختگی کا یقین حاصل ہوتا ہے اور اہل بیت اطہار کا آپ کے مومن کامل ہونے پر اتفاق ہے بلکہ دورِ اول میں ان کے ایمان میں کسی کو شک تک نہیں تھا۔ دیکھئے حضرت امیر علیہ السلام کی امیر شام معاویہ کے ساتھ کافی خط وکتابت رہی اور حضرت علیؑ نے اپنے مکاتیب میں اس کو سخت سُست الفاظ بھی کہے لیکن معاویہ کبھی جرأت نہ کر سکا کہ حضرت علیؑ کو باپ کے کفر کا طعنہ دے ورنہ لوگوں کو ورغلانے اور اُن کو دھوکا میں ڈالنے کا ایک بڑا حربہ اس کے ہاتھ لگ جاتا اور ببانگ دہل اعلان کرتا کہ میں مسلمان باپ کا بیٹا ہوں اور حضرت علیؑ معاذ اللہ کافر باپ کا بیٹا ہے۔ پس حضرت علیؑ کی سخت کلامی کے باوجود معاویہ کا جرأت نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ دورِ اول میں حضرت ابوطالب کے ایمان کے متعلق قطعاً کسی کو شک نہ تھا نہ دوستوں کو اور نہ دشمنوں کو لیکن سادات کی مظلومیت کی آڑ میں جب بنی عباس نے بنی امیہ سے سلطنت چھین لی۔ اور

خود سلطنت کے تخت پر متمکن ہوئے تو اولاد حضرت علیؑ کو عوام کی نظروں میں سبک کرنے کے لئے انہوں نے ایک سیاسی چال چلی اور حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کو انہوں نے اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا تاکہ سادات سے اپنی برتری کے ثبوت میں وہ کہہ سکیں کہ ہم رسولؐ کے مسلمان چچا کی اولاد ہیں اور اولادِ علیؑ رسولؐ کے کافر چچا کی اولاد تھے پس اس دھوکا سے لوگوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا لینا ان کے لئے آسان تھا اور اسلامی مذاہب کے علماء و آئمہ اور مورخ و محدّث سب چونکہ اسی پرفتن دَور کی پیداوار ہیں پس انہوں نے سلاطینِ وقت کے نظریہ کو خوب اپنایا اور اسے فروغ دے کر آلِ محمدؐ سے دشمنی کی آتشِ غضب کو اسی کلمہ سے خوب ٹھنڈا کیا کہ حضرت ابوطالب معاذاللہ کافر تھے۔

بہرکیف تاریخ اسلام حضرت ابوطالبؑ کے آثار کو نہیں مٹا سکتی اور منصف مزاج لوگ آخر حقیقت کا سراغ لگا لیا کرتے ہیں۔ سُورج پر گرد پھینکنے سے اپنا منہ و سر ہی خاک آلود ہوتا ہے بہرکیف شیعہ کا اجماع ہے اور یہی عقیدہ ہے کہ حضرت ابوطالب سچے مسلمان اور وفادارِ رسول تھے بلکہ محسن اسلام تھے اور بعض روایات سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے آخری وصی تھے اور تبرکات انبیاء انہی کے ذریعہ سے حضور تک پہنچے تھے چنانچہ بروایت کافی حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے بھی اس قسم کی روایت منقول ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضور رسالتمآبؐ کے جملہ آبائے طاہرین یکے بعد دیگرے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوصیاء میں سے تھے واللہ اعلم۔ ہم نے ایمان حضرت ابوطالبؑ کے متعلق مفصل بحث تفسیر انوار النجف جلد پنجم صہ ۲۰۱ تا صہ ۲۱۲ درج کی ہے جو اکثر علامہ امینی کی کتاب "الغدیر جلد ۷" سے ماخوذ ہے۔

معراجِ جسمانی کا عقیدہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور رسالتمآبؐ کو معراج جسمانی ہوئی تھی اور ایک بار نہیں بلکہ کئی بار ہوئی اور جو لوگ معراج روحانی کے قائل ہیں ان کا دامن دلیل سے خالی ہے۔ ہمارے پاس قرآن مجید کا صریح فرمان سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے خاص بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی۔ وہ مسجد اقصیٰ جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنایا ہے۔ تاکہ ہم اس کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔ پس آیت مجیدہ صاف جسمانی معراج

کو ثابت کر رہی ہے کیونکہ فرمان ہے کہ اس نے اپنے عبد خاص کو سیر کرائی اور عبد صرف روح کا نام نہیں بلکہ جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہوا کرتا ہے اور مسجد اقصیٰ سے بیت المقدس مراد لینا غلط ہے کیونکہ اقصیٰ کا معنی ہے سب سے دور اس لئے کہ وہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے پس مسجد اقصیٰ وہ جائے عبادت ہو گی جو سب سے دور ہو اور اگرچہ بیت المقدس پر بھی مسجد اقصیٰ کا اطلاق مجازاً وارد ہے۔ کیونکہ وہ عربوں سے بہت دور تھا لیکن آیت مجیدہ میں اسی مجازی دوری کو مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ لے جانے والے کے استعمال میں جب حقیقی معنی مراد لیا جا سکتا ہے تو بغیر قرینہ کے مجاز مراد لینا خلاف قاعدہ ہے اور چونکہ اللہ ہی لے گیا ہے پس اس کی ذات کے نزدیک سب سے دور یعنی سب دنیا والوں سے دور کا مقام مراد ہونا چاہیئے اور اگر بالفرض مسجد اقصیٰ کا معنی بیت المقدس بھی کیا جائے تو اس سے آگے کی نفی اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ کہا جائے گا۔ کہ بیت المقدس تک جانا قرآن سے ثابت ہے اور آگے امکان کی انتہائی حدود تک جانا احادیث متواترہ سے ثابت ہے بہرکیف معراج کے اثبات میں تواتر سے احادیث موجود ہیں جس میں شک کرنے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں ہو سکتی کسی زمانہ میں معراج کی عقلی صحت کیلئے خرق والتیام کا مسئلہ آڑے آجاتا تھا لیکن آج کل جدید معلومات و نئے انکشافات نے خرق والتیام کے فرسودہ خیال ثابت کر دیا ہے۔ چاند پر راکٹ بھیجنے اور مریخ پر ڈیرہ ڈالنے کے خواب دیکھنے والے خرق والتیام کی محالیت کو ختم کر بیٹھے ہیں اور آسمانی منازل کو وہ انسان کا گشت ثابت کر چکے ہیں پس وہ انسان جو امکان کی آخری منزل ارتقاء پر فائز ہو اس کے لئے اپنی روحانی طاقت کے ذریعے یہ بلندیاں طے کرنا کوئی مشکل نہیں جب کہ مادہ کی طاقت کے بل بوتہ پر یہ بلندیاں بالکل ہیچ معلوم ہو رہی ہیں اور مسلم ہے کہ روح کی طاقت مادہ کی طاقت سے بدرجہا قوی اور مضبوط تر ہوتی ہے۔ اور پھر حضورؐ کے متعلق تو خود خدا نے یہ دعویٰ کیا کہ میں خود لے گیا ہوں پس اشکال کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے باقی رہا کہ معراج پر حضورؐ نے کیا کیا دیکھا تو اس کی تفاصیل کتب میں درج ہے البتہ باتیں ہوئیں اور کتب حدیث گواہ ہیں کہ جو باتیں ہوئیں وہ حضرت علیؑ کے لہجہ میں ہوئیں جیسے کہ ینابیع المودۃ اور تفسیر برہان و دیگر کتب میں بھی موجود ہے بعض ہونے والی باتوں میں سے ہم نے تفسیر کی تیسری جلد میں تذکرہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی نے اعتراض کیا تھا کہ موسیٰؑ سے خدا نے خود کلام کیا تھا اس کے بدلہ میں آپ کو کیا ملا تو آپ نے فرمایا مجھے اس کے بدلہ

میں معراج بالتفصیل تفسیر کی جلد چہارم کے آخیر میں ملاحظہ فرمائیں۔ بہرکیف معراج پر جس قدر باتیں ہوئیں وہ مخاطبہ کے ذریعے سے ہوئیں جبرئیل درمیان میں واسطہ نہ تھا کیونکہ معراج کی منزل جبرئیل کے مقام السدرۃ المنتہیٰ سے بلند تھی اور معراج پر جاتے ہوئے حضورؐ نے مقام البیت المعمور پر تمام انبیاء کو نماز پڑھائی تھی اور انبیاء سے پوچھا تھا کہ تم کیوں نبی مبعوث ہوئے؟ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ توحید خدا اور آپ کی نبوت اور علیؑ کی ولایت پر ہم مبعوث ہوئے۔ آیتِ میثاق کی تفسیر میں تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں۔

معراج کی دعوت کے لئے جانے والا اور ساتھ لانے والا جبرئیل امین تھا اور جس سواری پر لایا گیا اس کا نام براق تھا اور حجابات کی منازل آپ نے رفرف پر طے کیں اور جبرئیل ٹھہر گیا تھا کیونکہ اس نے عرض کی تھی کہ اگر ایک انگلی کے برابر بھی آگے بڑھوں۔ تو میرے پر جلتے ہیں۔ معراج کے واقعات میں کلاً یا جزءً اختلاف ہو سکتا ہے لیکن علمائے امامیہ میں یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ حضورؐ کو معراج جسمانی ہوا تھا اور یہ آپ کے معجزات وکمالات میں سے اہم معجزہ وکمال ہے جو کسی نبی کو نصیب نہیں ہوا اور یہ حضرت موسیٰؑ کے کلیم اللہ ہونے سے بدرجہا افضل ہے کیونکہ قرب ومحبت کا بلند ترین مقام ہے اسی لئے آپ کے القاب میں سے حبیب اللہ ممتاز ترین لقب ہے۔

قرآن مجید کے متعلق عقیدہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کا تمام کتب سماویہ سے درجہ بلند ہے اور یہ تمام کتب سماویہ کے علوم کی جامع کتاب ہے اور اس کی پہلی آیت ہی اس کے لاریب ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور شیعہ مذہب کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کا انکار کرنا یا اس میں شک کرنا کفر ہے بلکہ اس کی ایک آیت اور لفظ میں شک کرنا بھی کفر ہے باقی انبیاء کے معجزہ جات ایک قوم کے لئے اور ایک وقت کے لئے تھے۔ خداوند کریم نے حضورؐ کو یہ معجزۂ زندہ قیامت تک کے لئے عطا فرمایا جس کے علوم کسی زمانہ میں پرانے نہیں ہوتے اور ہر مفسر اس سے نئے نئے اسرار ورموز پر واقف ہوتا چلا جاتا ہے اس لئے کسی زمانہ میں علماء اس کی تحقیق وتدقیق کے متعلق اپنے نظر وفکر کے نتیجہ کو آخری نتیجہ کہنے کی جراءت نہ کر سکے قرآن مجید میں اعجاز کے بہت سے پہلو ہیں مثلاً ● اس کے الفاظ کا نظم ونسق معجزہ ہے ● اس کی سلاست معجزہ ہے ● اس کی روانی ومطالب کا تسلسل معجزہ ہے ● باوجود کثرت علوم

کے جامع ہونے کے تصادم نہ ہونا معجزہ ہے ● اس کی فصاحت و بلاغت معجزہ ہے۔
● اس کی پیشین گوئیوں کی حرف بحرف صداقت معجزہ ہے ● سابقہ انبیاء و امم کے
قصوں کا بیان معجزہ ہے ● اس کے احکام میں پائیدار مصالح و مفاسد کا وجود معجزہ ہے۔
● اور ہر زمانہ میں اس کا نیا اور تازہ ہونا معجزہ ہے ● ہم نے تفصیل وار مقدمہ تفسیر میں
ان کو درج کیا ہے۔ یہاں اسی قدر لکھنا ہی کافی ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کو خداوند کریم نے اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ پر نازل فرمایا پس یہ اللہ کا کلام ہے۔ نہج البلاغہ میں حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ هٰذَا الْقُرْاٰنُ بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ۔ یہ قرآن جو دو تختیوں کے درمیان ہے۔ اللہ کا کلام ہے اور شیعہ امامیہ کا اس پر اتفاق و اجماع ہے۔ البتہ اہل خلافت کی جانب سے شیعوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ حدیث ثقلین جو مُسلّم بین الفریقین ہے جس میں حضور نے فرمایا تھا۔ اِنِّیْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ ترجمہ:- میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی عترت اگر تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے مذہب شیعہ میں ان دونوں سے تمسک کرنا دین سمجھا گیا اور قرآن کو کتاب صامت اور اہلبیتؑ کو قرآن ناطق کہا گیا۔ پس شیعہ قرآن مجید کی اس تفسیر کو قبول کرتے ہیں جو قرآن ناطق یعنی اہل بیت اطہار سے وارد ہو اور اپنی رائے کو اس میں داخل کرنا گناہ عظیم تصور کرتے ہیں آپکی زندگی میں ایک آواز اٹھائی گئی تھی کہ ہمیں صرف صامت کتاب ہی کافی ہے جس کا صاف یہ مطلب تھا کہ ہم اس کی تفسیر اپنی مرضی سے کریں گے پس اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفسیر اپنی رائے سے کرنے والے قرآن کے ٹھیکہ دار بن گئے اور جنہوں نے قرآن کا مفسر آل محمدؐ کو سمجھا وہ منکر قرآن قرار دیئے گئے یہ ہے اصلی بنیادی اختلاف۔ پس شیعہ بیچاروں پر کیچڑ اچھالنے کا افسوسناک رویہ اسی اصلی اختلاف کا ہی نتیجہ ہے۔

شیعہ کی طرف جو تحریف کی نسبت ہے وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ سابق اختلاف کی آتش غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہی ان پر اتہام لگایا جاتا ہے ورنہ دامن مذہب امامیہ اس سے بالکل بری و منزہ ہے تحریف بمعنی تقدیم و تاخیر کے تو سب مسلمان قائل ہیں کہ کئی آیات پہلے اور مدنی آیات بعد یا مدنی پہلے اور مکی بعد اس قسم کا اختلاط قرآن مجید میں تخلل

موجود ہے۔ باقی رہا قرآن مجید میں کمی زیادتی کا ہونا تو اس وقت تک کسی بھی مسلمان کہلانے والے نے اس کا قول نہیں کیا۔ البتہ تیسری صورت اور وہ یہ کہ اس سے کچھ کم ہو گیا ہو تو اس بارے میں شیعوں پر جو اعتراضات ہیں وہ بے بنیاد ہیں کیونکہ احادیث اہل بیت میں جو زیادتیاں بیان کی جاتی ہیں۔ وہ تفسیری نوٹ ہیں یعنی جناب رسالتمآبؐ اور حضرت علی مرتضیٰ یا صحابہ کرام کی جانب سے جو آیت متعلقہ کے متعلق تفسیری نوٹ ہوتا تھا۔ اس کی آئمہ نشاندہی فرماتے تھے اس کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ جزو آیت تھا اور ازراہِ تحریف اسے حذف کر دیا گیا اور اسی قسم کی روایات اہل سنت کی کتابوں میں بھی بکثرت ملتی ہیں چنانچہ علامہ سیوطی کی اتقان اور در منثور میں اسی قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں۔

دورِ اول سے اس وقت تک شیعوں میں یہی قرآن مروج گھروں میں یہی قرآن مساجد شیعہ میں یہی قرآن اصول و فروع کا ماخذ یہی قرآن اور حتاکہ نماز میں یہی قرآن موجود ہے اسی قرآن کی تفسیریں مذہب شیعہ میں بکثرت موجود ہیں شیعہ احادیث میں قرآنی آیات کا ایک بے پناہ حصہ موجود ہے بلکہ تمام شوؤن مذہب میں شیعہ کا دار و مدار قرآن ہے لیکن بتفسیر آل محمد پس یہاں مناسب ہے علمائے اعلام کی تصریحات بطور نمونہ نقل کر دی جائیں تاکہ منصف مزاج طبقہ کے لئے باعثِ اطمینان ہو۔

ابن بابویہ فی العقائد اعتقادنا فی القرآن انہ کلام اللہ و وحیہ و تنزیلہ وقولہ وکتابہ الی ان قال وان اللہ تعالیٰ محدثہ ومنزلہ وربہ وحافظہ والمتکلم بہ اعتقادنا ان القرآن الذی انزلہ اللہ علی نبیہ محمد ھو ما بین الدفتین وھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذالک ومبلغ سورہ عند الناس مأۃ واربع عشرۃ سورۃ وعندنا

شیخ صدوق عقائد میں فرماتے ہیں قرآن کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا کلام اس کی معرفت کا ذریعہ اس کا نازل کردہ اس کا قول اور اس کی کتاب ہے تحقیق اللہ اس کا پیدا کرنے والا اتارنے والا اس کا مالک محافظ اور کلام کرنے والا ہے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ تحقیق وہ قرآن جو اللہ نے اتارا۔ اپنے نبی محمدؐ پر وہ وہی ہے جو دو تختیوں کے درمیان ہے اور وہی جو لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے اس سے کچھ زائد نہیں ہے اور اس کی سورتیں لوگوں کے

أَنَّ الضُّحٰى وَأَلَمْ نَشْرَحْ سُوْرَةٌ وَاحِدَةٌ وَالْإِيْلَافِ وَأَلَمْ تَرَ كَيْفَ سُوْرَةٌ وَاحِدَةٌ وَمَنْ نَسَبَ إِلَيْنَا إِنَّا نَقُوْلُ إِنَّهُ أَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ فَهُوَ كَاذِبٌ۔

نزدیک ایک موجود ہیں اور ہمارے نزدیک الضُّحٰی اور الم نشرح ایک سورہ اور لایلاف اور الم ترکیف ایک سورہ شمار ہوتا ہے اور جو ہماری طرف منسوب کرے کہ ہم اس سے زیادہ کے قائل ہیں وہ جھوٹا ہے۔

اَلْمَجْلِسِيُّ فِي الْاِعْتِقَادَاتِ۔ أَنْ يُؤْمِنَ بِحَقِيْقَةِ الْقُرْاٰنِ وَمَا فِيْهِ مُجْمَلًا وَكَوْنِهِ مُنَزَّلًا مِنَ اللّٰهِ وَكَوْنِهِ مُعْجِزًا وَإِنْكَارُهُ وَالْاِسْتِخْفَافُ بِهِ كُفْرٌ وَكَذَا فِعْلُ مَا يَسْتَلْزِمُ الْاِسْتِخْفَافَ بِهِ كَجُزْئِهِ مِنْ غَيْرِ ضَرُوْرَةٍ وَالْقَائِهِ فِي الْقَاذُوْرَاتِ۔

علامہ مجلسیؒ اپنے عقائد میں فرماتے ہیں۔ قرآن کی حقیقت پر ایمان لانا واجب ہے اور جو کچھ اس میں ہے (خواہ تفصیل معلوم نہ ہو) اور اس کے منزل من اللہ ہونے پر اور اس کے معجز ہونے پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا انکار و توہین کفر ہے اسی طرح ہر وہ کام جو اس کی توہین کا موجب ہو۔ جیسے بلا ضرورت اس کو اپنی کمائی کا ذریعہ بنانا اور اس کو نجس مقام پر ڈالنا (کفر ہے)

اَلْمُرْتَضٰى۔ أَنَّ الْعِلْمَ بِصِحَّةِ نَقْلِ الْقُرْاٰنِ كَالْعِلْمِ بِالْبُلْدَانِ وَالْحَوَادِثِ الْكِبَارِ وَالْوَقَائِعِ الْعِظَامِ وَالْكُتُبِ الْمَشْهُوْرَةِ وَأَشْعَارِ الْعَرَبِ الْمَسْطُوْرَةِ

سید مرتضیٰ فرماتے ہیں۔ تحقیق قرآن مجید کے صحیح منقول ہونے کا علم ایسا ہے جیسے دور دور کے بڑے بڑے شہروں اور بڑے حادثوں اور عظیم یادگاروں اور مشہور کتابوں اور جاہلی عربوں کے نقل شدہ شعروں کے صحیح نقل ہونے کا یقینی علم ہے۔

الطبرسی فی مَجْمَعِ الْبَيَانِ: قَالَ فَأَمَّا الزِّيَادَةُ فَمُجْمَعٌ عَلٰى بُطْلَانِهِ وَأَمَّا النُّقْصَانُ مِنْهُ فَقَدْ رَوٰى جَمَاعَةٌ مِنْ أَصْحَابِنَا وَقَوْمٌ مِنَ الْحَشْوِيَّةِ الْعَامَّةِ أَنَّ

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں زیادتی کے قول کا بطلان اجماعی ہے۔ البتہ کمی کے متعلق روایات ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت نے اور عامہ میں سے حشویہ قوم نے قرآن میں تغیر اور

فِی الْقُرْاٰنِ تَغْیِیْرًا وَنُقْصَانًا وَالصَّحِیْحُ مِنْ مَذْهَبِ اَصْحَابِنَا خِلَافُهُ

نقصان کا قول کیا ہے لیکن ہمارے مذہب (امامیہ) کے علماء کا صحیح مذہب اس کے خلاف ہے (یعنی اس میں کوئی کمی نہیں ہے جس طرح کہ اس پر کوئی زیادتی نہیں ہے)۔

علمائے امامیہ شیعہ کے اکابرین کے اقوال ہم نے نقل کئے ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ یہی موجودہ قرآن جو شرق سے غرب تک اور شمال سے جنوب تک تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلا ہوا ہے جس سے اسلام کا بچہ بچہ واقف ہے یہی قرآن کلام اللہ ہے اور اللہ کی اپنے رسول مقبول محمد مصطفیٰ پر بھیجی ہوئی کتاب ہے اس کی آیات میں سے ایک چھوٹی سی آیت کا انکار بھی کفر ہے اور اس کے کسی مسلم فیصلے کا انکار بھی کفر ہے اسی طرح اس کی توہین یا ہر وہ فعل جس سے اس کی توہین لازم آ جائے وہ کفر ہے۔

پس شیعوں پر اتہامات و الزامات کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ خشبتا کے دعویدار چونکہ آل محمدؐ کی تعلیمات کے مٹانے کے درپے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر شیعہ قوم کو اپنے نظریات بیان کرنے کا عام موقعہ ملا تو مذہب آل محمدؐ دنیا پر چھا جائے گا پس وہ ہر قسم کے ہتھکنڈے صرف لوگوں کو شیعہ قوم سے متنفر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کی بات نہ سنی جائے۔

نزولِ قرآن مجید

قرآن مجید میں صاف اعلان ہے کہ قرآن مجید ماہ مبارک رمضان میں اترا ہے شیخ صدوق عقائد میں تحریر فرماتے ہیں

بَابُ الْاِعْتِقَادِ فِیْ نُزُوْلِ الْقُرْاٰنِ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ، قَالَ الشَّیْخُ اِعْتِقَادُنَا فِیْ ذٰلِكَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ نَزَلَ فِیْ شَهْرِ رَمَضَانَ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ جُمْلَةً وَّاحِدَةً اِلَی الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ثُمَّ نُزِّلَ مِنَ الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ فِیْ مُدَّةِ عِشْرِیْنَ سَنَةً وَاَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اَعْطٰی نَبِیَّهُ الْعِلْمَ

باب۔ شب قدر میں قرآن کے نازل ہونے کے بارے میں اعتقاد یہ ہیں۔ شیخ صدوق فرماتے ہیں اس بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ تحقیق قرآن مجید ماہ رمضان کی شب قدر میں اکٹھا البیت المعمور پر اترا ہے۔ پھر البیت المعمور سے بیس برس کے عرصہ میں اترتا رہا ہے اور تحقیق خداوند کریم نے اس کا علم اپنے نبی کو اجمالاً دے دیا اور

جُمْلَةً ثُمَّ قَالَ لَهُ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا وَقَالَ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ

پھر حکم دیا۔ کہ قرآن کے ساتھ جلدی نہ کرو۔ اس سے قبل کہ بذریعہ وحی کے پورا کر دیا جائے اور یہ دعا کرو۔ اے پروردگار میرے علم کو زیادہ کر اور فرمایا۔ اس کو زبان سے نہ نکالو تاکہ جلد بازی کرو۔ تحقیق اس کا جمع کرنا اور قرأت کرنا ہم پر عائد ہے جب ہم قرأت کریں تو تم پھر قرأت کرو پھر ہم پر ہے اس کا بیان کرنا۔

آیات مذکورہ بالا کی اس امر پر تصریح ہے کہ حضورؐ قرآن کو نزول سے پہلے جانتے تھے اور وہ اس کا علم لے کر ہی تشریف لائے تھے صرف ظاہری وحی کے ہونے کے بعد اس کا اظہار کرتے تھے۔ جیسے کہ آیات میں موجود ہے۔ اور یہ کہنا کہ قرآن کا علم پہلے کس طرح ہو سکتا ہے جب کہ اس کے مضامین بعد کی پیداوار ہیں جیسے جنگ احد و بدر کی آیات وغیرہ یا دیگر مسائل و واقعات تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ واقعات بعد کے ہیں لیکن خداوند کریم اپنے علم میں ان واقعات کے خارج میں واقع ہونے کا محتاج نہیں ہے جس طرح وہ خود علیم ہے اسی طرح قبل از وقوع کسی شیئ کا علم اپنے نبی کو بھی دے سکتا ہے شب قدر کے متعلق بہت کچھ اختلافات کتب میں موجود ہیں لیکن علمائے امامیہ کے نزدیک ۱۹۔۲۱۔۲۳ ماہ رمضان کی تین راتوں میں سے ایک غیر معین رات ہے لہٰذا اعمال شب قدر انہی راتوں میں بجالائے جاتے ہیں اور آئمہ معصومین کے فرامین سے مجموعی طور پر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور ان کے علاوہ جن راتوں کے متعلق کچھ روایات ہیں وہ اس پایہ کی نہیں ہیں۔

ہم قرآن مجید کے قدیم ہونے کے قائل نہیں بلکہ اس کو حادث جانتے ہیں اور اللہ کی مخلوق مانتے ہیں جس طرح شیخ صدوق کے الفاظ نقل کئے جا چکے ہیں۔

ملائکہ پر ایمان

ملائکہ کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ اجسام نوریہ ہیں۔ جو کتے اور سور کے علاوہ ہر شکل کو اپنا سکتے ہیں چنانچہ جبرئیل کے متعلق وارد ہے کہ وہ خدمت پیغمبرؐ میں دحیہ کلبی کی شکل میں حاضر ہوتا تھا۔ بہرکیف مطلب کو ثابت کرنے کے لئے احادیث کا یا اجماع علماء کا سہارا لینا انتہائی کمزوری ہے جبکہ قرآن مجید میں ان کا صراحت سے ذکر موجود ہے پس ملائکہ کے وجود کا منکر قرآن کا منکر ہے اور وہ بلاریب

کا فرستہ۔

ملائکہ کی تعداد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جان سکتا ان کی خلقت حضرت آدم علیہ السلام سے بہت پہلے کی ہے حضرت امیر علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ان میں سے جو قیام کی حالت میں ہیں وہ سجدہ نہیں کرتے اور جو رکوع میں ہیں وہ قیام نہیں کرتے ۔ گویا عبادت کی اہم چار حالتوں میں وہ منقسم ہیں (قیام ، قعود ، رکوع اور سجود) ایک سے دوسری حالت پر منتقل نہیں ہوتے اور انسانوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کی عبادت (نماز) فرشتوں کی عبادت کی ہر چہار حالتوں پر مشتمل ہے بروایت انوارِ نعمانیہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے صرف آسمان کے فرشتے زمین کی مٹی کے ذرات سے تعداد میں زیادہ ہیں اور آسمان میں کوئی قدم رکھنے کی جگہ نہیں۔ جہاں کوئی فرشتہ تسبیح و تقدیس پروردگار میں مشغول نہ ہو اور زمین میں کوئی انگوری یا مٹی کا روڑا ایسا نہیں جس پر کوئی فرشتہ موکل نہ ہو پس وہ اپنی کارکردگی یومیہ بارگاہ خالق میں پیش کرتے ہیں اور ہر یوم ہم اہلِ بیتؑ کی ولایت کا اقرار کرتے ہیں اور ہمارے محبوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ہمارے دشمنوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔

ملائکہ کی کثرت تعداد کے متعلق تفسیر لوامع التنزیل میں کتاب جواہر القرآن سے منقول ہے کہ آدمی جنوں کا دسواں حصہ ہیں اور یہ سب مل کر بحری مخلوق کا دسواں حصہ ہیں اور ان سب سے زمین کے ملائکہ دس گنا ہیں اور اگر ان سب کو ملایا جائے تو آسمانِ اول کے فرشتے ان سے دس گنا ہیں اور ان سب کے مجموعے سے دوسرے آسمان کے فرشتے دس گنا ہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس سات آسمانوں تک پھر ساتوں آسمانوں اور زمین کے سب فرشتے مل کر کرسی کے فرشتوں کا دسواں حصہ ہیں اور ان سب سے سراوقات عرش میں سے ایک سرادق کے فرشتے دس گنا زیادہ ہیں اور سراوقات کی تعداد چھ لاکھ ہے اور یہ سب عرش کے فرشتوں کا دسواں حصہ ہیں آسمانوں میں کوئی قدم رکھنے کی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں سجود یا قیام میں کوئی ملک موجود نہ ہو اور وہ سب تسبیح و تقدیس پروردگار میں مشغول ہیں اور سب مل کر عرش کے طواف کرنے والوں کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے ایک قطرہ سمندر کے مقابلہ کے مقابلہ میں پھر لوح کے فرشتے جن کا سردار اسرافیل ہے اور پھر جبریل کے ماتحت کام کرنے والے پس اللہ کے لشکروں کو سوائے اس کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ دمًا

يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ملائکہ معصوم مخلوق ہے اور وہ نوری ہیں۔ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ یعنی جو کچھ حکم دیا جاتا ہے بس وہ وہی بجالاتے ہیں وہ ایک چشم زدن میں بھی اپنے پروردگار کی مخالفت نہیں کرتے۔ لہٰذا ملائکہ کے متعلق بعض بعض الزامات جھوٹے افسانوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اور ہمارا عقیدہ ہے کہ سب فرشتے محمدؐ و آل محمدؐ کے غلاموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام ملائکہ سے چار فرشتے افضل ہیں۔ جبرائیل میکائیل اسرافیل اور عزرائیل اور جبرائیل ان سب سے اشرف و افضل ہیں۔

جنّوں کے متعلق عقیدہ

جن کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ اجسام ناریہ ہیں۔ اور ہر شکل اختیار کر سکتے ہیں حتیٰ کہ کتا اور سور کی شکل میں بھی وہ آ سکتے ہیں۔ گوبر اور ہڈی وغیرہ ان کی غذا ہے جیسا کہ روایات میں آیا ہے۔ ان کے اثبات کے لئے بھی روایات یا اجماع کا سہارا لینا بے کار ہے قرآن مجید ان کے وجود کا اعلان کرتا ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ بھی انسانوں کی طرح ذی ہوش اور صاحب عقل مخلوق ہے اور عبادت کی تکلیف میں انسانوں کے ساتھ شریک ہیں چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ہم نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر عبادت کے لئے۔

قوم جن کی پیدائش کا مادہ آگ ہے اور ابلیس ان کا جدِ اعلیٰ نہیں بلکہ اس کے متعلق تو ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ یہ قوم جن سے تھا۔ بہرکیف کوئی کہتا ہے کہ ان کا جدِ اعلیٰ نسناس تھا کوئی کچھ اور کہتا ہے خلقتِ حضرت آدمؑ سے قبل زمین ان کی جائے رہائش تھی۔ اور انسانوں کی آبادی کے بعد جنگلوں اور گھاٹیوں میں رہتے ہیں میں نے کہیں ایک روایت میں دیکھا ہے کہ خدا نے ان کے پاس ان کی قوم سے ایک نبی بھیجا تھا لیکن انہوں نے سرتابی کر کے اس کو مار دیا۔ حضرت آدمؑ کی خلقت سے قبل انہوں نے زمین پر کافی شر و فساد بپا کر رکھا تھا پس ملائکہ کو حکم ہوا تو انہوں نے ان کو مارا اور قتل کیا۔ لیکن ابلیس تائب ہو گیا اور اس کو چھوڑ دیا گیا پھر حضرت آدم علیہ السلام کے سجدہ کے وقت جو اس نے گل کھلائے وہ قرآن میں موجود ہیں بلکہ روایات میں تو یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت آدم کے جسدِ خاکی کو بھی یہ خواہ مخواہ چھیڑا کرتا تھا اور اس کو توہین آمیز نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ بہرکیف روح کے داخلے کے بعد

تو اس کی توبہ و شرافت کا بھانڈا پھوٹ گیا اور انسان کا بلکہ دینِ خدا کا اعلانیہ دشمن بن گیا۔

قرآن مجید نے اس کے شر و وسوسہ سے بچنے کا حکم دیا اور اسی وجہ سے متعدد مقامات پر حضرت آدم کے قصّہ کو دہرا کر اس کے دھوکہ میں آنے سے بچنے کی دعوت دی پس نیک بخت انسان وہ ہے جو اس کے دامِ تزویر سے بچ نکلے کیونکہ یہ انسان کو ہر رنگ میں ہر طور سے گمراہ کرتا ہے اور ہر انسان کو اس کے اپنے انداز سے گمراہ کرتا ہے عابد کو عبادت میں دھوکا دیتا ہے عالم کو علمی رنگ میں گمراہ کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ انتہائی عیار و مکار اور تجربہ کار دشمن ہے اس سے ہوشیار رہنا عقل مند آدمی کا کام ہے۔

قومِ جن عبادت میں ہمارے ساتھ شریک ہے یہ معلوم نہیں کہ وہ کس طرح ان عبادات کو بجالاتے ہیں۔ بہرکیف ان کی تکالیف میں ان کی نوعی حیثیت کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے حضرت سلیمان کے درباری جن کافی تھے بلکہ آپ کی شادیاں بھی ان میں ہوئیں۔ اور جنابِ رسالتمآبؐ کی بارگاہِ فیضِ انتساب میں بھی آکر مشرف ہوتے تھے۔ چنانچہ سورۂ جن قرآن مجید میں انہی کے فضائل کا تذکرہ کرتا ہے حضرت امیر علیہ السلام کی خدمت میں جن کا آنا اور مسائل دریافت کرنا کتب تواریخ میں موجود ہے حضرت سید الشہداء کی بارگاہ میں جنّوں کا آنا اور نصرت کی پیش کش کرنا مذکور ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے نیک لوگ اور مومن لوگ موجود ہیں۔ البتہ ان میں سے شریر اور فاسق و فاجر افراد کا ہونا بلکہ کثرت سے ہونا بھی قابلِ تسلیم ہے کیونکہ ہر قوم میں نیک قلیل المقدار ہوا کرتے ہیں۔ جہاں تک معلومات کا تعلق ہے جن انسانوں کو تکلیفیں دیتے ہیں اور اسی بناء پر آئمہ کی جانب سے شرِ جنات کے دفع کرنے کے لئے حرز بھی منقول ہیں بلکہ جنابِ رسالتمآبؐ سے بھی منقول ہیں لیکن زمانۂ حاضرہ میں بالخصوص مغربی پاکستان میں جنّوں کے مستقل اڈے ہیں وہ غالباً قومِ جنّات کو بدنام کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ پیسہ کمانے کے لئے دوکاندار لوگوں نے بالخصوص پیر طبقہ نے قومِ جن کی شرارت کو اس قدر اچھالا ہے کہ اس قوم کا دانش مند طبقہ بھی انسانوں کی اس بد سرشت سے انگشت بدنداں ہوگا۔

توہم پرستی تو ویسے بھی سرزمینِ ہند میں معمولِ عام تھی لیکن وہ بیماری جو موجودہ دور میں بالکل جن ظاہر ہوئی ہے انتہائی خطرناک عبرتناک اور افسوسناک ہے لوگوں نے اس کو ایک مستقل فن بنالیا ہے اور لوگوں میں جن نکالنے کی ٹریننگ حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ

فن اس سے بھی زیادہ دلچسپی کا موجب بن گیا ہے کہ اس میں عورتوں کی آمد زیادہ ہے اور شیطان نے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جو جال بچھایا ہے اس کے حُسن ترتیب یا کمالِ فریب کا ہی نتیجہ ہے جو عورت اپنے شوہر سے یا ماں باپ سے کسی وجہ سے ناراض ہو یا اس کا کوئی مطالبہ نہ مانا جا رہا ہو اس کو شیطان اس راستہ پر آسانی سے دھکیل کر لے آتا ہے پس وہ اس داؤ سے مردوں کے دماغوں پر سوار ہو جاتی ہے اور جو چاہتی ہے کرتی ہے اور روایات میں ہے کہ عورتیں شیطان کا جال ہیں۔ ہم بچپنے کے زمانہ میں جن نکالنے کے اڈے بہت کم سنتے تھے لیکن اب جو اس صنعت نے ترقی کی ہے۔ پاکستان میں کسی دوسری صنعت کو ایسا فروغ حاصل نہ ہوا ہوگا۔ میرے اندازہ سے تقریباً ہر شہر میں اس کا چھوٹا یا بڑا اڈہ ضرور موجود ہے اور اکثر جن نکالنے کے فن کار انتہائی غنڈے قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور بالخصوص جنوں کے گرفتار مریض کو ڈھول طبلے کی پر کشش تھاپوں سے اس قدر مسحور کر لیا جاتا ہے کہ وہ ان کے کانوں میں شراب کے نشہ سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے یہ لوگ پھر انتہائی غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ زبان کو زیبا نہیں اور قلم کو ایسے شرمناک بیانات سے جھجک محسوس ہوتی ہے۔ بس خاموشی ہی بھلی۔

اگر قوم جن میں کوئی خدا پرست طبقہ اس وقت موجود ہے جو غیرت وحمیت کی دولت اپنے پاس رکھتا ہو اور میری یہ گزارشات بھی ان تک پہنچ جائیں تو میں ان سے پُر زور سفارش کروں گا کہ اپنی قوم کو اس بدنامی سے محفوظ رکھیے اور چونکہ جن وانسان مقصدِ عبادت میں شریک ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا ایسے غنڈوں کو اس طرزِ عمل سے باز رکھنے میں قدم بڑھائیے تاکہ ناموسِ انسانیت بھی تباہ نہ ہو اور قوم جن کا وقار بھی مجروح نہ ہو اور قوم جن کو حق حاصل ہے کہ ان کی قوم کی بدنامی کا سامان مہیا کرنے والے دوکانداروں کو ہی وہ اپنی گرفت میں لائیں تاکہ باقی انسانوں کو ان کے شر سے نجات حاصل ہو اور وہ بھی ان کے شر سے محفوظ رہیں

اب تو یہ وبا اس قدر عام ہے کہ جس بیمار کی بیماری کو نیم طبیب لوگ معلوم نہ کر سکیں اور ان کا علاجِ مؤثر ان کے پاس نہ ہو تو اپنی نااہلیت کو چھپانے کا ان کو بہانہ مل جاتا ہے فوراً کہہ دیتے ہیں کہ اس کو جن ہے بس طبیب کا بھرم رہ گیا اور بیمار کا ستیاناس ہو گیا اس نے اس وہم کو مول لے کر اپنے پورے خاندان کی شرافت وغیرت کا بیڑا غرق کر دیا اور میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اس بیماری کا شکار عورتیں ہی زیادہ ہوا کرتی ہیں میں اس کا انکار نہیں کرتا

کہ جن بھی اذیتیں دیتے ہیں یعنی ان میں جو غنڈہ عنصر ہے وہ ایسا کرتا ہوگا۔ چنانچہ حرز و تعویذ کا وجود اس امر کا شاہد ہے لیکن میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ اکثر تی رجحان محض دوکانداری اور فریب کاری ہے خدا مومنوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

عرش اعظم و کرسی

علمائے ہیئت نے جو بیان کیا ہے اس کے مطابق اس کو فلک اعظم یا فلک الافلاک کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ نو آسمانوں کے قائل ہیں سات پہلے پھر آٹھواں فلک البروج جسے شرعی اصطلاح میں کرسی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور نواں عرش ہے علم ہیئت والوں کے نزدیک تمام ستارگان اور بروج آسمان ہشتم یعنی فلک البروج میں ہیں بعض احادیث بھی اس ترتیب کو ثابت کرتی ہیں مثلاً یہ کہ آسمانوں اور زمینوں کی حیثیت کرسی کے مقابلہ میں اسی طرح ہے۔ جیسے ایک انگوٹھی کا چھلا ایک وسیع جنگل میں اور کرسی کی نسبت عرش کے مقابلہ میں بعینہ یہی ہے ابھی ابھی ملائکہ کی کثرت کے بیان میں بھی عرش و کرسی کی عظمت جرمی بیان ہو چکی ہے اس لحاظ سے عرش کرسی پر حاوی ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے وسیع ہے پس خداوندکریم کا عرش پر ہونا اس طرح نہیں جس طرح بادشاہانِ دنیا اپنے تخت پر جلوہ گر ہوا کرتے ہیں کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ خدا جسم و جسمانیات سے پاک و منزا ہے اور اس سے کوئی مقام خالی نہیں ہے پس قرآن مجید میں جہاں عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى موجود ہے کہ رحمٰن عرش پر جلوہ گر ہے اس استواء اور جلوہ گری کا معنی تسلط کامل ہے نہ کہ بیٹھنا جو جسمانیات کی شان سے ہے۔ اور عربی زبان میں استواء استیلا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا معنی تسلط و تصرف کامل ہے لیکن آئمہ معصومینؑ کے کلام میں عرش کی دو تاویلیں اور بھی منقول ہیں جیسے کہ شیخ صدوقؒ نے عقائد میں تحریر فرمایا ہے چنانچہ وہ باب الاعتقاد فی العرش میں فرماتے ہیں عرش کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ جمیع مخلوق کے مجموعہ کا نام ہے اور دوسری تاویل اس کی یہ ہے کہ اس سے مراد علم ہے اور حضرت امام صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کا مطلب کیا ہے تو آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ اپنی جملہ مخلوق سے برابر برابر نسبت رکھتا ہے کوئی شئی دوسری چیز کی بہ نسبت اس سے قریب تر نہیں ہے۔ پہلا معنی یعنی اگر جمیع خلق کا مجموعہ لیا جائے تو اس کے عرش کے حاملین آٹھ فرشتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی آٹھ آٹھ آنکھیں ہیں۔

ہیں کہ ہر آنکھ پوری دنیا پر چھا سکتی ہے تو ان میں سے ایک آدمی کی شکل کا ہے اور وہ بنی آدم کے لئے خدا سے رزق طلب کرتا ہے دوسرا بیل کی شکل میں ہے جو حیوانات کے لئے خدا سے رزق طلب کرتا ہے تیسرا شیر کی شکل کا ہے جو درندوں کے لئے خدا سے رزق مانگتا ہے اور چوتھا مرغ کی شکل میں ہے جو پرندوں کے لئے رزق طلب کرتا ہے۔ پس دنیا میں یہ چار ہیں اور آخرت میں آٹھ ہوں گے۔ دوسرا معنی یعنی اگر اس کی تاویل علم سے کی جائے تو اولین میں سے اس کے حاملین چار ہیں حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور آخرین میں سے اس کے حاملین چار ہیں حضرت محمد مصطفیٰؐ حضرت علیؑ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ اور عرش کے بارے میں آئمہ طاہرینؑ سے یہ مطلب احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

پہلے معنی کے لحاظ سے حاملین عرش سے مراد نظام تکوین کے تدبیر کرنے والے ملائکہ ہیں اور چونکہ ذی روح مخلوق کے نظام سے ہی باقی نظام وابستہ ہے۔ لہٰذا ان کی چار قسموں کے لئے ایک ایک ملک مقرر ہے اور یہ کہ ملک کی شکل آدمی یا بیل یا شیر یا مرغ کی ہے اس بنا پر کہ ملائکہ ہر شکل میں آ سکتے ہیں یا یہ کہ افہام انسانی سے قریب کرنے کے لئے مطلب کی ادائیگی کو تمثیل کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور علم کی صورت میں سابق میں سے چار نبیوں کا اختیار اس لحاظ سے ہے کہ وہ صاحبانِ شریعت تھے اور باقی نبی انہی کی شریعت کے تابع تھے لہٰذا انہی کو مرکزیت حاصل تھی اور آخرین میں سے اصحاب کساؑ کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ مخفی نہیں اور باقی آئمہ ان ہی کے نقش قدم پر ہی چلنے والے ہیں۔

گویا ہمارے بیان میں عرش کے تین معانی ہو گئے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے فلک الافلاک یا عرش اعظم اور استوار سے مراد تسلط و تصرف کامل ہے پس اللہ نظام تکوینی میں اس تصرف کامل کا واحد مالک ہے اور دوسرا معنی اس نظام تکوینی کی تعبیر ہے جس کے مدبر چار فرشتے مقرر ہیں اور نظام تکوینی نظام تشریعی کا مقدمہ ہے اور تیسرا معنی علم اس نظام تشریعی کی تعبیر ہے جس کے ناظم اولین میں سے چار اولوالعزم پیغمبر تھے اور آخرین میں سے اصحاب کساؑ ہیں اور اللہ کا عرش پر مسلط ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ نظام کائنات کی دونو تدبیروں کا مختار اعلیٰ اور سربراہ حقیقی ہے خواہ تدبیر تکوینی ہو یا تدبیر تشریعی۔ پس الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی اس کے تصرف کامل اور اختیار کلی کا اعلان

ہے اور شرعی اصطلاحات میں عرش و کرسی دونوں سے ایک ہی معنی مراد لیا جاتا ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِحَقَائِقِ الْاُمُوْرِ۔

افلاک کا معنی

اگرچہ اس قسم کی بحثوں کا دین و مذہب سے واسطہ نہیں ہے لیکن دورِ حاضر کی نئی تحقیقات اور نت نئے انکشافات چونکہ علوم و اسرار کے عجیب و غریب خزائن مخفیہ کو سامنے لا رہے ہیں جن کی طرف کلامِ پیغمبر میں یا فرمانِ شہِ ولایت میں کچھ نہ کچھ اشارات موجود ہیں جن کو تاحال قابلِ توجہ قرار نہ دیا گیا تھا اس لئے ان مطالب کو یکسر نظر انداز کرنا شاید مستحسن نہ ہو پس یہ جاننا چاہیے کہ سابق ہیئت دان افلاک کی تعداد نو بتایا کرتے تھے جن میں سے دو کا ذکر تو ہو گیا یعنی فلک الافلاک اور فلک البروج پہلے کو عرش اور دوسرے کو کرسی سے تعبیر کیا گیا۔ پھر ان کے نیچے پیاز کی چھلکوں کی طرح تہہ بہ تہہ علی الترتیب مریخ مشتری زحل شمس عطارد زہرہ اور قمر کے سات افلاک وہ بیان کرتے تھے جن پر نہ کوئی دلیل تھی اور نہ برہان بس کسی نے زمین پر بیٹھ کر یہ نام تجویز کر لئے اور بعد والوں نے کچھ اضافہ کے ساتھ اسے آگے بڑھا دیا اور مستقل ایک علم بن گیا۔ پھر آسمانوں میں سے ہر ایک میں متعدد جزوی افلاک تجویز کر لئے جن کی علمِ ہیئت والے چوراسی تک تعداد بیان کرتے ہیں اور کسی مطلب پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں سوائے اندازہ کے اور اذہان چونکہ انہی سمعیات تک ہی محدود تھے لہٰذا جو کچھ انہوں نے کہا مانتے چلے گئے پس آئمہ کے فرامین بھی لوگوں کی کوتاہ علمی کی بدولت محلِ استفادہ نہ بن سکے پس جنابِ سرورِ کائنات کے معراج کو مسئلہ لاینحل صرف ہیئت والوں کے بلا دلیل مسلمات کی بناء پر سمجھا گیا اور خرق و التیام کی الجھنوں میں پھنس کر لوگ ایک آشکار حقیقت سے غافل ہو گئے۔ ان کے پاس نہ تدبیر کے تیز ناخن موجود تھے جو ذہن میں پڑی ہوئی اس گرہ کو کھول سکیں اور نہ اسباب و ذرائع کے روشن فانوس ان کے پاس تھے تاکہ حقیقت اور بناوٹ میں امتیاز پیدا کر سکیں اب جو مادہ میں منازلِ ارتقاء طے کرنے والوں نے استخدام و تسخیرِ موجودات کی طرف اسباب و ذرائع کی وسعت و فراوانی کے ساتھ آگے قدم بڑھایا ہے۔ تو وہ معمے خود بخود حل ہونے لگ گئے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا دعویٰ کہ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ فَاِنِّیْ اَعْرَفُ بِطُرُقِ السَّمٰوٰتِ مِنَ الْاَرْضِ یعنی مجھ سے سوال کرو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ کیونکہ میں زمین کی بہ نسبت آسمانوں کے راستوں کو زیادہ جاننے والا ہوں یا یہ کہ پستیوں

کی بجائے مجھے بلندیوں کے طرق زیادہ معلوم ہیں۔ اس وقت تک آپ کا یہ فرمان صرف
املقۂ لسانی یا ہمہ زبانی تک محدود بنا ہوا تھا کہ مغرب سے اٹھنے والی آوازوں کی دھمک
نے کانوں کے پردے پھاڑ کر دماغ میں یہ بات پہنچا دی کہ اے تم کس غفلت میں پڑے
رہے علیؑ تو ایک بہت بلند مقصد کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ اے انسانو! مجھے ایک
اپنے جیسا معمولی انسان نہ سمجھو تمہیں تو زمین پر رہتے ہوئے زمین کے مسائل سلجھانے کا علم ہی
نہیں لیکن میں تم میں رہ کر اور زمین پر بیٹھ کر آسمانوں کی راہوں کو عبور کر سکتا ہوں اور تمہیں
آسمانی منازل طے کرنے اور علو و ارتفاع کے زینے سر کرنے کی یہاں سے تدبیریں بتا سکتا
ہوں یعنی مجھے صرف حلال و حرام اور ثواب و گناہ کے مسائل تک محدود نہ سمجھو بلکہ اگر میرے
ذرایعہ سے مادی دنیا میں قدم آگے بڑھانا چاہو تو میں وہ مفکر ہوں کہ زمین کے مخفی دفینوں
سے اور مادہ کے اسرارِ خفیہ سے آسمانوں کی بلندیوں اور اس کے راہوں کو طے کرنا آسان
بنا سکتا ہوں۔ علیؑ کا یہ دعویٰ سن کر علم ہیئت کے ڈھکوسلوں سے متاثر سنجیدہ اذہان اور
صرف حلال و حرام تک مسائل کو سمجھ سکنے والے سادہ عوام تو خاموش رہے لیکن بدوی لوگ
جن کو حقائق سے دور تک کا واسطہ نہ تھا نہ وہ مادی مسائل سلجھانے کے اہل نہ شرعی مطالب
کے چنداں دلدادہ تھے وہ ابھرے کسی نے پوچھا۔ اچھا بتائیے میری مونچھوں کے بال کتنے
ہیں۔ کسی نے کہا میرے سر کے بال گن دیجئے! حضرت امیر علیہ السلام اس پس ماندہ ذہنیت
کا جائزہ لینے کے بعد خاموش ہو گئے یا یہ فرمایا کہ تمہارے ایک ایک بال کے نیچے ایک
ایک شیطان موجود ہے یعنی اس قدر طبیعت میں کوفت محسوس ہوئی کہ ان کو جواب تک
دینا تو بجائے خود منہ لگانا بھی پسند نہ کیا۔ آج مغرب والے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہتے
ہیں کہ کاش ایسا عالم ہمیں نصیب ہوتا تو چاند تک راکٹ آج کی بجائے آج سے تیرہ سو
سال قبل پہنچ جاتا اور وہاں ہمارا جھنڈا لہراتا نظر آتا۔

میں دور چلا گیا مقصد یہ ہے کہ آسمانوں کی اُوپر کی وضع قطع مل کر پیاز کے چھلکوں کی
طرح تہہ بہ تہہ ہونا اور پھر ہر ایک کی حیرت ناک موٹائی اور ستاروں کا آٹھویں آسمان یعنی
کرسی میں جڑا ہوا ہونا ناقابلِ فہم مسائل تھے جن کو موجودہ تحقیقات و انکشافات نے قابلِ فہم
بنا دیا کیونکہ آسمان سے مراد صرف جہتِ علو ہے اور بارش کا آسمانوں سے نازل ہونے
کا بھی یہی مطلب ہے کہ بلندی کی طرف سے آتی ہے جس کو ہم نے ایک موٹا جسم فرض

کر رکھا تھا اور فلک سے مراد ایک دائرہ ہے جس پر ستارے یا سیارے اپنی معینہ و مقررہ حالت پر نظام تکوین کے ماتحت گردش کرتے ہیں ورنہ اگر وہ جسم مان لیا جائے جس کو علم ہیئت والے خرق والتیام سے پاک ومنزہ تصور کئے ہوئے تھے۔ تو روس یا امریکہ کے چشم دید راکٹوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا اور خلا کی قسم دین اور قرآن تو ان جدید افکار و انظار کے لئے محض محل تمسخر ہی بن کر رہ جائے گا۔ پس کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ کا یہی مطلب ہے کہ چاند سورج ستارے سب اپنے دائرہ معینہ پر نظام قدرت کے ماتحت گردش کرتے ہیں گویا فلک اسی دائرہ گردش کا نام ہے جس پر اجرام سماویہ کی گردش جاری ہے پس ہر ستارے کا مدار اس کا فلک ہے اور اس لحاظ سے بے حد و حساب افلاک ہیں جو شمار نہیں کئے جا سکتے اور موجودہ تحقیقات نے تو معراج کے مسئلہ کو سمجھنے میں خوب مدد دی ہے اور قرآن مجید میں جس مقام پر چیلنج ہے کہ اگر تمہاری طاقت میں ہے تو اقطار سموٰت سے نفوذ کر جاؤ حالانکہ تم ایسا نہیں کر سکتے ہو تو نفوذ کا معنی داخل ہونا نہیں بلکہ اس سے بڑھ جانا ہے گویا حضرت رسالتمآبؐ کے معراج نے بلندیوں کو سر کرنے کی دعوت دی اور حضرت علیؑ نے جھنجھوڑ کر جائزہ لینا چاہا کہ آیا وہ اس قابل بھی ہیں کہ ان کو ظاہری ترقیوں کے اسباب بتائے جائیں تو جب دیکھا کہ ابھی انسان اس مقام سے بہت پیچھے ہے پس اس بارے میں خاموشی اختیار کر لی اور باقی آئمہ علیہم السلام عوامی اصطلاحات کے پیش نظر لوگوں سے باتیں کرتے رہے کیونکہ ان کے اذہان کے مطابق کلام کرنا ہی ان کی شان تھی۔ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ لیکن ساتھ ساتھ یہ بتاتے چلے گئے کہ ایک دور آئے گا جس میں لوگ آگے بڑھنے کی اہلیت رکھتے ہوں گے پس چرخ چہارم کا کرسی نشین اگر معاون بلکہ مقتدی ہوگا اور عالم علو سے حضرت جبرئیل اس فاتح اعظم کی آمد کا اعلان کریں گے۔ پس زمین اپنے تمام خزائن پیش کرے گی اور جن جن زمین کے خزانوں تک موجودہ ترقی یافتہ طبقہ نہ پہنچ سکا ہوگا۔ ان کے لئے وہ کھل جائیں گے اور ایک حیرت انگیز انداز سے وہ عالم کو فتح کر کے اسلام کا علم ہر جگہ لہرائیں گے

لوح و قلم کے متعلق عقیدہ

شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہٗ نے عقائد میں فرمایا ہے کہ اِنَّهُمَا مَلَکَانِ یہ دونوں فرشتے ہیں اور معانی الاخبار میں انہی سے ایک مضمون کی ایک روایت بھی مروی ہے لیکن علمائے ملت کو اس معنی میں ان

سے کافی اختلاف ہے اور قرآن مجید کا فرمان بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ کہ یہ قرآن مجید لوح محفوظ میں ہے آیت کا ظاہر مرحوم صدوق کی تائید نہیں کرتا اور مشہور یہی ہے کہ لوح ایک نورانی تختی ہے جس پر تمام علوم منقوش ہیں خواہ اس تختی کی جو بھی کیفیت ہے اور خواہ تحریر کسی بھی کیفیت یا طریقہ سے ہو۔ اور قلم کے متعلق بھی ایسا ہی وارد ہے کہ اس کو پیدا کرنے کے بعد حکم دیا گیا کہ لوح پر لکھ تو اس نے مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ کے علوم لکھ دیئے۔ بہرکیف لوح و قلم کے متعلق اجمالی اعتقاد رکھنا ہی کافی ہے۔ ان کی تفصیل کو جاننا غیر ضروری ہے۔

البیت المعمور

کعبہ کی محاذات میں عالم بالا میں ایک مقام ہے جو ملائکہ سما کا قبلہ ہے جس طرح کعبہ زمین والوں کا قبلہ ہے اور روایت میں اس کا برج چہارم پر ہونا منقول ہے اسی مقام پر شب معراج حضورؐ گئے تھے اور جبرئیل نے اذان کہی تھی اور گزشتہ تمام انبیاء نے آپ کے پیچھے نماز ادا کی تھی اور یہ آیت بھی اسی مقام پر اتری تھی وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا الآیہ اور آپ نے پوچھا تو تفسیر برہان میں ہے کہ تمام نبیوں نے جواب میں کہا تھا ہم اللہ کی توحید تیری نبوت اور علیؑ کی ولایت پر مبعوث ہوئے ہیں اور ینابیع المودۃ میں بھی یہ روایت موجود ہے نیز تفسیر نیشاپوری سے بھی منقول کی جاتی ہے۔

کعبہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا ہے وہ کعبہ ہے جو ہزاروں برکتوں کا سرچشمہ اور ہدایت کا بلند ترین مینار ہے چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ بتحقیق پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ درحالیکہ وہ بابرکت اور عالمین کا ہادی ہے اس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بحکم پروردگار کی تھی اور حضرت اسمٰعیل اینٹیں اٹھا اٹھا کر دیتے تھے اور روایات میں ہے کہ کعبہ کی زمین سب زمینوں سے پہلے سطح آب پر بچھائی گئی پس یہ پوری زمین کا دل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد کئی دفعہ اس کی تعمیر ہوئی۔ ہم نے تفسیر انوار النجف کی چوتھی جلد میں ایک جامع بیان لکھا ہے جس میں کعبہ کی مختصر تاریخ موجود ہے۔ ہمارے نزدیک کعبہ کی عزت واجب ہے اور اس کی توہین صرف گناہ نہیں بلکہ موجب کفر ہے کعبہ کو اہل اسلام

سے متعدد تعلقات ہیں۔

۱) آیاتِ بیّنات اس میں ہیں جن کی تعظیم واجب ہے۔

۲) تمام مسلمانوں کا مسلّم طور پر قبلہ ہے نمازوں میں اس کی طرف رُخ کرنا ذبح کے وقت ذابح و مذبوح کا اس کی طرف متوجّہ ہونا اور مرنے والے کا اس کی طرف منہ کرنا بوقت غسل میّت کا ایک طریق خاص سے اس کی طرف رُخ کرنا اور دفن کے وقت داہنے پہلو پر میّت کو لٹانا کہ کعبہ کی طرف اس کا منہ ہو جائے ضروری ہے۔

۳) حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی جائے ولادت ہے اور کتب فریقین سے یہ بات تسلیم شدہ ہے۔

۴) یہ گھر بیت اللہ ہے اور اسلام کی مقدّس عبادت حج کا فریضہ اسی جگہ ادا ہوتا ہے

۵) شیعوں کے لئے اس میں اور بھی ایمانی روابط ہیں کہ ام الائمہ جناب فاطمہ بنتِ اسد کے لئے اس کی دیوار شگافتہ ہوئی تھی۔

۶) شیعوں کے لئے ایک یادگار مصیبت بھی ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے احرام تڑوائے گئے اور ان کو حج کا موقعہ نہ دیا گیا تھا۔

۷) حضرت قائم آلِ محمدؑ بھی پہلے پہل بوقتِ ظہور کعبہ میں ہی تشریف لائیں گے اور یہیں سے اعلان کریں گے۔

۸) کعبہ کی وجہ سے مکّہ اور اس کا گرد و نواح حرم پروردگار ہے جو جائے امن قرار دیا گیا۔

۹) حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیل کی وجہ سے تمام اہلِ اسلام کے دل اس کی طرف جھکتے ہیں، کیونکہ ملّتِ ابراہیمیؑ پر چلنے کا ان کو حکم دیا گیا ہے۔

۱۰) اسی کعبہ میں ہی حضرت امیر علیہ السلام کو دوشِ پیغمبر پر قدم رکھنے کا موقعہ ملا تھا جو نورٌ علیٰ نور کی تفسیر تھی اور انہوں نے بُت شکنی کا فریضہ ادا فرمایا تھا بہر کیف کعبہ کو باقی زمینوں سے بجا شرف حاصل ہے کہ یہ تمام دنیا کے لئے بیت اللہ کے لقب سے ملقب ہوا ہے اور سلطان و گدا نبی و ولی و امام و مقتدی سب کی اسی کی طرف گردنیں جھکتی ہیں اور کعبہ کی تولیّت کا بجا شرف حضرت ابو طالبؑ کو حاصل تھا جس کی بدولت تمام قبائل اس کے سامنے غلامانہ حیثیت سے پیش آتے تھے۔ خدا سے دعا ہے کہ اپنے مقدّس گھر کی زیارت نصیب فرمائے اور فریضۂ حج ادا کرنے کی

توفیق عنایت کرے (بفضلِ خدا ہماری دُعا مقبول ہوئی اور اسی سال ۱۹۶۶ء مطابق ۱۳۸۶ھ اپنی بیوی اور والدین کے ہمراہ فریضۂ حج کو ادا کر کے بخیریت واپس پہنچا ہوں۔)

آیاتِ بیّنات

کعبہ میں وہ اشیاء یا خواص جن کو پروردگار عالم نے قرآن میں آیاتِ بیّنات سے تعبیر فرمایا ہے۔

① مقامِ ابراہیمؑ — بعض کہتے ہیں یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت اسمٰعیلؑ کی زوجہ نے آپ کو نہلایا تھا بعض نے کہا ہے کہ یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر آپ نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تھی اور اس پر آپ کے قدموں کے نشانات باقی ہیں اور وہ آج تک زندہ معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

② حجرِ اسود — مروی ہے کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ جنت سے اترا تھا اور یہ بروزِ محشر اپنے زائرین کی گواہی دے گا اس نے بصورتِ اعجاز حضرت امام علی زین العابدینؑ کی امامت کی گواہی دی تھی جب کہ آپ کا حضرت محمد حنفیہ سے ظاہری نزاع تھا اور اس کا اعجازی پہلو یہ بھی ہے کہ اس کو کبھی غیر معصوم نصب نہ کر سکا۔

③ حطیم — یہ وہ مقام ہے جہاں پر حضرت آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی اور کعبہ کی زمین کا اشرف حصّہ یہی مقام ہے۔

④ زمزم — یہ وہ پانی ہے جو حضرت اسمٰعیل کے پاؤں کی برکت سے نکلا تھا جب کہ آپ بچپنے کے عالم میں پیاس کی شدّت سے تڑپ رہے تھے اور حضرت ہاجرہ ماتا کی محبت میں کوہِ صفا، کوہِ مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑ رہی تھی اس پانی کو خدا نے آبِ شفا بنا دیا تو وہ مٹی خاکِ شفا کیسے نہ ہو گی جس پر دین کی حفاظت کی خاطر فخرِ اسمٰعیل کی قربانی ہوئی اور فخرِ ہاجرہ کا کلیجہ زخمی ہُوا۔

⑤ صفا و مروہ — یہ وہ پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان تلاشِ آب میں حضرت ہاجرہ سات مرتبہ دوڑی تھی اور اب تک وہ دوڑنا حاجیوں کے لئے فرض ہے۔

⑥ اس مقام پر اہلی جانور وحشی درندوں سے نہیں ڈرتے۔ چنانچہ دورانِ حج میں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جبکہ مسجد الحرام میں بیٹھے تھے ایک بلی کبوتروں کے جھنڈ میں داخل ہوئی جو دانہ کھا رہے تھے پس اس نے چکّر لگا کر ایک کبوتر کو پکڑ لیا اور چلی گئی حالانکہ دستور یہ ہے کہ بلی کو دیکھ کر کبوتر بھاگ جایا کرتے ہیں لیکن وہاں یہ بات نہ تھی نہ اس کی آمد سے

ذکر بھی کر دیتے ہیں کا شیعی معتقدات سے تعلق ہے ایک مسجد کوفہ اور دوسرے حرم حسینؑ۔

مسجد کوفہ

حدیث میں وارد ہے کہ یہ جنّت کے باغات میں سے ایک باغ ہے اس میں ایک ہزار ستر نبیوں نے نماز پڑھی ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اس میں ایک ہزار نبی اور ایک ہزار وصی نے نماز ادا کی ہے۔ بلکہ ایک روایت میں ہے کہ کوئی عبد صالح نہیں گزرا جس نے اس مسجد میں نماز ادا نہ کی ہو حتیٰ کہ شب معراج حضرت رسالتمآبؐ نے بھی اس میں نماز ادا فرمائی۔ اس مسجد میں نماز فرائض ایک ہزار کے برابر اور نافلہ پانچسو کے برابر ہے اس مسجد میں بغیر تلاوت و عبادت بیٹھنا بھی عبادت ہے۔ پہلے پہل اس کا نشان حضرت آدمؑ نے قائم کیا تھا۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ حرم خدا و رسول کے بعد کونسی زمین اشرف ہے تو آپ نے فرمایا کوفہ۔ یہ پاک و پاکیزہ ٹکڑا ہے اس میں انبیاء و اوصیاء کی قبریں ہیں۔ اس میں مسجد ہے جس میں ہر نبی نے نماز ادا کی ہے اسی میں اللہ کا عدل قائم ہوگا (شاید اس سے حضرت قائم آلِ محمدؑ کی دولت ساطعہ مراد ہو۔)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کا حرم اور نبیؐ و علیؑ کا حرم بھی ہے۔ اس میں ایک نماز ایک لاکھ کے برابر ہے اور ایک درہم راہِ خدا میں خرچ کرنا ایک لاکھ خرچ کے برابر ہے اور مدینہ اللہ نبیؐ و علیؑ کا حرم ہے اس میں ایک نماز دس ہزار کے برابر اور ایک درہم کا خرچ دس ہزار درہم کے برابر ہے اور کوفہ اللہ و نبیؐ و علیؑ کا حرم ہے اس میں ایک نماز ایک ہزار نماز کے برابر ہے حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ایک دن فرمایا اے اہل کوفہ تم کو اللہ نے ایک ایسی چیز عطا کی ہے جو اور کسی کو عطا نہیں ہوئی۔ تمہاری جائے عبادت آدمؑ کا گھر، نوحؑ کا گھر اور ادریسؑ کا گھر ہے حضرت ابراہیمؑ کا حضرت خضرؑ اور میرا مصلّا ہے اور تمہاری مسجد ان چاروں مسجدوں میں سے ہے جن کو خدا نے چنا ہے (مسجد نبوی، مسجد الحرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد کوفہ) یہ مسجد بروز محشر اپنے اہل کے لئے اور ان لوگوں کے لئے شفاعت کرے گی جنہوں نے اس میں نماز پڑھی ہوگی اور اس کی شفاعت قبول ہوگی۔ اور زمانہ نہ گزرے گا کہ اسی میں حجر اسود نصب ہوگا (شائد زمانہ قائم آل محمد علیہ السلام مراد ہو) اور ایک زمانہ آئے گا کہ یہ مسجد حضرت مہدیؑ کا مصلا ہوگی۔ جو میری اولاد سے ہوگا اور ہر مومن کا مصلیٰ ہوگا اور مومن جہاں بھی ہوں گے اس میں اکٹھے ہوں گے پس اس کو نہ چھوڑو اور اللہ کی خوشنودی کی خاطر اس میں

نماز ادا کیا کرو۔ اور اللہ سے اپنی حاجات طلب کیا کرو۔ اگر لوگ اس کی برکات کو جانتے ہوتے تو اس کی طرف اطرافِ زمین سے کھچ کر آ جاتے۔ اگرچہ برف پر ہی ان کو چلنا پڑتا۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۴)

حرم حسینؑ زمین کربلا

بعض روایات میں ہے کہ ایک دفعہ زمین کعبہ نے اپنی برتری پر ناز کیا کہ مجھ جیسا کون ہے میں کعبہ کا مسکن ہوں تو فوراً وحی الٰہی ہوئی۔ خاموش اے زمین کعبہ۔ کربلا کی زمین کے مقابلہ میں تیری فضیلت کو وہ نسبت ہے جو ڈوبی سوزن کے پانی کو سمندر سے اگر وہ زمین اور اس کے ساکن کو میں خلق نہ کرتا تو تجھے پیدا نہ کرتا اور نہ تیرا کعبہ ہوتا (مرادی ترجمہ کیا گیا ہے) سفینۃ البحار

اس حدیث میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو کعبہ کی طرف جھکتے ہیں اور کربلا والوں کو پس پشت ڈالتے ہیں جو کعبہ کی حرمت کا باعث بنے یعنی انسانوں کو صرف کعبہ کی طرف جھک کر بخشش کا یقین نہیں کر لینا چاہیے جب تک اس محسن کو نہ پہچانیں جس نے اپنے خونِ گلو سے کعبہ کی توقیر و عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ خدا کی قسم اگر ان کی سرفروشی نہ ہوتی اور ان کی قربانیوں سے اسلام کی حفاظتی حصار کی تعمیر نہ ہوتی۔ تو اسلامی ڈھانچے کو یزیدی طاغوتی حملے روحِ ایمان سے کھوکھلا کر کے رکھ دیتے نہ اسلام رہتا نہ بیت اللہ کی حرمت رہتی اور نہ حج کرنے والے رہتے پس حسینؑ نے بیت اللہ کی لاج رکھ لی۔ اس میں شک نہیں کہ مدینہ منورہ ہدایتِ خلق کا سرچشمہ رہا ہے لیکن ایک وقت محدود کے لئے کیونکہ یہ ناقابلِ فراموش تاریخی حقیقت ہے کہ جب اسلامی شرعی حدود کی پامالی کے لئے اموی سلاطین جور نے اپنی اندھا دھند پیش قدمی سے اسلامیانِ عالم کو ظلم و استبداد کے اوچھے حربوں سے مرعوب کر لیا۔ اور تعلیماتِ اسلامیہ کو چیلنج کرتے ہوئے لغزیت کے زرانی چہرہ پر اپنی بداعمالیوں کی نجاستوں کی گندگی کو ڈالنا چاہا اور اسے داغدار بنانے کے لئے ہر ممکن طریقہ کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑے بڑوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا لیا تو صرف حسینؑ بن علیؑ کا وجودِ مسعود تھا جو اس کی غلامانہ طوفانی شیطانی لہروں کے سامنے کوہِ گراں بن کر سینہ تن کے کھڑا ہو گیا اور اپنی پوری کوششوں سے استبدادی حربوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت پی کر اسلام کی بقا و حیاتِ جاودانی کی تحریر اپنے خونِ ناحق سے صفحۂ کربلا پر لکھ دی

اور پھر بتول زادیوں نے اپنے خطبات و اعلانات اور صبر و رضا کے مظاہرات سے اس تحریک کو ایسا چمکایا کہ قیامت تک کے لئے تمام اقوام عالم کو حق و ناحق کے درمیان فیصلہ اپنی اپنی منزلوں میں منظر آگیا پس خداوند کریم نے زمین کربلا کو جو خصوصیات عطا فرمائیں وہ یہ ہیں۔

(۱) زلزلہ قیامت کے وقت اس زمین کو اٹھالیا جائے گا اور یہ خطہ جنّت کے تمام خطوں سے اشرف و افضل ہوگا۔ جنّت کے باغات میں یہ زمین اس طرح چمکے گی جیسے کوکب دری باقی ستاروں میں چمکتا دمکتا ہے حتاکہ تمام اہلِ محشر خیرگی محسوس کریں گے۔ الخبر

(۲) خاک شفا کی تسبیح سے استغفار کرنا ستر گنا زیادتی ثواب کا موجب ہے۔

(۳) خاک شفا کی تسبیح کا ہاتھ میں رکھنا دوسری عام تسبیحوں پر پڑھنے کے برابر ہے۔

(۴) خاکِ شفا پر سجدہ کرنے سے عبادت کی رکاوٹ کے سات حجابات دور ہو جاتے ہیں اور نماز مقبول ہوتی ہے۔

(۵) خاک شفا کا پاس رکھنا خطرات سے بچنے کا تعویذ و حرز ہے بشرطیکہ بغرض حفاظت اپنے پاس رکھے۔

(۶) اگر سامانِ تجارت میں خاکِ شفا کو رکھا جائے تو تجارت میں برکت ہوتی ہے۔

(۷) نوزائیدہ بچے کے حلق میں ڈالنا اس کی امن و سلامتی کا باعث ہے۔

(۸) میّت کے ساتھ قبر میں رکھنا عذابِ قبر سے امان کا باعث ہے۔

(۹) زمین کربلا میں دفن ہونے والا بلا حساب جنّت میں جائے گا۔ جس طرح نجف میں دفن ہونے والا عذابِ قبر سے محفوظ ہوگا۔

(۱۰) زمین پر اترنے والے فرشتے جب واپس جاتے ہیں تو حورانِ جنّت ان سے خاکِ شفا بطور تحفہ طلب کرتی ہیں۔

(۱۱) یہی زمین حضرت عیسیٰؑ کی ولادت گاہ ہے۔

(۱۲) حضرت موسیٰؑ کو بھی اس زمین میں شرفِ کلام حاصل ہوا تھا۔

(۱۳) اس مقدس زمین پر واقعاتِ کربلا سے قبل دو سو نبی اور دو سو وصی اور دو سو سبط دفن ہوئے جو درجہ شہادت پر فائز تھے (مختصر از خصائص حسینیہ)

ہم نے ان خصوصیات کو تفسیر انوار النجف میں اور زیادہ بسیط لکھا ہے۔

ان چار حرموں کی باقی تمام زمین کے خطّوں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کو مسافر دورانِ سفر میں بھی اپنا گھر قرار دے سکتا ہے پس مسافر حالتِ سفر میں ان چار مقامات پر نماز قصر و اتمام میں صاحبِ اختیار ہے چاہے پوری پڑھے اور چاہے قصر پڑھے یعنی مسجد الحرام، مسجد نبوی، مسجد کوفہ اور حرم سیّد الشہداء بعض علمائے اعلام نے باقی مشاہد مشرفہ کو بھی اس حکم میں ان چاروں کے ساتھ شامل کیا ہے اور چونکہ زمینوں کا تذکرہ ہی ہے لہٰذا مناسب ہے کہ دو زمینوں کے اور دو خطّوں کا ذکر بھی ہو جائے جن کا شیعی معتقدات سے تعلق ہے۔

وادیٔ سلام

یہ کوفہ کے نزدیک وادی ہے جہاں حضرت علی علیہ السلام مدفون ہیں اور اس میں کافی انبیاء دفن ہو چکے ہیں اور حضرت امیر علیہ السلام کے روضہ میں حضرت آدمؑ و حضرت نوحؑ دو نبیوں کا مدفن بھی ہے چنانچہ ان کی زیارت بھی یہاں پڑھی جاتی ہے۔ حضرت آدمؑ کے تابوت کو حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے زمانہ میں اصلی مدفن سے نکال لائے تھے اور یہاں آکر دفن کیا تھا اور حضرت نوحؑ کا اصلی گھر بھی یہیں تھا۔ اور طوفان نوحؑ کا مقام بھی مسجد کوفہ میں اب تک موجود ہے بہرکیف اس وادی میں تمام مومنوں کے ارواح سکونت رکھتے ہیں حضرت ہود اور حضرت صالح کی قبریں بھی اسی وادی میں ہیں۔ میں نے ایک روایت میں پڑھا تھا کہ حضرت ابراہیم نے نجف کی زمین کا خطّہ اور وادی سلام کا رقبہ اسی نشیب میں بسنے والی ایک قوم سے خریدا تھا کیونکہ وہاں ایک شب رہے تھے اور ان کی بدولت وہاں سے زلزلہ موقوف ہو گیا تھا پس آپ نے وہ زمین اپنے نام کر لی جس کی بدولت وہ زلزلہ ہمیشہ کے لئے موقوف ہو گیا اور حضرت اسمٰعیل کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اسی زمین میں میری اولاد سے ایک ولی اللہ دفن ہوگا اور یہ ٹکڑا اس کا اور اس کے شیعوں کا مسکن و مدفن ہوگا۔ واللہ اعلم

وادیٔ برھوت

یہ وادی یمن میں ہے جو جہنمی ارواح کا مسکن ہے جیسا کہ روایات میں موجود ہے۔

بیت المقدس

اس کو مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ مقدس کا لفظ عام طور پر

دال مشدد سے ہوتا ہے۔ مُقدّس ہو لیکن اگر میم پر زبر قاف کو ساکن اور دال پر زیر ہو تو لفظ درست رہے گا یعنی مَقدِس ترکیبی لحاظ سے مصدر میمی مضاف الیہ ہو گا اور معنی ہو گا پاک رہنے کی جگہ یا تقدّس کا گھر۔ پہلی صورت میں کوئی خاص معنی نہیں بنتا لیکن وہاں بھی تقدیس سے مصدر میمی قرار دے کر مقدّس کا معنی تقدیس لیا جا سکتا ہے بہرکیف استعمال بغیر شد کے زیادہ بہتر ہے

حضور ابتداءً بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور وہ اس طرح کہ کعبہ کو درمیان میں رکھ لیتے تھے تاکہ دونوں کی طرف منہ ہو جائے لیکن جب وارد مدینہ ہوئے تو یہودیوں نے اعتراض شروع کر دیا کہ اگر آپ نبی ہوتے تو اپنا قبلہ بھی الگ بناتے پس حضورؐ نے آسمان کی طرف منہ بلند کر کے دعا مانگی جس کی حکایت قرآن مجید میں موجود ہے قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ الآیہ تحقیق ہم نے تیرا چہرہ آسمان کی طرف پھرتا ہوا دیکھا ہم ضرور تجھے ایسے قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو تجھے پسند ہے اور حضورؐ شدت سے اس امر کے منتظر تھے کہ قبلہ مجھے وہی عطا ہو جو میرے جد حضرت ابراہیمؑ کا تھا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیل کا قبلہ بھی کعبہ تھا۔

مکہ میں ۱۲ برس آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور مدینہ میں جانے کے بعد ۱۶ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کیا پس جب قبلہ کعبہ مقرر ہوا تو یہودیوں نے اعتراض کی نوعیت بدل لی اور کہنا شروع کر دیا کہ اگر پہلا قبلہ درست تھا تو اب غلطی کر رہے ہو اور اگر اب قبلہ درست ہے تو پہلے غلطی کرتے رہے ہو تو آپ نے ان کو جواب دیا کہ تمہیں خدا نے ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار سے منع فرمایا تھا اور باقی دنوں میں اجازت دی تھی اگر مچھلی کا شکار جائز ہے تو سنیچر کو کیوں حرام ہے اور اگر ناجائز ہے تو باقی ایام میں کیوں جائز ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ دونو صورتیں مصلحتِ ایزدی سے درست ہیں آپ نے فرمایا جس طرح تمہاری دونو صورتیں مصلحتِ پروردگار سے درست ہیں تو ہماری بھی اسی مصلحت کی بنا پر دونو وقت کی نمازیں درست ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ بیت المقدس ایک برگزیدہ اور مقدس مقام ہے۔ مسجد کوفہ

کے بیان میں ذکر ہوا ہے کہ یہ ان چار مساجد میں سے ہے جن کو خدا نے چن لیا ہے اور یہ مسجد بہت سے انبیاء کی عبادت گاہ ہے اس کی تعمیر حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام نے کی تھی جس کی تفصیل تفسیر انوار النجف کی جلد ۱۱ صہ ۲۲۹ پہ ملاحظہ ہو۔ حضرت زکریا اور حضرت یحیٰی دونوں اسی مسجد میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حضرت عیسیٰ اس مسجد میں کافی عرصہ وعظ فرماتے رہے حضرت مریم کی عبادت گاہ یہی مقام تھا نیز مریم کا والد عمران جو بقولے نبی تھا وہ بھی اسی مسجد میں عبادت کیا کرتے تھے، بہرکیف ہمارے نزدیک وہ مقام نہایت قابل احترام اور واجب التعظیم ہے۔ یہ مسجد ابتدائے اسلام سے مسلمانوں کے قبضہ میں رہی لیکن اس سال ۱۹۶۷ء مطابق ۱۳۸۶ھ میں اسرائیلیوں نے جہاں عربوں کے اور کافی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ وہاں انہوں نے بیت المقدس کو بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لیا

ساتواں باب

امامت کا بیان

امام کا منصوص من اللہ ہونا ضروری ہے

ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح عہدۂ نبوت کے لئے خدا خود اپنے مخصوص بندوں کو نامزد فرماتا ہے اسی طرح امامت کے لئے بھی اسی کا نامزد کردہ ہی ہونا چاہیئے کیونکہ امامت کا عہدہ رسالت و نبوت کی طرح ولایت مطلقہ کا عہدہ ہے اور اس کو سوائے معصوم کے دوسرا کوئی نہیں سنبھال سکتا۔ اور باتفاقِ جمیع مسلمانانِ عالم حضرت رسالتمآبؐ چونکہ تمام سابق انبیاء سے افضل واشرف تھے اور عالمین کیلئے نذیر تھے ان کی جگہ جو ان کا قائم مقام ہوگا وہ بھی عالمین کیلئے نذیر ہوگا۔ آپ قرآنِ مجید کے مبلغ و معلم تھے لہٰذا آپ کا قائمقام بھی وہی ہو سکتا ہے جو قرآن کا مبلغ و معلم بننے کی اہلیت رکھتا ہو۔

دیکھئے جناب رسالتمآبؐ کے پاس دو قسم کا اقتدار تھا ایک دنیاوی دوسرا دینی، دنیاوی لحاظ سے آپ سلطانِ وقت تھے لہٰذا سیاستِ مدینہ اور اس کی تدبیر آپ کے ہاتھ میں تھی اور دینی لحاظ سے آپ رسولِ اعظم تھے لہٰذا روحانی پیشوا تھے۔ اور لوگوں کے لئے بارگاہِ ربوبیت تک قرب کا وسیلہ تھے پس آپ کی مسند صرف دنیاوی نہیں تھی تاکہ جو بھی سیاستِ مدینہ کا اہل ہو وہی اس پر بیٹھ جائے بلکہ یہاں تو ایسے شخص کی ضرورت تھی جو علوم قرآنیہ میں بھی اس کا قائم مقام صحیح معنوں میں بن سکتا ہو کیونکہ آپ کی نبوت کو اولی و ذاتی حیثیت حاصل تھی۔ اور دنیاوی سیاست ثانوی حیثیت سے تھی اور یہ بعید از عقل ہے کہ قائمقام میں ثانوی حیثیت کو ملحوظ رکھا جائے اور ذاتی حیثیت کو نظر انداز کیا جائے پس اگر صحابہ میں نظر دوڑائی جائے تو سوائے علیؑ کے کوئی بھی ایسا فرد نظر نہیں آتا جو علوم نبویہ میں ان کا صحیح قائمقام بن سکتا ہو۔

کیونکہ جب ہم علمی حیثیت سے جائزہ لیں گے اور کتب فریقین سے بلا تعصب صحابہ کی صحیح پوزیشن معلوم کرنے کی کوشش کریں گے تو خدا کی قسم ہر فریق کی کتابوں میں علم کی بلند منزل پر علیؑ کا قدم ہی نظر آئے گا۔ حتیٰ کہ ہم حضرت عمر کی زبانی بھی علمی مشکلات میں پھنسنے کے بعد اور علیؑ سے مشکل کشائی کی بھیک مانگنے کے بعد یہی الفاظ سنیں گے لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ اور جناب رسالتمآبؐ سے بھی سنیں گے اقضاکم علی چنانچہ حضرت ابن عباس حبرِ امت کا قول ہے مَا عِلْمِیْ وَعِلْمُ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ فِیْ عِلْمِ عَلِیٍّ اِلَّا كَقَطْرَةٍ فِیْ سَبْعَةِ الْبَحْرِ یعنی میرا اور محمدؐ کے تمام صحابہ کا علم علیؑ کے علم کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے ایک قطرۂ آب سات سمندروں کے مقابلہ میں۔

ویسے عقلی لحاظ سے ڈاکٹر کا صحیح قائمقام ڈاکٹر ہی ہو سکتا ہے۔ وکیل کا صحیح قائمقام وکیل ہی ہو سکتا ہے ورنہ اس کی جگہ خالی رہے گی پھر ان میں بھی اگر کئی قسمیں ہوں تو ہر قسم میں قائمقامی اسی نوعیت سے ہو گی مثلاً آنکھوں کے ڈاکٹر کا قائم مقام آنکھوں کا ڈاکٹر ہی ہو گا۔ فوجداری وکیل کا قائمقام فوجداری وکیل ہی ہو گا وَعَلٰی هٰذَا الْقِیَاس۔

پس ان اصولوں کی بناء پر حضرت رسالتمآبؐ کی حیثیت اگر نبوت کی ہے تو ان کا قائمقام وہی ہو سکتا ہے جو عہدۂ نبوت کو سنبھال سکتا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ سلسلۂ نبوت کے خاتمہ کی وجہ سے اسے نبی نہ کہا جا سکے گا۔ پس عقلاً بھی عہدۂ خلافت کا حقدار وہی ہو گا جو نبی کے اوصاف رکھتا ہو اور نصاً بھی ایسا ہی ہونا چاہیے بنا بریں اجماعِ امت سے ایسے شخص کا تعین بہت مشکل ہے کیونکہ اولاً تو اہل کی شناخت بہت مشکل ہے کیونکہ کوئی کسی کے ظاہری اعمال و افعال سے تو واقف ہو سکتا ہے لیکن اس کے باطنی حالات کا پتہ صرف خالق علیم کو ہی ہو سکتا ہے پس وہی اس کو متعین کر سکتا ہے ثانیاً اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں اہل ہے تو اہل کا انتخاب کارے دارد کا مصداق ہے کیونکہ جذبات و خواہشات کے علائق بہت کم لوگوں کو راہِ راست پر چلنے دیتے ہیں چنانچہ ہم نے بڑے بڑوں کو ڈگمگاتے دیکھا ہے کہ صحیح امیدوار کو جاننے کے باوجود اس کو پیچھے ہٹانے کے درپے ہوتے ہیں لہذا نبی یا قائمقام نبی کا حق انتخاب صرف خالق کو ہی ہونا چاہیے اسی بناء پر شیعہ اجماعی خلافت کے قائل نہیں پس نبی علیہ السلام کی جگہ منبر خلافت پر وہی جلوہ گر ہو گا جو نبی کی طرح تمام امت

سے افضل ہو اور تمام صفات کمالات میں پوری اُمّت سے اکمل ہو اور واقعی طور پر چونکہ خدا ہی حقیقت کو جانتا ہے لہٰذا خلافت کا منصوص من اللہ ہونا ضروری ہے۔ اس مقصد کی پوری وضاحت ہم نے اپنی نو تصنیف کتاب "اسلامی سیاست" میں کی ہے

محمدؐ و آلِ محمدؐ تمام کائنات سے افضل ہیں

شیخ صدوق رحمہ اعتقادیہ رسالہ میں فرماتے ہیں۔ یَجِبُ اَنْ نُعْتَقِدَ اَنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ یَخْلُقْ خَلْقًا اَفْضَلَ مِنْ مُحَمَّدٍ وَالْاَئِمَّۃِ مِنْ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ اِنَّھُمْ اَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ واجب ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ تحقیق اللہ نے کوئی مخلوق محمدؐ و آلِ محمدؐ جو آئمہ ہیں سے افضل پیدا نہیں کی اور تحقیق یہ اللہ کی محبوب ترین مخلوق ہیں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ نَعْتَقِدُ اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ جَمِیْعَ الْخَلْقِ لَہٗ وَلِاَھْلِ بَیْتِہٖ وَاِنَّہٗ لَوْلَاھُمْ لَمَا خَلَقَ اللّٰہُ سُبْحَانَہُ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَلَا الْجَنَّۃَ وَلَا النَّارَ وَلَا اٰدَمَ وَلَا حَوَّا وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃَ وَلَا شَیْئًا مِمَّا خَلَقَ اور ہمارا اعتقاد ہے کہ تحقیق اللہ نے تمام مخلوق کو صرف حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ کے لئے ہی زیورِ وجود سے آراستہ فرمایا ہے اگر یہ نہ ہوتے تو خدا نہ آسمان و زمین کو بناتا نہ جنّت و نار کو پیدا کرتا نہ آدم و حوّا پیدا ہوتے اور نہ فرشتے خلق ہوتے غرضیکہ کوئی چیز منصۂ شہود پر نہ آسکتی۔

حضرت علی علیہ السلام کا مقام

اس مقام پر مجھے ہر قسم کا رطب و یابس اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ جذبات کی رو میں بہنے کو اچھا سمجھتا ہوں پس جو بات عقلِ سلیم قبول کرے اسی پر ہی عقیدہ کی تعمیر زیادہ پائیداری کی موجب ہوگی بعض لوگ قلم کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے منہ پر عقل و خرد اور فکر و نظر کی مضبوط جالی نہیں لگاتے پس وہ ہر قسم کے ہفوات اُگلنے لگ جاتی ہے میں طول کی بجائے فضیلت آلِ محمد کی چھلکتی ہوئی سلسبیل سے رحیقِ مختوم کے خالص گھونٹ پیش کروں گا جنہیں پی کر اہلِ ولاء جھوم جائیں اور اہلِ شک علم و یقین کو اپنے دامن میں لینے کی سعادت حاصل کر سکیں۔

ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ عالم اکبر میں پروردگارِ عالم کی طرف سے جاری کردہ دو نظام تکوینی و تشریعی میں سے آنحضوری یعنی تشریعی کو تکوینی پر فضیلت حاصل ہے۔ پس

یہاں نظام تشریعی میں اگر آلِ محمدؑ تمام مشرعین پر افضل ثابت ہو جائیں تو کل کائناتِ خداوندی میں ان کا افضل ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا۔ پس بفضلہٖ تعالیٰ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ جناب رسالتمآبؐ کے بعد حضرت علیؑ سے لے کر حضرت مہدیؑ تک تمام آئمہ طاہرینؑ سابق تمام انبیاءؑ سے افضل واشرف ہیں اس باب میں اجمالی دلیل تو اسی قدر ہی کافی ہے کہ جب سرکار رسالتمآبؐ سیدالانبیاء ہیں تو ان کی جگہ پر جو ان کا قائمقام ہوگا۔ اسے انبیاء سے افضل ہونا چاہیئے اور یہ عقولِ سلیمہ کے لئے بدیہی ہے کیونکہ ضلعی حاکم کا قائم مقام ضلعی حاکم کو ہی سمجھا جاتا ہے صوبائی حاکم کا قائمقام صوبائی حاکم ہی شمار ہوتا ہے اور صدر کا قائم مقام مملکت میں صدر کی حیثیت کا حامل ہی ہوا کرتا ہے پس جناب رسالتمآبؐ کے صحیح قائمقام کو انبیاء سے افضل ہونا چاہیئے لیکن میں اس بیان کو ذرا تفصیل کا رنگ دیتا ہوں قرآن مجید نے آدم و ملائکہ کا قصہ بار بار دہرایا اور ساتھ ہی ابلیس کی سرزنش اور اس کے انکار کو بھی قرآن نے کئی دفعہ ذکر کیا تو کیا یہ بار بار کی دہرائی دہرانے والے کی بھول چوک کا نتیجہ تو نہیں؟ یقین جانیئے کہ نہیں تو پھر یہ بار بار کا ذکر حضورؐ کا اپنا تصرف تو نہیں؟ یقین کیجئے کہ ایسا بھی ہرگز نہیں تو پھر کیا عقل سلیم کی آنکھوں پہ پٹی ہے کہ وہ دیکھتی نہیں یا منظر و فکر کی دوڑ دھوپ پر کوئی پابندی ہے کہ وہ محنت نہیں کرتی آخر یہ ہوا کیوں؟ صرف یہ نہیں بلکہ جہاں جہاں بھی واقعات کو بار بار دہرایا گیا ہے اس میں کوئی ایسا راز پنہاں ہے جسے اذہان میں پختہ کرنے کی ضرورت ہے ایک دفعہ سے نہیں تو دوسری دفعہ دوسری بار سے نہیں تو تیسری دفعہ آخر کسی وقت تو آنکھ کھلے گی نا؟

خدائے حکیم نے سوال وجواب کے انداز میں اپنی خلافت کا معیار اچھوتے رنگ سے ظاہر کیا پہلے اعلان میں تو اِنِّیْ جَاعِلٌ کے لفظ سے تصریح فرمادی کہ یہ مرتبہ نص سے تعلق رکھتا ہے یعنی میری اپنی ذاتی مشیت کے سوا اور کسی کے مشورہ و صلاح کی ضرورت نہیں پس فرمایا کہ میں بناتا ہوں اس کے بعد جو فرشتوں نے آدم پر نکتہ چینی کی کہ ایسے کو کیوں بناتا ہے جو فساد و خونریزی کریگا اور اپنی اہمیت و صلاحیت کو ذکر کیا کہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرنے والے ہیں تو ان کے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ دیا اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

سوال وجواب کے رنگ میں یہاں دو چیزیں بالکل واضح طور پہ منظر عام پر آگئیں

ایک تو خلافت کے متعلق ملائکہ کا نظریہ کہ خلیفہ اسے ہونا چاہیے جس میں دو صفتیں ہوں پہلی یہ کہ فساد اور خونریزی کرنے والا نہ ہو یعنی تمدّنی زندگی کے وقار و ناموس کو جانتا ہو اور اس کی پاس رکھتا ہو یا یوں سمجھئے کہ خود فسادی نہ ہو بلکہ فساد کے قلع و قمع کی اہلیت رکھتا ہو۔ یعنی سیاستِ مدنیہ اور سیاستِ ملکیہ کو اچھی طرح سنبھال سکتا ہو اور اس پر کنٹرول کر سکتا ہو اور دوسری صفت یہ کہ وہ تسبیح و تقدیس کرنے والا ہو یعنی عابد و زاہد ہو متقی ہو۔ حضرت آدمؑ کے متعلق ان کو ان دونوں صفتوں کے جامع ہونے کا شبہ تھا کیونکہ جس مادہ سے حضرت آدمؑ کی تخلیق ہوئی تھی اس کے اثرات ان کے سامنے تھے وہ اس سے قبل زمین پر آباد ہونے والی پہلی مخلوق قوم جن کو دیکھ چکے تھے اور انہیں جذبات و شہوات کی کارستانیوں کا پتہ تھا جو اس مخلوق میں تغولیض کی جا رہی تھیں لہٰذا فساد اور خونریزی کا اندیشہ بجا تھا نیز قوائے جسمانیہ کا جذب و دفع و اخلاقِ نفسیہ میں نظم و ضبط یا بدنظمی و بے قاعدگی کی کیا تا کی خشوع و خضوع اور ایمان و اخلاص پر کافی اثر انداز ہوتی ہے لہٰذا ایسی مخلوق تسبیح و تقدیس پروردگار کی بجا آوری میں یقیناً کوتاہی کرے گی کیونکہ خواہشات سے نہ گلو خلاصی ہو گی اور نہ یقین و تقویٰ کی لذت نصیب ہو گی پس وہ اپنے مقام پر معیارِ خلافت ان دو چیزوں کو سمجھتے ہوئے بول اُٹھے۔

دوسری چیز جو اس جگہ منظرِ عام پر آئی وہ یہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے بھی دو چیزوں کا اظہار فرمایا۔ ایک یہ کہ خلافتِ ارضیہ میں صرف نص کو ہی دخل ہے یہاں رائے و مشورہ کا کوئی دخل نہیں اور دوسری یہ کہ جس بات کو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ مقصد یہ کہ تم اپنے سابق تجربہ کی بنا پر یا مادہ کے خواص و اثرات کی بنا پر جو ایک عامؑ اندازہ کر رہے ہو وہ درست ہے لیکن جو جوہر میری نظر میں ہے وہ تمہیں معلوم نہیں جس کی بنا پر میں اسے خلافت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کرنا چاہتا ہوں پس وہ اس جوہر کی بدولت سیاستِ ملکیہ کو بھی سنبھال سکے گا اور تسبیح و تقدیس سے بھی غفلت نہ کرے گا اس بیان میں عام انتخابات کی قلعی بھی کھل گئی کہ جب فرشتے کسی انسان کے متعلق صحیح نظریہ قائم نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا اندازہ صرف ظاہری نشوونما یا ظاہری اسباب تک ہی محدود ہوتا ہے تو عام لوگ کسی انسان کے انتخاب میں کہاں تک صحیح نظریہ کو اپنا سکیں گے پس انتخاب کا حق صرف اس ذات کو ہے جو اس کے باطنی جوہر سے مطلع

جو جس پر تمام خوبیوں کا دار و مدار ہے اور وہ اللہ ہی ہے گویا انتخاب خلافت کے لئے ظاہری معیار کافی نہیں بلکہ معیارِ خلافت کی واقعیت کو صرف خدا ہی جان سکتا ہے پس إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ سے یہی واضح ہوا کہ تم جس انداز سے بات کر رہے ہو وہ صرف ظاہر ہی ظاہر ہے اور میں جس نظریہ سے اعلان کر رہا ہوں وہ باطنی جوہر پر موقوف ہے جس کی تمہیں کوئی خبر نہیں لہٰذا خلافت کے متعلق صرف مجھے ہی نامزد کرنے کا حق حاصل ہے۔

یہاں فرشتے خاموش ہو گئے کیونکہ معاملہ باطن کا تھا جس کو وہ نہ سمجھ سکے پس علمی میدان میں آدمؑ اور ملائکہ کو کھڑا کر کے ظاہری طور پر امتحان لے لیا اور آدمؑ کا شرفِ علمی ظاہری طور پر جوان پر کھلا تو انہیں معلوم ہوا کہ عقل و علم کا جوہر ہی وہ جوہر ہے جو اس مادہ ظاہری کے پردہ میں کار فرما ہے اور وہ جوہر اس مادہ کے تاریک پردہ میں رہ کر جو کام کر سکتا ہے وہ اس پردہ کے بغیر نہیں کر سکتا۔ بیشک وہ مادہ کی تمام ظلمتوں اور تاریکیوں پر پس پردہ رہتے ہوئے چھا سکتا ہے اور اپنی نورانی کرنوں سے ظلمت کدۂ عالم کو منور کر سکتا ہے پس تسبیح و تقدیس جو اس سے ظاہر ہو گی وہ ہمارے بس سے باہر ہے اور اس کی فضیلت بے شک ظاہر و باہر ہے چنانچہ اپنی بے جا لب کشائی پر خجالت محسوس کرتے ہوئے سجدہ میں گر کر عملاً حضرت آدمؑ کی افضلیت کا لوہا مان لیا اور بارگاہِ رب العزت سے سبقت لسانی کی معافی مانگ کر ہمیشہ کے لئے اس مقامِ عظیم کی خواہش کو خیرباد کہہ دیا اور آرام میں رہے۔

فرشتوں نے اپنے نور کے حسن اور اس کی حسنِ اطاعت کو عریانی کے رنگ میں دیکھا ہوا تھا اور مادے کے اثرات و فسادات کو صرف ظلمانی رنگ میں دیکھا تھا اب جو اس مادے کے تاریک و سیاہ پردے کے اندر حسن کی زیبائش اور اس کی حسنِ اطاعت میں پرکشش آرائش کا ملاحظہ کیا تو بول اٹھے اور بے تحاشا زبان نور سے یہ کلمات نکلے سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ

گویا عالم تکوین کی انتظامیہ (ملائکہ) دو باتوں کو سمجھے ہوئے تھے۔ ایک تدبیر قہری بمشیّتِ پروردگار اور دوسری تسبیح و تقدیس قہری بحکم فطرتِ نوریہ لیکن یہاں مادیات

کے تاریک پردوں سے جو نور چمکا اس میں حسنِ تدبر و جوہرِ اطاعتِ اختیاریہ کی شعاعیں ان کے لئے خیرہ کن تھیں۔ لہٰذا ہتھیار ڈال دیئے پس علم و معرفت ہی ہے معیارِ فضیلت و میعارِ کرامت جس کی بناء پر تمام عالمِ تکوین عالمِ تشریع کے سامنے خادم کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ قرآن میں بار بار یہ یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ یہ سب کچھ تمہارے لئے ہے۔ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا اور حدیث قدسی میں ایک فقرہ کہیں آتا ہے۔ خَلَقْتُ الْخَلْقَ لَكَ وَخَلَقْتُكَ لِي کہ اے اولادِ آدم سب مخلوق میں نے تیرے لئے پیدا کی ہے اور تجھے اپنے لئے خلق کیا ہے۔

جناب رسالتمآبؐ کی تمام انبیاء پر افضلیت علم کی بدولت ہے چنانچہ محبِ المسلمین مُسلم حدیث قدسی لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ کا ذاتِ پروردگار کا ارشاد جو حضورؐ کی کی عظمت و جلالتِ شان کا مظہر ہے وہ صرف جذباتی جملہ نہیں بلکہ واقع کا آئینہ دار ہے چنانچہ انسان کی پیدائش سے ہی ملائکہ کی بھری مجلس میں پروردگارِ عالم نے اس کی برتری کا پہلے روز اعلان فرما دیا۔ اسی طرح تمام انبیاء کی اپنی اپنی امتوں سے فضیلت و کرامت کا اصلی سرچشمہ علم ہی تھا پس ماننا پڑتا ہے کہ سیّد الانبیاء کی تمام انبیاء سے شرافت و سیادت کا اصلی معیار علم ہی ہے اور قرآن تمام کتبِ سماویہ کے علوم کا جامع ہے جس طرح حضورؐ بنفسِ نفیس تمام کمالاتِ نبوت کے جامع ہیں اور حضورؐ قرآن کے عالم اور مدرس تھے۔

تو جو بھی ان کا صحیح جانشین ہو گا اسے انبیاء سے افضل ہونا چاہیئے میرے بیان سے یہ اندازہ بلکہ یقین ہو جائے گا کہ ہدایتِ خلق کے لئے خدا اسی کو منتخب فرماتا ہے جو اس انتخاب کے اہل ہو اور جناب رسالتمآبؐ نے اپنے بعد کے لئے متعدد مقامات پر وضاحت فرما دی کہ میری جانشینی کا اہل کون ہے اور چونکہ اب علم کے ماخذ دو ہی تھے ایک قرآن اور دوسرے خود وجود سرکارِ رسالت مآبؐ پس آپ نے ہر دو کے درِ حقیقہ کی نشاندہی کھلے اور صاف الفاظ میں فرما دی تاکہ بعد میں کبھی مغالطہ نہ ڈالا جا سکے اور قیامت تک کے لئے ہدایتِ امت کا مستقل انتظام ہو جائے گا۔

علامہ امینی نے اس مقام پر کتب مخالفین سے بہت کچھ آثار نقل فرمائے ہیں۔

ہم ہر دو مقام یہاں ذکر کرتے ہیں پہلا مقام کہ حضرت علیؑ علم رسول کے وارث ہیں۔

① قَالَ عَلِیٌّ وِعَاءُ وَ وَصِیِّی وَبَابِیَ الَّذِیْ اُوْتِیَ مِنْهُ

آپ نے فرمایا علیؑ میرے علم کا ظرف میرا وصی اور میرے پاس پہنچنے کا دروازہ ہے۔

② قَالَ عَلِیٌّ بَابُ عِلْمِیْ وَمُبَیِّنٌ لِاُمَّتِیْ مَآ اُرْسِلْتُ بِهٖ مِنْ بَعْدِیْ
کنز العمال ج ۶ کشف الثام

علیؑ میرے علم کا دروازہ اور میری امت کے لئے ان چیزوں کے بیان کرنے والا ہے جن کے لئے میں بھیجا گیا ہوں

③ عَلِیٌّ خَازِنُ عِلْمِیْ (شرح بن ابی الحدید)

علیؑ میرے علم کا خازن ہے۔

④ اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا وَلَا تُؤْتَی الْبُیُوْتُ اِلَّا مِنْ اَبْوَابِهَا

میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے اور گھروں میں دروازوں سے ہی داخل ہوا جاتا ہے۔

علامہ امینی نے الغدیر میں ایک سو ترتالیس[۱۴۳] علمائے اہل سنت کی فہرست لکھی ہے جنہوں نے باسناد صحیح یہ حدیث نقل کی ہے۔

عن البحار۔ قَالَ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی آدَمَ فِیْ عِلْمِهٖ وَاِلٰی اِبْرَاهِیْمَ فِیْ وَقَارِهٖ وَاِلٰی سُلَیْمَانَ فِیْ قَضَائِهٖ وَاِلٰی یَحْیٰی فِیْ زُهْدِهٖ وَاِلٰی اَیُّوْبَ فِیْ صَبْرِهٖ وَاِلٰی اِسْمٰعِیْلَ فِیْ صِدْقِهٖ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍؑ

یعنی جو شخص حضرت آدمؑ کو اپنے علم میں ابراہیمؑ کو خلت میں سلیمانؑ کو اپنے فیصلوں میں یحییٰؑ کو زہد میں ایوبؑ کو صبر میں اور اسمٰعیلؑ کو اپنے صدق میں دیکھنا چاہئے تو وہ علیؑ بن ابی طالب کو دیکھ لے۔

یہ حدیث مختلف کتب آثار میں مختلف الفاظ سے وارد ہوئی ہے ان کی تفاصیل الغدیر علامہ امینی میں ملاحظہ ہوں

حضرت علیؑ علوم قرآنیہ کے وارث ہیں۔

عَنْ رَبِیْعِ الْاَبْرَارِ لِلزَّمَخْشَرِیْ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ یَقُوْلُ عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْقُرْاٰنِ وَالْحَقُّ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ وَلَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ

ربیع الابرار سے مروی ہے۔ ام سلمہ فرماتی ہیں میں نے جناب رسول کریمؐ سے سنا۔ فرماتے تھے۔ علیؑ حق اور قرآن کے ساتھ ہے اور حق و قرآن علیؑ کے ساتھ ہیں اور یہ

الحَوض۔ دونو ایک دوسرے سے ہرگز جُدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ کوثر پر وارد ہوں گے

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا عالمِ قرآن ہونا اس قدر واضح اور کتبِ اسلامیہ میں اتنا بدیہی ہے کہ صحابہ میں سے کوئی شخص بھی حضرت علیؑ کی فضیلت کے انکار کی جرأت نہیں کر سکا چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر الاتقان میں بروایت علیہ ابونعیم ابن مسعود سے روایت کی ہے۔ اِنَّ الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ مَا مِنْهَا حَرْفٌ اِلَّا وَلَهٗ ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ وَ اِنَّ عَلِیَّ ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ عِنْدَهٗ مِنْهُ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔

ترجمہ :۔ قرآن سات حرفوں میں اُترا ہے اور اُن میں سے ہر حرف کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور تحقیق علیؑ بن ابی طالب کے پاس اس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ میرا اور محمدؐ کے تمام صحابہ کا علم علیؑ کے علم کے مقابلہ میں اس طرح ہے جس طرح سات سمندروں کے مقابلہ میں ایک قطرہ آب ہو (الغدیر) اور اس میں شک نہیں کہ حضورؐ کے بعد لوگ جس قدر حضرت علیؑ کے چشمۂ فیوضِ علمیہ سے سیراب ہوئے اور کسی سے ان کو اس کا عشرِ عشیر بھی دستیاب نہ ہو سکا اور حضورؐ کے بعد ہمیشہ کے لئے مقامِ علم میں جو علیؑ نے عقدہ کشائی فرمائی تاریخ اسلام اس کی ممنون رہے گی آپ کے عام خطبات بھی اگر آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو علوم و معارف کے چھلکتے ہوئے سمندر آپ کو محسوس ہونگے اور تمام صحابہ کرام حضرت علیؑ کے مقامِ علمی کے سامنے اس طرح سہمے ہوئے معلوم ہوں گے جیسے ایک ادنیٰ سا طالب علم ایک مہیب بڑے ماہر استاد کے سامنے اور ان کی سطوتِ علمی اور صولتِ عرفانی میدانِ علم میں باوجود للکارنے کے اپنے حریف نہ دیکھ سکی تیرہ چودہ سو سال کے بعد والوں کا کہنا کہ فلاں بڑا عالم تھا اور فلاں بڑا مفسّر تھا کوئی فائدہ نہیں رکھتا جب کہ اوراقِ تاریخ ان کی علوم و معارف میں یتیمی کا رونا رہے ہوں۔ ہر سائل کو نوکِ شمشیر سے یا تازیانہ کی شہ سے خاموش کرا لینا اور ہے اور علوم و معارف کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانا اور ہے حسن کی جلوہ گری پردوں کے اندر بھی چھپی نہیں رہتی اور بدصورتی کا عیب ہزار چھپانے کے بعد بھی آخر عریاں ہو کر رہتا ہے۔ علیؑ کے علم کو کہاں تک چھپایا جا سکتا ہے اور کسی ہیچمدان کے عیب پر کہاں تک پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ آخر

زجس کی مہک اپنا آپ ظاہر کر دیتی ہے اور عطر کا جوہر اپنی خوشبو سے خود ظاہر ہوا کرتا ہے خدا کی قسم دشمن کے منہ سے تعریف اور سوکن کی زبان سے حسن کی تصدیق حقیقت و واقعیت کے سب سے بڑے گواہ ہیں۔ علیؑ کے فضائل و مناقب کے اوپر پردہ ڈالنے والوں نے بہت کچھ چھپایا اور کافی حقائق پر پردہ ڈالا لیکن حضرت عمر کے اس اعتراف کو کوئی مورخ نظر انداز کرنے پر موفق نہ ہو سکا۔ لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ حتیٰ کہ نحویوں کو بھی لولا کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے اسی جملہ کے علاوہ اور کوئی مثال نہ مل سکی اور یہ سب قدرتِ پروردگار اور اس کی حکمت کے کرشمے ہیں کہ طالبانِ علوم ابتداء ہی سے باور کرلیں کہ رسالتمآبؐ کے بعد صرف علیؑ ہی ہے جو چرخ علم و معرفت پر چمکتا ہوا آفتاب ہے جس کی روشنی تمام اکابر صحابہ کے لئے باعث فیض تھی میرا دل چاہتا ہے کہ اس مقام پر حضرت امیر علیہ السلام کی زبانی اپنے مقام علم کی ترجمانی میں ان کے چند جملے پیش کروں جو قلب ایمان میں فرط و انبساط کے موجب ہیں بحارالانوار کی جلد چہارم باب احتجاجات امیرالمومنین میں اصبغ بن نباتہ روایت کرتا ہے کہ جب میرے مولا سریر آرائے خلافت ہوئے اور لوگ بیعت کر چکے تو آپ رسالتمآبؐ کا عمامہ سر پر حضورؐ کی عبا دوش اطہر پر نعلین رسول الثقلین زیب پا اور تلوار سرکار رسالت زیب کمر کرکے مسجد نبوی میں تشریف لائے پس آتے ہی خطیب منبر سلونی نے منبر رسالت کو رونق بخشی اور السنان سے بیٹھ کر اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دونوں ہاتھ گود میں رکھ لئے اور ارشاد فرمایا

يَا مَعَاشِرَ النَّاسِ سَلُوْنِي قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِي هٰذَا سَفَطُ الْعِلْمِ هٰذَا لُعَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ هٰذَا مَا زَقَّنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ زَقًّا زَقًّا سَلُوْنِي فَاِنَّ عِنْدِي عِلْمُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ اَمَا وَاللّٰهِ لَوْ ثُنِيَتْ لِيَ الْوِسَادَةُ فَجَلَسْتُ عَلَيْهَا لَاَفْتَيْتُ اَهْلَ التَّوْرَاةِ بِتَوْرَاتِهِمْ حَتّٰى يَنْطِقَ التَّوْرَاةُ فَتَقُوْلُ صَدَقَ

گروہ حاضرین! مجھ سے میرے چلے جانے سے قبل پوچھ لو۔ یہ علم کا جوہر ہے۔ یہ زبان رسالت کا لعاب ہے یہ رسالتمآبؐ کی زبان وحی کا چوسا ہوا نچوڑ ہے مجھ سے پوچھو تحقیق میرے پاس اولین و آخرین کا علم ہے ہاں بخدا اگر میرے لئے تکیہ لگایا جائے اور میں اوپر بیٹھ جاؤں توراۃ والوں کو توراۃ سے فتویٰ دوں

عَلِیٌّ مَا كَذِبَ لَقَدْ اَفْتَاكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیَّ وَ اَفْتَيْتُ اَهْلَ الْاِنْجِيْلِ بِاِنْجِيْلِهِمْ حَتّٰى يَنْطِقُ الْاِنْجِيْلُ فَيَقُوْلُ صَدَقَ عَلِیٌّ مَا كَذِبَ لَقَدْ اَفْتَاكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیَّ وَ اَفْتَيْتُ اَهْلَ الْقُرْاٰنِ بِقُرْاٰنِ حَتّٰى يَنْطِقَ الْقُرْاٰنُ فَيَقُوْلُ صَدَقَ عَلِیٌّ مَا كَذِبَ لَقَدْ اَفْتَاكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیَّ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَيْلًا وَ نَهَارًا فَهَلْ فِيْكُمْ اَحَدٌ يَعْلَمُ مَا فِيْهِ اِلٰى اَنْ قَالَ ثُمَّ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ فَوَالَّذِیْ خَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَءَ النَّسَمَةَ لَوْ سَئَلْتُمُوْنِیْ عَنْ اٰيَةٍ اٰيَةٍ فِیْ لَيْلٍ نَزَلَتْ اَوْ فِیْ نَهَارٍ نَزَلَتْ مَكِّيِّهَا وَ مَدَنِيِّهَا وَسَفَرِيِّهَا وَحَضَرِيِّهَا نَاسِخِهَا وَ مَنْسُوْخِهَا وَ مُحْكَمِهَا وَ مُتَشَابِهِهَا وَ تَاْوِيْلِهَا وَ تَنْزِيْلِهَا لَاَخْبَرْتُكُمْ (الحدیث)

یہاں تک کہ خود توراۃ بول کر کہے کہ علیؑ کا قول سچا ہے جھوٹا نہیں اور انہوں نے وہ فتویٰ دیا ہے جو مجھ میں اللہ نے نازل فرمایا اور انجیل والوں کو انجیل کا فتویٰ دوں حتیٰ کہ انجیل بول اٹھے کہ علیؑ نے سچ فرمایا جھوٹ نہیں بلکہ وہ فتویٰ دیا جو اللہ نے مجھ میں نازل کیا اور قرآن والوں کو قرآن سے فتویٰ دوں کہ قرآن بول کر کہے علیؑ نے وہ کہا جو مجھ میں اللہ نے اتارا اور تم بھی صبح وشام قرآن پڑھتے ہو بتاؤ تم میں کوئی ایسا ہے جو اس کے علوم کو جانتا ہو۔ اسلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پھر فرمایا، پھر پوچھو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ مجھے اس ذات کی قسم جس نے دانہ سے انگوری کو پیدا کیا اور رُوح کو خلق فرمایا اگر تم مجھ سے ایک ایک آیت پوچھو خواہ رات میں اتری یا دن میں اتری مکی ہو یا مدنی، سفری یا حضری ناسخ یا منسوخ، محکم یا متشابہ اور تاویل یا تنزیل تو میں تم کو بتا دوں گا۔

وَفِیْ اُخْرٰی قَالَ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ فَاِنَّ بَيْنَ جَوَانِحِیْ عِلْمًا جَمًّا

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا مجھ سے پوچھو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاسکو تحقیق میری پسلیوں کے اندر علم کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اسی طرح حضرت امیر علیہ السلام کا یہ فرمان صرف جذباتی نہیں بلکہ حقیقت کا ترجمان ہے لَوْ شِئْتُ لَاَ وْقَرْتُ سَبْعِيْنَ بَعِيْرًا مِنْ تَفْسِيْرِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ اگر میں چاہوں تو صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ لاد سکتا ہوں۔ فضل بن روزبہان جیسا متعصب آدمی بھی علیؑ کی علمی برتری کو تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ جہاں علامہ نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل کے اثبات کے لئے یہ آیت پیش کی۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا

مِنْ عِبَادِنَا ترجمہ :- پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا۔ جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا تو فضل بن روز بہان اگرچہ آیت کو دلیلِ خلافت بنانے سے انکاری رہا لیکن یہ جملہ کہا گیا۔ عَلِیٌّ مِنْ جُمْلَةِ وَرَثَةِ الْكِتَابِ فَهٰذَا يَدُلُّ عَلٰى عِلْمِهٖ وَوُفُوْرِ تَوَغُّلِهٖ فِیْ مَعْرِفَةِ الْكِتَابِ۔ انتھٰی ترجمہ :- علیؑ وارثانِ کتاب میں سے ایک ہے کیونکہ آپ کتاب کے حقائق کو جانتے تھے۔ پس کتاب کا وارث ہونا دلالت کرتا ہے کہ آپ عالم تھے اور کتاب کی معرفت میں آپ کافی گہرائی تک پہنچے ہوئے تھے آخر میں صرف حدیثِ ثقلین پیش کرتا ہوں جو تمام اہلِ اسلام کی کتبِ صحاح میں موجود ہے اور حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا :- اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا اَوْ كَمَا قَالَ۔ ترجمہ :- میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت جبتک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ امتِ اسلامیہ میں جنابِ رسالتمآبؐ کے بعد حضرت علیؑ سب سے بڑے عالم تھے۔ اور تمام کمالات کا جامع فقرہ جو حضورؐ نے فرمایا تھا عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ۔ علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق اس کے ساتھ ہے اور علاوہ ازیں حضورؐ نے تصریح بھی فرمادی کہ علیؑ تمام انبیاء کے کمالات کا جامع ہے جیسے کہ ہم ایک حدیث اس مضمون کی نقل کر چکے ہیں پس حضرت امیر علیہ السلام کی تمام انبیاء پر افضلیت ثابت ہو گئی۔ اور یہی بیان آپ کی خلافت بلافصل کی بھی دلیل ہے کیونکہ فاضل کی موجودگی میں مفضول کو اور افضل کی جگہ فضل کو بٹھانا بالکل غیر معقول ہے پس اگر جنابِ رسالتمآبؐ کی حیثیت دین کی سربراہی کی ہے تو ان کی جگہ دینی سربراہ وہی ہو سکتا ہے جو دینی معلومات کو کم از کم دوسروں سے زیادہ جانتا ہو اور وہ سوائے علیؑ کے اور کوئی نہیں تھا اسی طرح آیۂ مجیدہ آیتِ مباہلہ میں اَنْفُسَنَا کی لفظ ثابت کر رہی ہے کہ حضرت علیؑ نفسِ رسولؐ ہے تو جب رسولؐ تمام انبیاء سے افضل ہے تو نفسِ رسولؐ بھی افضل ہو گا اور خلافت بلافصل کے لئے بھی یہی لفظ کافی ہے اور اسی بیان سے واضح ہو گیا کہ حضرت علیؑ کے بعد یکے بعد دیگرے آئمہ طاہرین علیہم السلام تمام انبیاء سابقین سے افضل ہیں۔

آئمہ طاہرینؑ کے متعلق عقیدہ

شیخ صدوق قدہ نے اعتقادیہ میں فرمایا ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے بعد خداوند کریم کی جانب سے مخلوق پر حجت یکے بعد دیگرے بارہ امام ہیں۔

- پہلا امام حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام۔
- دوسرا امام حضرت امام حسن بن علیؑ علیہ السلام
- تیسرا امام حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام
- چوتھا امام حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام
- پانچواں امام حضرت امام محمد باقر علیہ السلام
- چھٹا امام حضرت جعفر صادق علیہ السلام
- ساتواں امام حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
- آٹھواں امام حضرت علی رضا علیہ السلام
- نواں امام حضرت محمد تقی علیہ السلام
- دسواں امام حضرت علی نقی علیہ السلام
- گیارہواں امام حضرت حسن عسکری علیہ السلام
- بارہواں امام حضرت حجت غائب امام منتظر صاحب الزمان علیہ السلام

ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ اولو الامر ہیں جن کی اطاعت کا اللہ نے حکم دیا ہے اور یہ لوگوں پر گواہ ہوں گے یہ اللہ کے دروازے ہیں اور اللہ تک پہنچنے کا راستہ ہیں اور اس کی طرف رہبری کرنے والے ہیں اس کے علم کے خازن ہیں اس کی وحی کے مترجم ہیں اس کی توحید کے ارکان ہیں اور وہ ہر قسم کی خطاء و لغزش سے پاک و منزہ ہیں اور تحقیق یہ وہی ہیں۔ جن سے خدا نے رجس کو دور رکھا اور ان کو پاک رکھا جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے یہ صاحبان معجزہ و براہان ہیں یہ اہل زمین کے لئے عذاب خداوندی کے امان کا باعث ہیں۔ جس طرح کہ ستارے اہل آسمان کے لئے باعث امان ہیں۔ ان کی مثال اس امت میں کشتی نوحؑ جیسی ہے جو اس پر سوار ہوگا ناجی ہوگا۔ یہ گناہوں کی بخشش کا دروازہ ہیں جس طرح موسیٰؑ کی امت کے لئے باب حطہ مقرر تھا اور یہ اللہ کے وہ برگزیدہ بندے ہیں کہ اللہ سے کسی بات میں سبقت نہیں کرتے

اور اس کے امر کے ماتحت عمل کرتے ہیں اور ان کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ان کی محبت ایمان ہے اور ان کا بغض کفر ہے ان کا حکم اللہ کا حکم ہے اور ان کی نہی اللہ کی نہی ہے اور ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور ان کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے اور ان کا ولی اللہ کا ولی ہے اور ان کا دشمن اللہ کا دشمن ہے

قرآن و آئمہ اہل بیتؑ

تمام مسلمانوں کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ناقابل تنسیخ دستور العمل ہے اس کے تمام فیصلے آخری اور قطعی ہیں۔ اب عقل سلیم خود ہی فیصلہ کر سکتی ہے کہ جب کوئی بھی دستور بغیر دستور چلانے والے کے کارآمد اور مفید ثابت نہیں ہو سکتا تو یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ دستور خداوندی تنہا کافی قرار پائے۔ ورنہ اگر یہ تنہا ہی کافی ہوتا تو ابتداً کسی لانے والے کی ضرورت ہی کیا تھی! خدا خود کسی طریقہ سے ہر انسان کے پاس اپنا قانونی ضابطہ بھیج دیتا پس انسانوں کو راہ نجات معلوم کرنے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کے لمبے چوڑے انتظام کی حاجت نہ رہتی۔ لیکن یقین جانیئے کہ معلم کے بغیر صرف کتاب کا کافی ہونا فطرت انسانیہ سے بعید ہے۔ اگر اس طرح باور نہ ہو تو ظاہری نظام حکومت کو دیکھ لیجئے۔ جب اکثر قوانین حکومت کا علم ہر ایک کو ہوتا ہے تو احکام کے لئے پولیس و دیگر انتظامی امور کی کیا ضرورت ہے پس صرف قانون ہی کو کافی سمجھ لیا جائے ہر فرد اتنا کہ قانون ٹریفک معلوم ہے لیکن حکومت کو ہر چوک پر سنتری مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے معلوم ہوا کہ صرف قانون کا وجود و علم امن کا ضامن نہیں اور صرف ضابطہ کا جان لینا تصادم و ایکسیڈنٹ سے بچاؤ کا کفیل نہیں ہو سکتا جب تک قانون کی حفاظت کیلئے مخصوص پاسبان مقرر نہ ہوں اسی طرح خدائی قانون بھی تنہا راہ حق کی تلاش اور اس پر کام کرنے کے طریقے بتانے کے لئے کافی نہیں جب تک کتاب والے کی ہدایات ساتھ نہ ہوں۔

عقل کا تقاضا یہی ہے کہ جو قانون بنا کر بھیجے اس قانون کا محافظ بھی وہ خود ہی متعین کرے اگر قانون ظاہری حکومت کا ہوگا تو اس کے محافظین ظاہری حکومت خود متعین کرے گی پبلک کو اس کا ذرہ بھر اختیار نہیں ہے اور اگر حکومت الٰہیہ کا قانون ہے تو اس کا محافظ اسی حکومت کی نامزدگی سے ہونا چاہیئے۔ ورنہ انتہائی ناانصافی ہو گی۔ کہ

قانون کی کتاب اللہ کی جانب سے ہو اور مبلّغ امّت کی اپنی مرضی سے ہو اور اگر انتخاب خداوندی کے سابق طریق کار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انتخاب مبلّغین کا سلسلہ صرف اللہ کے ہی ہاتھ میں رہا کیا ہے ؟

حضرت طالوت و جالوت کا قرآنی قصہ صرف الفاظ کی بھرتی نہیں بلکہ امّت اسلامیہ کے لئے دعوتِ فکر اور درس حقیقت ہے جب نبی وقت نے حضرت طالوت کی نامزدگی کا اعلان فرمایا :- قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا۔ ترجمہ :- ان کو نبی نے فرمایا کہ تحقیق اللہ نے طالوت کو تمہارا حکمران مقرر کیا ہے تو انہوں نے شور و غوغا شروع کر دیا کہ اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ اور ہم زیادہ حقدار ہیں تو اس نبی نے یہی جواب دیا۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ترجمہ :- تحقیق اس کو اللہ نے خود ہی چُن لیا ہے اور اس نے اس کو علم اور طاقتِ جسمانی تم سے زیادہ عطا فرمائی ہے اس کی تفصیل ہم نے تفسیر انوار النجف کی تیسری جلد میں کی ہے جو بہترین معلومات کا ذخیرہ ہے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ حکومتِ شرعی کے لئے انتخابِ خداوندی کی ضرورت ہے اور نبی کو بھی خدا کے فیصلہ میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہوا کرتی بلکہ اللہ صرف نبی کو اطلاع دیتا ہے اور نبی اعلان کر دیتا ہے جیسے کہ طالوت کے واقعہ سے ظاہر ہے اور حکومتِ الٰہیہ کا معیار علم اور طاقت اس مقام پر ظاہر کی گئی ہے

باتفاق امّتِ اسلامیہ جناب رسالتمآبؐ کی شریعت اور کتاب کی حد قیامت ہے تو کس قدر تعجب خیز بات ہے کہ سابقہ قابلِ نسخ شریعتوں کی تبلیغ و ترویج کے لئے تو اللہ ہی کی جانب سے عہدہ داروں کا تعیّن ہو اور اس ناقابلِ تنسیخ شریعت کا نظام خود امّت پر چھوڑ دیا جائے۔ پہلی شریعتوں میں نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا ہر نبی کے بعد جو اللہ کے دین کا محافظ آتا تھا۔ وہ نبی ہوتا تھا۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کے بعد انبیاء ہی محافظِ تورات رہے اور وہ معصوم ہوا کرتے تھے تو سیّد الانبیاء جس طرح خود اشرف الانبیاء ہیں اور ان کا دین اشرف الادیان ہے اسی طرح ان کے وصی اشرف الاوصیاء ہیں اور ان کی کتاب بھی اشرف الکتب ہے پس اشرف الادیان کی اشرف الکتب قرآن کے مبلّغ و محافظ اشرف الانبیاء کے اشرف الاوصیاء و نائبین کو اللہ کی ہی جانب سے

منتخب ہونا چاہیئے اور انہیں بھی درجۂ رفیعۂ عصمت کبریٰ پر فائز ہونا چاہیئے اور چونکہ حدود شریعت تاقیامت ہیں ۔ لہٰذا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا ضروری ہے اور چونکہ حضورؐ خود بنفسِ نفیس تمام انبیارِ سابقین سے افضل تھے تو اُن کے قائم مقام کو بھی تمام انبیارِ سابقین سے افضل و اشرف ہونا چاہیئے پس یہ بیان اور اس سے سابق کا بیان آئمہ اہلِ بیتؑ کی نقلی امامت پر عقلی دلیل کے لحاظ سے کافی و وافی ہے ۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ امام غیر معصوم نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا اسی کو ہی عہدۂ تبلیغ کے لئے انتخاب فرماتا ہے جو زیورِ عصمت سے آراستہ ہو جو دلیلیں عصمتِ انبیأ پر دی جا چکی ہیں وہی یہاں پر بھی دی جا سکتی ہیں لہٰذا اعادہ کی ضرورت نہیں ہے پس علم و عمل و حکمت و وقار و سخاوت و شجاعت وغیرہ میں بھی ان کو جملہ افرادِ امت سے اشرف و اکمل ہونا چاہیئے اور صاحبِ اعجاز ہونا بھی ان کے لئے لازمی ہے اور ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ سے لے کر حضرت قائمؑ تک آئمہ طاہرین علیہم السلام صفاتِ فاضلہ میں جملہ امتِ اسلامیہ سے اشرف و اکمل تھے اور ہر امام کی سیرت و کردار علم و عمل اور شرف و کمال اپنے اپنے دور کے مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ اور چراغِ ہدایت تھا حتیٰ کہ متعصب ترین افرادِ امت کو بھی ان کے عیب نکالنے کی ہمت نہ ہو سکی ۔

علیؑ کی خلافت بلافصل از روئے قرآن مجید

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خلافت بلافصل پر عقلی لحاظ سے بہت کچھ روشنی ڈالی جا چکی ہے اور منصف مزاج طبائع کے لئے راہِ حق کی تلاش میں کوئی وقت نہیں رہی اور ہٹ دھرمی کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں تاہم اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر کہ کہیں اس کے بارے میں کمی نہ رہ گئی ہو اور اتمامِ حجت کے طور پر نیز ذِکْرُ عَلِیٍّ عِبَادَةٌ کے پیشِ نظر آیات و اخبار کو پیش کرتا ہوں جن کی دلالت خلافتِ علیؑ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے ۔

① آیتِ مباہلہ

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى

الکٰذِبِیْنَ ترجمہ :۔ پس اگر وہ آپ سے جھگڑیں اس بارے میں بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو ان سے کہہ دیجئے آؤ ہم اپنے بیٹے بلائیں اور تم اپنے بیٹے بلاؤ ہم اپنی عورتیں بلائیں اور تم اپنی عورتیں بلاؤ اور ہم اپنے نفس بلائیں اور تم اپنے نفس بلاؤ پس ایک دوسرے پر بددعا کریں اور اللہ کی لعنت جھوٹوں پر مقرر کریں باتفاق مفسرین اہلِ اسلام حضرت رسالتمآبؐ نے مقام عمل میں بیٹوں کی جگہ امام حسنؑ و امام حسینؑ کو ساتھ لیا۔ نساء کی جگہ جنابِ خاتونِ جنت حضرت فاطمہؑ زہرا کو ہمراہ لیا اور نفس کی جگہ حضرت علیؑ کو ہمراہ لے گئے۔ پس اس آیت مجیدہ میں ابناء نساء اور انفس کے مصداق یہی تھے پوری آیت پر تفصیلی تبصرہ ہم نے تفسیر کی تیسری جلد میں کیا ہے یہاں صرف لفظ انفس ہمارا مقامِ استدلال ہے گویا الفاظ آیت بتلاتے ہیں کہ حضورؐ نے مردوں میں سے اس تحریک میں ان کو شریک کرنا تھا جو حضورؐ کے ساتھ اس قسم کی یگانگت رکھتے ہوں جس طرح کہ جسم اور نفس کی آپس میں ہوتی ہے پس وہی مرد جانے کے اہل ہو سکتے تھے جو حضورؐ کے لئے بمنزلہ نفس ہوں اور یہ خیال رہے کہ صیغہ جمع کے اندر کم از کم تین کی گنجائش تھی لیکن صرف حضرت علیؑ کو ہمراہ لے جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انفس کا مصداق سوائے علیؑ کے اور کوئی نہیں تھا پس آیت مجیدہ کی رُو سے علیؑ نفسِ رسول ثابت ہوئے۔ پس ان تمام انبیاء سابقین سے افضل ہونا ثابت ہو گیا اور رسول کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو رسولؐ کی طرح ان تمام لوگوں پر حکومت کرنے کا اہل ہو جو رسولؐ کی رعایا تھے اور چونکہ تمام انبیاء رسول پاکؐ کی رعایا کی حیثیت رکھتے ہیں اور علیؑ نفس رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ان سے افضل ہے پس علیؑ کا خلیفۂ رسول ہونا ثابت ہوا نیز آیت کے لفظوں میں علیؑ کو نفسِ رسول کہنا علیؑ کے جامع کمالات نبویہ ہونے کی دلیل ہے اگرچہ نبوت کا عہدہ ختم ہے لیکن جامع کمالات ہونے کی حیثیت سے خلیفہ بلافصل آیت کی رُو سے انہی کو ہونا چاہیئے کیونکہ کامل کی موجودگی میں ناقص کو حاکم ماننا بعید از عقل ہے اور نفسِ رسول سے کسی کا کامل تر ہونا ناممکن ہے۔

نیز یہ آیت سچے اور جھوٹے کے درمیان امتیاز قائم کر رہی ہے کہ مباہلہ میں جانے والے رسول کے ساتھی ایسے سچے ہیں کہ ان کی سچائی میں کوئی شک تک نہیں کیونکہ وہاں جھوٹوں پر لعنت کرنی تھی تو جب خدا ان کے سچے ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ پھر

کسی مسلمان کو ان کی صداقت میں شک کرنے کا کیا حق ہے حالانکہ امامت و سیاست میں ابنِ قتیبہ دینوری نے صاف لکھا ہے کہ حضرت علیؑ نے خود جا کر ابوبکر کو اپنا حق جتلایا تھا جس کو جھٹلایا گیا یا ناقابلِ عمل سمجھا گیا گویا آیتِ مجیدہ میں ان کی خلافت بلافصل کی دلیل دو پہلوؤں سے ہے ایک نفسِ رسول ہونے کی حیثیت سے دوسرے صادق ہونے کی حیثیت سے۔

(۲) آیتِ ولایت

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ پ ع سوائے اس کے نہیں کہ تمہارا ولی اللہ اور اس کا رسول ہے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں حالتِ رکوع میں۔ آیتِ مجیدہ کے متعلق اکثر مفسرینِ اہلِ سنت نے تسلیم کیا ہے کہ یہ حضرت علی علیہ السلام کے حق میں آئی ہے تفسیر کبیر رازی اور تفسیر ثعلبی میں حضرت ابوذر سے منقول ہے باختلافِ الفاظ کہ ہم نے نماز ظہر حضورؐ کے پیچھے پڑھی مسجد میں ایک سائل نے سوال کیا جب اس کو کچھ نہ ملا تو اس نے جانب آسمان منہ کر کے اپنی محرومی کا شکوہ کیا پس حضرت علیؑ نے حالتِ رکوع میں انگلی کا اشارہ کیا اور اس نے انگوٹھی اتار لی حضرت رسالتمآبؐ نماز کے بعد دست بدعا ہوئے کہ اے پروردگار میرے بھائی موسیٰؑ نے تجھ سے دعا مانگی تھی۔ اے رب میرا سینہ کھول دے میرا معاملہ آسان کر دے میری زبان کی گرہ کو دور کر تاکہ لوگ میری بات کو سمجھیں اور میرے لئے میری اہل میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر مقرر فرما اور اس کو میرا شریک کار بنا دے" تو تو نے قرآن میں صاف بتایا ہے کہ اس کی دعا مستجاب ہوئی اور تو نے ارشاد فرمایا۔ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا پ ع ہم تیرا بازو تیرے بھائی کے ذریعہ سے مضبوط کر دیں گے اور تمہیں غلبہ دیں گے پس وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے وَاَنَا مُحَمَّدٌ نَبِيُّكَ وَصَفِيُّكَ اَللّٰهُمَّ فَاشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ عَلِيًّا اُشْدُدْ بِهٖ ظَهْرِيْ اور میں تیرا نبی و برگزیدہ ہوں۔ اے اللہ پس تو میرا سینہ کشادہ کر اور میرا معاملہ آسان کر اور میرے لئے میری اہل سے علیؑ کو میرا وزیر مقرر فرما اور اس کے ذریعہ سے میری پشت کو مضبوط کر۔

ابوذر کہتا ہے خدا کی قسم ابھی دعا پوری نہیں ہوئی تھی کہ اللہ کی جانب سے جبرئیل اترا اور یہ آیت لے کر آیا اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ الآیۃ آیت مجیدہ میں ولایت مطلقہ ہے اس میں کوئی قید نہیں ہے اور ولایت مطلقہ جس کے لئے ثابت ہوا سے معصوم ہونا چاہیئے کیونکہ غیر معصوم کی ولایت خدا کی جانب سے مطلقہ ہو نہیں سکتی بلکہ غیر معصوم کے تصرفات پر پابندی لگانا پڑتی ہے جس طرح والدین کی اولاد پر ولایت ہے لیکن اطاعت میں پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ اس صورت میں اطاعت واجب ہے جب خلافِ حکم خدا وہ حکم نہ دیں لیکن جس کی ولایتِ مطلقہ بلاقید واجب ہو تو مقصد یہ ہے کہ اس سے خلافِ حکمِ خدا حکم صادر ہونے کا امکان نہیں اور اسی کو عصمت کہا جاتا ہے چونکہ آیت باتفاقِ مفسرین علیؑ کے حق میں ہے لہٰذا آیتِ مجیدہ جس طرح جناب رسالت مآبؐ کو معصوم اور ولی مطلق ثابت کرتی ہے اسی طرح حضرت علیؑ کو بھی ولی مطلق اور معصوم ثابت کر رہی ہے اور چونکہ ضمیر مخاطب کم تمام مومنوں کو خطاب کر رہی ہے لہٰذا جس طرح خدا و رسول کی ولایت تمام مومنوں پر ہے اسی طرح علیؑ کی ولایت بھی تمام مومنوں پر ہے۔ اور ولایت کا جو معنی خدا اور رسولؐ کے لئے ہوگا وہی معنی علیؑ کے لئے بھی ہوگا اور چونکہ خدا کی ولایت تصرف کامل کے معنی میں ہے لہٰذا رسولؐ و علیؑ کی ولایت کو بھی تصرف کامل کے معنی میں ہونا چاہیئے اور رسالت مآبؐ کی ولایت بمعنی تصرف کے مسلم ہے تو علیؑ کی ولایت بھی اسی معنی میں خود بخود ثابت ہو گئی کیونکہ لفظِ مشترک سے ایک استعمال میں متعدد معانی مراد لینا ناجائز ہے اور ولایت مطلقہ یعنی تصرف کامل کا دوسرا معنی خلافت و حکومت ہے پس آیت کی رُو سے علیؑ کی خلافت بلا فصل ثابت ہو گئی۔

⑵ آیتِ تبلیغ

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (سورہ مائدہ آیت ۶۷)

اے رسول پہنچا دو وہ چیز جو تمہارے رب کی جانب سے تم پر اتاری گئی پس اگر تم نے نہ کیا تو تم نے گویا اس کی رسالت نہ پہنچائی۔ تفسیر درمنثور ملے میں مروی ہے کہ یہاں علیؑ کی ولایت کا پیغام پہنچانا ہی مقصود تھا چنانچہ بعض صحابہ آیت مجیدہ کو اس طرح پڑھا کرتے تھے۔

بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اَنَّ عَلِيًّا مَوْلَى الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی یہ بات پہنچا دو کہ علیؑ مومنوں کا مولیٰ ہے آپ حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر واپس ایک مقام پر پہنچ کر جسے غدیر خم کہتے ہیں اور اسی مقام سے یمن و شام وغیرہ کے راستے الگ الگ ہوتے تھے پس حضورؐ نے لوگوں کو رکنے کا حکم دیا کیکر کے درختوں کے نیچے جھاڑو دینے کا حکم صادر فرمایا اور ایک بڑا لمبا خطبہ پڑھا اس کے بعد اسلامی احکام کی وضاحت فرمائی پھر علیؑ کو اپنے پاس بلا کر پالان ہائے شتر کے منبر پہ اپنے ہاتھ سے اس قدر بلند فرمایا کہ دونوں بغلوں کی سفیدی نمودار تھی اور اعلان کر کے فرمایا اَلَا مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اور اس فقرہ کو آپ نے تین مرتبہ دہرایا اور پھر دعا مانگی اے پروردگار تو اس کو دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کو دشمن قرار دے جو علیؑ کا دشمن ہو اور ابھی تک لوگ منتشر نہ ہونے پائے تھے کہ یہ آیت اتری اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ ع آیت ۳) ہم نے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے اسلام پر میں راضی ہوا۔ پھر اس حدیث کو صحابہ میں سے ایک سو دس افراد نے بیان کیا ہے اور چوراسی تابعی ہیں جنہوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور احادیث میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو تواتر میں حدیث غدیر کا مقابلہ کر سکتی ہو۔

تفسیر درمنثور[1] میں علامہ سیوطی نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے۔

لَمَّا نَصَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيًّا يَوْمَ غَدِيْرِ خُمٍّ فَنَادٰى لَهٗ بِالْوِلَايَةِ هَبَطَ جِبْرَئِيْلُ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ — جب غدیر خم کے دن حضرت رسالتمآبؐ علیؑ کو بلند کر کے ان کی ولایت کا اعلان کر چکے تو جبرئیل یہ آیت لے کر اترا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا۔

یہ روایت چونکہ بوجہ تواتر کے انکار کا موقعہ نہیں دیتی۔ لہٰذا بعض لوگ اس کی تاویل یہ کیا کرتے ہیں کہ دوستی کا حکم دیا گیا تھا کیونکہ ولایت کا معنی دوستی ہے اور مولیٰ کا معنی دوست ہے لیکن اس موقع پر حسان کے قصیدہ نے ان تمام تاویلات کو ختم کر کے رکھ

---

[1] نیز تفسیر ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان ج ۳ ص ۱۰ میں بھی مذکور ہے۔

دیا اور مشہور و معروف کتب معتبرہ میں درج ہے علی ما حکی۔ چنانچہ حسکانی نے شواہد التنزیل میں۔ خوارزمی نے فضائل میں حموینی نے فرائد السمطین میں نطنزی نے خصائص میں اور دیگر مصنفین نے اپنی تصانیف میں درج کیا ہے ہم قصیدہ کے چند اشعار یہاں درج کرتے ہیں۔

يُنَادِيْهِمْ يَوْمَ الْغَدِيْرِ نَبِيُّهُمْ
بِخُمٍّ وَّأَسْمِعْ بِالنَّبِيِّ مُنَادِيَا
بِأَنِّيْ مَوْلَاكُمْ نَعَمْ وَوَلِيُّكُمْ
فَقَالُوْا وَلَمْ يُبْدُوْا هُنَاكَ التَّعَادِيَا
إِلٰهُكَ مَوْلَانَا وَأَنْتَ وَلِيُّنَا
وَلَنْ تَجِدَنْ مِنَّا لَكَ الْيَوْمَ عَاصِيَا
فَقَالَ لَهٗ قُمْ يَا عَلِيُّ فَإِنَّنِيْ
رَضِيْتُكَ مِنْ بَعْدِيْ إِمَامًا وَّهَادِيَا
فَمَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا وَلِيُّهٗ
فَكُوْنُوْا لَهٗ أَنْصَارَ صِدْقٍ مُّوَالِيَا
هُنَاكَ دَعَا اَللّٰهُمَّ وَالِ وَلِيَّهٗ
وَكُنْ لِلَّذِيْ عَادٰى عَلِيًّا مُعَادِيَا

غدیر کے دن ان کو جناب رسالتمآبؐ باآواز بلند ندا دے رہے تھے۔ مقام خم میں اور حضورؐ کی آواز تمام لوگوں کو خوب سنائی دے رہی تھی کہ میں تمہارا مولیٰ اور دین و دنیا میں تمہارے امور کا مختار ہوں۔ تو ان تمام نے بغیر کراہت کے بیک زبان جواب دیا تیرا خدا ہمارا مولا ہے اور تو تمام امور میں ہمارا ولی و حاکم ہے اور اس معاملہ میں ہمارا کوئی فرد آپ کے حکم سے سرتابی نہ کرے گا۔ پس آپؐ نے فرمایا یا علیؑ اٹھو کیونکہ میں اپنے بعد تم کو امامت اور ہدایت کے عہدہ کے لئے نامزد کرتا ہوں۔ پس جس کا میں مولا و حاکم ہوں تو یہ بھی اس کا ولی و حاکم ہے پس تم لوگ اس کے سچے دوست اور معاون بن جاؤ۔ اس وقت دعا کی۔ اے اللہ اس کے دوست کو دوست رکھ اور جو اس کا دشمن بنے تو اس کا دشمن بن۔

قصیدہ میں امام و ہادی کی دو لفظیں مولیٰ کا ہی ترجمہ ہیں۔ حسان کے نہ اس ترجمہ پر جناب رسالتمآبؐ نے نکیر فرمائی اور نہ کسی صحابی نے اعتراض کیا حتیٰ کہ اس روایت کے نقل کرنے والے مورخین نے بھی حسان کے اس تصرف پر زبان کشائی نہیں کی جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ نے مراد ہی یہی معنی لیا تھا جو حاضرین کو مقامی

قرآن کے لحاظ سے معلوم تھا اور اس روایت کے لئے مناقب فاخرہ سے جو الفاظ منقول ہیں۔ ان میں علیؑ کو ہارون سے مثال بھی دی گئی۔ چنانچہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

فَقَالَ النَّبِيُّ مَنْ اَوْلٰى مِنْكُمْ بِاَنْفُسِكُمْ فَضَجُّوْا بِاَجْمَعِهِمْ وَ قَالُوْا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَاَخَذَ بِيَدِ عَلِيٍّ وَقَالَ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهٗ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهٗ لِاَنَّهٗ مِنِّيْ وَ اَنَا مِنْهُ وَهُوَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَكَانَتْ اٰخِرُ فَرِيْضَةٍ فَرَضَهَا اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ الآیہ

حضورؐ نے پوچھا تمہارے نفسوں پر جو تم سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہے وہ کون ہے؟ تو سب پکار اٹھے اور کہنے لگے۔ وہ اللہ اور اس کا رسول ہے۔ پس آپ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا جس کا میں مولا ہوں تو اس کا علیؑ مولا ہے اے اللہ تو اس کو دوست رکھ جو اس کو دوست رکھے اور اُنکو دشمن رکھ جو اس کو دشمن رکھے اس کی مدد کر جو اس کی مدد کرے اور اس کو رسوا کر جو اس کو رسوا کرے کیونکہ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور اس کو مجھ سے وُہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰؑ سے تھی مگر فرق یہ ہے کہ میرے بعد نبی کوئی نہ ہوگا اور یہ آخری فریضہ تھا جو اللہ نے آپ پر فرض کیا تھا پھر اس کے بعد اللہ نے یہ آیت بھیجی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ الخ میں نے آج تمہارا دین کامل کر دیا۔

ان الفاظ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خلافت و افضلیت تین مقاموں سے سمجھی جا رہی ہے۔

حضور کا پہلے اپنے اولیٰ بالتصرف ہونے کا اقرار لینے کے بعد علیؑ کے مولا ہونے کا اعلان صاف بتلاتا ہے کہ یہ علیؑ کے اولیٰ بالتصرف ہونے کا ہی اعلان تھا۔ ورنہ محبت اور دوستی کے حکم کے لئے اپنے لئے اس اقرار لینے کی کیا ضرورت تھی۔

② مَنْ کُنْتُ کی تعمیم یعنی یہ کہ جس جس کا میں مولا ہوں یعنی اولیٰ ہوں اس اس کا علیؑ مولا ہے یعنی اولیٰ ہے مولا کا معنی اولیٰ پہلے قرینہ کی رو سے ہے پس اس فقرہ میں حضرت علیؑ کی تمام کائنات خداوندی میں رسولِ خداؐ کے بعد افضلیت کا اعلان ہے

③ آخر میں علیؑ کو ہارون سے اور اپنے آپ کو موسیٰؑ سے مشابہت دے کر علیؑ کی حکومت و خلافت کو ناقابلِ تاویل بنا دیا۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ کوہ طور پہ جاتے ہوئے ہارونؑ کی صرف دوستی کا حکم نہیں دے گئے تھے بلکہ اولیٰ بالتصرف اور حاکم مقرر کر کے چلے تھے اور چونکہ ہارونؑ عہدۂ نبوت پر بھی فائز تھے اور یہاں نبوت ختم تھی لہٰذا مبادا اس مشابہت سے کوئی علیؑ کو نبی سمجھ لے اس کی وضاحت فرما دی کہ میرے بعد نبی کوئی نہ ہوگا پس اس تاریخی پس منظر کے بعد آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ کا اترنا حضرت علیؑ کی خلافت کے منصوص ہونے کی تاکید در تاکید ہے اور مناقبِ اخطب خوارزمی سے بروایت حذیفہ یمانی و ابوذر غفاری منقول ہے کہ حضورؐ نے جب خم غدیر میں ولایت علیؑ کا اعلان فرمایا تو اس کے بعد حکم دیا۔ سَلِّمُوْا عَلٰی عَلِیٍّ بِاِمْرَةِ الْمُؤْمِنِیْنَ کہ علیؑ کو خلافتِ مومنین کا سلام کرو اور اس کے بعد آیت اَکْمَلْتُ نازل ہوئی۔

④ آیت اطاعت

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (سورۂ نساء آیت ۵۹)

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول و اولوالامر کی اطاعت کرو۔ فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں کہا ہے کہ اس مقام پر خدا نے اولوالامر کی مطلق طور پر اطاعت کا حکم دیا ہے پس اس سے ثابت ہوا کہ اولوالامر وہی ہو سکتے ہیں جو معصوم ہوں کیونکہ اگر معصوم نہ ہوں تو ان سے غلطی کا امکان ہوگا اور ان کی غلط کاریوں میں بھی ان کی اطاعت کرنی پڑے گی کیونکہ حکم میں کوئی استثناء نہیں ہے حالانکہ وہ غلط کاریوں سے منع فرماتا ہے پس آیت مجیدہ کی رو سے اطاعت کا قطعی حکم اولوالامر کی عصمت کو ثابت کرتا ہے۔ الخ۔ فخرالدین رازی کی یہ بات واقعی قابلِ داد ہے کہ اس نے اولوالامر میں عصمت کو ضروری قرار دیا۔ لیکن مقامِ عمل میں اپنا بیڑا غرق کر دیا جبکہ کرسیٔ خلافت پر ایسے شخص کو لا کر کھڑا کر دیا جس سے عصمت کوسوں دور تھی چنانچہ کرسی سنبھالنے کے بعد وہ خود بھی اپنی نااہلیت کا بانگ دہل اعلان کرتے رہے چنانچہ امامت و سیاست ابن قتیبہ دینوری

کردیجئے لَسْتُ بِخَیْرِکُمْ میں تم لوگوں سے اچھا نہیں ہوں اِنَّ لِیْ شَیْطَانًا یَعْتَرِیْنِیْ ایک شیطان ہے جو مجھے گمراہ کرتا رہتا ہے۔ اِنْ زُغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ۔ اگر میں کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھے راستے پر لگا دینا۔ اس قسم کا اقرار خود عصمت کے لئے چیلنج ہے جس کو فخر رازی نے آیت کی رو سے اولوا الامر میں ضروری قرار دے دیا ہے اور میں دعوی سے کہتا ہوں کہ پوری امت میں معصوم سوائے آل محمد کے اور کوئی نہیں ہے قرآن مجید کی آیت مباہلہ میں اَنْفُسَنَا کا لفظ اور سابقہ روایت میں رسول کا فرمانا اِنَّهٗ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ علیؑ کی عصمت کی سندیں ہیں اس کے علاوہ عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ علیؑ کی عصمت پر برہان قاطع ہے پھر ہارونؑ سے مشابہت۔ ایمان کا خطاب جو خندق میں فرمایا اور حدیث طیر میں خدا کے محبوب ترین ہونے کا لقب اور حدیث عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ وغیرہ یہ سب علیؑ کی عصمت پر ببانگ دہل ناطق ہیں تو ثابت ہوا کہ اطاعت مطلقہ کا حکم صرف معصوم کی اطاعت کے لئے ہی ہو سکتا ہے اور معصوم آل محمد کے سوا کوئی دوسرا ہے نہیں اور چونکہ صحابہ میں سے علیؑ ہی اس صفت کے حامل تھے پس آیت کی رو سے اولوا الامر کے پہلے مصداق وہی ہیں اور وہی رسول اللہ کے بعد ان کے خلیفہ بلا فصل ہیں۔

⑤ آیت تطہیر

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا۔ آیہ مجیدہ کے متعلق ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں کہا ہے کہ اکثر مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہ حضرت علیؑ فاطمہؑ حسنؑ و حسینؑ کے حق میں نازل ہوئی مسلم نے باب فضائل اہل بیت میں حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ جناب رسالتمآب نے حسنینؑ علیؑ و فاطمہؑ کو ردا کے اندر اکٹھا کر کے آیت تطہیر پڑھی سیوطی نے درمنثور میں بھی اس کو نقل کیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کو نقل کر کے اسے صحیح علی شرط البخاری قرار دیا ہے۔ نیز ترمذی میں باب مناقب اہل بیت میں عمر بن ابی سلمہ سے مروی ہے کہ جب آیت تطہیر نازل ہوئی تو اس وقت جناب رسالتمآب ام سلمہ کے گھر میں تشریف فرما تھے پس علیؑ فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ علیہم السلام کو جمع کر کے ان پر چادر ڈال دی اور دعا مانگی۔

اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَآءِ اَهْلُ بَيْتِيْ فَاَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا
مستدرک ترمذی اور مسند احمد میں انس سے مروی ہے کہ اس کے چھ ماہ بعد تک جناب رسالتمآب جب صبح کی نماز کے لئے مسجد کو تشریف لے جاتے تھے تو دروازہ فاطمہ سے گزرتے ہوئے آیۂ تطہیر کی تلاوت کرتے تھے۔ بہرکیف اس باب کی تمام احادیث کو جمع کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے اور علماء نے صرف اسی حدیث پر مستقل کتابیں لکھی ہیں بعض لوگوں نے اہل بیت اطہار کے فضائل پر پردہ ڈالنے کے لئے ازواج کو اس کے اندر لانے کی کوشش کی ہے لیکن روایت کے تواتر نے ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ اور ظاہر ہے کہ ہر وہ فعل جو منشائے خداوندی کے خلاف ہو وہ رجس ہے اور منشائے ایزدی کے مطابق ہو وہ طہارت ہے تو آیتِ مجیدہ میں علیؑ و بتولؑ و حسنین شریفین علیہم السلام کی عصمت کا واضح اعلان ہے اور چونکہ خدا کی جانب سے امت پر اولی بالتصرف وہی ہو سکتا ہے جو معصوم ہو اور امتِ محمدیہ میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا معصوم نہیں ہے پس آیتِ مجیدہ علیؑ کی خلافت بلافصل کی دلیل ہے۔

⑥ آیت تقویٰ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ
اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ

ظاہر ہے کہ سچوں کے ساتھ ہونے کا مطلب جسمانی قرب نہیں بلکہ روحانی قرب اور ان کی اطاعت مقصود ہے اور صداقت کی تین صورتیں ہیں

① اعتقاد میں صداقت ② زبان میں صداقت ③ عمل میں صداقت

پس صحیح معنوں میں صادق وہی ہو سکتا ہے جو ایمان و قول و عمل میں بالکل صادق ہو اور اس سے ان تینوں پہلوؤں میں غلطی کبھی صادر نہ ہو۔ پس آیتِ مجیدہ میں صادقین سے مراد معصوم ہی ہوئے کیونکہ جس سے ایمان و اقرار و عمل میں کبھی جھوٹ اور غلطی نہ ہو وہی معصوم ہوتا ہے پس سابق تطبیق سے آیتِ مجیدہ حضرت علیؑ کی خلافت کی دلیل ہے۔

⑦ آیتِ صلوٰۃ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (الآیہ) جناب رسالتمآب سے جب صلوٰۃ کا طریقہ پوچھا گیا تو آپ نے

فرمایا کہ میرے اُوپر دم بریدہ صلوات نہ پڑھی کرو۔ جب لوگوں نے معنی پوچھا تو آپ نے فرمایا میرے ساتھ میری آل کو شریک نہ کرنا۔ دم بریدہ صلوات ہے۔ ویسے تو رنگ صلوات میں ازواج و اصحاب کو بھی شامل کر لیا کرتے ہیں لیکن حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کے لئے ایک مقام محفوظاً بھی موجود ہے جس سے اصل و بناوٹ کے درمیان واضح فرق معلوم ہو جاتا ہے کہ نماز کے تشہد میں یہ درود و صلوات صرف آل محمدؐ کے لئے ہی مخصوص ہو جاتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ سے جو درود منقول ہے وہ صرف یہی ہے اور باقی لوگوں کے اپنی طرف سے جذباتی و خواہشاتی اضافے ہیں اور حضرت شافعی کی طرف بھی ایک شعر منسوب ہے۔

يَا أَهْلَ بَيْتِ رَسُوْلِ اللهِ حُبُّكُمْ ۔۔۔ فَرْضٌ مِنَ اللهِ فِي الْقُرْآنِ أَنْزَلَهُ

اے رسولؐ اللہ کے گھر والو تمہاری محبت اللہ کی جانب سے فرض ہے اس قرآن میں جو اس نے نازل فرمایا۔

وَكَفَاكُمْ مِنْ عَظِيْمِ الْقَدْرِ أَنَّكُمْ ۔۔۔ مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلٰوةَ لَهُ

اور تمہاری عظیم منزلت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جو تم پر درود نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے۔

تو تمام صحابہ کرام پر بلا استثنا آل محمدؐ پر درود پڑھنا لازم تھا تو جس پر درود پڑھا جاتا ہے اس میں کسی افضلیت وخوبی کا ہونا ضروری ہے ورنہ حکم صرف طرفداری بن جانے گا اور خدا کسی کی ناجائز طرفداری نہیں کرتا پس جب طرفداری نہیں بلکہ استحقاق ہے تو پھر کیا حق پہنچتا ہے کسی امتی کو خواہ صحابی ہو یا غیر کہ جس پر درود بھیجے اس پر حکومت کرے اور درود پڑھنے والا آگے کھڑا ہو اور جس پر درود بھیجا جائے وہ پیچھے کھڑا ہو پس رسالتمآبؐ کے بعد مقدم ہونے اور حاکم ہونے کا حق صرف آل محمدؐ کو ہی حاصل ہے جن کا اشرف فرد حضرت علیؑ ہے تو گویا یہ آیت مجیدہ التزامی طور پر حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل کو ثابت کرتی ہے۔

(۹) آیت بیّنہ

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (سورہ ہود آیت ۱۷)

تفسیر مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام علی رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ آیتِ مجیدہ میں شاہد سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں اور علامہ علی اعلی اللہ مقامہ نے ذکر کیا ہے کہ جمہور اہلِ سنّت نے بھی اس جگہ شاہد سے مراد حضرت علی کو لیا ہے لہٰذا یہ آیتِ مجیدہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل پر نص ہے اور ابن روزبہان نے اہل سنّت کی تفسیروں میں اس کا حوالہ نہیں تسلیم کیا لیکن دلائل الصدق ج ۲ ص ۱۲۰ میں اسے تفاسیر اہل سنّت سے ثابت کیا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں شاہد کے معنی کے متعلق چند وجوہ ذکر کئے گئے ہیں اور تیسری یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس سے مراد حضرت علیؑ ہیں (اور ضمیر غائب کا مرجع یَتْلُوْهُ میں بَیِّنَۃ بمعنی برہان ہے) اور مِنْهُ میں ضمیر غائب کا مرجع مَنْ ہے) یعنی وہ شاہد محمدؐ سے ہے اور اس کی جزو ہے اور سیوطی نے درمنثور میں حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کوئی قریشی ایسا نہیں جس کے حق میں قرآن کا کچھ حصہ نہ اترا ہو تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی کہ آپ کے حق میں بھی کچھ اترا ہے تو آپ نے سورہ ہود کی یہ آیت پڑھی اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ الخ کہ جناب رسالتمآب بینہ پر تھے اور میں اس کا شاہد ہوں اور اسی طرح طبری سے بھی منقول ہے اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ آیت چار وجوہ کی بناء پر حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر دلالت کرتی ہے۔

① آیتِ مجیدہ میں حضرت علیؑ کو شاہد کہا گیا ہے اور شاہد سے مراد ہے امت پر شاہد ہونا اس قرینہ سے آپ رسول کے تالی ہیں جس طرح رسول کو شاہد کہا گیا ہے اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا (ہم نے تم کو شاہد مبشر اور نذیر بنا کے بھیجا) اور باقی انبیاء کے متعلق کہا گیا ہے وَجَعَلْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِیْدًا عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ (یعنی ہم نے ہر امت کا شہید ان کے نفسوں سے بنایا اور تجھے ان لوگوں پر شہید بنایا) اور اس سے لوگوں کے امور دینی ولایت و حکومت شرعی ثابت ہے پس حضرت علی کو شاہد کہنا لوگوں کے امور پر اس کی ولایت کو ثابت کرتا ہے اور یہی خلافت کا مفہوم ہے

② آیتِ مجیدہ میں علیؑ کو رسولؐ کا بعض کہا گیا ہے کیونکہ مِنْهُ میں مِنْ تبعیض کے لئے ہے) اور خود پیغمبر نے اس کی تائید ان لفظوں میں فرمائی عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ اور یہ عصمت فضل اور باقی تمام صفاتِ حمیدہ میں رسولؐ کے ساتھ علیؑ کی مشارکت کو

ثابت کرتی ہے پس علیؑ ہی رسولؐ کی خلافت کے سزاوار ہوئے۔

۴ آیتِ مجیدہ میں علیؑ کو رسولؐ کا تالی کہا گیا ہے جیسے کہ ضمیر مذکر کا مرجع کے ساتھ تطابق کا تقاضا ہے اور تالی ہونے سے مراد بلافصل پیچھے چلنا ہے اور اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ وُہ ان کے قائمقام ہوں۔ دوسری صورت یہ کہ وُہ بھی ان کی طرح بینہ پر ہوں اور تیسری صورت یہ کہ ان کی دعوت میں ان کے مددگار و معاون ہوں جیسے حضورؐ نے خود فرمایا کہ میں نے اللہ سے دُعا کی ہے کہ وہ میری کمر کو علیؑ کی مدد سے مضبوط کرے اور اس کو میرا شریک کار بنائے اور خدا نے وہ مستجاب فرمائی پس علیؑ نبی سے اس طرح ہیں جس طرح ہارون موسیٰ سے تھے پہلی صورت میں تو خلافت ثابت ہوگئی۔ دوسری صورت میں جب ان کی طرح بینہ پر ہیں تو ان کے بعد ان کے قائم مقام ہونا یقیناً ہیں اور تیسری صورت میں جب علیؑ ہی رسولؐ کا سب سے بڑا مددگار ہے تو خلافت کا بھی سب سے پہلا حقدار ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ضمیر کا مرجع بینہ ہے جیسے گزر چکا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ علیؑ وہ ذات ہے جو حضرت محمد مصطفیٰؐ کی شہادت قرآن مجید کی تلاوت سے دیتے تھے تو ان کو رسالتمآبؐ کا دوسرا معجزہ قرار دیا گیا۔ پہلا معجزہ بینہ اور دوسرا معجزہ وہ شاہد ہے جو بینہ کی تلاوت کرتا ہے پس یہ حضرت علیؑ کی تمام صحابہ سے افضل ہونے کی دلیل ہے پس وہی خلافت کے حقدار ہیں (دلائل الصدق)

۹ آیتِ استجابت

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ الخ سورۂ انفال آیت ۲۴

اے ایمان والو اللہ اور رسول کی بات کو قبول کر لیا کرو۔ جب وہ تم کو ایسی چیز کی طرف بلائیں جس میں تمہاری زندگی کا راز مضمر ہو پس آیت مجیدہ خلافت علیؑ کی دلیل ہے۔ کیونکہ رسولؐ نے بحکم خدا بذریعہ حدیث غدیر متواتر اور حدیث ثقلین متواتر علیؑ کی اطاعت کی طرف سب صحابہ کو بلایا جس کا قبول کرنا آیت مجیدہ کے حکم کے ماتحت سب پر واجب تھا۔

۱۰ آیتِ فتنہ

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً الخ سورہ انفال آیت ۲۵۔ اور بچو فتنے سے مبادا اپنی لپیٹ

ہیں سے لے ان کو جو ظلم کریں تم میں سے خاص طور پر تفسیر مجمع البیان میں ابو ایوب انصاری سے مروی ہے کہ حضورؐ نے عمار سے فرمایا میرے بعد فتنے ہوں گے۔ خون ریزیاں ہوں گی اور آپس میں تلوار چلے گی پس ایسے حالات میں علیؑ کا دامن تھام لینا اگر تمام لوگ ایک وادی میں جا رہے ہوں اور علیؑ دوسری وادی میں اکیلا ہو تو تمام لوگوں کو چھوڑ کر اسی وادی کی طرف چلو جس میں علیؑ ہو اے عمار! علیؑ تجھے ہدایت سے نہ ہٹائے گا اور گمراہی میں نہ ڈالے گا اے عمار! علیؑ کی اطاعت میری اطاعت ہے اور میری اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

اور حاکم ابوالقاسم حسکانی کی کتاب "شواہد التنزیل" سے منقول ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے فرمایا مَنْ ظَلَمَ عَلِیًّا مَقْعَدِیْ هٰذَا بَعْدِیْ وَفَاتِیْ فَكَاَنَّمَا جَحَدَ بِنُبُوَّتِیْ وَنُبُوَّةِ جَمِیْعِ الْاَنْبِیَاءِ قَبْلِیْ جس نے میری اس مسند کے متعلق میری وفات کے بعد علیؑ پر ظلم کیا تو گویا اس نے میری نبوت اور مجھ سے پہلے کے تمام انبیاء کی نبوت کا انکار کیا۔

تفسیر صافی اور تفسیر برہان میں آئمہ طاہرین علیہم السّلام سے بھی اس فتنہ سے مراد حضرت علیؑ کی خلافت وحق کا غصب کرنا ہے اور غاصبین کو ہی ظالم کہا گیا ہے چنانچہ تفسیر برہان میں بطریق مخالفین ابن مسعود سے بھی اسی مضمون کی ایک روایت حضرت رسالتمآبؐ سے نقل کی گئی ہے کہ آپ نے ابن مسعود سے فرمایا جس نے میری مسند کے بارے میں علیؑ پر ظلم کیا گویا وہ میری اور تمام انبیاء کی نبوت کا انکاری ہے پس عامہ وخاصہ کی روایات کی رو سے حضرت علیؑ کی خلافت کا غاصب ظالم ہے یعنی حضورؐ کے بعد خلیفہ بلافصل حضرت علیؑ ہے اور جو اس بارے میں علیؑ سے جھگڑا کرے گا وہ ظالم ہو گا۔

(۱۱) آیت تائید

هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ سورۂ انفال آیت ۶۲ وہ اللہ جس نے تیری تائید اپنی مدد سے اور مومنین کے ذریعے سے کی ہے۔

(۱۲) آیت تسلیہ

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ آیت ۶۴ اے نبی تجھے اللہ کافی ہے۔

اور وہ جو مومنین میں سے تیری اتباع کریں۔ ابونعیم سے حلیۃ الاولیاء میں مروی ہے۔ کہ یہ دونو آیتیں حضرت علیؑ کے حق میں اتری ہیں اور علامہ حلّی اعلی اللہ مقامہٗ نے ان دونو آیتوں کو خلافتِ بلافصل کی دلیل قرار دیا ہے کیونکہ جب بفرمانِ خدا علی ناصرِ رسولؐ ہے اور اللہ نے اپنی نصرت و تائید پر علیؑ کو معطوف قرار دیا ہے نیز نبی کو کافی ہونے کے لئے کفایت خداوندی پر علیؑ کا عطف ہے تو اس سے زیادہ عظمت اور کیا ہوگی پس تمام صحابہ سے اس شرف میں بھی حضرت علیؑ ممتاز ہیں۔ لہٰذا انہیں ہی خلافت کا استحقاق حاصل ہے علاوہ ازیں علامہ حلّی نے بہت کافی آیتیں اس سلسلہ میں ذکر فرمائی ہیں لیکن ہم انہی بارہ کی تعداد پر اکتفا کرتے ہیں اور اب چند احادیث مسلّمہ بطورِ اتمامِ حجت خلافت کے متعلق پیش کرکے ہم اس موضوع پر بحث کو ختم کردیں گے۔

خلافتِ حضرت علیؑ بطریق احادیث

احادیث اس سلسلہ میں بہت زیادہ ہیں لیکن ہم صرف بارہ احادیث پیش کریں گے۔

① نزولِ سورۂ برأت

محدثین و مفسرین کا اتفاق ہے کہ جب سورۂ برأت نازل ہوئی تو حضرت رسالتمآبؐ نے اہلِ مکہ کو حکمِ خداوندی سنانے کے لئے ابوبکر کو نامزد فرمایا اور پھر اس کو اس عہدۂ جلیلہ سے معزول فرما کر حضرت علیؑ کو متعین فرمایا الفاظ روایات میں قدرے اختلاف ہے لیکن اصل مقصد سب کا ایک ہے اور وہ یہ ہے۔

• حضورؐ نے حضرت ابوبکر کو روانہ فرمایا کہ سورۂ برأت کی دس آیتیں ان کے سامنے جاکر پڑھے اور ان کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو منسوخ کردے اور پھر حضرت علیؑ کو روانہ فرمایا کہ حضرت ابوبکر سے وہ عہدہ خود لے کر جائے چنانچہ حضرت علیؑ رسولؐ خدا کی مخصوص سواری ناقہ غضباء پر سوار ہوکر مقام ذوالحلیفہ یا عرج یا ضجنان یا جحفہ پر (باختلاف الفاظ) ابوبکر کو جا ملے اور ان کو معزول کرکے عہدہ سنبھال لیا اور روانہ ہوگئے ابوبکر نے واپس آکر دریافت کیا کہ حضورؐ کیا میرے بارے میں کچھ اترا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں کوئی بات نہیں لیکن یہ اعلان چونکہ

میری طرف سے ہے لہٰذا اس کو میں نے ہی پہنچانا ہے یا میری جانب سے صرف وہی پہنچا سکتا ہے جو مجھ سے ہے۔ روایت کے لفظ یہ ہیں۔

لَا يُؤَدِّي عَنِّي إِلَّا أَنَا أَوْ رَجُلٌ مِنِّي

اس روایت کو تیرہ معتبر اکابر صحابہ نے روایت کیا ہے۔

① حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام
② حضرت ابوبکر
③ ابن عباس
④ انس بن مالک
⑤ ابوسعید خدری
⑥ ابورافع
⑦ سعد بن ابی وقاص
⑧ ابوہریرہ
⑨ عبداللہ بن عمر
⑩ حبشی بن جنادہ
⑪ عمران بن حصین
⑫ ابوذر غفاری
⑬ جابر بن عبداللہ

اور جن کتب معتبرہ میں یہ روایت موجود ہے وہ یہ ہیں۔ درمنثور ج ۳ ص ۲۰۹، کنز العمال جلد ۱ ص ۲۲۰، ۲۲۶۔ مسند احمد ج ۱ ص ۱۵۱۔ تفسیر شوکانی ج ۲ ص ۳۱۹، تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۳۸ و ج ۷ ص ۳۵۷ عینی شرح بخاری ج ۸ ص ۶۳۷ خصائص نسائی ص ۲۰، کفایۃ گنجی ص ۱۲۵، جامع ترمذی ج ۲ ص ۱۳۵، سنن بیہقی ج ۹ ص ۲۲۴، قسطلانی شرح صحیح بخاری ج ۸ ص ۱۳۶، فتح الباری ج ۸ ص ۲۵۹، عینی ج ۸ ص ۲۳۰ اور مدارج المعانی۔

اس حدیث کی اہمیت تو اس امر سے خوب واضح ہے کہ یا اس کو رسول خود پہنچائے یا وہ آدمی پہنچائے جو رسول سے ہو۔ ابوبکر کو راستہ سے واپس بلوا کر حضرت علی کو نامزد کر گئے جیسا اس امر کو خوب واضح کرتا ہے کہ نیابت رسول کو سوائے علی کے اور کوئی نہیں سنبھال سکتا کیونکہ جب صرف ان آیتوں کیلئے ایک شخص غیر موزوں [illegible] پورے عالم کے لئے کیسے ہو سکتا ہے؟ پس یہ حدیث شریف حضرت علی کی خلافت پر نص قاطع ہے اس کے متعلق لمبی چوڑی بحث سوالات و جوابات کے ساتھ ہم نے تفسیر انوار النجف کی ساتویں جلد میں کی ہے

وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

② حدیثِ منزلت

یہ حدیث کتبِ صحاح مثلاً بخاری و مسلم و مسند احمد بن حنبل سے نقل کی جاتی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ اے علیؑ کیا تو راضی نہیں کہ تیری مثال مجھ سے وہ ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر فرق صرف اتنا ہے کہ میرے بعد نبی کوئی نہیں ہوگا۔ یعنی جس طرح ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کی تمام امّت سے افضل تھا اسی طرح حضرت علیؑ جنابِ رسالتمآبؐ کی تمام امّت سے افضل تھے جس طرح وہ حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ تھے اسی طرح حضرت علیؑ بھی جنابِ رسالتمآبؐ کے خلیفہ تھے پس روایت کی دلالت خلافت بلافصل پر روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

③ حدیثِ ایمان

بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّهٖ سارے کا سارا ایمان سارے کے سارے کفر کے مقابلہ میں جارہا ہے اور تمام مؤرخین نے حضرت رسالتمآبؐ کا علیؑ کے حق میں یہ فرمان نقل کیا ہے جبکہ آپ جنگِ خندق میں عمرو ابن عبدود کے مقابلہ کو روانہ ہوئے اور جب علیؑ کل ایمان ثابت ہوئے تو خلافت پر اس کی دلالت اظہر من الشمس ہے کیونکہ خدائی عہدہ کی تقسیم ایمان کے تابع ہے اور علیؑ ایمان کل ہے۔ لہٰذا تمام صحابہ سے اس کی افضلیت عیاں ہے۔ جنگ خندق کی تفصیل تفسیر انوار النجف جلد ۱۱ ص ۱۶۲ تا ص ۱۸۳ ملاحظہ ہو۔

④ حدیثِ محبّت

لَا یُحِبُّكَ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا یُبْغِضُكَ اِلَّا مُنَافِقٌ یہ حدیث ترمذی شریف اور مسند احمد بن حنبل میں مذکور ہے ابنِ حجر مکی نے صواعقِ محرقہ میں بھی اسی مضمون کی احادیث نقل کی ہیں۔ بلکہ یہ حدیث معنوی طور پر اپنے اندر تواتر کا درجہ رکھتی ہے بنابریں صحابہ کرام سے حضرت علی علیہ السلام کی افضلیت ثابت ہوئی کیونکہ صحابہ سب مومن تھے تو ایمان کی شرائط میں سے ایک شرط محبت علیؑ تھی۔ لہٰذا علیؑ کی محبت ان کے لئے جزوِ ایمان تھی لیکن علیؑ پر کسی صحابی کی محبت جزوِ ایمان ہونے کی حیثیت سے فرض نہ تھی۔ پس جب علیؑ افضل ثابت ہوئے تو خلافت بھی ثابت ہو گئی کیونکہ افضل کی موجودگی میں مفضول کی

کو مقدم کرنا انتہائی ناانصافی ہے۔

⑤ **حدیثِ طیر** مسند احمد بن حنبل اور کتبِ معتبرہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ جناب رسالتمآبؐ کے پاس پرندے کا بھُنا ہوا گوشت آیا تو آپ نے یہ دعا مانگی اَللّٰھُمَّ اَئْتِنِیْ بِاَحَبِّ النَّاسِ اِلَیْکَ یَاْکُلُ مَعِیْ مِنْ ھٰذَا فَاَکَلَ مَعَہٗ اے اللہ میرے پاس اپنا محبوب ترین آدمی بھیج جو میرے ساتھ کھا کھائے پس دعا قبول ہوئی اور حضرت علیؑ آگئے تو آپ نے ان کے ساتھ مل کر کھایا۔ یہ حدیث تواتر کا درجہ رکھتی ہے اور اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضرت علیؑ خدا کا محبوب ترین بندہ تھا پس افضلیت اور خلافت ثابت ہوگئی۔

⑥ **حدیثِ حق** اَلْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ وَ عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ لَنْ یَفْتَرِقَا حق علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ حق کے ساتھ ہے اور یہ دونوں آپس میں جدا نہ ہوں گے اس روایت کے الفاظ مختلف ہیں۔ حدیث تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے بلحاظ معنی کے اور التزامی طور پر اس کی خلافت پر دلالت ظاہر ہے۔

⑦ **حدیثِ مدینہ** اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔ حدیث مشہور و معروف ہے پس جب حضرت علیؑ علم میں تمام صحابہ کرام سے افضل و برتر تھے بلکہ سب کا ملجا و ماوٰی تھے جس کی تصدیق حضرت عمر نے لَوْلَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ کے نقروے کردی تو اس سے بڑھ کر خلافت کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کیونکہ مسند نبوت پر تمکن علمی مرتبہ کے لحاظ سے ہونا قرینِ عقل ہے۔ احادیث مذکورہ کے حوالہ جات گزر چکے ہیں۔

⑧ **حدیثِ ثقلین** یہ حدیث کتب صحاح میں موجود ہے اور حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہے اس حدیث کے موضوع پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں چنانچہ مولانا سید حامد حسین قبلہ لکھنوی اعلی اللہ مقامہ نے عبقات الانوار کی ایک ضخیم جلد میں صرف حدیث ثقلین ہی کو موضوع بحث قرار دیا مسند احمد تفسیر ثعلبی صحیح مسلم وغیرہ سب کتب میں یہ حدیث موجود ہے اگرچہ روایات کے الفاظ مختلف ہیں لیکن اس مفہوم میں سب شریک ہیں کہ حضور نے فرمایا

تھا اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت جب تک تم ان دونوں سے تمسک کئے رہو گے ہرگز ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ یہ حدیث تمام صحابہ کرام کو حضرت علیؑ اور باقی اہل بیتؑ سے تمسک کرنے کی وصیت ہے اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اہل بیت سے مراد حضرت علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ ہی ہیں جیسے آیتِ تطہیر کے بیان میں مفصلاً گزر چکا ہے پس ان کو قرآن کا قرین بنانا ان کی خلافت پر نص ہے ایک حدیث میں عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ فرمایا چنانچہ یہ حدیث پہلے گذر چکی ہے پس حدیث کی دلالت خلافت پر عیاں راچہ بیان کی مصداق ہے

⑨ حدیثِ غدیر

یہ حدیث متواتر ہے مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ آیتِ تبلیغ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔ خلافتِ علیؑ پر نص ہے۔

⑩ حدیث جمع کمالات

سیوطی سے ثنائی میں حاکم سے منقول ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؑ کے حق میں فرمایا

مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی اٰدَمَ فِیْ عِلْمِہٖ وَنُوْحٍ فِیْ فَھْمِہٖ وَاِبْرَاھِیْمَ فِیْ حِلْمِہٖ وَیَحْیٰی فِیْ زُھْدِہٖ وَمُوْسٰی فِیْ بَطْشِہٖ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی عَلِیٍّ جو شخص آدمؑ کو علم میں نوحؑ کو فہم میں ابراہیمؑ کو حلم میں یحییٰ کو زہد میں اور موسیٰؑ کو اپنی قوت میں دیکھنا چاہے تو علیؑ کو دیکھے یہ حدیث بھی مختلف کتب میں مختلف الفاظ سے مروی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ علیؑ جامع کمالات انبیاء ہے پس علیؑ انبیاء سابقین سے افضل ہیں۔ جن میں ایک ایک کمال تھا کیونکہ علیؑ میں ان سب کے کمالات موجود تھے پس حضورؐ رسالتمآبؐ کے بعد ان کے صحیح قائمقام و خلیفہ یہی ہوں گے۔

⑪ حدیث شب معراج

بروایت ینابیع المودۃ ابن مسعود سے مروی ہے کہ حضورؐ رسالتمآبؐ ارشاد فرماتے ہیں۔ معراج پر جاتے ہوئے جب میں چوتھے آسمان پر پہنچا تو یاقوت احمر کا ایک مکان دیکھا جبرئیل نے بتایا کہ یہ البیت المعمور ہے اور وہاں مجھے نماز کے لئے کہا گیا

تو تمام نبیوں کو خدا نے جمع کیا اور انہوں نے میرے پیچھے صف باندھ لی۔ چنانچہ میں نے ان کو دو رکعت نماز پڑھائی جب سلام پڑھ چکا تو اللہ کی جانب ایک قاصد آیا کہ اے محمدؐ! خدا سلام کے بعد فرماتا ہے۔ سَلِ الرُّسُلَ عَلیٰ مَا اَرْسَلْتُهُمْ مِنْ قَبْلِكَ فَقُلْتُ مَعَاشِرَ الرُّسُلِ عَلیٰ مَا بَعَثَكُمْ رَبُّكُمْ قَبْلِی فَقَالَتِ الرُّسُلُ عَلیٰ نُبُوَّتِكَ وَ وَلَایَةِ عَلِیِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ ان رسولوں سے پوچھیے کہ تجھ سے پہلے یہ کیوں رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں تو میں نے پوچھا اے گروہ رسل تمہارے رب نے تم کو مجھ سے پہلے کیوں کر بھیجا تھا تو کہنے لگے کہ تیری نبوت پر اور علیؑ بن ابی طالب کی ولایت پر۔ نیز سورۂ زخرف میں آیہ مجیدہ وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ میں جہاں حکم ہے کہ اے رسول اپنے سے گزشتہ انبیاء سے پوچھو اس آیتِ مجیدہ کی تاویل میں کافی عرصہ تک لوگ سرگرداں رہے کہ جن سے پوچھنے کا حکم ہے وہ موجود نہیں تو حکم کیوں دیا گیا ہے اور اگر پوچھنا ممکن ہے۔ تو کیسے؟ چنانچہ یہ سوال ایک مرتبہ امام محمد باقر علیہ السلام سے ہوا اور امام جعفر صادقؑ سے بھی ہوا جیسا کہ بحار الانوار ج ۹ میں موجود ہے اور آئمہؑ نے یہی جواب دیا کہ یہ آیت زمین پر نہیں اتری بلکہ شب معراج البیت المعمور پر یہ آیت اتری ہے۔ اور فخرالدین رازی نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے اور روایت غالباً ابن عباس سے نقل کی ہے کہ شب معراج البیت المعمور پر یہ آیت اتری جب سب انبیاء سامنے موجود تھے تو حضورؐ نے انبیاء سے اس لئے نہ پوچھا کہ انہیں ان کا جواب معلوم تھا پس بات راز پوشیدہ رہ گئی لیکن آئمہ اہل بیتؑ سے صاف طور پر ظاہر ہوئی ہے چنانچہ تفسیر برہان میں بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے سب انبیاء سے دریافت فرمایا کہ تم کس چیز پر مبعوث ہوئے ہو؟ تو سب نے یہی جواب دیا کہ ہم تین اقراروں پر مبعوث ہوئے ہیں اللہ کی توحید تیری نبوت اور علی بن ابی طالب کی ولایت اور تفاسیر اہل سنت میں تفسیر نیشاپوری سے بھی اسی طرح منقول ہے۔

پس اس روایت سے حضرت علیؑ کی فضیلت عیاں ہے کہ انبیاء کی بعثت حضرت علیؑ کی ولایت کے اقرار پر ہوئی اور کتاب ینابیع المودۃ ملا سلیمان حنفی نقشبندی میں بھی صاف موجود ہے۔ لَمْ یُبْعَثْ نَبِیٌّ قَطُّ اِلَّا بِوِلَایَةِ عَلِیِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ کہ کوئی نبی مبعوث نہ ہوا مگر ساتھ ولایت علیؑ بن ابی طالب کے اور یہ شرف صحابہ میں سے

کسی کو حاصل نہیں ہوا لہٰذا خلافتِ نبوی کا ان کے علاوہ کوئی بھی حقدار نہیں ہے۔

(۱۴) حدیثِ نور

اَنَا وَ عَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ یہ حدیث مسلمات میں سے ہے اور اس سے قبل خلقتِ نوری کی ایک حدیث گزر چکی ہے اور اس قسم کی احادیث کو جمع کیا جائے تو ایک الگ کتاب بن جائے گی۔ حدیث مبارک میں حضرت علیؑ کا حضرت رسالتمآبؐ سے انتہائی قرب کا اظہار ہے ایک حدیث میں آپ نے فرمایا سارے لوگ الگ الگ درختوں سے ہیں لیکن میں اور علیؑ ایک درخت کی دو شاخیں ہیں ایک حدیث میں فرمایا عَلِیٌّ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْہُ اس حدیث کو صحاح ستہ میں نقل کیا گیا ہے (علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں) یہ حدیث مبارک علیؑ کی افضلیت کا ببانگِ دہل اعلان کر رہی ہے پس خلافتِ بلافصل رسولؐ کے بعد صرف انہی کا ہی حق ہے۔

تتمہ کے طور پر ایک بات کہہ دوں کہ خلافتِ بلافصل کے متعلق جس قدر روایات میں نے پیش کی ہیں۔ یہ عشرِ عشیر بھی نہیں ان کا جو پیش کی جا سکتی ہیں میں نے صرف عددِ آئمہ کے مطابق بارہ احادیث تبرکاً پیش کی ہیں اور ان کا فائدہ صرف ان لوگوں کو ہے جس کا آئینہ قلب تعصب و عناد کی میل سے صاف ہے۔ پس وہ غور و فکر کے بعد راہِ حق کی تلاش کرنے میں کامیاب ہوں گے اس مقام پر جس قدر احادیث میں نے نقل کی ہیں ان سب کی دلالت علی علیہ السلام کے تمام کمالات نفسیہ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور یہ احادیث حضرت علیؑ کی عصمت کی بولتی ہوئی زبانیں ہیں اور منبرِ رسول پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو جامع کمالاتِ نبویہ ہو اگرچہ خود نبی نہ ہو اور وہ صرف اس پابندی کے ماتحت کہ یہ عہدہ ختم ہے نہ اس لئے کہ اس میں اہلیت نہیں کیونکہ اہلیت کے لحاظ سے تو آپ آئینہ کمالات انبیاء ہیں جیسے کہ اس مضمون کی ایک حدیث بیان کی جا چکی ہے اور اہلیت کے لحاظ سے تو رسولؐ کی خبر میں علیؑ مثلِ ہارون ہیں ایمان کل ہیں۔ محبوب ترین خدا ہیں حق ہیں باب علوم نبویہ ہیں۔ اور ناطق قرآن ہیں جس طرح کہ احادیث بتلا رہی ہیں پس عقل و نقل ہر دو طریقوں سے ہم نے حضرت علیؑ علیہ السلام کی خلافتِ بلافصل کو ثابت کیا ہے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

باقی آئمہ کے متعلق نص

ینابیع المودۃ سے بروایت جابر منقول ہے کہ جب آیت اولوالامر اتری تو میں نے بارگاہ نبوی میں عرض کی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ عَرَفْنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلَہٗ فَمَنْ اُولُوا الْاَمْرِ الَّذِیْنَ قَرَنَ اللّٰہُ طَاعَتَھُمْ بِطَاعَتِكَ (ترجمہ) یا رسول اللہ ہم نے اللہ و رسول کو تو جان لیا ہے فرمائیے وہ اولوالامر کون ہیں جن کی اطاعت کو خدا نے آپ کی اطاعت کے ساتھ ملایا ہے تو آپ نے فرمایا ھُمْ خُلَفَائِیْ یَا جَابِرُ وَاَئِمَّۃُ الْمُسْلِمِیْنَ بَعْدِیْ وہ میرے خلیفے ہیں اے جابر اور میرے بعد مسلمانوں کے امام ہیں (پھر آپ نے ان کے نام گنوائے) ان کا پہلا علیؑ بن ابی طالب پھر حسنؑ پھر حسینؑ پھر علی بن الحسینؑ پھر محمد بن علیؑ جو تورات میں باقر کے لقب سے ملقب ہیں اے جابر تجھے اس کا زمانہ نصیب ہوگا ان سے ملنا تو میرا اسلام پہنچا دینا پھر صادق جعفر بن محمد پھر موسیٰ بن جعفر پھر علیؑ بن موسیٰ پھر محمد بن علیؑ پھر علی بن محمد پھر حسنؑ بن علیؑ پھر وہ ہوگا جس کا نام اور کنیت میرے نام اور کنیت جیسی ہوگی وہ اللہ کی زمین میں اس کی حجت ہوگا اور اس کے بندوں میں اس کا خلیفہ ہوگا اور حسنؑ بن علیؑ کا فرزند ہوگا۔ ذَالِكَ الَّذِیْ یَفْتَحُ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَھَا الخ وہ ہوگا کہ خداوند کریم اس کو مشرق و مغرب پر فتح دے گا۔

اہل سنت کے مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ حضورؐ نے اپنے بعد آئمہ کی تعداد بارہ فرمائی تھی اور پھر فرمایا تھا کہ وہ سب قریش سے ہوں گے۔ چنانچہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں اس امر کا اعتراف کیا ہے لیکن چونکہ دروازۂ اہل بیت کو تعصب وعناد کی بناء پر چھوڑ بیٹھے لہٰذا باوجود انتہائی تگ و دو کے انہیں وہ بارہ خلیفے مل نہ سکے اور وہ اسلامی و ملوکی حکومتوں میں امتیاز نہ کر سکے جس کی بدولت وہ ایسے دلدل میں جا پھنسے جس سے نکلنا مشکل ہو گیا اور چونکہ ان کو گھٹی میں یہ چیز پلائی گئی کہ خبردار کسی صحابی کے متعلق زبان کشائی نہ کرنا کیونکہ حضورؐ نے فرمایا اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ میرے سارے اصحاب مثل ستارگان آسمان کے ہیں جس کے پیچھے چلو گے ہدایت پاؤ گے حالانکہ معنوی لحاظ سے یہ فقرہ بالکل مہمل ہے لیکن صرف بعض صاحبان اقتدار کی بحالی اقتدار کی خاطر چونکہ اس کی پردہ پوشی کے لئے کسی

خوشامدی آدمی نے یہ فقرہ حضورؐ کی طرف منسوب کر دیا تو سب نے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا اور یہ کسی نے نہ سوچا کہ کسی کی اچھائی یا برائی کا معیار بھی ہونا چاہیے اگر سب کے سب ہادی و رہبر اور نیک ہیں تو بخاری شریف کی حوض والی حدیث کا کیا مطلب ہے کہ حوض سے کئی لوگوں کو ہٹایا جائے گا تو میں کہوں گا یہ تو میرے صحابی ہیں پس جواب ملے گا تمہیں کیا پتہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا گل کھلائے تھے یہ لوگ پچھلے پاؤں گمراہ ہو چکے تھے اور حضورؐ نے عمار کو صاف لفظوں میں فرمایا تھا کہ میرے بعد فتنے ہوں گے۔ پس اگر سب لوگ مل کر ایک وادی میں ہوں اور صرف علیؑ دوسری وادی میں ہوں تو علیؑ کا ساتھ نہ چھوڑنا کیونکہ وہ تمہیں گمراہی میں نہ پڑنے دیں گے تفسیر انوار النجف ج ۵ ص۶۵ پھر علیؓ کو حق کے ساتھ کہنا قرآن کے ساتھ کہنا اپنے علم کا در کہنا اور اپنے جیسا کہنا کیا محض زبانی جمع خرچ اور جذباتی نعرہ ہے؟ صرف اجماع اور دھاندلی نے اچھے خاصے محققین کی آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں وہ صرف یہ فقرہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور عقل کے منہ میں لگام دے دیتے ہیں کہ خبردار صحابہ کے متعلق کچھ نہ کہو۔ ہاں بے شک اچھے کو اچھا کہو اور برے کو برا کہو۔ جو قابلِ اطاعت ہے اس کی اطاعت کرو اور جو قابلِ نفرت ہے اس سے نفرت کرو۔ اگر اور کہیں نہیں تو معاویہ و علیؓ کی لڑائی میں تو اس مفروضہ حدیث کی قلعی کھل گئی تھی جبکہ دونوں طرف سے صحابی کافی تعداد میں قتل ہو رہے تھے۔ البتہ ایک لحاظ سے اس روایت کو درست بھی کہا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ بیشک وہ سب کے سب ستارگان آسمان کی طرح تھے لیکن ستارے کچھ نحس بھی تو ہیں لہٰذا مقصد یہ ہے کہ میرے صحابہ میں سے کچھ نیک اور کچھ بد ہوں گے اور جس کے پیچھے لگو گے وہ ہدایت کرے گا خواہ جہنم کی طرف لیکن اگر علیؑ کے پیچھے رہو گے۔ تو وہ سیدھی جنت کی راہ بتائے گا چنانچہ عمار نے علیؑ کا راستہ لیا اور جنگِ صفین میں علیؑ کی جانب رہا اور آخر کار درجۂ شہادت پر فائز ہوا۔ اویس قرنی علیؑ کے ساتھ رہا اور جنگِ صفین میں شہید ہوا۔ چنانچہ عمار کو حضورؐ نے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ تو گمراہ اور باغی جماعت کے ہاتھوں مارا جائے گا اور مناقب خوارزمی سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا تھا جب فتنہ رونما ہو تو علیؑ کا ساتھ دینا کیونکہ وہی حق و باطل

کے درمیان فرق کرنے والا ہے میرے اس طویل بیان کا مقصد یہ ہے کہ صرف
اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ والی فرضی حدیث نے جس کو عقل سلیم تسلیم کرنے کے لئے
ہرگز تیار نہیں بڑے بڑوں کو عقل و فکر کے راستہ سے ہٹایا ہے کہ وہ اس چکر
میں پڑ کر رسول اکرم کے فرمودہ بارہ خلفائے امت کی تعیین نہ کر سکے۔ ورنہ اگر اقتدار
کی محبت ہاؤ و ہو کی دھاندلی اور کورانہ تقلید کا جوا گردن سے اتار پھینکتے اور عقل و
فراست کو فکر و نظر کی پشت پر سوار کر کے حقیقت کا جائزہ لینے کے لئے معمولی
محنت بھی کرتے تو راستہ بڑا صاف تھا اور ان کو علیؑ سے لے کر مہدیؑ تک بارہ
امام آسانی سے مل جاتے اور یہی جنت جانے کے لئے صراط مستقیم ہے تفسیر
برہان میں کسی مقام پر ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مقام حسرت میں ارشاد
فرمایا کہ تعجب کی بات ہے لوگوں کو صرف دو گواہوں سے حق مل جایا کرتا ہے۔
اور علیؑ کو ایک لاکھ بیس ہزار گواہوں کی موجودگی کے باوجود حق نہ دیا گیا۔ یعنی خم غدیر
میں جبکہ علیؑ کی خلافت و ولایت کا حضورؐ نے اعلان فرمایا تھا وہاں کم از کم اس
وقت ایک لاکھ بیس ہزار کا مجمع تھا۔ بہر کیف ارباب بصیرت اور اصحاب فکر و تدبر
کے لئے انصاف کی راہیں کھلی ہیں اور حق کے دامن میں بہت کچھ گنجائش ہے
اور جب علیؑ کی خلافت حقہ کا دامن ہاتھ میں آجائے تو پھر راہ گم ہونے کا ڈر ہی ختم
ہو جاتا ہے کیونکہ پھر ہر امام نے اپنے بعد والے امام کو اعلانیہ نامزد فرمایا اور اپنا وصی
بنایا اور بعد میں چونکہ اقتدار کا چکر موجود نہ تھا ورنہ ہر امام کے بعد دوسرے امام کی
تعیین میں نصوص و نامزدگیوں کو چیلنج کیا جاتا۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے تمام
اہل بیت کو جمع فرما کر حضرت امام حسنؑ کو اپنا وصی و جانشین مقرر فرمایا اور امام حسینؑ
علیہ السلام نے بوقت آخر اپنے فرزند امام علی زین العابدین علیہ السلام کو اپنا وصی مقرر
فرمایا۔ اس مقام پر روایات میں ہے کہ حضرت محمد بن حنفیہ نے بھی دعویٰ کیا تھا۔
اور حقیقت یہ ہے کہ آپ خود مدعی نہ تھے بلکہ بعض لوگوں کو اشتباہ تھا چنانچہ امام
علی زین العابدین علیہ السلام اور حضرت محمد بن حنفیہ نے مکہ میں حجر اسود کے سامنے
کھڑے ہو کر حجر اسود کو فیصل مقرر کیا اور حجر اسود نے بلسان فصیح حضرت امام علی زین العابدین
علیہ السلام کے حق میں گواہی دی تو حضرت محمد بن حنفیہ نے جھک کر معافی مانگی اور تمام

لوگوں کے دلوں میں جو اشتباہ تھا وہ رفع ہوگیا۔ امام علیؑ زین العابدین علیہ السلام نے اپنے فرزند امام محمد باقر علیہ السلام کو وصی بنایا انہوں نے اپنے بعد کے لئے اپنے فرزند امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو وصی بنایا۔ انہوں نے اپنے فرزند امام علی رضا علیہ السلام کو اپنا وصی قرار دیا انہوں نے اپنے فرزند امام محمد تقی علیہ السلام کو اپنا قائمقام بنایا انہوں نے اپنے فرزند علی نقی علیہ السلام کو اسرار امامت سپرد فرمائے اور اپنا وصی مقرر کیا۔

انہوں نے اپنے فرزند حضرت امام صاحب العصر حجت عج اللہ فرجہٗ علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا جو بامر خدا غائب ہیں اور باذنِ خدا ظہور فرمائیں گے اور زمین خدا کو جور و اعتساف اور ظلم و استبداد سے صاف کر کے دین خدا کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے امن و اطمینان سے اس کو پُر کریں گے خوشا حال وہ لوگ جو اس دور عدل میں امامِ عادل کے زیر سایہ زندگی کے لمحات بسر کریں گے پروردگار عالم سے بفضل محمدؐ و آل محمدؐ شب و روز یہی دعا ہے کہ ہمیں اس حکومتِ عادلہ کا دَور نصیب فرمائے اور اس امام عادل کو جلد بھیج کر بے وارث دین کی سربلندی کا سامان فراہم فرمائے ان کی تشریف آوری سے بہت اجڑے ہوئے گھر آباد ہوں گے دین کا لٹا ہوا کھیت خوب سرسبز و شاداب ہوگا حق والوں پر آئی ہوئی خزاں ختم ہوگی اور موسم بہار ایمان والوں کے قلوب میں مسرتوں و خوشیوں کا سماں پیدا کرے گا

اوصافِ آئمہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ چونکہ امام رسول کا صحیح قائمقام ہے لہٰذا تمام انسانی صفاتِ کمال سے اس کا متصف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ باقی تمام افراد امت سے افضلیت کا حامل ہو۔

صفتِ عصمت

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ سے حضرت مہدی علیہ السلام تک تمام آئمہ چونکہ حضرت رسالتمآبؐ کے صحیح جانشین تھے لہٰذا ابتدائے عمر سے آخر عمر تک ہر صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے پاک و مبرا تھے بلکہ ان سے ترک اولیٰ کا صدور بھی نہیں ہوتا تھا نیز یہ کہ اپنے اختیار سے معصوم تھے فرشتوں کی طرح ترک گناہ پر مجبور نہ تھے کیونکہ فرشتوں کا گناہ نہ کرنا ان کا کمال نہیں اس لئے کہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتے اگر یہ کہا جائے کہ آئمہ بھی فرشتوں کی طرح گناہ کرنے پر طاقت نہیں رکھتے تھے تو پھر یہ کمال نہ ہوگا کمال تب ہوگا کہ انسان ایک

غلطی کر سکتا ہو اور پھر اپنے اختیار سے اس کو نہ کرے۔ جیسے کہ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے تھے کہ میں معاویہ کی طرح چالاکی و فریب کاری اگر چاہوں تو کر سکتا ہوں لیکن مجھے میرا دین ایسی چیزوں سے روکتا ہے اور اس کو روکنے والی کوئی شئے نہیں ہے لہٰذا بعض لوگوں کے ذہن میں جو چیز سمائی ہوئی ہے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام گناہ نہیں کر سکتے تھے یہ امامت کی شان کو نہ پہچاننے کا نتیجہ ہے پس صحیح عقیدہ یہ ہے کہ امامت کی عصمت نبی کی طرح اختیاری ہے نہ کہ اضطراری مثل ملائکہ پس ان کی عصمت کی شان ملائکہ کی عصمت کی شان سے بلند تر ہے نیز ان کی عصمت سابق انبیاء سے بھی بلند تھی کیونکہ گزشتہ انبیاء سے ترکِ اولیٰ ہو سکتا تھا جیسا کہ حضرت آدمؑ نے ترکِ اولیٰ کیا۔ لیکن آئمہ طاہرین علیہم السلام سے ترکِ اولیٰ نہ ہوتا تھا اور عام طور پر ان کا دستور تھا کہ جب ان کے سامنے اطاعتِ پروردگار کے دو پہلو ہوں تو یہ اس پہلو کو اختیار فرمایا کرتے تھے جس میں مشقت زیادہ ہو۔

صفت علم

ہمارا عقیدہ ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ تمام افرادِ امت سے علم میں افضل و اکمل تھے اور تاریخ بتلاتی ہے کہ ہر دَور کے علماء ان کے سامنے طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی شاگردی کو اپنے لئے مایۂ افتخار قرار دیتے تھے چنانچہ اہل خلاف کے بڑے امام نے بھی اپنے آپ کو حضرت صادقؑ کا شاگرد کہلانا اپنا کمال سمجھا اور آج تک اس کے مقتدی اسی بات پر فخر محسوس کرتے ہیں پس ہمیں بجا فخر حاصل ہے کہ ہمارے آئمہ لوگوں کے بڑے بڑے آئمہ کو پڑھاتے ہیں اور پڑھا سکتے ہیں لیکن آئمہ اہل بیتؑ کو پڑھانے کی کسی میں ہمت ہے نہ امکان اور پہلے دَور سے ہی دیکھ لیجئے قرآن مجید کے سمجھنے یا شریعتِ اسلامیہ کے مشکل مسائل کو حل کرنے میں جب صحابہ کو وقت پیش آئی تو انہوں نے بابِ علوم نبوتیہ پر آ کر دستک دی اور حضرت عمر تک علیؑ کی مشکل کشائی کے بعد لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ کا کلمہ پڑھتے ہوئے واپس پلٹے لیکن قطعاً تاریخ یہ نہیں ثابت کر سکتی کہ کسی مسئلہ میں حضرت علیؑ نے کسی بڑے سے بڑے صحابی سے امداد لی ہو۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ پس ہر دَور میں علمائے اسلام مسائل مشکلہ میں آئمہ اہل بیتؑ کی طرف ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ ایک شاعر نے خوب کہا ہے (انوار النجف جلد ۳)

اِذَا شِئْتَ اَنْ تَخْتَارَ لِنَفْسِكَ مَذْهَبًا — جب تو اپنے لئے کوئی مذہب اختیار کرنا

وَتَعْلَمُ اَنَّ النَّاسَ فِیْ نَقْلِ اَخْبَارٍ
فَدَعْ عَنْكَ قَوْلَ الشَّافِعِیِّ وَمَالِكٍ
وَاَحْمَدَ وَالْمَرْوِیَّ عَنْ كَعْبِ اَحْبَارٍ
وَوَالِ اُنَاسًا قَوْلُهُمْ وَحَدِیْثُهُمْ
رَوٰی جَدُّنَا عَنْ جِبْرَئِیْلَ عَنِ الْبَارِیْ

چاہیے اور تجھے پتہ ہو کہ لوگ احادیث نقل کرنے کے درپے ہیں تو شافعی اور مالک کے قول کو چھوڑیئے اور احمد حنبل اور کعب الاحبار کی روایتوں کو ترک کیجئے پس ان لوگوں سے محبت رکھیئے جن کا قول وحدیث اس طرح ہو کہ ہمارے نانا نے جبریل سے اور جبریل نے خدا کی طرف سے یہ حکم پہنچایا۔

اور تاریخ عالم گواہ ہے کہ سوائے علیؑ کے سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ کا دعویٰ کوئی نہ کرسکا اور ہر دور میں آئمہ طاہرینؑ یکے بعد دیگرے تشنگانِ علوم کو اپنے بحور علمیہ سے سیراب کرتے رہے۔ مقدمہ تفسیر مراۃ الانوار سے مروی ہے۔ ایک مرتبہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مکہ میں کسی نے عرض کی کہ آپ قرآن مجید کی تفسیر ایسی بیان کرتے ہیں جو اس سے پہلے ہم نے نہیں سُنی ہوتی تو آپ نے فرمایا عَلَیْنَا نُزِّلَ قَبْلَ النَّاسِ وَلَنَا فُسِّرَ قَبْلَ النَّاسِ فَنَحْنُ نَعْرِفُ حَلَالَهٗ وَحَرَامَهٗ وَنَاسِخَهٗ وَمَنْسُوْخَهٗ وَسَفَرِیَّهٗ وَحَضَرِیَّهٗ وَفِیْ اَیِّ لَیْلَةٍ نَزَلَتْ مِنْ اٰیَةٍ وَفِیْمَنْ نَزَلَتْ وَفِیْ مَا اُنْزِلَتْ الخبر ترجمہ قرآن لوگوں سے پہلے ہم پر اترا اور لوگوں سے پہلے ہم پر اس کی تفسیر کھلی پس ہم ہی اس کے حلال و حرام ناسخ و منسوخ اور سفری و حضری کو جانتے ہیں ہمیں پتہ ہے کہ کس رات میں کونسی آیت اتری اور کس باب میں اتری کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ قَالَ مَا یَسْتَطِیْعُ اَحَدٌ اَنْ یَّدَّعِیَ اَنَّ عِنْدَهٗ عِلْمَ جَمِیْعِ الْقُرْاٰنِ كُلِّهٖ ظَاهِرِهٖ وَبَاطِنِهٖ فرمایا کہ کسی کی مجال نہیں کہ یہ دعویٰ کرے کہ میں تمام قرآن کے ظاہر و باطن کا علم رکھتا ہوں سوائے اوصیاء کے بہرکیف اس قسم کی احادیث آئمہ طاہرین علیہم السلام سے متواتر منقول ہیں اور ایسے واقعات جن میں اہل اسلام عاجز آگئے اور آئمہ اہل بیتؑ نے ہی ان کی علمی مشکلوں کو حل فرمایا ہو تاریخ میں بکثرت موجود ہیں جو معنوی طور پر تواتر کی حد تک ہیں پس ہمارا عقیدہ ہے کہ وارث قرآن یہی تھے اور علوم نبویہ سینہ بسینہ ان کے پاس موجود تھے اور چونکہ قرآن تمام کتب سماویہ کے علوم پر حاوی ہے لہٰذا آئمہ معصومین علیہم السلام علمی مقام میں سابق انبیاء سے افضل و اکمل تھے۔

غلط الزام کا جواب

چونکہ اہل اسلام میں بڑے بڑے علماء آئمہ اہلبیت کے مقابلہ میں طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا آئمہ طاہرینؑ کے بعض فرامین جب ان کے ذہن نارسا سے دور ہوتے ہیں تو ان میں ان کے متعلق ایک بغاوت سی پیدا ہو جاتی ہے پس جب شیعہ ان کے سامنے آئمہ طاہرینؑ کے علمی ذخائر میں سے کوئی نکتہ پیش کریں تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ شیعہ اپنے آئمہ کو عالم الغیب مانتے ہیں۔ یہ ان کی فہم ناقص اور علم قاصر کا ہی دھوکہ ہے کہ بعض ایسی چیزیں جو آئمہ کے نزدیک قرآن مجید کے ظواہر میں سے ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی دقتِ نظر کے باوجود ان کے اذہان میں معمہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور شیعہ جب ایسی چیزوں کو بیان کریں تو انہیں یقیناً یہ باتیں اجنبی معلوم ہوتی ہیں پس وہ بلا دریغ اسے علم غیب سے تعبیر کرتے ہیں مثال کے طور پر خلیفہ ثانی کے سامنے دو ماؤں میں لڑکی اور لڑکے کے متعلق جھگڑے کا مقدمہ پیش ہوا، ان دونوں میں سے ہر ایک لڑکے کی دعویدار تھی خلیفہ سے جب فیصلہ نہ ہو سکا تو سرکار ولایت کے درِ دولت پر جبّہ سائی کی آپ نے ایک حجم کی دو شیشیاں منگوا کر دونوں عورتوں کو ایک ایک شیشی دے دی کہ اس میں وہ اپنا دودھ بھر دیں چنانچہ دونوں کو وزن کیا گیا اور جس کا دودھ زیادہ وزنی نکلا اس کے حق میں لڑکے کا فیصلہ کر دیا اور دوسری کو لڑکی دے دی جب آپ سے وجہ پوچھی گئی تو آیتِ وراثت سے استدلال فرمایا کہ خدا نے مرد کو عورت سے دگنا حصّہ دینے کا حکم دیا ہے لہٰذا مرد کی خوراک عورت سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ بنا بریں سینۂ مادر میں لڑکے کی غذا وزنی اور لڑکی کی غذا ہلکی اس نے مقرر کی ہے کہتے ہیں آپ سے کسی نے سوال کیا کہ جواب دینے کے لئے آپ تامل نہیں فرماتے تو آپ نے فرمایا جس طرح ہاتھ کی انگلیوں کو شمار کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں اس لئے کہ وہ ہر وقت تمہارے پاس اور سامنے ہیں اسی طرح مسائل قرآنیہ ہمارے سامنے ہیں ہمیں تامل و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح آپ سے ایک شخص نے دردِ شکم کی شکایت کی کہ کافی علاج کرا چکا ہوں لیکن آرام نہیں ملتا آپ نے فرمایا اس کا نسخہ قرآن مجید میں موجود ہے وہ حیران ہوا تو آپ نے فرمایا شہد لے لو اور بارش کا پانی لے لو پھر عورت کے حق مہر میں سے کوئی شیئ لے کر ان میں ملا لو اور اس کو پی لو چنانچہ اس نے عمل کیا تو تندرست ہو گیا آپ

نے اس نسخہ کی ترتیب اس طرح بیان فرمائی کہ قرآن میں شہد کی تعریف میں ہے کہ یہ شفا ہے بارش، کا پانی مبارک ہے اور عورت اپنے مہر سے کوئی چیز ہبہ کرے تو وہ ھنیئا مریئا ہے پس تینوں مل جائیں تو کیوں نہ شفا ہو۔

اسی طرح امام محمد تقی علیہ السلام سے چور کی سزا کی حد پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا صرف ہاتھ کی انگلیاں کاٹی جائیں۔ وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا مساجد اللہ کی نشانیاں ہیں اور ہتھیلیاں چونکہ جائے سجدہ ہیں لہٰذا ان کو سزا سے مستثنیٰ قرار دے کر باقی حصہ پر حد جاری کی جائے۔

بہرکیف چونکہ آل محمدؐ کے حادی علوم کے مقابلہ میں دنیا کے علماء عام مبتدی کی حیثیت رکھتے تھے لہٰذا وہ ایسی باتوں کو علم الغیب سمجھنے لگ جاتے تھے جس طرح آج کل کی نئی تحقیقات علم غیب کے ظرف سے ہی تو برآمد ہو رہی ہیں جو مسائل کل تک عقدۂ لاینحل تھے آج معرض التفات سے بھی گر گئے ہیں مادہ و طبیعت کے بہت سے سربستہ راز آج عیاں ہو چکے ہیں گویا معلومات کے غیبی خزانے روز بروز کھلتے جا رہے ہیں اور ترقی کرنے والے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی ترقیاں جہاں ختم ہوں گی حجتِ زمانہ کا قدم آگے ہو گا اور جو معلومات کے خزانے ان کی آخری اور انتہائی کوشش کے بعد بھی سربستہ راز کی طرح مخفی رہیں گے وہ بحیثیتِ پروردگار حجتِ خدا کے سامنے آشکار ہوں گے پس جو علوم ان کے سامنے ایک واضح حقیقت کی طرح ہوں گے اس دنیا کی ترقی کی آخری منازل پر پہنچنے والے بھی ایسے غیبی معلومات سے تعبیر کریں گے

شیعہ کا عقیدہ ہے کہ علم غیب صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو جس قدر عطا فرمائے وہ اس قدر غیب کا عالم ہوتا ہے اور محمدؐ و آل محمدؐ کو تمام کائنات میں سے زیادہ علم عطا فرمایا اور بہت سے غیبی علوم ہیں جو باقی انبیاء کی بہ نسبت بھی محمدؐ و آل محمدؐ زیادہ جانتے ہیں اب ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کے پاس غیب کا کتنا علم تھا یہ خود اللہ ہی جانتا ہے اور آنے والا وقت بتائے گا کہ علم غیب میں سے امام کو کس قدر عطا ہوتا ہے ہاں اس قدر ضرور ہم کہتے ہیں کہ ان کے پاس اتنا ہے کہ اور کسی کے پاس نہیں اور خدا نے ان کو اپنے سب

بندوں سے زیادہ عطا فرمایا ہے
ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ اگر کوئی شخص شیعوں کی طرف اس سے زیادہ کوئی بات منسوب کرے تو وہ جھوٹا ہے علوم شرعیہ میں ان کا علم کلی ہے کیونکہ یہ ہادی ہیں۔ لہٰذا کسی مسئلہ میں عاجز آ جانا ان کے شایان شان نہیں ہے لیکن علوم تکوینیہ میں جس قدر ضرورت ہو اور مصلحتِ خداوندی ہو ان کو علم ہوتا ہے اور جتنا خدا چاہے جب چاہے دے سکتا ہے ہر وقت ہر شئے کا علم اور ہر جزوی کا علم صرف خدا کی ہی صفت ہے وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ پس شیعہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کو جس طرح کسی دوسری صفت میں خدا کا شریک نہیں مانتے اسی طرح صفتِ علم میں بھی وہ ان کو خدا کا شریک نہیں جانتے بلکہ ان کے علم کو عطیۂ پروردگار سمجھتے ہیں اور شیعوں کے نزدیک وہ شخص مشرک ہے جو اپنے کسی پیر و مرشد کو یا کسی بڑے سے بڑے ہادی کو خدائی صفات میں شریک جانتا ہو

فرقہ وہابی کی تردید

لیکن یہ یاد رہے کہ شیعوں کے نزدیک ایسا شخص بھی بے ایمان اور گمراہ ہے جو محمدؐ و آلِ محمدؐ کو اپنی طرح کسی علوم کا مالک سمجھے آئمہ پڑھ کر عالم نہیں بنتے بلکہ ان کا علم محض عطیہ پروردگار ہے۔ چنانچہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا کہ آئمہ نے کسی سے درس لیا بلکہ خود انہوں نے اپنے امام باپ یا دادا سے بھی اس طرح نہیں پڑھا جیسے پڑھنے کا عام دستور ہے جس طرح حضرت رسالتمآبؐ نے کسی سے نہیں پڑھا اسی طرح حضرت علیؑ نے بھی حضرت رسالتمآبؐ سے نہیں پڑھا اور امام حسنؑ و حسینؑ نے بھی نہ باپ سے پڑھا ہے نہ ماں سے اور نہ نانا سے روایات میں حسنینؑ کا تختیاں لکھنا ملتا ہے لیکن یہ نہیں ملتا کہ ان کو خوشخطی کون پڑھاتا یا سکھاتا تھا وعلیٰ ہذا القیاس اس قدر ملتا ہے کہ ایک امام نے بوقتِ اخیر دوسرے امام کو وصیت فرمائی اور اسرار امامت تفویض کئے۔ پڑھانا کہیں نہیں ملتا بلکہ بعض آئمہ پڑھنے کی حدود سے بھی چھوٹے تھے۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا۔ اور بعض آئمہ کو اپنی زندگیاں نظر بندیوں اور قید خانوں میں گزارنی پڑیں۔ لہٰذا پڑھنا اور پڑھانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اگر اب بھی باور نہ ہو تو تجزیہ کر کے دیکھئے امام حسن عسکری علیہ السلام کی وفات کے وقت حضرت قائم آلِ محمد چار برس کے تھے۔ امام محمد تقی علیہ السلام امام رضا علیہ السلام سے دور تھے اور بوقتِ شہادت آپ کی عمر بھی کم تھی۔ لیکن علوم و فنون میں بڑے سے بڑے اسلامی علماء ان کے سامنے منقار زیر پر تھے یعنی ابن اکثم سے سوال و جواب تمام کتب

تاریخ و حدیث میں ملتے ہیں۔ حالانکہ باپ سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اور کسی دوسرے سے پڑھنا تاریخ نہیں بتلاتی۔ اسی طرح امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی عمر کا اکثر و بیشتر حصہ زندان میں گذرا ہے تو امام علی رضا علیہ السلام کی تربیت کس نے کی اور تعلیم کس نے دی؟ وعلیٰ ہذا القیاس۔

آپ تاریخ کو بڑی غور سے دیکھیں آئمہ معصومین کے قلزم علم سے فیض یاب ہونے والوں کا جائزہ بھی لیں اور پھر یہ بھی دیکھیں کہ انہوں نے کسی سے کچھ پڑھا بھی نہیں نہ اپنے سے پہلے امام نے ان کو درسی سبق دیئے اور نہ کسی دوسرے نے ان کے استاد ہونے کا دعویٰ کیا۔ آئمہ تو بجائے خود اس خاندان کی شہزادیاں بھی عالمہ غیر معلمہ کے لقب سے ملقب ہیں۔ جناب خاتون جنت عالمہ غیر معلمہ ہے اور جناب زینب خاتون سلام اللہ علیہا بھی عالمہ غیر معلمہ ہے بہرکیف جو لوگ محمدؐ و آل محمدؐ کو اس طرح کسی علم سے عالم سمجھیں انہوں نے ان کی شان کو نہیں سمجھا ہم ایسے لوگوں کو ایمان سے کافی دور سمجھتے ہیں بس آخری بات یہی ہے اور اسی پر ایمان و عقیدہ ہے کہ ان کا علم اللہ کا عطیہ ہے اس نے ان کو سب سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے اور جہاں روایات میں یہ ملتا ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اَلْفَ بَابٍ مِنَ الْعِلْمِ یعنی حضورؐ نے مجھے ایک ہزار علم کے دروازے تعلیم فرمائے اس کا مقصد بھی وہ پڑھنا پڑھانا نہیں جو درس و تدریس کے ذریعے ہوا کرتا ہے بلکہ ایک رمز ہے جس طرح تمام مخلوق محمدؐ و آل محمدؐ کے وسیلہ سے پیدا ہوئی حالانکہ پیدا کرنے والا سب کو اللہ ہے یا جس طرح محمدؐ مصطفیٰ کو قرآن ظاہری طور پہ عطا ہوا اور درمیان میں واسطہ جبریل ہے حالانکہ دینے والا خود اللہ ہی تھا اسی طرح علوم علیؑ کے لئے درمیان میں واسطہ حضرت رسالتمآبؐ تھے اور دینے والا خود اللہ تھا اسی طرح حسنینؑ شریفین و باقی آئمہ۔ اسی بناء پر آپ کا یہ ارشاد کہ زَقَّنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ زَقًّا مجھے حضورؐ نے علم اس طرح دیا جس طرح پرندہ بچے کو دانا بھراتا ہے حالانکہ علم کھانے کی چیز نہیں مقصد صرف یہی ہے کہ علوم علویہ خدا کی جانب سے ہیں اور حضرت رسالتمآب درمیان میں وسیلہ ہیں۔ آپ نے اپنے علم کے متعلق فرمایا ھٰذَا لُعَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ میرا یہ علم رسول کا لعاب ہے یعنی رسول کی زبان چوسنے کا نتیجہ ہے بس مقصد یہ ہے کہ ان کا علم وہبی ہے۔ کسبی نہیں اور

یہی ہمارا عقیدہ ہے۔

صفتِ عبادت

جنابِ رسالتمآب کے بعد مرتبہ عبادت میں آئمہ اہلبیت سے کوئی نہیں بڑھ سکتا۔ اصل عبادت تو یہ ہے کہ انسان میں عبدیت پوری طرح نافذ ہو جس طرح غلام کے تمام اعضاء اپنے آقا کے کنٹرول میں ہوتے ہیں پس خدا کا صحیح معنی میں عبد وہ ہوگا۔ جس کے تمام اعضاء پروردگار کی مرضی کے مطابق متحرک ہوں اور عبدیت کا یہ معنی آلِ محمدؐ میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے مقامِ مناجات میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ کلمہ بڑا وزنی ہے۔ وَجَدْتُكَ رَبًّا كَمَا اَرَدْتُ فَاجْعَلْنِيْ عَبْدًا كَمَا تُحِبُّ۔ اے اللہ میں نے تجھے اے یارب پایا جیسے میں چاہتا تھا۔ اب تو مجھے اپنا ایسا عبد بنا جیسے تو چاہتا ہے ایک مقام پر ارشاد ہے كَفٰى بِيْ فَخْرًا اَنْ تَكُوْنَ لِيْ رَبًّا وَكَفَانِيْ عِزًّا اَنْ اَكُوْنَ لَكَ عَبْدًا یعنی میرے فخر کے لئے اتنا کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے اور میری عزت کے لئے اس قدر کافی ہے۔ کہ میں تیرا عبد ہوں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے عبدیت و عبادت کا وہ منظر پیش کیا جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے مشعلِ راہ رہے گا حضرت علیؑ بن الحسین علیہ السلام نے اس عبدہ کو اس طرح نبھایا کہ دوست و دشمن سب زین العابدین کہنے لگے اور سید الساجدین لقب بن گیا۔ اسی طرح حضرت علیؑ سے لے کر حضرت مہدیؑ تک تمام آئمہ اہلبیت کی عبادت کا یہی عالم رہا ہے حضرت سجاد علیہ السلام کے باغ میں پانچ سو درخت کھجور کے تھے اور ہر رات ہر درخت کے پاس دو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ گویا ہر رات ایک ہزار رکعت نماز ادا فرماتے تھے اور حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا بھی یہی دستور تھا ایک دفعہ جنابِ زینب عالیہ نے خواہش کی اور کہلا بھیجا کہ بیٹا عبادت کو کچھ کم کر دو تو آپ نے رو کر جواب دیا کہ میری عبادت میرے جدنامدار حضرت علیؑ کی عبادت کے مقابلہ میں اس طرح ہے جس طرح ایک قطرہ سمندر کے مقابلہ میں اور جس طرح جنابِ رسالتمآب سے ایک حدیث منقول ہے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے اسی طرح آئمہ طاہرینؑ نماز میں مناجات پروردگار کی لذت محسوس فرماتے تھے۔

دشمنانِ خاندانِ رسولؐ ہمیشہ چونکہ تعصب و عناد کی بدولت خانوادۂ عصمت کی ہر فضیلت پر پردہ ڈالنے یا اس کی اہمیت کو کم کرنے میں۔ لگے رہتے تھے اور جن جن

لوگوں میں بالخصوص اموی خون کا اثر موجود تھا انہوں نے تو فضائل آلِ محمدؐ کو مٹانے یا گھٹانے کی شاید قسم اٹھالی تھی۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ابنِ تیمیہ نے اپنی ناپاک کوششوں کو بروئے کار لانے کا کھیل کھیلا اور توہینِ اہلِ بیتؑ کو اپنی زندگی کا محبوب مشغلہ قرار دیا۔ اس کی تمام تر تصانیف میں آئمہ اہلِ بیتؑ کے خلاف اچھا خاصا محاذ قائم ہے اس نے اموی عصبیت کی بناء پر تحقیر و تذلیل اہلِ بیتؑ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حتاکہ دامنِ اسلام پر اپنی جہالت و ضلالت کے ناپاک چھینٹے ڈالنے والا یزید بھی اس کے نزدیک ایک اچھا مسلمان ہے جس کی ناپاک سیرت کے سیاہ اوراق تاریخ اسلام میں رہتی دنیا تک اہلِ اسلام کی گردنیں جھکاتے رہیں گے۔ چنانچہ دورِ حاضر کے عباسی اور بٹ اسی کے مسموم پروپیگنڈے سے متاثر ہیں اور یزید لعین کی مداحی میں اسی کے بجوزہ نظریات سے اعتراف کرنے والے اور تنقیص شانِ اہلِ بیتؑ میں اسی کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ اس دشمنِ اہلِ بیتؑ نے اموی عصبیت کے جوش میں اگر حضرت علیؑ اور دیگر آئمہ اطہارؑ کی ایک ہزار شبانہ روز نماز کی عظمت کے خلاف آواز اٹھائی اور اسے ایک عبث فعل قرار دے کر عوام الناس کے دلوں کو خاندانِ رسولؐ کی محبت سے منحرف کرنے کی ناپاک کوشش کی علامہ امینی نے الغدیر ج ۵ میں اس کا اعتراض نقل کیا ہے۔ ابنِ تیمیہ کے اعتراض کے تین پہلو ہیں۔

① جناب رسالتمآبؐ چونکہ ایک ہزار رکعت نہیں پڑھا کرتے تھے۔ لہٰذا علیؑ و اولادِ علیؑ یہ فعل قابلِ تعریف نہیں بلکہ خلافِ سنتِ رسولؐ ہے۔

② دن رات میں دیگر امورِ ضروریہ کی انجام دہی کے بعد ایک ہزار رکعت کا وقت نکالنا ناممکن ہے۔

③ اگر بالفرض وقت نکل بھی آئے تو جلد بازی ہوگی اور خشوع و خضوع نہ ہوگا۔ پس ایسی عبادت کی کوئی قیمت نہیں۔

اختتامِ کلام پر کہتا ہے البتہ نمازِ تہجد کے ساتھ شب بیداری اور ایک رکعت میں ختم قرآن حضرت عثمان کے متعلق ثابت ہے لہٰذا ان کا تہجد اور تلاوتِ قرآن غیروں سے زیادہ وزنی ہے (منہاج السنۃ لابن تیمیہ ج ۲ ص ۱۱۹)

علامہ امینی نے پہلے اعتراض کا جواب چار طریقوں سے دیا۔

① قولِ رسولؐ

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرُ مَوْضُوْعٍ فَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَّسْتَکْثِرَ فَلْیَسْتَکْثِرْ
نماز اچھا موضوع ہے جو جس قدر زیادہ پڑھ سکے بے شک پڑھے (مستدرک حاکم ج ۱)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں۔ لہٰذا زیادتیٔ نماز کو خلافِ سنتِ رسول کہنا دیدہ دانستہ آلِ محمدؐ پر کیچڑ اچھالنے کے مترادف ہے۔

② فعلِ رسولؐ

صَحَّ عَنِ الْمُسْلِمِ وَالْبُخَارِیْ اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ حَتّٰی تَنْفَطِرَ قَدَمَاہُ بخاری و مسلم سے صحیح منقول ہے کہ حضورؐ رات کو نماز میں اس قدر قیام فرماتے تھے کہ قدم مبارک پھول جاتے تھے۔
پس فعلِ رسول سے ثابت ہوا کہ رات کو زیادہ نماز پڑھنا قبیح نہیں بلکہ سنتِ رسولؐ ہے۔

③ فعلِ اکابر

اہلِ سنت کے امامِ اعظم کے متعلق شیخ محمد عبدالحیٔ حنفی نے کتاب اقامۃ الحجہ صہ۹ پر لکھا ہے کہ وہ ہر رات تین سو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے ایک دفعہ راستہ میں سنا ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی کہ یہ شخص ہر شب پانچ سو رکعت پڑھتا ہے پس انہوں نے پانچ سو پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر لڑکوں کو کہتے ہوئے سنا کہ یہ ایک ہزار پڑھتا ہے تو ایک ہزار رکعت پڑھنا شروع کر دیا اور سونا چھوڑ دیا۔ مناقب خوارزمی جلد ۱ صہ ۲۲۲ میں ابو حنیفہ کا چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھنا مذکور ہے۔ نیز اس قسم کی اور ہزاروں حکایات موجود ہیں۔ لہٰذا ابن تیمیہ کو اپنا گھر پہلے سنبھال لینا چاہیئے۔

④ معنیٔ سنت

مستدرک حاکم سے جناب رسالتمآبؐ کا فرمان منقول ہے عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ تمہارے اوپر میری اور میرے خلفاء کی سنت پر چلنا ضروری ہے نیز رسالتمآبؐ اور حضرت ابوبکر کے زمانہ میں نماز تراویح نہیں تھی اس کو حضرت عمر نے سنہ ۱۴ھ میں جاری کیا۔ پس جب اہلِ سنت کے نزدیک سنت کا مفہوم صرف فعلِ رسول تک محدود نہیں بلکہ خلفائے راشدین کا فعل بھی سنت ہے جس کی بناء پر حضرت عمر کی ایجاد کو سنت سمجھا جاتا ہے اور علیؑ بھی جب خلیفۂ راشد تھے تو ان کے فعل کو بدعت اور خلافِ سنت کہنے کا کیا معنی؟ صرف دشمنیٔ علیؑ کا بھوت سر پر سوار ہے جو اپنے مسلّم اصولوں کو بھی نظرانداز کر رہا ہے ورنہ جس لحاظ سے حضرت علیؑ کی ایک ہزار رکعت خلافِ سنت قرار دی

جاری ہے اسی حیثیت سے تراویح کو بھی بدعت کہنا چاہیئے اور ابوحنیفہ کی شب بیداری اور ایک ہزار رکعت کو بھی بدعت شمار کرنا چاہیئے اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ بدعتیں ہیں جن کی فہرست گنوانے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے سوال کے جواب کے متعلق علامہ فرماتے ہیں اس کو ناممکن کہنا صرف اپنی طبیعت پر قیاس ہے کیونکہ عبادت نہ کرنے والے کو دوسرے کی عبادت ناممکن معلوم ہوتی ہے اگر خواہ مخواہ ناممکن ہی کہنا ہے تو ذرا اپنے گھر کا جائزہ بھی لے لیجئے مناقب خوارزمی میں ابوحنیفہ کا نماز جمعہ سے قبل بیس رکعت نماز پڑھنا جن میں قرآن ختم ہوتا تھا مذکور ہے حلیۃ الاولیاء میں حضرت عثمان کا نماز شب کی ایک رکعت میں ختم قرآن مذکور ہے تو ابن تیمیہ کے پاس ان بزرگوں کے متعلق امکان کا دروازہ کیسے کھلے گا اور تیسرے سوال کا جواب بھی اسی میں موجود ہے کہ ان کی جلد بازی میں خضوع و خشوع کہاں سے آتا ہوگا؟ بلکہ اگر موازنہ کیا جائے تو مذہب شیعہ کے طریقہ سے نماز کی ایک رکعت کے الفاظ تراسی (۸۳) بنتے ہیں تو ایک ہزار رکعت کے الفاظ تراسی ہزار ہوئے اور قرآن کے کل الفاظ کی تعداد ستتر ہزار نو سو تینتالیس (۷۷۹۴۳) ہے۔ گویا ایک ہزار رکعت نماز اور پورے ختم قرآن میں پانچ ہزار ستاون (۵۰۵۷) الفاظ کا فرق ہے خود اندازہ کیجئے کہ علی کے لئے پورے شب و روز کے ۲۴ گھنٹوں میں ایک ہزار رکعت ناممکن ہے اور بصورت امکان منافی خضوع ہے جس کے کل الفاظ تراسی ہزار بنتے ہیں اور حضرت عثمان اور ابوحنیفہ کی ایک رکعت میں پورے قرآن کی گنجائش بھی ہے اور منافی خضوع بھی نہیں جس کے الفاظ کی تعداد (۷۷۹۴۳) ہے۔ یہ جواب اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ حضرت عثمان حافظ قرآن بھی تھے یا نہیں کیونکہ جامع ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ حافظ بھی ہو اور تاریخ بتلاتی ہے کہ جمع قرآن میں دیگر صحابہ کو مامور کیا گیا تھا جن کو قرآن کچھ نہ کچھ یاد تھا اور متفرق صحف کی امداد سے انہوں نے جمع کیا ہم نے مقدمہ تفسیر انوار النجف میں اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے مقصد یہ ہے کہ جامع قرآن خود قطعاً حافظ قرآن نہیں تھے پس ایک رکعت میں ختم قرآن صرف افسانوی حیثیت رکھتا ہے۔ لطف یہ کہ ابن تیمیہ نے خود حضرت علی کی عبادت پر اعتراض کر کے حضرت عثمان کے لئے ایک رکعت میں قرآن ختم کرنا اس کے لئے باعث شرف لکھ دیا اور عقل کے اندھے کو

یہ یاد نہ رہا کہ وُہ تینوں اعتراض تو اس پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ کیونکہ رسولؐ اللہ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لہٰذا خلافِ سنّت رسولؐ ہوا۔ علاوہ ازیں وقت میں اس قدر گنجائش نہ تھی لہٰذا ناممکن ہے اور نیز اگر تیزی سے پڑھتے ہوں تو منافی خشوع ہے۔ لہٰذا فائدہ کچھ نہیں۔ ہاں سچی بات ہے کہ جس سے لگاؤ ہے اس کا ہر فعل برداشت کیا سکتا ہے اور جس سے دشمنی ہے اس کے ہر فعل کو اعتراض کی نذر کر دیا جاتا ہے۔

بہر کیف یہ جملہ معترضہ تھا۔ اس جیسے ہزاروں لوگ آلِ محمدؐ کے فضائل و کمالات سے جل جل کر جل بسے اور آخرکار جہنم کا ایندھن جا بنے۔ سُورج پر گرد اڑانے والے کے اپنے منہ پر گرد پڑا کرتی ہے اس سے سورج کا کچھ نہیں بگڑتا۔ منصف مزاج مؤرخین نے آلِ محمدؐ کی عبادت کو سراہا ہے۔

اور میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ عبادت صرف نماز و روزہ کا نام نہیں۔ بلکہ انسان کے تمام اعضاء و جوارح کا مشغولِ کارِ خدا ہونا عبادت ہے اور حضرت علیؑ کی عبادت کا نام سُن کر اگر کوئی ناصبی غصّہ و تعصب سے بڑبڑانے لگ جائے تو بے شک ہوا کرے اگر خود بانیٔ شریعت غرّا حضرت محمدؐ مصطفےٰ سے علیؑ کی عبادت کا وزن دریافت کیا جائے تو وہ علیؑ کی صرف ایک ضربت جو بروز خندق عمرو بن عبدود کے سر پہ پڑی تھی اس کو میزانِ عدل کے ایک پلڑے میں اور تمام امت کے اعمال نماز و روزہ وغیرہ بلا باختلاف روایات ثقلین کی سب عبادتیں دوسرے پلڑے میں ڈال کر فرماتے ہیں علیؑ کی ضربت مجھے جھکتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہ ہے علیؑ کی ایک عبادت اور وہ بھی چھٹے نمبر کی کیونکہ جہاد فروعات میں سے چھٹے نمبر پر ہے اور یہ سارے جہادوں کا موازنہ نہیں بلکہ پوری زندگی کے جہادوں میں سے ایک جہاد اور اس میں سے بھی صرف ایک ضربت کی قیمت ثقلین کی عبادتوں سے یا امت کے جملہ اعمال سے زیادہ وزنی اور قیمتی ہے تو علیؑ کے باقی جہاد اور باقی عبادتیں نہ معلوم ان کا کیا وزن ہوگا؟

اسی طرح حضرت علیؑ شبِ ہجرت بسترِ رسولؐ پر سوئے اور اس کا سونا بھی چونکہ اطاعت و عبادتِ خداوندی تھا تو اس عبادت کی قیمت قرآن سے پوچھئے بعج سویرے اُٹھتے ہی جبریلؑ سے اپنے حق میں قصیدہ سُنا۔ اللہ نے قرآن میں آیت بھیج دی۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ

یہ یاد نہ رہا کہ وہ تینوں اعتراض تو اس پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ کیونکہ رسولؐ اللہ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لہٰذا خلافِ سنّت رسولؐ ہوا۔ علاوہ ازیں وقت میں اس قدر گنجائش نہیں لہٰذا ناممکن ہے اور نیز اگر تیزی سے پڑھتے ہوں تو منافی خشوع ہے۔ لہٰذا فائدہ کچھ نہیں۔ ہاں سچی بات ہے کہ جس سے لگاؤ ہے اس کا ہر فعل برداشت کیا سکتا ہے اور جس سے دشمنی ہے اس کے ہر فعل کو اعتراض کی نذر کر دیا جاتا ہے۔

بہرکیف یہ جملہ معترضہ تھا۔ اس جیسے ہزاروں لوگ، آلِ محمدؐ کے فضائل و کمالات سے جل جل کر چل بسے اور آخرکار جہنم کا ایندھن جا بنے۔ سورج پر گرد اڑانے والے کے اپنے منہ پر گرد پڑا کرتی ہے اس سے سورج کا کچھ نہیں بگڑتا۔ منصف مزاج مؤرخین نے آلِ محمدؐ کی عبادت کو سراہا ہے۔

اور میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ عبادت صرف نماز و روزہ کا نام نہیں۔ بلکہ انسان کے تمام اعضاء و جوارح کا مشغولِ کارِ خدا ہونا عبادت ہے اور حضرت علیؑ کی عبادت کا نام سن کر اگر کوئی ناصبی غصہ و تعصب سے بڑبڑانے لگ جائے تو بے شک ہوا کرے اگر خود بانیٔ شریعت غرّا حضرت محمد مصطفےٰؐ سے علیؑ کی عبادت کا وزن دریافت کیا جائے تو وہ علیؑ کی صرف ایک ضربت جو بروزِ خندق عمرو بن عبدود کے سر پر پڑی اس کو میزانِ عدل کے ایک پلڑے میں اور تمام امت کے اعمال نماز و روزہ وغیرہ یا باختلافِ روایات ثقلین کی سب عبادتیں دوسرے پلڑے میں ڈال کر فرماتے ہیں علیؑ کی ضربت مجھے جھکتی ہوئی منظر آتی ہے اور یہ ہے علیؑ کی ایک عبادت اور وہ بھی چھٹے نمبر کی کیونکہ جہاد فروعات میں سے چھٹے نمبر پر ہے اور یہ سارے جہادوں کا مواز نہ نہیں بلکہ پوری زندگی کے جہادوں میں سے ایک جہاد اور اس میں سے بھی صرف ایک ضربت کی قیمت، ثقلین کی عبادتوں سے یا امت کے جملہ اعمال سے زیادہ وزنی اور قیمتی ہے تو علیؑ کے باقی جہاد اور باقی عبادتیں نہ معلوم ان کا کیا وزن ہوگا؟

اسی طرح حضرت علیؑ شبِ ہجرت بسترِ رسولؐ پر سوئے اور اس کا سونا بھی چونکہ اطاعت و عبادتِ خداوندی تھا تو اس عبادت کی قیمت قرآن سے پوچھئے صبح سویرے اٹھتے ہی جبرائیلؑ سے اپنے حق میں قصیدہ سنا۔ اللہ نے قرآن میں آیت بھیج دی۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ

لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا لینے کی خاطر اپنا نفس قربان کر دیتے ہیں۔ اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے سبحان اللہ بعض لوگوں کو رو رو کر وہ مرتبہ نہیں ملا جو علیؑ نے سو سو کر لے لیا۔ بہرکیف خطابیات میں جانے کی ضرورت نہیں

اس مقام پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ امتِ محمدیہ میں سے آئمہ اہلِ بیت کے ہم پلّہ عبادت میں کوئی نہیں اور حسبِ ضرورت میں اس مقصد کو بیان کر چکا ہوں اور میں ہر ہر صفتِ کمال کو بیان کرنا توضیحِ واضحات سمجھتا ہوں خلاصہ یہ کہ آئمہ اہلِ بیتؑ تمام صفاتِ حمیدہ میں پوری امت سے اتم و اکمل تھے اور کوئی بھی ان کے گرد راہ تک نہیں پہنچ سکتا چہ جائیکہ ان کے ہم پلّہ یا ان سے افضل ہو۔

حلم و حوصلہ ہادیانِ دین اور رہنمایانِ شرعِ متین کے لئے یہ صفت انتہائی ضروری ہے کیونکہ ہر قسم کے لوگ جب ان سے بات کریں گے تو بعض ضدی اور اکھڑ مزاج ایسے بھی ہوا کرتے ہیں جن کو ادب و متانت سے بات کرنا آتا ہی نہیں وہ شرافت و تہذیب کے ماحول سے کوسوں دور ہوا کرتے ہیں اگر حلم و حوصلہ نہ ہو اور جذبات و خواہشات کارفرما ہوں تو یقیناً مقصد میں کامیابی ناممکن ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ کو فرعون کی طرف مبلغ بنا کر بھیجنے سے قبل ہی پروردگار نے انہیں حوصلہ اور نرمی کی تلقین فرما دی تھی کہ قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا یعنی فرعون کے شاہانہ مزاج کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے حق کی دعوت دینا اور اس کی ہر قسم کی تلخ کلامی کو صبر و ضبط کے دامن میں جگہ دے کر ان سے بات کرنا۔ اسی بناء پر اپنے حبیب کی تعریف میں فرمایا۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا اَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ اگر آپ سخت مزاج اور تند خو ہوتے تو یہ لوگ آپ سے دور ہو جاتے اور اس صفت میں اگر آئمہ اہلِ بیتؑ کی سیرت کا جائزہ لیا جائے تو انبیاء سابقین سے ان کا قدم بہت آگے نظر آتا ہے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے انتہائی حوصلہ شکن حالات کے باوجود جس کردار کا مظاہرہ فرمایا وہ صرف آپ کا ہی حصہ ہے آپ کی طرف ایک شعر بھی منسوب ہے۔

وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ　　فَمَضَيْتُ ثُمَّ قُلْتُ لَا يَعْنِيْنِيْ

یعنی جب میں کسی پست فطرت انسان کے پاس سے گزرتا ہوں جو مجھے سب

کر رہا ہوتا ہے تو یہ خیال کر کے چپکے سے گزر جاتا ہوں کہ کسی اور کو ہوگا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی شامی کے پاس سے گذرے تو اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں آپ اس کے پاس چلے گئے اور فرمایا اگر بھوکا ہے تو میں کھانا کھلاؤں۔ اگر پیدل ہے تو سواری دوں اگر مقروض ہے تو قرضہ اتاروں اگر گھر نہیں تو حسبِ منشاء مکان خرید کر دوں غرضیکہ کوئی حاجت پیش کرو جس کو میں پورا کروں بلا وجہ حسنؑ کو گالیاں کیوں دیتا ہے ان اخلاق کریمانہ کا یہ اثر ہوا کہ وہ شخص تائب ہو کر قدموں میں گر گیا۔ بے شک تلوار کی نوک یا تازیانہ کے رُعب سے کسی کو چپ کرانا اور ہے اور علم و حوصلہ سے کسی کی مشکل کشائی کر کے اس کے دل پر قبضہ کر لینا اور ہے اسی بناء پر حضرت رسالتمآبؐ نے بھی ارشاد فرمایا تھا کہ حسنؑ میرے اخلاق کا آئینہ دار ہے۔ صرف یہی نہیں حضرت سیّد الشہداء امام حسینؑ نے جو علم و حوصلہ اور صبر و ضبط کا منظر پیش کیا ہے۔ تاریخ عالم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی باوجود ضرورت کے دشمن کے لشکر کو سیراب کرنا حسینؑ ہی کا کام تھا اور باوجود انتہائی دشمنی کے حضرت سجادؑ کی حاکم مدینہ کے لئے امداد کی پیشکش علم و حوصلہ کی ایسی مثال ہے جس کی مثال نہیں۔ جب کہ ظلم و تشدد کا اس سے قصاص لیا جانے لگا تو جب اس کی نظر حضرت سجادؑ پر پڑی بدن کانپ گیا دریافت پر اُس نے بتایا کہ جو مظالم میں نے اس پر کئے ہیں ان کا بدلہ مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ لیکن امامؑ نے قریب اگر اس کے کان میں آہستہ سے فرمایا۔ بتاؤ اس عالم مصیبت میں میں تیری کیا امداد کروں؟ بہرکیف جزوی واقعات اگر بیان کئے جائیں تو کافی طول ہوگا۔ آئمہ اہلبیتؑ کا حسنِ کردار علم و حوصلہ اور صبر و ضبط پوری انسانیت کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

تسلیم و رضا

یہ وہ صفت ہے کہ بہت کم لوگ ہی اس کی توفیق پاتے ہیں اور آلِ محمدؐ کا یہ طرۂ امتیاز ہے اور یہی جہادِ اکبر ہے کیونکہ دشمن پر فتح پالینا آسان ہے لیکن اپنے نفس کو جیت لینا انتہائی کٹھن مرحلہ ہے جذبات پر عمل کر سکنے کے باوجود رضامندیٔ خالق و خوشنودیٔ پروردگار کی خاطر ان کو کچل کر رکھ دینا بہت بڑی فتح ہے اور بابِ عقل میں جہاں یہ حدیث ملتی ہے قَالَ لَهُ أَقْبِلْ فَأَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَهُ أَدْبِرْ فَأَدْبَرَ کہ پیدا کرنے کے بعد خدا نے عقل کو حکم دیا کہ آ تو وہ آیا پھر حکم دیا جا تو وہ گیا حالانکہ ظاہری معنی کے لحاظ سے خدا کی طرف آنا اور اس

سے جانا ناقابلِ فہم بات ہے کیونکہ وہ کسی مکان میں محصور نہیں تاکہ اس سے جانا یا اس کی طرف آنا صادق آئے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ اسے خواہشات کی طرف دعوت دی گئی تو اس نے قبول کی پھر خواہشات وجذبات سے منہ پھیرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے قبول کیا اور عقلِ کامل وہی ہے جو اپنے مولا کے حکم کے ماتحت ہر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو اور جذبات وخواہشات سے مرعوب ومغلوب نہ ہو سکے پس اقبال کا معنی ہے۔ ایسے اعمال کرنا جن میں ظاہری طور پر بھی فوائد ہوں اور ادبار کا معنی ہے ایسے اعمال وافعال پر تسلیم و رضا کے ماتحت سر جھکا لینا جن کی بجاآوری میں ظاہری فائدہ کوئی نہ ہو اور مشیتِ پروردگار کا تقاضا ہو۔

حضرت امیر المومنین علیہ السّلام کے پاس بازوئے شمشیر زن، قوت یداللّٰہی کا مظہر موجود تھا۔ تلوار آبدار ذوالفقار قبضہ میں تھی اور جذبات کو اُبھارنے والے اسباب کثرت سے تھے لیکن دوسری طرف حضورؐ کی وصیت تھی کہ یا علیؑ صبر وضبط سے کام لینا پس اپنے آقا کے حکم کے سامنے مشیتِ پروردگار کے ماتحت تسلیم و رضا سے سر جھکا لیا اور جذبات کو نظر انداز کر دیا۔ بلکہ جذبات کے اُبھرنے کے بعد یہ الفاظ زبانِ حق ترجمان سے ادا بھی کئے لَوْلَا وَصِيَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ اگر رسولؐ اللہ کی وصیت نہ ہوتی تو میں کچھ کر کے دکھاتا۔ بے طاقت ہاتھ اگر ساکن ہو جائے اور بے بس انسان صبر کا منظر پیش کرے تو تسلیم نہیں بلکہ بے بسی ہے لیکن کرار غیر فرار اسد کردگار اور ضیغمِ ربِ غفار کر سکنے کے باوجود ذوالفقار شرربار کو نیام میں رکھتے ہوئے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے تو یہ ہے تسلیم و رضا اور یہ امام حق اور معصوم کا ہی شیوہ ہے روایات میں ہے کہ مخدرۂ طاہرۂ عصمت نواز خاتون نے روح فرسا اور ہوشربا منظر دیکھا۔ تو دستار پیغمبر سر پہ اور قمیص رسولؐ ہاتھوں پر لئے بددعا کا ارادہ کیا تو عذاب کے آثار دیکھ کر پیکرِ تسلیم و رضا حضرت علی مرتضیٰؑ نے سلمان سے فرمایا کہ مادرِ حسنینؑ سے کہو بددعا نہ کرنا۔ چنانچہ سلمان نے پیغام دیا تو عالمۂ غیر معلّمہ نے حکمِ امام پہنچتے ہی سر جھکا لیا اور زبان پہ آئے ہوئے لفظ ضبط کر لئے اور یہی ہے منزلِ تسلیم و رضا جو اسی خانوادۂ عصمت کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی اور باقی تمام آئمہ انہی ماں باپ کے سپوت ہیں۔ جن کی منازلِ تسلیم و رضا نے عالمین کے اربابِ فہم و دانش اور اصحابِ عقل و خرد کی گردنیں

اپنے قدموں میں جھکا لیں۔ تفصیلی واقعات تاریخ آئمہ میں کثرت سے موجود ہیں۔

معجزہ و کرامت

ہمارا عقیدہ ہے کہ آئمہ اہلِ بیتؑ صاحبانِ معجزات و کرامات تھے معجزہ اور کرامت خارقِ عادت ہونے میں دونو برابر ہیں صرف اس قدر فرق ہے کہ دین کی حقانیت یا کسی خاص مسئلہ کی وضاحت یا نبوت و رسالت اور عہدہ امامت کے ثبوت کے لئے مخاطبین کی خواہش کی بناء پر نبی یا امام کی دعا سے یا ان کی برکت سے باذنِ خدا جو امرِ خارقِ عادت ظہور پذیر ہو وہ معجزہ کہلاتا ہے اور مذکورہ دواعی و اسباب کے بغیر اُن کے اعزاز و اعظام کی خاطر پروردگار عالم کا بعض تکوینیات کو ان کے تابع کر دینا یا خلافِ عادت امور کا منصۂ شہود پہ آنا ان کی کرامت کہلاتا ہے مثلاً جناب رسالتمآبؐ کے لئے قرآن مجید معجزہ ہے اور سر پہ بادل کا سایہ کرامت ہے اسی طرح شق القمر معجزہ ہے اور سوتے ہوئے غافل نہ رہنا ان کی کرامت ہے اسی طرح ردِ شمس معجزہ ہے اور بابِ خیبر کا اکھاڑنا کرامت ہے اور حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کے لئے حجرِ اسود کا گواہی دینا معجزہ ہے اور چشم زدن میں طے مسافت یا ان کی دُعا سے شفائے بیماراں کرامت ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اشارہ سے تصویروں کا شیر بن جانا معجزہ اور زندان سے غائب ہو کر فوراً واپس آجانا کرامت ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ غرضیکہ اہلِ بیت عصمت کی تاریخ کے مطالعہ سے معجزہ و کرامت کی جزئیات میں فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ خرقِ عادت میں دونو برابر ہیں۔ مقامِ اظہار میں صرف اعتبار ہی کا فرق ہے۔

نبی و امام کے معجزہ کا انکار کرنا نبی و امام کی ناقدر شناسی ہے بلکہ نبی و امام کے انکار کے برابر ہے لہٰذا جو شخص معجزہ کا منکر ہو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ کیونکہ معجزہ کا انکار قدرتِ خداوندی کا انکار ہے اور نبی و امام کی شان کا انکار ہے جو خدا نے ان کو عطا فرمائی اور محمدؐ و آلِ محمدؐ چونکہ انبیاء سابقین سے افضل ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاتھوں پر وقتاً فوقتاً وہ تمام معجزات ظہور پذیر ہوئے تھے جو فرداً فرداً انبیاء سے ظاہر ہوئے تھے آئمہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ان حقائق سے خوب واقف ہے بشرطیکہ اس کا ذہن مادہ و طبیعت کی وادی میں بھٹکا ہوا نہ ہو۔

خداوند کریم اپنی مقدس کتاب میں ارشاد فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ

سُبُلَنَا۔ وہ لوگ جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کر دیتے ہیں اور حضورؐ نے فرمایا تھا عَلَیْکُمْ بِالْجِہَادِ الْاَکْبَرْ جہاد اکبر میں فاتح بننے کی کوشش کرو اور وہ بڑا جہاد ہے اپنے نفس کا فتح کر لینا اور حدیث قدسی میں ہے عَبْدِیْ کُنْ لِیْ اَکُنْ لَکَ۔ اے میرے بندے تو میرا ہو جا میں تیرا ہو جاؤں گا۔ ایک اور حدیث قدسی میں ہے عَبْدِیْ اَطِعْنِیْ اَجْعَلْکَ مِثْلِیْ اے میرے بندے ——— تو میری اطاعت کر تو میں تجھے اپنا جیسا بنا لوں گا۔ اب ظاہر ہے کہ خدا جیسا بن جانا ناممکن ہے تو مقصد یہ ہے کہ جو بندہ جہاد اکبر کر کے اپنی خواہشات کو رضائے پروردگار کی خاطر قربان کر دے تو خدا اس کی قوتِ ارادیہ میں اس قدر پختگی اور توانائی بھر دیتا ہے کہ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ عالم تکوین میں انقلاب آور بن جاتے ہیں بایں معنی کہ اس کے منہ سے لفظ نکلتے ہیں تو خدا ان کو اپنی قدرتِ کاملہ سے حقیقت کا لباس پہنا دیتا ہے پھر ان کو دعا کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ ان کے ارادہ سے انقلاب پیدا ہو جاتا ہے جس طرح جناب بتول معظمہ نے حسینؑ سے کہہ دیا کہ کپڑے درزی کے پاس ہیں تو بس اس مخدومہ کا ارادہ ہوتے ہی خدا نے سب سامان کر دیا اور کپڑے تیار ہو کر خازنِ جنت کے پاس پہنچ گئے اور وہ درزی کی حیثیت سے درِ دولت پر امانت پہنچانے کے لئے پہنچ گیا پھر تقسیم کے وقت حسنؑ نے سبز چاہا تو پانی ڈالنے سے رسولؐ کے ہاتھوں پر سبز بن گئے اور حسینؑ نے سرخ چاہا تو پانی ڈالنے سے رسولؐ کے ہاتھوں پر سرخ بنتے گئے اسی طرح کسی کے سوال پر معصوم نے فرمایا اگر میں چاہوں تو دیوار سونے کی بن جائے پس اس فقرہ کے نکلتے ہی دیوار سونے کی بن گئی۔ امام حسنؑ نے فرمایا اگر میں خدا سے دعا مانگوں تو مشرق کو مغرب کر دے اور عورت کو مرد کر دے وغیرہ کسی نے آپ کے کلام میں شک کیا تو آپ نے ڈانٹ کر فرمایا۔ اے عورت نامحرموں کے مجمع سے نکل جا چنانچہ جب اس نے اپنے وجود کو دیکھا تو وہ عورت بن چکا تھا۔ وعلیٰ ہذا القیاس

بہر کیف یہ ان کی شانِ عبدیت ہے اور اس کا انکار ان کی امامت و ولایت کے انکار کے برابر ہے اور اس پر شک کرنا ان کی امامت میں شک کرنے کے مترادف ہے اور ان کی شان اس قدر بلند و عظیم ہے کہ نہ زبان کے الفاظ اس پر محیط ہو سکتے

ہیں نہ نطاقِ کاغذ میں اس کی وسعت ہے اور نہ حیطۂ تحریر میں وہ سما سکتے ہیں۔ پس اگر وہ سما سکتے ہیں تو اللہ کے محیط علم میں ہی سما سکتے ہیں اس پتلائے خاک کی کیا مجال کہ ان کے فضائل و محامد و کمالات کے احاطے کا دعوٰے کرے۔

میرے اس بیان سے غلط فہمی نہ ہو کہ شیعہ آلِ محمدؐ کو خدائی صفات میں شریک کرتے ہیں کیونکہ معجزہ و کرامت اور ہے اور صفات الٰہیہ میں شرکت اور ہے اس لئے ہم ان کو معجز نما کہتے ہیں خدا نہیں کہتے اور خدا وہ ہے جس نے ان کو یہ عظیم مرتبہ عطا فرمایا اور یہ سب اس کے ممنونِ احسان شکر گزار اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں بلکہ مخلوقِ خدا میں ان کی یہ عظمت و شان جب عیاں ہوتی ہے اور پھر بارگاہِ ربوبیت میں اپنا عجز ظاہر کرتے ہیں تو اصحابِ معرفت کو توحید کے وہ درس حاصل ہوتے ہیں جو کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس ان کا اللہ کی بارگاہ میں جھکنا ہی اس کی عظمت کا بہت بڑا ترجمان ہے۔ پس ان کو خالق رزاق محی ممیت مدبر کائنات ماننا سراسر شرک و کفر ہے لیکن ان کی عظمت اور ان کے معجز نما ہونے کا انکار بھی بے ایمانی اور منافقت ہے ہمارا عقیدہ بین بین ہے اور وہی صحیح ہے کہ تمام کائنات میں چونکہ ان جیسا کوئی عابد نہیں اور ان جیسا کوئی محبوبِ پروردگار نہیں پس خداوند کریم نے ان کو اس قدر دیا کہ ہمارے وہم و گمان سے بھی بالاتر ہے معجزہ و کرامت کا صدور ان کے ہاتھوں پر اس قدر ہوا کہ شمار سے باہر ہے اور اگرچہ وہ فعل خدا ہے لیکن مجازاً ان کی طرف نسبت دینا بھی جائز ہے۔

زمین حجتِ خدا سے خالی نہیں رہ سکتی

ہم اس سے قبل ثابت کر چکے ہیں کہ دینِ اسلام انسانی فطری تقاضوں کی ترجمانی ہے اور ضرورت نبی کے عنوان کے ماتحت بھی ہم اس مسئلہ کی وضاحت کر چکے ہیں پس جب وقارِ انسانیت اور ناموسِ بشریت کی بقاء وارتقا کا دارو مدار اس پر ہے کہ خدا کی جانب سے ان کے لئے قانون بودوباش کی وضع ہو۔ جسے دین کہا جاتا ہے اور یہ کہ وہ اپنے لطف سے اس دین کے مروج و مبلغ و محافظ کا انتظام بھی خود فرمائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح خود بخود واضح ہو گئی۔ کہ کوئی زمانہ حجتِ خدا سے خالی نہیں رہ سکتا ورنہ اتمامِ حجت نہ ہو گا اور ہم پچھلی بحثوں

میں خوب واضح کر چکے ہیں کہ نظامِ تکوینی نظامِ تشریعی کا مقدمہ ہے۔ جیسے ارشادِ قدرت ہے لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ یعنی اپنے حبیب کو فرماتا ہے کہ اگر تو نہ ہوتا۔ تو افلاک پیدا نہ ہوتے اور چونکہ حضورؐ نظامِ تشریعی میں تمام انبیاء و صلحاء و اولیاء کے سلطان و سید ہیں اسی لئے انہی کا نام لیا گیا اور وجود نظامِ تکوین کو انہی کے وجود سے وابستہ کیا گیا اور حضورؐ کی رحلت کے بعد چونکہ نظامِ تشریعی اپنے سربراہ جانشین پیغمبر امام زمانہ جو کہ حجتِ خدا ہے کے زیر سایہ قائم رہا اور اب تک نظامِ تکوینی چونکہ بدستور جاری و ساری ہے لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ اس نظام کا مقصود اصلی نظامِ تشریعی بھی باقی ہے۔ اور اس کا سربراہ جو پیغمبرؐ کا آخری جانشین ہے وہ بھی زندہ ہے ورنہ بے دولہا برات کی مثال صادق آئے گی اور خدا ایسی بیہودگیوں سے پاک و منزہ ہے۔

چونکہ حدیثِ قدسی میں خطاب سرورِ دو عالم حضرت محمدؐ مصطفےٰ کی جانب ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو کائنات کا نظام نہ ہوتا تو آپ سے پہلے آنے والے جملہ انبیاء ان کے استقبال کے لئے تشریف لائے۔ پھر ان کے چلے جانے کے بعد نظامِ کائنات کا برقرار رہنا بتلاتا ہے کہ اب وہ وجود باقی ہے جو مقصودِ کائنات افضل الموجودات حضرت سید السادات محمد مصطفےٰؐ کا ہی جزو اور ان کا حصہ ہو ورنہ خطاب لغو ہوگا۔ اور مقصود فوت ہوگا اسی بناء پر ایک حدیث میں ارشاد ہے اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ اٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَاَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَكُلُّنَا مُحَمَّدٌ ہمارا اول محمدؐ آخر محمدؐ اوسط محمدؐ اور ہم سب کے سب محمدؐ ہیں اور یہ دلیل صاف بتلاتی ہے کہ تاقیامت حجتِ خدا نورِ محمدیؐ سے الگ نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہوگا جو نورِ محمدیؐ کا حصہ ہو لہٰذا ہر زمانہ کے امام کا عترتِ رسولؐ سے ہونا ضروری ہے اور شریعتِ محمدیؐ کی حد بھی چونکہ قیامت تک ہے۔ لہٰذا امامتؑ کا سلسلہ بھی تاقیامت رہے گا اور سب کے سب عترتِ رسول سے ہوں گے۔ نیز قرآن تاقیامت ہے پس امام وہی ہوگا جو قرآن کا صحیح عالم ہو اور پچھلی بحثوں میں ثابت کیا جاچکا ہے کہ عترتِ رسولؐ اور آئمہ اہلبیتؑ کے سوا قرآن کا کما حقہٗ عالم کوئی بھی نہیں پس قرآن کے ساتھ امام کا وجود ضروری ہے نیز قرآن کا معجزہ ہونا بھی بتلاتا ہے کہ معجزنما تاقیامت قرآن کے ساتھ موجود ہو ورنہ معجزہ بغیر معجزنما کے ہوگا اور یہ باطل ہے پس امام کا وجود عترتِ رسول سے ضروری ثابت ہوا۔

قرآن سے وجودِ مہدیؑ کا اثبات

قرآن مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں۔ جن کی تاویل حضرت حجت علیہ السلام کے وجود سے کی جا سکتی ہے بلکہ یقیناً یہی مراد ہیں۔

① وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ
ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ بات لکھ دی ہے کہ میرے صالح بندے ہی میری زمین کے وارث ہوں گے۔

② يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ الآیۃ لوگ اللہ کے نور کو منہ سے بجھانا چاہتے ہیں اور خدا اپنے نور کو تمام کرنے والا ہے تاکہ تمام دینوں پر اس کو غلبہ دے۔

③ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ
اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غلبہ دے۔

④ وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو زمین میں کمزور کئے گئے اور ان کو امام بنائیں اور ان کو زمین کا وارث مقرر کریں۔

⑤ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا الآیۃ وعدہ کیا ہے اللہ نے ایمان والوں سے جنہوں نے نیک عمل کئے کہ ضرور ان کو خلیفۂ زمین بنائے گا جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو بنایا اور ضرور پوری قوت دے گا ان کے اس دین کو جو اس نے پسند کیا ان کے لئے اور البتہ ضرور ان کے خوف و ہراس کو امن سے تبدیل کر دے گا۔

ان پانچوں آیتوں کے متعلق بحار الانوار ج ۱۳ میں ہے کہ یہ حضرت حجت علیہ السلام اور اس کے زمانہ کے لئے ہیں۔ ان کے علاوہ اس مطلب کی اور بہت سی آیات ہیں لیکن ہمارے مطلب کے اثبات کے لئے یہی کافی ہے۔ ان آیات سے جو مطالب

واضح طور پر نکلتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) زمین کے وارث صالح بندے ہوں گے یعنی اقتدار نیک لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا اور دلالت التزامی اسی امر پر بھی ہے کہ نیک لوگوں کا اقتدار باقی و دائم رہے گا۔

(۲) دینِ خدا کا غلبہ تمام ادیانِ باطلہ پر ہو جائے گا اور وہ غلبہ دائمی رہے گا۔ ورنہ پھر کوئی وارث یا غالب ماننا پڑے گا۔

(۳) خلیفۂ زمین وہی ہوگا جس کو خدا نامزد کرے گا کیونکہ پہلی امتوں میں نامزدگی اس طرح سے ہوتی رہی ہے۔

(۴) ان کے خوف کو امن سے تبدیل کرے گا اور ضعف و کمزوری کے بعد ان کو قوت و طاقت عطا فرمائے گا۔

پس ان آیتوں کا صاف و صریح مضمون یہی ہے کہ ایک آنے والا آئے گا جس کی بدولت زمین عدل و انصاف کا گہوارہ بنے گی اور اس کی بدولت اللہ کے صالح اور نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔ پس دینِ خدا مظلومیت کے بعد اپنے مقامِ عروج پر پہنچے گا اور اس کو تمام دینوں پر غلبہ حاصل ہوگا اور حق والے ظلم و تشدد کے شکنجے سے مدتوں بعد آزادی حاصل کر کے دنیا میں امن کا سانس لینے پر موفق ہوں گے۔

بعض لوگوں نے آخری آیت کو اجماعی خلیفوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی یہ کوشش ہرگز بار آور نہیں ہو سکتی کیونکہ آیتِ مجیدہ میں خلافت سازی کا عہدہ خدا نے اپنے پاس رکھا ہے اور خلفائے سابقین کی مثال دی ہے کہ جس طرح ان کو میں نے نامزد کیا تھا اب بھی اسی طرح سے میں ہی بناؤں گا۔ نیز اگر یہ آیتِ مجیدہ خلفائے ثلاثہ کے حق میں ہوتی تو سقیفہ کی لمبی چوڑی نزاع کے وقت اگر بڑے بڑے حقوق جتلائے گئے تو یہ آیت پیش کیوں نہ کی گئی۔ اب چودہ سو برس کے بعد کی پیداوار جان چکی ہے کہ یہ آیت ان کے حق میں ہے تو خود انہی کو اس کا علم کیوں نہ تھا؟ بے شک ان کو علم تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ علم بھی تھا کہ یہ آیت خلافتِ نصی کو ثابت کرتی ہے اور اس آیت کی رو سے تو خلیفہ وہی بنے گا جس کو خدا بنائے اور اس کا بزبانِ پیغمبر غدیرِ خم میں اعلان کر دیا جا چکا تھا۔ پس یہ آیت اس وجہ سے کسی نے پیش کرنے کی جرأت نہ کی۔

بہرکیف قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات حضرت مہدیؑ کی آمد کو ثابت کرتی ہیں۔ اور جن جن لوگوں نے مہدویت کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ آیتیں ان کو سراسر باطل کر رہی ہیں۔ کیونکہ خود یہ آیات بتلاتی ہیں کہ ان مدعیان مہدویت میں کوئی ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی۔

حضرت مہدیؑ کی آمد پر تمام مسلمانوں کا اتفاق

اس میں شک نہیں کہ حضرت مہدیؑ آخر الزماں عجل اللہ فرجہٗ کی تشریف آوری کا عقیدہ تمام مسلمان رکھتے ہیں۔ بلکہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں بھی ایک بڑے ہادی کی متوقع آمد کا عقیدہ موجود ہے خواہ وہ اس کا جو بھی نام تجویز کرتے ہوں ویسے رفتارِ زمانہ کا جائزہ لینے سے ہر حساس انسان کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ظلم و تشدد و جور و استبداد و بے غیرتی و بے حیائی اور بہیمیت و درندگی کی آخر کوئی حد بھی ہونی چاہیئے اور ایک ایسا دَور بھی ہونا چاہیئے۔ جس میں ظلم و عدوان ختم ہو اور اس کی جگہ عدل و انصاف کا علم بلند ہو۔ کتب معتبرہ شیعہ و سنی میں موجود ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ زندگیٔ دنیا سے صرف ایک دن بھی بچ جائے تب بھی خدا ایک ایسے ہادی کو بھیجے گا جو میری عترت سے ہوگا اور وہ میرا ہم نام ہوگا زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح پُر کرے گا جس طرح ظلم و جور سے پُر ہو چکی ہوگی۔

عام مسلمانوں میں اور شیعہ میں صرف اس قدر اختلاف ہے کہ شیعہ کہتے ہیں۔ اس امام عالی مقام کی ولادت سامرا میں ۱۵ ار شعبان سنہ ۲۵۵ھ کو ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی نرجس خاتون تھا اور والد بزرگوار حضرت رسالتمآبؐ کے گیارہویں جانشین تاجدار امامت حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام تھے ان کی شہادت سنہ ۲۶۰ھ میں ہوئی اور حضرت مہدی علیہ السلام عرصہ پانچ سال میں عہدہ جلیلۂ امامت پہ فائز ہوئے۔ عام مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ابھی پیدا نہیں ہوئے بلکہ بعد میں پیدا ہوں گے اور اہل سنت میں سے بہت سے اعیان علماء شیعہ کے عقیدہ سے اتفاق رکھتے ہیں۔ علی مالکی منہم۔

آپ کی طویل زندگی پر شیعہ کے عقیدہ کی رُو سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ جب وہ اللہ کی مشیت سے غائب ہیں اور اللہ جس کو چاہے جس طرح چاہے

زندہ رکھ سکتا ہے تو یہ اعتراض ہم پر نہیں ہوگا بلکہ اللہ کی قدرت پر ہوگا۔ اگر دشمنِ آدمؑ ابلیس ایک طویل عرصہ تک زندگی پا سکتا ہے انبیاء میں حضرت خضرؑ حضرت الیاسؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام اگر مافوق العادہ ہزاروں برس زندہ رہ سکتے ہیں۔ تو حضرت مہدی علیہ السلام کی طویل زندگی کیسے ناممکن ہے؟ باقی یہ سوال کہ ان کے وجود غائب کا فائدہ کیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نظام کائنات کا وجود نظام تشریع سے وابستہ ہے اور اس وقت نظام تشریع کا سربراہ حضرت حجت خواہ لوگوں کی ظاہری نظروں سے غائب ہیں موجود ہیں اور ان کی غیبت میں بھی نظام شرعی کے محافظین ہر جگہ ان کی نیابت میں کام کر رہے ہیں۔ حسب مشیتِ ایزدی کا تقاضا ہوگا تو وہ خود بھی تشریف لائیں گے اور ظاہر ہو کر کام کریں گے اب ان کے وجودِ غائب سے بذریعہ نائبین اس طرح عالم تشریع کا نظام جاری و ساری ہے جس طرح سورج بادلوں میں چھپ جانے کے بعد اپنی شعاعوں کے ذریعے سے دنیا میں روشنی پھیلاتا رہتا ہے۔ پس یہ تمام حق کی آواز بلند کرنے والے شمسِ امامت کی کرنیں ہیں جو ان کی غیبت میں عالم میں اُجالے کے موجب ہیں

شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرت حجت صاحب الزمان امام العصر مہدی ہادی علیہ السلام ۱۵ شعبان کی رات سامرہ میں جناب نرجس خاتون کے بطنِ اقدس سے پیدا ہوئے۔ پھر ان کی تربیت غائبانہ ہوتی رہی اور امام حسن عسکری علیہ السلام نے اس زمانہ کی ظالم حکومت کے خوف سے ان کی غیبت کا مکمل انتظام فرمایا تھا اور اس سے پہلے خداوند کریم نے ان کی غیبت کا مکمل انتظام فرمایا تھا کہ آپ شکمِ مادر میں بھی غائب رہے۔ حتٰی کہ اپنے خاندان کی عورتوں پر حمل کا راز فاش نہ ہو سکا اور حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی پھوپھی جناب خاتون آخر وقت تک محسوس نہ کر سکیں۔ یہ اہتمام اس لئے کہ حکومتِ وقت آپکی آمد سے اس طرح گھبرائی ہوئی تھی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش سے پہلے نمرود یا حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے قبل فرعون ایک آنے والے سے گھبرا گئے تھے اور انہوں نے اس خطرہ کو رفع کرنے کی خاطر کتنے ناحق حمل چاک کرا دیئے تھے پس بعینہٖ وہی خدشہ اس دور کے عباسی حکمرانوں کو لاحق تھا جس کی وجہ سے خدا نے قبل از وقت ولادت ان کو غائب کر دیا تاکہ قریب کی عورتیں بھانپ نہ جائیں اور حکومتِ وقت درپئے ایذا نہ ہو جائے پھر ولادت کے بعد بھی اکثر غائب رہے اور سرداب

میں تربیت ہوتی رہی جب دنیا غفلت کی نیند سو جاتی تھی تو کنیز اٹھا کر امام حسن عسکری علیہ السلام کے سامنے لاتی تھی اور آپ اس سے محبت و پیار کرتے۔ تھے غیبت کا یہ عالم تھا کہ اپنے خاندان کے قریبی لوگوں کو خبر بھی نہ تھی چنانچہ امام حسن عسکری علیہ السلام کے جنازہ کے وقت عین موقعہ پر آپ تشریف لائے اور باپ کا جنازہ پڑھا۔ اس کے بعد تقریباً ستر برس غیبت صغریٰ کا زمانہ رہا اور اس زمانہ میں خاص خاص لوگوں کو شرفِ زیارت حسبِ مصلحت حاصل ہو سکتا تھا۔ غیبت صغریٰ میں آپ کی نیابت خاصہ میں کام کرنے والے صرف چار آدمی تھے جنہوں نے یکے بعد دیگرے یہ عہدہ جلیلہ سنبھالا۔ پہلے حضرت عثمان بن سعید ان کے بعد ان کے فرزند حضرت محمد بن عثمان بن سعید ان کے بعد ابوالقاسم حسین بن روح اور آخر میں علیؒ بن محمد سمری۔ پھر غیبت کبریٰ کا دور شروع ہوا جو آج تک بدستور ہے۔ اَللّٰھُمَّ عَجِّلْ فِیْ فَرَجِہٖ وَلِیِّکَ الْحُجَّۃِ بْنَ الْحَسَنِ وَاجْعَلْنَا مِنْ اَنْصَارِہٖ بِجَاہِ مُحَمَّدٍ وَّ آلِہٖ

فروع میں تقلید کا حکم

کتاب کی تمہید میں ہم نے عنوان (علمائے اعلام کا مقام) کے ذیل میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے فرامین ذکر کئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ زمانۂ غیبت میں علمائے مجتہدین نیابتِ عامۂ امام علیہ السلام کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ لہٰذا تمام فروعی مسائل میں ان علماء کی طرف رجوع کرنا واجب ہے اور احادیث میں یہ کہیں نہیں کہ ہر زمانہ میں صرف ایک مجتہد اعلم کی ہی تقلید کی جائے بلکہ وہاں حکم ہے مَنْ کَانَ مِنَ الْفُقَھَاءِ صَائِنًا لِنَفْسِہٖ حَافِظًا لِدِیْنِہٖ مُخَالِفًا عَلٰی ھَوَاہُ مُطِیْعًا لِاَمْرِ مَوْلَاہُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ یُّقَلِّدُوْہُ (احتجاج) فقہاء میں سے جو بھی اپنے نفس پر قابو رکھنے والا اپنے دین کی حفاظت کرنے والا اور اپنے مولا کے حکم کا فرمانبردار ہو۔ پس عوام کو چاہیئے کہ اس کی تقلید کریں۔ اسی طرح اسحاق بن یعقوب کے سوالات کے جواب میں حضرت حجت علیہ السلام نے تحریراً ارشاد فرمایا وَاَمَّا الْحَوَادِثُ الْوَاقِعَۃُ فَارْجِعُوْا فِیْھَا اِلٰی رُوَاۃِ اَحَادِیْثِنَا فَاِنَّھُمْ حُجَّتِیْ عَلَیْکُمْ وَاَنَا حُجَّۃُ اللّٰہِ عَلَیْھِمْ۔

پس آئندہ کے مسائل میں ان لوگوں کی طرف رجوع کرو جو ہماری احادیث کے راوی ہیں کیونکہ وہ لوگ میری طرف سے تم پر حجت ہیں اور میں اللہ کی طرف سے ان پر

حجت ہوں بہرکیف معصوم کے فرمان میں یہ کہیں نہیں کہ تم سب صرف ایک شخص کی طرف رجوع کرو بلکہ جس شخص میں یہ علامات موجود ہوں جو مذکور ہو چکی ہیں۔ تم ان کی طرف رجوع کرو اور وہی تم پر حجت ہیں۔

دُور جانے کی کیا ضرورت ہے جب امام خود ظاہر تھے اس وقت تو اعلم کا مسئلہ ہی صاف تھا۔ لیکن آئمہ نے اس وقت کے دُور دُور کے شیعوں کو اپنی طرف رجوع کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ ہر علاقہ کے شیعوں کو اپنے قریب ترین عالم کی طرف رُجوع کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ورنہ اگر اعلم کی تقلید واجب ہوتی تو اس دَور میں دیگر علماءُ کی طرف رُجوع کرنے کا حکم کیوں صادر فرماتے بلکہ کہنا چاہیئے تھا کہ علماء سے اعلم تو بجائے خود ہم انبیائے سابقین سے بھی اعلم ہیں لہٰذا ہمارے علاوہ کسی کو فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں لہٰذا کسی کو کسی سے مسئلہ دریافت کرنے کی اجازت نہیں لیکن اُمّت کی سہولت کی خاطر آئمہ نے شیعوں پر یہ بوجھ رکھنا گوارا نہ فرمایا اور ہر ملک کے شیعہ کو قریب ترین کے عالم سے مسائل دریافت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس مسئلہ پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں میں مقدمہ تفسیر انوار النجف میں اس مسئلہ کو بڑی وضاحت اور تفصیل سے بیان کر چکا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن آیات و احادیث سے تقلید کا وجوب ثابت کیا جاتا ہے ان سے تقلیدِ اعلم کا وجوب قطعاً ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ احادیث و آیات سے تقلید ہر مجتہد کا جواز ثابت ہوتا ہے پس جس انسان کو جس مجتہد سے مسئلہ پوچھنے میں آسانی ہو اسی سے اپنے معالم دینیہ حاصل کر کے اس پر عمل کر سکتا ہے۔ ورنہ دین پر عمل کرنا دشوار سے دشوار تر بن جائے گا اور تحصیلِ علم کا جذبہ خود بخود ختم ہو جائے گا اور اس کی خرابیاں حد و حساب سے باہر ہیں۔

ہمارے ملک میں جو ایک مہلک مرض ہے اور روز افزوں وہ خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے وہ یہ کہ اپنے خواہشات و جذبات کے ماتحت جس کسی کو کسی عالم دین سے مسئلہ سے اختلاف ہوتا ہے وہ فوراً تمام علماء کے خلاف علم بغاوت کھڑا کر دیتا ہے اور تقلید کا جوا گردن سے اتار پھینکنے میں اپنی زندہ دلی اور روشن خیالی سمجھتا ہے حالانکہ یہ انتہائی خطرناک ذہنی مرض ہے اور اس قسم کی پوری رَو قوم کے لئے پیغام ہلاکت ہے اگر علماء کے خلاف اس قسم کی بغاوت کو فروغ دیا گیا تو وہ دن دُور نہیں

کہ شیعہ عوام کا اہلِ علم سے رابطہ کٹ جائے اور یقین رکھیئے کہ کوئی قوم قومی حیثیت سے علم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

قوم کے درد دل رکھنے والے اس مرض کا علاج سوچیں اور اس کے قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں جو افرادِ قوم علماء کے خلاف علم بغاوت بلند کریں ان کے منہ میں لگام دینا ہر دردِ دین رکھنے والے انسان کا فرضِ اولین ہے۔ بعض جہلاً علماء کے خلاف علمِ بغاوت کا جھنڈا کھڑا کر کے اپنے آپ کو اخباری ظاہر کرتے ہیں اور یہ صرف نفس پرستی اور فریب شعاری ہے حقیقت میں اخباری کا معنی ہے۔ احادیث آئمہ کو سمجھنے والا اور ان پر عمل کرنے والا اور اس لحاظ سے علمائے اعلام اور مجتہدین ذوی احترام ہی اپنے آپ کو اخباری کہلا سکتے ہیں اور جن علمائے اعلام کو سابقین میں سے اخباری کہا گیا ہے وہ اپنے مقام پر مجتہد تھے۔ جیسے علامہ مجلسی علامہ جزائری علامہ نوری اور علامہ فیض کاشانی وغیرہ۔ بہرکیف عوام شیعہ پر مجتہد کی تقلید مسئلہ شرعیہ فرعیہ میں واجب ہے اور اس کے بغیر اس کے اعمال کی درستی مشکل ہے۔

وہ مجتہد جس کی تقلید جائز ہے اسے جامع الشرائط ہونا چاہیے۔

(۱) قرآن و حدیث سے اصول امامیہ کے مطابق مسائل شرعیہ فرعیہ کا استنباط کر سکتا ہو۔

(۲) حلال زادہ ہو (۳) عادل ہو

(۴) مرد ہو (۵) مذہب امامیہ اثنا عشریہ رکھتا ہو

(۶) خواہش نفسیہ و جذبات شہویہ پر کنٹرول کر کے ہر لحاظ سے شرعی اقدار کا محافظ ہو۔

بنابریں سہم امام علیہ السلام و دیگر حقوق شرعیہ اور امور حسبیہ کا ہر مجتہد جامع الشرائط کو اختیار حاصل ہے اور اسے حاکم شرعی کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی جن جن معاملات میں امام کی طرف رجوع ضروری ہے زمانِ غیبت میں ہر مجتہد جامع الشرائط کو ان کی نیابت عامہ کا حق حاصل ہے۔

آٹھواں باب

بعض شیعی مختصات

حکم امام کے سامنے تسلیم

ہمارا عقیدہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کی طرح تمام آئمہ طاہرین علیہم السلام کا فرمان خواہشِ نفس کے تابع نہیں ہوتا بلکہ ان کا قول فعل اور عمل و سیرت سب مشیتِ پروردگار کے ماتحت ہوتے ہیں حضرت رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق صریح طور پر فرمایا تھا۔ اَنَا وَعَلِیٌّ اَبَوَا هٰذِهِ الْاُمَّةِ کہ میں اور علیؑ اس امت کے باپ ہیں۔ پس اس لحاظ سے تنقیح مناط کے قاعدہ کے مطابق تمام آئمہ کی یہی حیثیت ہے پس پوری امت پر ان کے حکم کی تعمیل واجب ہے کیونکہ ان کا حکم خدا کا حکم ہے اور اولوالامر کی اطاعت مطلقہ بھی اسی امر کو ثابت کرتی ہے پس انسان اس وقت تک مومن کامل نہیں بن سکتا۔ جب تک آئمہ کو اپنے نفس جان مال اور اولاد سے محبوب تر نہ سمجھے اور ان کو اپنے والدین سے بھی افضل جاننا فرضِ ایمانی ہے بلکہ والدین کی اطاعت اسی حد تک واجب ہے جب تک وہ مخالفتِ نبی و امام کا حکم نہ دیں ورنہ والدین کی اطاعت ساقط اور نبی و امام کی اطاعت فرض ہو جائے گی۔

لہٰذا ہر مومن کا فرض ہے کہ جب امام کا فرمان سامنے آجائے تو اس پر جرح کی عادت چھوڑتے ہوئے سرِ تسلیم خم کرے خواہ ظاہری طور پر اس کی مصلحت نہ بھی سمجھ رہا ہو دیکھئے ہارون مکی کا واقعہ سب پڑھتے ہیں۔ خراسانی نے کہا تھا میں شیعہ ہوں امام نے فرمایا اگر درست کہتا ہے تو سامنے تنور میں کود جا اس نے عذر کیا تو آپ نے ہارون مکی سے فرمایا پس وہ فوراً تنور میں کود گیا اور خراسانی جب قریب آیا تو دیکھا کہ وہ آگ کے انگاروں پر آرام سے ذکرِ خدا میں مشغول ہے پس

آئمۂ معصومین علیہم السلام کی اطاعت کا صحیح مقصد یہ ہے کہ ان کی فرمائش کو بلا چوں وچرا تسلیم کر لیا جائے۔

اور شیعہ کا عقیدہ ہے کہ آئمہ طاہرینؑ قرآن ناطق ہیں بعض جہلاؑ کا حکم امام ثابت ہو جانے کے بعد قرآن سے ثبوت طلب کرنا حسبنا والوں کی عادات کا ہی اثر ہے ورنہ حق تو یہ ہے کہ قرآن کا ظاہر جب پیش کیا جائے تو پوچھنا چاہیئے کہ امام بھی اس کی تفسیر اسی طرح کرتے ہیں یا وہ کچھ اور فرماتے ہیں لیکن جب معصوم کا فرمان معلوم ہو جائے اور قرآن کے ظاہر سے نہیں ملتا ہو تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ فرمان معصوم قرآن کے عین مطابق ہے خواہ صامتِ قرآن سے ہمیں وہ حکم مل سکے یا نہ مل سکے۔ مثال کے طور پر ہر ایک جانتا ہے کہ تمام آئمہ ریش تراشی کو حرام جانتے تھے اور ہر امام کی ڈاڑھی موجود تھی باوجود اس یقین کے یہ پوچھنا کہ آیا یہ حکم قرآن میں ہے؟ تو اس کا مطلب صاف یہی ہوگا کہ امام کے عمل کا قرآن کے مطابق ہونے کا یقین نہیں یا یہ کہ وہ قرآن ناطق نہیں جب قرآن ناطق کا عمل سامنے ہے تو قرآن صامت سے تلاش کرنے کا مطلب ہی کچھ نہیں۔ جنگِ صفین کے موقعہ پر جب اہل شام نے قرآن کو نیزوں پر بلند کیا تھا تو حضرت علیؑ نے صاف فرمایا تھا کہ میں جب کہہ رہا ہوں تو پرواہ مت کرو اور آگے بڑھو گھبراتے کیوں ہو گویا مطلب یہ تھا کہ وہ قرآن صامت ہے اور میں ناطق ہوں بہرکیف اس میں طول کرنے کا فائدہ کوئی نہیں حقیقی شیعہ وہ ہے جو امام کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اس پر بحث ہرگز نہ کرے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسلام کا معنی ہی تسلیم بتایا تھا۔

امہات آئمہ

آبائے آئمہ کے متعلق سابقاً ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ تا آدم مومن کامل تھے اور امہات آئمہ کے متعلق بھی عقیدہ یہی ہے کہ مومنہ کاملہ تھیں کیونکہ جس کو خدا اپنے خصوصی عہدہ کے لئے چنتا ہے اس کے ظرف کی خود حفاظت کرتا ہے اور عقلی دلائل جو آبائے نبی و امہات نبی کے ایمان کے متعلق ہو سکتے ہیں۔ یہاں بھی وہی جاری ہوں گے اور نقلی طور پر آئمہ کی منقولہ زیارتوں میں ان الفاظ کا ہونا کُنْتَ فِی الْاَصْلَابِ الشَّامِخَۃِ وَالْاَرْحَامِ الْمُطَھَّرَۃِ کہ آپ ہمیشہ بلند مرتبہ پشتوں اور پاک و پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتے رہے پس عقیدہ یہ ہے کہ ہر امام کا ظرفِ رحم پاک و

پاکیزہ تھا اور تا آدم ان کا سلسلہ اسی طرح تھا۔ یعنی ان کا سلسلہ نسب کفر و شرک کی آلائشوں سے کسی دور میں ملوث نہ ہوا وَ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ

برگزیدہ خواتین

تمام شیعہ و سنی روایات اس امر پر متفق ہیں کہ خداوند کریم نے تمام عالم میں سے چار عورتوں کو برگزیدہ فرمایا اور وہ یہ ہیں۔

① آسیہ بنت مزاحم زوجۂ فرعون ② مریم بنت عمران مادر عیسیٰ

③ خدیجہ بنت خویلد ام المومنین ④ فاطمۃ الزہراء ام الائمۃ النجباء

① عَنِ الدُّرِّ الْمَنْثُوْرِ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ حَسْبُکَ مِنْ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَخَدِیْجَۃُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ وَفَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَاٰسِیَۃُ امْرَاَۃُ فِرْعَوْنَ

بروایت درمنثور انس سے منقول ہے کہ حضرت رسولِ خدا نے فرمایا کہ تمام جہان کی عورتوں میں سے مریم بنت عمران خدیجہ بنتِ خویلد فاطمہ بنت محمد اور آسیہ زوجہ فرعون فضیلت و شرف کے لئے کافی ہیں۔ (یہ افضل ہیں) بروایت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے فرمایا کہ حضرت رسالتمآبؐ نے فرمایا تحقیق اللہ عزوجل نے عورتوں میں چار کو چن لیا ہے اور وہ مریم آسیہ خدیجہ اور فاطمہ ہیں الخبر

② فِی الْخِصَالِ ۔ عَنْ اَبِی الْحَسَنِ الْاَوَّلِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اخْتَارَ مِنَ النِّسَاءِ اَرْبَعًا مَرْیَمَ وَاٰسِیَۃَ وَخَدِیْجَۃَ وَفَاطِمَۃَ الخبر

میں نے صرف ایک روایت اہلِ سنت کی کتاب درمنثور سے اور ایک روایت شیعہ کی کتاب خصال سے نقل کی ہے اس باب کی روایات کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں ان کے برگزیدہ خدا ہونے میں کسی کو مجالِ انکار نہیں کیونکہ قرآن میں ان کا ذکر موجود ہے

آسیہ بنت مزاحم

یہ فرعون کی زوجہ تھی اور آخر دم تک ایمان پر ثابت قدم رہی فرعون کی فرعونیت اور اس کا انتہائی ظلم و تشدد اس کو جادۂ حق سے نہ ہٹا سکے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بقاء کا سبب یہی خاتون تھی فرعون سے چوری خدائے قدوس کی عبادت کر لیا کرتی تھی اور عقیدۂ توحید پر اس کا ایمان راسخ تھا اور روایات میں ہے کہ یہ خاتون بروز محشر جنت میں حضرت رسالتمآبؐ کے حرم میں داخل ہو گی۔ قرآن اس کی مدح و ثنا میں ارشاد فرماتا ہے۔ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ

اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ خدا نے مومنوں کے لئے زوجۂ فرعون کی مثال بیان کی ہے جب اس نے کہا تھا اے پروردگار میرے لئے جنت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالموں سے اٹھالے چنانچہ خدا نے اس کو ان کے شر سے محفوظ کر لیا اور کہتے ہیں فرعون نامرد تھا جس کی بنا پر اس کے آسیہ کے ساتھ عورت و مرد والے تعلقات نہیں تھے اور یہی بات قرینِ عقل بھی ہے۔

② مریم بنتِ عمران

بروایت بحار الانوار ابو بصیر سے مروی ہے میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے مریم کے والد عمران کی نبوت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں وہ اپنی قوم میں نبی و مرسل تھے۔ مریم کی ولادت سے قبل حضرت عمران کی زوجہ نے منت مانی تھی کہ میں اپنے بچے کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کروں گی۔ چنانچہ ان کو یہ لڑکی عطا ہوئی اور اسے بیت المقدس میں حضرت ذکریا کی زیرِ تربیت رکھا گیا۔ جب جوان ہوئی تو حضرت ذکریا نے ان کے لئے ایک حجرہ تعمیر فرمایا۔ ان کے پاس بے موسم کے میوہ جات حضرت ذکریا نے جو دیکھے تو پوچھا اَنّٰی لَكِ هٰذَا؟ یہ کہاں سے آگئے۔ تو مریم نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:۔ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فرمایا اللہ کی جانب سے ہیں اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاۗءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ اللہ بے حساب رزق دیتا ہے جسے چاہے۔ پھر مریمؑ کو فرشتے کی بشارت اور حضرت عیسیٰؑ کی بغیر باپ کے ولادت وغیرہ کے قرآن مجید میں تفصیل سے قصے درج ہیں اور مریم کی برگزیدگی پر نص کرتے ہوئے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ تحقیق اللہ نے تجھے چن لیا اور پاک کیا اور تجھے عالمین کی عورتوں پر برگزیدہ فرمایا ہے۔

ہم نے تفسیر انوار النجف کی تیسری جلد سورہ آلِ عمران میں جناب مریمؑ کے ذکر اور ان کی برگزیدگی پر کافی روشنی ڈالی ہے اور ان کی وجہ اصطفاء کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ جناب خاتونِ جنت حضرت فاطمہؑ ان سے افضل و اشرف تھیں ان کی افضلیت صرف اپنے زمانہ کی عورتوں پر تھی اور حضرت فاطمہؑ کی فضیلت تمام جہانوں

اٰمَنُوا امْرَاَةَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ خدا نے مومنوں کے لئے زوجۂ فرعون کی مثال بیان کی ہے جب اس نے کہا تھا اے پروردگار میرے لئے جنت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالموں سے اٹھالے چنانچہ خدا نے اس کو ان کے شر سے محفوظ کر لیا اور کہتے ہیں فرعون نامرد تھا جس کی بنا پر اس کے آسیہ کے ساتھ عورت و مرد والے تعلقات نہیں تھے اور یہی بات قرینِ عقل بھی ہے۔

۲ مریم بنت عمران

بروایت بحار ابوبصیر سے مروی ہے میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے مریم کے والد عمران کی نبوت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں وہ اپنی قوم میں نبی و مرسل تھے۔ مریم کی ولادت سے قبل حضرت عمران کی زوجہ نے منت مانی تھی کہ میں اپنے بچے کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کروں گی۔ چنانچہ ان کو یہ لڑکی عطا ہوئی اور اسے بیت المقدس میں حضرت زکریا کی زیر تربیت رکھا گیا۔ جب جوان ہوئی تو حضرت زکریا نے ان کے لئے ایک حجرہ تعمیر فرمایا۔ ان کے پاس بے موسم کے میوہ جات حضرت زکریا نے جو دیکھے تو پوچھا اَنّٰی لَكِ هٰذَا؟ یہ کہاں سے آگئے۔ تو مریم نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:۔ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فرمایا اللہ کی جانب سے ہیں اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ اللہ بے حساب رزق دیتا ہے جسے چاہے۔ پھر مریمؑ کو فرشتے کی بشارت اور حضرت عیسیٰؑ کی بغیر باپ کے ولادت وغیرہ کے قرآن مجید میں تفصیل سے قصے درج ہیں اور مریم کی برگزیدگی پر نص کرتے ہوئے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ تحقیق اللہ نے تجھے چن لیا اور پاک کیا اور تجھے عالمین کی عورتوں پر برگزیدہ فرمایا ہے۔

ہم نے تفسیر انوار النجف کی تیسری جلد سورہ آلِ عمران میں جناب مریمؑ کے ذکر اور ان کی برگزیدگی پر کافی روشنی ڈالی ہے اور ان کی وجہ اصطفاء کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ جناب خاتونِ جنت حضرت فاطمہؑ ان سے افضل و اشرف تھیں ان کی افضلیت صرف اپنے زمانہ کی عورتوں پر تھی اور حضرت فاطمہؑ کی فضیلت تمام جہانوں

کی عورتوں پر تھی ان کی فضیلت کی حد وہاں تک ہے جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کی نبوت ہے اور جناب فاطمہؑ کی فضیلت وہاں تک ہے جہاں تک حضرت محمد مصطفیٰؐ کی نبوت ہے چنانچہ بعض روایات میں اس طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ نیز ان کی فضیلت ایک صفت خاصہ کے ماتحت تھی اور وہ ہے بغیر شوہر کے عیسیٰؑ پیغمبر کی ماں بننا اور حضرت فاطمہؑ کی فضیلت شمائل وخصائل نسوانی کے لحاظ سے تھی [1]

---

[1] بعض جاہل میری اس عبارت سے سادہ لوح انسانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور میرے بلکہ جملہ علمأ اعلام کے خلاف لوگوں کو اُبھارنے کی سعی نامسعود کرتے ہیں کہ شمائل وخصائل نسوانی سے مراد (معاذ اللہ) حیض ونفاس ہے حالانکہ ان عقل کے اندھوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جناب بتول معظمہ کا تقابل جناب مریمؑ سے فضیلت کے لحاظ سے کیا گیا ہے اور سیدہ طاہرہ کو مریمؑ سے افضل ثابت کیا گیا ہے کیا فضیلت صفات خسیسہ میں ہوا کرتی ہے یا صفات شریفہ میں ہوتی ہے؟ نیز کسی لغت میں شمائل کا لفظ صفات ناقصہ میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ اعلیٰ صفات کو ہی شمائل کہا جاتا ہے اگر نسوانیت کے استعمال سے دھوکا ہوتا ہے تو قرآن مجید کی آیت مباہلہ میں حضرت بتول معظمہ کے لئے نسوانیت کا استعمال موجود ہے تو کیا وہاں بھی صفات ناقصہ ثابت کی جائیں گی؟

میرا مقصد ہے کہ مریمؑ کو جس صفت کے ماتحت عالمین کی عورتوں سے برتری حاصل ہے وہ یہ ہے کہ ان کو شوہر کے بغیر عیسیٰؑ کی ماں بننے کا شرف نصیب ہوا اور یہ صفت بلاشک عالمین میں کسی عورت میں نہیں پائی گئی اور جناب مریمؑ کا اس میں کوئی بھی شریک نہیں ہے لیکن یہ صفت مریمؑ کی اختیاری نہیں بلکہ اضطراری تھی اور بغیر شوہر کے بچے کی ماں بنا دینا اللہ کا کام ہے مریمؑ کا اپنا ذاتی اختیاری فعل نہیں لیکن مخدومہ طاہرہ سیدہ کونینؑ کو تمام ان صفات میں برتری حاصل ہے جو صنف نازک کیلئے معیار فضیلت بن سکتے ہیں پس وہ بیٹی بیوی اور ماں ہونے کی حیثیت سے تمام عالمین کی عورتوں سے افضل تھیں کیونکہ بے عیب بیٹی ہونے کے لحاظ سے تمام امت کی بیٹیوں کیلئے اسوۂ حسنہ کی تشکیل کرنے والی تھیں اور بے عیب بیوی کے لحاظ سے تمام بیویوں کیلئے راہنمائی کے فرائض انجام دینے والی تھیں اور بے عیب ماں ہونے کی حیثیت سے تمام ماؤں کیلئے اولاد کی تربیت کا درس دینے والی تھیں اور یہ صفات مخصوصہ ہیں جن کو صنف نازک اگر پوری ذمہ داری سے نبھالیں تو پورا انسانی معاشرہ دنیا کی زندگی کو جنت کا گہوارہ محسوس کریگا خداوند کریم حسد کرنے والوں کو بات سمجھنے کی توفیق مرحمت فرمائے پس خلاصہ یہ ہے جناب بتول معظمہ کو صفات اختیاریہ میں مریمؑ سے بلکہ عالمین کی جملہ عورتوں سے برتری حاصل ہے اور آیت تطہیر کی مصداق ہونے کی حیثیت سے یہ مخدومہ طاہرہ تمام صفات رذیلہ وخسیسہ اور تمام رذیلہ وناقصہ سے اس طرح پاک ہیں جس طرح پاک ہونے کا حق ہے اور تمام علمائے امامیہ اثنا عشریہ کا یہی عقیدہ ہے اور جو شخص علمائے شیعہ کی طرف توہین بتول کی نسبت دیتا ہے وہ اپنے حسد وکدورت کی بنا پر اس کو پیدا کرتا ہے شیعہ علما کا دامن اس قسم کے گندے عقائد کے دھبوں سے پاک وستھرا ہے خداوند کریم مومنین کو حق کہنے اور کرنے کی توفیق دے اور علماء کو صحیح خدمت دین کی ہدایت عطا فرمائے۔ (مؤلف)

③ خدیجہؓ بنت خویلد

اُم المومنین ام الآئمہ یہ مخدومہ عقیلۂ قریش کے لقب سے مشہور و معروف تھیں اور بڑے بڑے نامور رؤسا نے شادی کے لئے پیغامات بھیجے تھے لیکن سب کی خواہشات کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر رکھ دیا اور حضرت رسالتمآبؐ کی کنیزی کو دین و دنیا کیلئے باعث فخر قرار دیا۔ تاریخ اسلام میں اس پاک بی بی کی اسلامی خدمات اور حضرت رسالتمآبؐ سے وفا شعاری کی داستان لاجواب حیثیت رکھتی ہے اس قدر مالدار تھیں کہ اس کے صرف سونے کے ڈھیر کے سایہ میں حیوان آرام کر سکتے تھے ہزاروں اونٹ گردو نواح کے ممالک میں بغرض تجارت آیا جایا کرتے تھے ہزاروں غلام و کنیزیں اس کی خدمت میں صبح و شام مصروف عمل تھے پورے عرب میں اس کے وقار کا چرچا تھا۔ سبقت اسلامی کے لحاظ سے ظاہری طور پر اس کا نمبر دوسرا ہے پہلا سابق الاسلام حضرت علیؑ اور اس کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ ابتدائی دور میں مکہ مکرمہ میں جب حضورؐ نماز پڑھتے تھے۔ تو پہلو میں حضرت علیؑ اور اس کے پیچھے یہ مخدومہ کھڑی ہو جاتی تھیں اور نماز جماعت میں فقط یہی شریک ہوا کرتے تھے مسلمانوں نے خدیجہ کا مال کھا کھا کر کلمہ اسلام سیکھا۔ قرآن فرماتا ہے وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ کہ خدا نے تجھے تنگدست پایا پس غنی کر دیا۔ اس مقام پر تمام مفسرین رقمطراز ہیں کہ خدا نے رسولِ خدا کو خدیجہ کے مال سے غنی کیا تھا اور حضورؐ نے خدیجہ کی ساری دولت اسلام اور مسلمانوں کی بقاء و ارتقاء پر خرچ کر ڈالی حتیٰ کہ شعب ابی طالب میں جب جانا پڑا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا اور بعض اوقات یہ بی بی درختوں کے پتے کھا کر گذارہ کر لیا کرتی تھیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ سے قبل اس بی بی کا کوئی شوہر نہیں ہوا اور یہ باکرہ تھیں جیسا کہ بحار الانوار ج ۶ میں ایک روایت بھی ہے لہٰذا دختران کا اس کی جانب منسوب ہونا صرف مجازی ہے جس طرح کہ رسالتمآبؐ کی طرف ان کی نسبت مجازی ہے جو لڑکیاں ان کی جانب منسوب ہیں۔ درحقیقت وہ ان کی بہن سے تھیں اور ان کے ہاں تربیت پانے کی وجہ سے ان کی طرف منسوب ہو گئیں اس میں شک نہیں کہ یہ بی بی تمام مسلمانوں کی بلکہ اسلام کی محسنۂ عظمیٰ تھیں عقلی لحاظ سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ نور نبی و نور امام کبھی کسی دور میں غیر مومن پشت اور غیر طاہر شکم میں نہیں

رہا لہٰذا آباء و امہات آنحضرؐ کا مومن ہونا بالکل واضح و مبرہن ہے تو جب خداوند کریم نے نورِ نبوت و نورِ امامت کے ظرف کو اس طرح کفر و شرک کی آلائشوں سے پاک رکھا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ جناب خدیجہ حضورؐ سے قبل کسی غیر مسلم کے نکاح میں ہو حالانکہ وہ گیارہ اماموں کی ماں ہے اور بارہ معصوموں کا ظرف ہے لہٰذا جس طرح خدا نے آسیہ کو کافر کے قرب سے محفوظ رکھا اور مریمؑ کو اسی مصلحت کی بنا پر بغیر شوہر کے بچہ دے دیا تو اس برگزیدہ بی بی کو بھی چونکہ ظرفِ عصمت و امامت تھی، کافر شوہروں سے محفوظ رکھا اور حضورؐ رسالتمآبؐ ہی اس کے پہلے شوہر تھے۔ واللہ اعلم لہٰذا اس عقیدہ کے خلاف روایات کی تاویل کی جائے گی۔

۴ خاتونِ دوجہاں حضرت فاطمہ زہرا بنت ختم الرسل سلام اللہ علیہا

ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ مخدومہ عالمین کی تمام عورتوں سے افضل و اشرف تھیں اور کتب شیعہ و سنی میں یہ روایت متواتر ہے کہ جنت کی تمام عورتوں کی یہ سردار ہیں خواہ وہ اولین سے ہوں یا آخرین سے ہوں اور ان کی عظمت و جلالت شان کے لئے صرف آیتِ تطہیر ہی کافی و وافی ہے اور تمام روایات شیعہ و سنی میں موجود ہے کہ آیتِ تطہیر کے نزول کے چھ ماہ بعد یا نو ماہ بعد تک جناب رسالتمآبؐ جب اس دروازہ سے گزرتے تھے تو آیتِ تطہیر کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور روایات میں ہے کہ جب آپ باپ کے گھر تشریف لاتی تھیں تو حضورؐ اٹھ کھڑے ہوتے تھے حدیث شریف میں ہے آپ نے فرمایا اَلَا اِنَّ فَاطِمَةَ بَضْعَةٌ مِّنِّیْ کہ فاطمہ میرا ٹکڑا ہے مَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔ ان کے فضل و شرف پر احادیث بکثرت موجود ہیں بنابریں بعض علماء نے ان کو سابق انبیاء سے بھی افضل کہا ہے بہرکیف جنت میں کوئی بھی نہیں جا سکتا جب تک اس پاک بی بی کی ولاء نہ رکھتا ہو اور جس پر یہ بی بی ناراض ہو وہ جنت کی بو تک نہیں پا سکتا پس شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ یہ مخدومہ طاہرہ و مطہرہ کی رجس و کثافت سے پاک و صاف تھیں اور آیتِ تطہیر کی رو سے معصومہ تھیں۔ نیز جملہ نسوانی آلائشوں سے مبرا و منزہ تھیں اور اسی وجہ سے ان کا لقب بتول ہے۔

۵ جناب عالمہ غیر معلمہ حضرت زینب بنت علی سلام اللہ علیہا

ائمہ کے طور پر اس پک

خاتون کا ذکر کرنا ضروری تھا بلکہ شاید میری کتاب ناقص ہی رہتی اگر اس مخدرۂ محسنۂ اسلام
کا پاک ذکر زیب قرطاس نہ ہوتا۔ حضرت سجادؑ نے ان کو عالمۂ غیر معلمہ کا لقب دیا تھا
اس بی بی کی عظمت شان اس سے ظاہر ہے کہ اس کا نام جناب رسالتمآبؐ نے باذن
پروردگار تجویز کیا تھا اگر اس مخدومہ کا نام پنجتن پاک کے ناموں کا مخفف سمجھا جائے مثلاً
ز سے زہراؑ ی سے علیؑ ن سے حسنینؑ اور ب سے نبیؐ گویا یہ مخدومہ اپنے کردار سے
ان پانچوں کی مظہر تھیں مقام تبلیغ میں محمدؐ کی شان مقام خطبہ میں علیؑ کا لہجہ پردہ داری میں
بتول معظمہ کی سی عفت کہ سامنے چند قدموں کے فاصلہ پر حسینؑ سا بھائی ذبح ہو گیا اور
قدم دروازہ سے باہر نہ آیا اور مقام صبر و رضا میں حسنؑ و حسینؑ کا کردار ان سے نمایاں تھا
اگر گنجائش ہوتی تو اس بی بی کی عظمت شان کے چند فقرے اور بھی بڑھائے جاتے لیکن
اختصار کے پیش نظر خیالات و جذبات کو محدود کر رہا ہوں۔ اگر اس مخدومہ کے نام کو
مرکب اضافی کیا جائے کہ زین اب سے ہے تو خدا گواہ ہے۔ جس طرح اس ہستی نے
اس نام کی لاج رکھی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے واقعی یہ بی بی اپنے باپ کی بلکہ نانا کی
کی بھی زینت تھی اور اس کے دم سے آج تک اسلام میں دم ہے میں اپنے عقیدہ سے کہتا
ہوں کہ حسینیت لاج ہے نبوت کی اور زینب لاج ہے حسینیت کی جس طرح طاغوتی استبدادی
اور طاغوتی قوتیں قندیل اسلام کو بجھا چلی تھیں اور حسینؑ نے ان کے سامنے کوہ گراں بن کر
باطل کے طوفانی دھارے کا منہ موڑ دیا اسی طرح وہی طاقتیں حسینیت کو دبانے کے لئے
ہر زمانہ میں کوشاں ہوئیں اور حسینؑ کو معاذاللہ باغی کہہ کر اور اس سانحۂ عظمیٰ کو واقعۂ پارینہ بتا کر
نسیاً منسیاً کرنے کے لئے بے تاب رہیں لیکن اس مخدومہ کے بازاروں اور درباروں کے خطبات
اور فصاحتی بیانات نے سب پر پانی پھیر دیا اور حسینیت کے پرچم کو بلند کر کے اس کی زندگی
کی حدوں کو قیامت سے متصل کر دیا۔ اے مخدومۂ طاہرہ ہم تیرے غلام تیری بارگاہ میں دست
بستہ سلام عرض کرتے ہیں اور تجھے اسلام کی محسنہ سمجھتے ہوئے تیرے دامن فیض سے وابستہ
ہو کر تیری ولاء کی بدولت خدا سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے نجات کے امیدوار ہیں
اے مخدومہ تیرے اوپر تیرے بھائیوں پر تیرے باپ و نانا پر تیری والدہ ماجدہ پر نیز تیرے
سارے ستم سہے ہوئے ساتھیوں پر ہم جاں نثار شیعوں کا سلام ہو اس مخدومہ کی عظمت شان کی اس سے
بڑھ کر اور کیا دلیل ہو گی کہ ایک وقت تک امام حسینؑ کے بعد یہ بی بی حجۃ امامت کی سربراہ رہیں

بنا بریں اس بی بی کو معصومہ کہنا بھی بجا ہے۔

اصحاب نبی کے متعلق عقیدہ

جناب رسالتمآبؐ کے باوفا صحابہ کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ یقیناً جنتی ہیں اور باقی مسلمانوں سے پہلے وہ جنت کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے مشکلات و مصائب میں حضورؐ کا ساتھ دیا اور اسلام کی غربت کے وقت اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے بے شک وہ لوگ ہمارے محسن ہیں اور ہماری طرف سے جزائے شکر کے مستحق ہیں پس جس قدر صحابہ حضورؐ کے حین حیات مختلف جنگوں میں جامِ شہادت پی کر چل بسے یا کلمہ حق پر جن کی وفات ہوئی وہ یقیناً ناجی ہیں۔ ہاں حضورؐ کی رحلت کے بعد جو صحابہ موجود تھے اگر وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے تو یقیناً جنتی ہوں گے اور ہم ایسے صحابہ کے خادم و نوکر ہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے رسولؐ کی اولاد کو نشانۂ ظلم بنایا اور افتخار کا پندار کی خاطر رسولؐ کی اکلوتی دختر جناب فاطمہ زہراؑ کو ناراض کیا جس کے متعلق حضورؐ کا فرمان تھا کہ یہ میرا ٹکڑا ہے جس نے اس کو ناراض کیا۔ گویا اس نے مجھے ناراض کیا تو ایسے لوگ یقیناً رسول پر ظلم کرنے والے ہیں۔ بس دشمنانِ آلِ رسولؐ سے ہم بیزار ہیں ان کی صحابیت کا احترام اس حد تک ہے جب تک ان سے آلِ محمدؐ کی مخالفت سرزد نہ ہو جنہوں نے آلِ محمدؐ کی پرواہ نہ کر کے رسولؐ کے صریح فرمانوں کو ٹھکرا دیا ہم ایسوں کی پرواہ نہیں کرتے اور رسولؐ کی آل کے دشمنوں کو ہم کسی صفت پر اچھا کہنے کو تیار نہیں ہیں۔ لہٰذا جو لوگ شیعوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ شیعہ صحابہ کو نہیں مانتے بالکل اور سراسر غلط ہے اور شیعوں پر بہتان عظیم ہے ہمارے نزدیک وہ شیعہ نہیں ہے جو صحابہ رسولؐ کا دشمن ہے لیکن صحابی وہ ہے جو رسولؐ کی زندگی میں رسولؐ کا وفادار ہو اور ان کے بعد ان کی عترت و آل پر ظلم نہ کرے۔

بخاری شریف کتاب المغازی باب غزوہ حدیبیہ — ترجمہ مرزا حیرت دہلوی حدیث ۱۲۱۹

عن العلاء بن المسیب عن ابیه قال لقیت البراء بن عازب فقلت طوبی لک صحبت النبی ﷺ وبایعته تحت الشجرة فقال یا ابن اخی انک لا تدری ما احدثنا بعده

علاء بن مسیب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں میں نے براء بن عازب سے مل کر کہا تم کو مبارک ہو کہ تم رسولؐ کی صحبت میں رہے اور آنحضرت سے درخت کے نیچے بیعت کی [illegible]

بنابریں اس بی بی کو معصومہ کہنا بھی بجا ہے۔

اصحابِ نبی کے متعلق عقیدہ

جناب رسالتمآب کے باوفا صحابہ کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ یقیناً جنتی ہیں اور باقی مسلمانوں سے پہلے وُہ جنت کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے مشکلات و مصائب میں حضورؐ کا ساتھ دیا اور اسلام کی غربت کے وقت اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے بے شک وہ لوگ ہمارے محسن ہیں اور ہماری طرف سے جزائے شکر کے مستحق ہیں پس جس قدر صحابہ حضورؐ کے حینِ حیات مختلف جنگوں میں جامِ شہادت پی کر چل بسے یا کلمہ حق پر جن کی وفات ہوئی وہ یقیناً ناجی ہیں۔ ہاں حضورؐ کی رحلت کے بعد جو صحابہ موجود تھے اگر وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے تو یقیناً جنتی ہوں گے اور ہم ایسے صحابہ کے خادم و نوکر ہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے رسولؐ کی اولاد کو نشانۂ ظلم بنایا اور اقتدارِ ناپائیدار کی خاطر رسولؐ کی اکلوتی دختر جناب فاطمہ زہرا کو ناراض کیا جس کے متعلق حضورؐ کا فرمان تھا کہ یہ میرا ٹکڑا ہے جس نے اس کو ناراض کیا۔ گویا اس نے مجھے ناراض کیا تو ایسے لوگ یقیناً رسول پر ظلم کرنے والے ہیں۔ پس دشمنانِ آلِ رسولؐ سے ہم بیزار ہیں ان کی صحابیت کا احترام اس حد تک ہے جب تک ان سے آلِ محمدؐ کی مخالفت سرزد نہ ہو جنہوں نے آلِ محمدؐ کی پرواہ نہ کرکے رسولؐ کے صریح فرمانوں کو ٹھکرا دیا ہم ایسوں کی پرواہ نہیں کرتے اور رسولؐ کی آل کے دشمنوں کو ہم کسی قیمت پر اچھا کہنے کو تیار نہیں ہیں۔ لہٰذا جو لوگ شیعوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ شیعہ صحابہ کو نہیں مانتے بالکل اور سراسر غلط ہے اور شیعوں پر بہتانِ عظیم ہے۔ ہمارے نزدیک وہ شیعہ نہیں ہے جو صحابہ رسولؐ کا دشمن ہے لیکن صحابی وُہ ہے جو رسولؐ کی زندگی میں رسولؐ کا وفادار ہو اور ان کے بعد ان کی عترت و آلِ اطہر غلام ہو۔

بخاری شریف کتاب المغازی باب غزوۂ حدیبیہ

ترجمہ مرزا حیرت دہلوی حدیث ۱۳۱۶

عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ لَقِيتُ الْبَرَاءَ بْنَ الْعَازِبِ فَقُلْتُ طُوبَى لَكَ صَحِبْتَ النَّبِيَّ وَبَايَعْتَهُ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَقَالَ يَا ابْنَ أَخِي إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثْنَا

علاء بن مسیب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں میں نے براء بن عازب سے مل کر کہا تم کو مبارک ہو کہ تم رسولؐ کی صحبت میں رہے اور آنحضرت سے درخت کے نیچے بیعت کی (اور غزوہ) [illegible]

بَعْدَهٗ

انہوں نے جواب دیا اے بھتیجے تمہیں معلوم نہیں ہم نے رسولِ خدا کے بعد کیا کیا خرابیاں کی ہیں۔

وَفِي تَفْسِيرِ سُوْرَةِ الْمَائِدَةِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي حَدِيثٍ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ إِنَّ أَوَّلَ الْخَلَائِقِ إِبْرَاهِيمُ أَلَا وَأَنَّهُ يُجَاءُ بِرِجَالٍ مِنْ أُمَّتِي فَيُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَأَقُوْلُ يَا رَبِّ أَصْحَابِي فَيُقَالُ إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ (إلى ان قال) فَيُقَالُ إِنَّ هٰؤُلَاءِ لَمْ يَزَالُوا مُرْتَدِّيْنَ

ترجمہ حدیث ۱۰۲۸ ابن عباس سے اس حدیث کے ذیل میں ہے کہ آپ نے فرمایا سب سے پہلے ابراہیمؑ کو کپڑے پہنائے جائیں گے۔

اور ہوشیار ہو کہ چند آدمی میری اُمت کے لائے جائیں گے اور فرشتے ان کو دوزخ کی طرف لے جائیں گے اس وقت میں کہوں گا اے ربّ یہ تو میرے صحابی ہیں (اللہ کی جانب سے) ندا کسے گی تو نہیں جانتا۔ انہوں نے تیرے بعد کیا کیا کیا۔ "یہاں تک کہ فرمایا" پھر اللہ کی طرف سے ندا ہوگی کہ یہ لوگ تیرے (محمدؐ کے) جُدا ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے

وَفِيهِ فِي كِتَابِ الْفِتَنِ عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللهِ قَالَ النَّبِيُّ أَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ لَيُرْفَعَنَّ إِلَيَّ رِجَالٌ مِنْكُمْ حَتّٰى إِذَا أَهْوَيْتُ لِأُنَاوِلَهُمْ اخْتُلِجُوا دُوْنِي فَأَقُوْلُ أَيْ رَبِّ أَصْحَابِي فَيَقُوْلُ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ

ترجمہ بخاری مرزا حیرت ج ۳ حدیث ۱۹۳۲ عبداللہ (ابنِ مسعود) سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا میں حوض (کوثر) پر تمہارا پیش خیمہ ہوں گا اور تم میں سے چند لوگ میرے پاس لائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب میں ان کو (کوثر کا پیالہ) دینا چاہوں گا تو وہ لوگ میرے پاس سے کھینچ لئے جائیں گے میں عرض کروں گا اے پروردگار (یہ لوگ تو) میرے اصحابؓ ہیں خدا تعالیٰ فرمائے گا۔ تم نہیں جانتے ہو۔

کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا بدعتیں
کی ہیں۔

پہلی حدیث کے ترجمہ میں مترجم نے صحابہ سے بھار ہلکا کرنے کے لئے بریکیٹ دے کر عجز و انکساری کی راہ نکال لی لیکن پچھلی دو نو حدیثوں میں یہ راہ پیدا نہ ہو سکی، کیونکہ نہ ان کو دوزخ میں لے جایا جانا ان کی انکساری ہے نہ ان کا مرتد ہونا انکساری کی بنا پر ہے اور نہ حوض کوثر سے کھینچ لیا جانا ازراہِ انکساری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے بعد جو صحابہ کرامؓ آنحضورؐ کی تعلیمات پر ثابت قدم رہے۔ ان کی خاکِ پا ہمارے لئے سرمۂ چشم ہے لیکن احادیثِ بخاری و دیگر کتب سیر و تاریخ کی روایات کے پیشِ نظر جو لوگ دینِ محمدیؐ پر ثابت نہ رہ سکے ہم ان سے بے زار ہیں اب ہر شخص کتب کی دیکھ بھال کے بعد خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ کون ثابت قدم رہا اور کون مرتد ہوا؟ ہم سب کی یکسانیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ قانونِ اسلام کی رُو سے جو نیک ہو اس کو نیک سمجھتے ہیں اور جو بد ہو اس کو بد سمجھنا اپنا ایمان جانتے ہیں پس جو رسولؐ و آلِ رسولؐ کا وفادار ہو اسے وفادار سمجھتے ہیں اور جو اس راہ سے ہٹ گیا ہو ہم اس سے ہٹ جانا ایمان سمجھتے ہیں۔ ہم نیک و بد کو قطعاً ایک جیسا کہنے کو تیار نہیں بلکہ ظالم کو ظالم سمجھتے ہیں اور مظلوم کو مظلوم جانتے ہیں۔ جب کہ خود جناب رسالتمآبؐ اپنے سب صحابہ کو برابر نہیں سمجھتے تھے چنانچہ موطا امام مالک باب شہداء میں ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے شہدائے احد کی تعریف کی تو حضرت ابوبکر نے عرض کی حضورؐ ہم نے بھی تو جہاد کیا اور ان کے ساتھ برابر کے شریک رہے آپ نے فرمایا تمہیں کیا معلوم میرے بعد کیا کیا بدعتیں کرو گے۔ (یعنی میرے سامنے کی دینداری کافی نہیں جب تک کہ میرے بعد رہ کر وفا شعاری کا مظاہرہ نہ کرو)

آلِ رسولؐ سے سلوک

اس میں ذرا بھر شک نہیں کہ توقع کے بعد آنے والی بڑی سے بڑی مصیبت آسانی سے برداشت کی جایا کرتی ہے لیکن امن کی رشک آور گھڑیوں میں چند لمحات بسر کرنے کے بعد معمولی سے معمولی مصیبت کا ادنیٰ جھٹکا بھی ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور سدا بہار گلشن کا یکبارگی خزاں کے منہ میں آجانا کسی بھی صاحبِ دل باغبان سے برداشت نہیں

کیا جا سکتا۔ اندازہ کیجئے جس دروازہ پر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کا سلطان پہنچ کر آیۂ تطہیر پڑھے بغیر آگے نہ بڑھے جس آستانِ مقدس سے ملائکہ کو خیرات ملتی ہو جس بارگاہ میں دربان جنت رضوان کی بجائے درزی کہلانا فخر محسوس کرتے ہوں۔ جس چوکھٹ کا جبرئیل جیسے سیّد الملائکہ سلام کریں جو مقام قدسیوں کی جبہ سائی کا مرکز ہو جس بی بی کی آسیہ گردانی فرشتوں کے لئے مایۂ افتخار ہو جس بی بی کی کنیزی ازواج انبیاء کے لئے باعثِ ناز ہو۔ جس بی بی کا حورانِ جنّت طواف کرتی ہوں اور جس بی بی کا سیّد الانبیاء جیسا باپ احترام کرتا ہو کون جانتا تھا کہ اسی دروازہ کو جلانے کی دھمکیاں وہی لوگ دیں گے جنہوں نے کل تک اپنے رسولؐ کو اسی دروازہ پر احترام کے لئے رکا ہوا دیکھا تھا۔ کیا خبر تھی کہ اسی آستانہ عالیہ کی بے حُرمتی کے لئے وہی لوگ اُٹھیں گے جو کل تک ملائکہ کو اترتا ہوا دیکھتے رہے کس کے تصوّر میں یہ بات تھی کہ اس بی بی کا احترام بھلا دیا جائے گا جس کے احترام کے لئے خاتم الانبیاء کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ میں کس زبان سے کہوں کہ زمانے نے کس طرح پلٹا کھایا اور کیسے کہوں کہ اُمّت کے ہاتھوں نبی زادی نے کیا کیا دیکھا خدا جانتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے دل دھڑکتا ہے جگر کانپتا ہے آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں ہاتھ لرزتا ہے اور بدن تھرّاتا ہے۔ کہ سدا بہارِ گلشن نبوّت کو کس طرح خزاں نے گھیرا نہ زمین پھٹی نہ آسمان گرا اور نہ اہلِ اسلام کے دلوں پر ذرہ بھر اثر ہوا جب ملکہ شرافت سرمایۂ نبوّت خواتینِ جنّت کی مخدومہ حورانِ فردوس کی شہزادی سیدالانبیاء کی اکلوتی پیاری بیٹی دعویٰ فدک کے خارج ہو جانے کے بعد روتی ہوئی واپس پلٹیں۔ ہم اگر شیعہ کتب سے کچھ لکھیں تو اسے مبالغہ سمجھا جائے گا آخر اس قدر اذیت تو دی گئی کہ پیکر تسلیم ورضا کی زبانی بے ساختہ یہ الفاظ نکلے جن کو کتبِ سیر نے ابھی تک محفوظ رکھا ہوا ہے اور وہ ابدالآباد تک مخدومۂ دو عالم کی ناقابلِ برداشت تکالیف کی ترجمانی کرتے رہیں گے

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّهَا	میرے اوپر مصائب اس طرح برسے کہ اگر وہ مصائب
صُبَّتْ عَلَى الْاَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا	دنوں پر برستے تو وہ سیاہ راتوں سے تبدیل ہو جاتے

میں اُمّت کی جفا شعاری صحیح بخاری کی زبان سے پیش کرتا ہوں چنانچہ کتاب الخمس میں حضرت عائشہ روایت فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہؑ بنت رسولؐ نے رسولؐ کی وفات

کے بعد حضرت ابوبکر سے رسول اللہ کے مال فیٔ سے بچے ہوئے حصّہ کی وراثت کا سوال کیا تو ابوبکر نے جواب دیا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوا کرتا ہے اس کا جو اثر ہوا وہ بخاری کے الفاظ میں یہ ہے۔

فغضبت بنت رسول اللہ فھجرت ابا بکر فلم تزل مھاجرتہ حتی توفیت وعاشت بعد رسول اللہ ستۃ اشھر الخ

پس فاطمہؑ بنت رسولؐ اللہ ناراض ہو گئیں اور ابوبکر سے قطع کلامی (بائیکاٹ) کر لی اور یہ بائیکاٹ ہمیشہ رہی یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی اور رسولؐ اللہ کے بعد کل چھ ماہ زندہ رہیں۔

باب غزوہ خیبر میں اس سے بھی زیادہ وضاحت موجود ہے حضرت عائشہ ہی روایت فرماتی ہیں۔

فابی ابوبکر ان یدفع الی فاطمۃ منھا شیئا فوجدت فاطمۃ علی ابی بکر فی ذلک فھجرتہ فلم تکلمہ حتی توفیت وعاشت بعد النبی ستۃ اشھر فلما توفیت دفنھا زوجھا علی لیلا ولم یؤذن بھا ابا بکر وصلی علیھا وکان لعلی من الناس وجہ حیاۃ فاطمۃ فلما توفیت استنکر علی وجوہ الناس

پس ابوبکر نے فاطمہؑ کو اس میں سے کچھ بھی دینے سے صاف انکار کر دیا، چنانچہ فاطمہؑ ابوبکر پر اس بارے میں ناراض ہو گئیں پس ان سے بائیکاٹ کر لی اور قطع کلامی کر لی یہاں تک کہ وفات پا گئیں اور کل چھ ماہ نبی علیہ السلام کے بعد زندہ رہیں پس جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے شوہر حضرت علیؑ نے ان کو رات کے وقت دفن کیا۔ اور ابوبکر کو شرکت کی اجازت نہ دی اور جنازہ خود ہی پڑھا اور لوگوں میں علیؑ کا رنگ فاطمہؑ کی زندگی تک ہی تھا پس جب وہ فوت ہوئیں تو لوگوں کے رخ علیؑ سے پھر گئے۔

مترجم بخاری مرزا حیرت دہلوی اردو ترجمہ میں حدیث ۱۲۰۶ کے حاشیہ پر اس طرح لکھتا ہے: حضرت فاطمہؑ کا دعویٰ کرنے پر باغ کے وراثت تھا ان کو یہ حدیث معلوم نہ تھی

کہ انبیاء کو قبضہ مالکانہ نہیں ہے نہ وہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ان کا کوئی وارث ہو سکتا ہے اس میں کوئی عجب نہیں ہو سکتا کہ فاطمہ زہرا کو اس حدیث سے واقفیت نہ تھی بہت سے امور خانہ داری کے معاملہ میں جو ازواج کو علم تھا غیر کو نہ تھا پس حضرت فاطمہ کو جب اس کا اطمینان ہو گیا تو حضرت ابوبکر سے راضی ہو گئیں اور قطعی طور پر کا ناراض ہونا کوئی موجب نقصان نہیں۔

اب ذرا بخاری شریف سے جناب فاطمہ کی منزلت ملاحظہ ہو اب مناقب قرابت رسول میں ہے

قَالَ النَّبِيُّ فَاطِمَةُ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ قَالَ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي فَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبَنِي

نبی نے فرمایا فاطمہ جنت میں جانے والی عورتوں کی سردار ہے مسور بن مخرمہ سے مروی ہے کہ تحقیق رسول اللہ نے فرمایا فاطمہ میرا پارہ گوشت ہے جو اسے ناراض کرے گا اس نے مجھے ناراض کیا۔

مترجم بخاری مرزا حیرت پر حیرت ہے کہ اس نے مسلمان کہلانے کے باوجود بانی اسلام کی شہزادی کو جہالت کی طرف بے باکانہ طور پر منسوب کرنے میں ذرا بھر شرم محسوس نہ کی کہتا ہے (عجب نہیں کہ فاطمہ کو اس حدیث سے واقفیت نہ تھی، بہت سے امور خانہ داری کے معاملہ میں جو ازواج کو علم تھا غیر کو نہ تھا) یہ اس کے اسم باسمٰی متحیر ذہن کا ہی نتیجہ ہے کہ مثال دے کر تطبیق نہ کر سکا مثال تشکیک ہے کیونکہ جن لوگوں کا جن مسائل سے خاص تعلق ہوا کرتا ہے ان مسائل میں انہی کو زیادہ واقفیت ہونی چاہیے چونکہ امور خانہ کا تعلق ازواج سے تھا لہذا حضور نے ازواج کو انہی مسائل کی خاص طور پر رہبری فرمائی نہ ان مسائل کو صحابہ سے تعلق تھا نہ ان سے بیان کئے بلکہ بعض شوہر و بیوی کے مخصوص مسائل کا علم صرف بیوی تک ہی محدود رہتا ہے اور دوسری عورتوں تک پہنچانا ان کا کام ہوتا ہے۔

حیرت نے یہ سوچ نہ کی کہ انبیاء کے قبضہ مالکانہ کی نفی کا تعلق متعلقہ وارثوں سے تھا نہ کہ صحابہ سے لہذا وصیت میں علی و فاطمہ کو تنبیہ کرنی چاہیے تھی کہ دیکھو میری وراثت کوئی نہیں لہذا کسی سے اس بارے میں مت جھگڑنا یہ تو اس طرح ہے گا کہ مسئلہ کا تعلق امور خانہ داری سے ہو اور سمجھایا صرف مردوں کو جائے۔ یقین جانیے کہ جس حیرت کو آپ نساد

جنّت کی سردار کا لقب دے رہے تھے اگر ان کو آپ اپنی وراثت سے محروم کرتے تو وہ صبر و ضبط سے کام لے کر سرِ تسلیم خم کر لیتیں کیونکہ ان کی حیثیت عام عورتوں کی سی نہیں تھی کہ وہ اس باب میں اصرار کرتیں اور سمجھ نہیں آتی کہ بالفرض اگر حضورؐ نے ابوبکر کو ہی بتانا تھا تو بی بی کو اس کے صدیق ہونے کی بناء پر مان لینا چاہیئے تھا معلوم ہوا کہ یہ صرف ڈھکوسلا تھا اور ترکۂ رسولؐ پر ہاتھ صاف کرنے کا بہانہ تھا اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

قرآن مجید جب صاف اعلان کرتا ہے۔ وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ حضرت سلیمانؑ داؤد کا وارث ہوا۔ حضرت زکریاؑ نے اپنے لئے وارث کی دعا مانگی۔ نیز تقسیم وراثت میں قرآن مجید نے نبی و غیر نبی کا ہرگز فرق نہیں کیا اور یہ سب قرآنی فیصلے بی بی کے گواہ ہیں اور فخر الدین رازی نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے بعض لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ قرآن میں نبیوں کی وراثت کا جہاں ذکر ہے وہاں وراثتِ علمی مراد ہے نہ کہ ترکۂ مالی تو اس کے کئی جواب ہیں۔

① علم میں وراثت باطل ہے کیونکہ علم اگر وراثت سے ملتا تو کسی نبی کا بیٹا بے علم اور جاہل نہ رہتا پھر تمام دنیا والے علماء ہوتے کیونکہ سب اولادِ نبی ہیں۔

② اگر حضرت سلیمانؑ داؤدؑ کے علم کے وارث تھے تو مجھے بتائیں کہ داؤدؑ کا خانگی سامان اور دولتِ ملکی سلیمان کی طرف کیوں منتقل ہوئی اس کو غرباء اور مساکین میں تقسیم ہو جانا چاہیئے تھا حالانکہ کسی نبی کی جائیداد مالی کو عام تقسیم کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

③ اگر یہ درست ہے تو حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ کے خانگی سامان کو کن لوگوں میں تقسیم کیا گیا؟ اگر حضرت رسالتمآبؐ کی تربیت اسی گھر میں ہوئی جو حضرت عبداللہ کا تھا تو معلوم ہوگا کہ نبی وارث ہوتے ہیں لہٰذا نبی زادے یا نبی زادیاں بھی اپنے باپ نبی کے وارث ضرور ہوں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بی بی نے ان لوگوں کے اسلام کی قلعی کھول دی کیونکہ جب حضورؐ آخر وقت میں کچھ لکھنا چاہتے تھے تو کہہ دیا گیا تھا۔ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے اب جو بی بی نے وراثت کا سوال اٹھا کر کتاب اللہ کے فیصلے پیش کئے اور قانونِ وراثتِ قرآنی کو سامنے رکھا تو قرآن سے حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے کہنے لگے رسولؐ کا فرمان ہے کہ ہم کسی کے وارث نہیں ہوتے اور نہ ہمارا کوئی وارث

ہوتا ہے گویا اسلام ایک کھلونا ہے کہ قرآن کو کافی کہنے سے وقت نکلتا ہے تو قرآن کو کافی کہہ دیا اور اگر قرآن مخالف پڑتا ہے تو حدیث کی گرہ لگا کر مطلب نکال لیا۔

مرزا حیرت کہتا ہے کہ اطمینان ہو جانے کے بعد رضامند ہو گئیں اور حکومتِ وقت یہ واقتدار پرست طبقہ اب تک یہی رٹ لگاتا پھرتا ہے کہ بی بی راضی ہو گئیں حتاکہ رازی نے بھی جواب نہ بن پڑنے پر بلا ثبوت کہہ دیا کہ تب وہ راضی ہو گئیں تھیں ادھر روایت بخاری میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مرتے دم تک ناراض رہیں۔ قطع کلامی کو جاری رکھا اور دفن بھی رات کو کی گئیں اور حد یہ کہ ابوبکر کو دفن وجنازہ میں شامل بھی نہ کیا گیا۔ اب خود ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ لوگ سچے ہیں جو حکومت وقت کی وکالت کرتے ہوئے بی بی کی رضامندی کا اعلان لئے پھرتے ہیں یا وہ جسے صدیقہ کہا جاتا ہے سچی ہے کہ تادم آخر ناراضگی برقرار رہی حتاکہ شمولیت جنازہ کی اجازت بھی نہ دی گئی۔

مفتی محمد عبدہ نے دیکھا کہ بی بی کی رضامندی کا اعلان ناقابلِ قبول ہے کیونکہ حدیثیں اس تاویل کو قبول نہیں کرتیں تو اس نے تفسیر منار ج ۱۰ امداد رسول کے بیان کے ذیل میں کہہ دیا کہ چونکہ ناراضگی کا سبب غلط فہمی تھی۔ لہٰذا ان کی اس بلا وجہ ناراضگی کا ابوبکر پہ کوئی اثر نہیں پڑتا وہ اپنے مقام پر سچا تھا اور یہ اپنے مقام پر صدیقہ تھیں اور بات ویسے کی ویسی اور مرزا حیرت نے اسی کا اگلا بڑا لقمہ چبانا شروع کر دیا چنانچہ رضامندی کا اعلان کرنے کے بعد آخر میں جوڑ لگا دیا کہ بلا وجہ کافی ناراض ہونا۔ موجبِ نقصان نہیں ہے ادھر حدیث میں ہے کہ جس نے بی بی کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا تو چونکہ بفرمانِ پیغمبر بی بی کی ناراضگی حضورؐ کی ناراضگی ہے تو مرزا حیرت کی بات کا مطلب یہ ہوا کہ رسولؐ کا کافی ناراض رہنا بھی نقصان دہ نہیں ہے (العیاذ باللہ)

چونکہ بی بی کے حق پہ پردہ ڈالنے کے لئے عموماً بی بی کی رضامندی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے لہٰذا اس رضامندی کا قصہ ایک دوسرے اہلسنت کے مشہور محدث علامہ ابن قتیبہ دینوری کی زبانی کتاب الامامۃ والسیاسۃ سے سنئے کہ جب حضرت ابوبکر وحضرت عمر معافی لینے کے لئے درِ دولت پر حاضر ہوئے (اوّل ان دونو کا معافی طلب کرنے کے لئے جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کوئی حدیث نہیں تھی۔ بلکہ سیاسی چال تھی اپنی غلطی بخشانے گئے ورنہ اگر اپنے مقام پر مطمئن ہوتے تو معافی مانگنے کے لئے جاتے

کیوں اور وہاں روتے کیوں ؟

فَلَمَّا قَعَدَا عِنْدَهَا حَوَّلَتْ وَجْهَهَا اِلَى الْحَائِطِ فَلَمَّا سَلَّمَا عَلَيْهَا فَلَمْ تَرُدَّ عَلَيْهِمَا السَّلَامَ

جب یہ دونو قریب جا کر بیٹھے تو بی بی نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ انہوں نے سلام کیا تو بی بی نے ان کو جواب سلام بھی نہ دیا۔

پھر بی بی نے اپنی میراث کے متعلق سوال کیا

مَا بَالُكَ اَسْرَتُكَ اَهْلُكَ وَلَا نَرِثُ مُحَمَّدًا

کیا بات ہے تیرے بچے تیرے وارث ہوں اور ہم محمدؐ کے وارث نہیں ؟ وہ گویا معافی مانگنے کے لئے گئے ہیں لیکن بات وہی کی وہی ہے۔

اَرَأَيْتُكُمَا اِنْ حَدَّثْتُكُمَا حَدِيْثًا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ تَعْرِفَانِهِ وَتَفْعَلَانِ بِهِ قَالَا نَعَمْ فَقَالَتْ نَشَدْتُكُمَا اللّٰهَ اَلَمْ تَسْمَعَا رَسُوْلَ اللّٰهِ يَقُوْلُ رِضَا فَاطِمَةَ مِنْ رِضَايَ وَسُخْطُ فَاطِمَةَ مِنْ سُخْطِيْ فَمَنْ اَحَبَّ فَاطِمَةَ ابْنَتِيْ فَقَدْ اَحَبَّنِيْ وَمَنْ اَرْضَى فَاطِمَةَ فَقَدْ اَرْضَانِيْ وَمَنْ اَسْخَطَ فَاطِمَةَ فَقَدْ اَسْخَطَنِيْ قَالَا نَعَمْ سَمِعْنَاهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَالَتْ فَاِنِّيْ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ اِنَّكُمَا اَسْخَطْتُمَانِيْ وَمَا اَرْضَيْتُمَانِيْ وَلَئِنْ لَقِيْتُ النَّبِيَّ لَاَشْكُوَنَّكُمَا اِلَيْهِ۔

پھر فرمایا کیا تم کو میں جناب رسالتمآب کی حدیث سناؤں جسے تم جانتے ہو تو عمل کرو گے۔ کہنے لگے ہاں! بی بی نے فرمایا تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتی ہوں کیا تم نے رسالتمآب سے نہیں سنا کہ فاطمہؑ کی رضا میری رضا ہے اور فاطمہؑ کی ناراضگی میری ناراضگی ہے جس نے میری لڑکی فاطمہؑ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی جس نے فاطمہؑ کو راضی کیا اس نے مجھے راضی کیا اور جس نے فاطمہؑ کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا ؟ ان دونو نے کہا واقعی ہم نے حضورؐ سے سنا ہے تو بی بی نے فرمایا میں اللہ اور اس کے فرشتوں کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ تم دونو نے مجھے ناراض کیا ہے ؟ راضی نہیں کیا اور اگر میں نبی علیہ السلام سے ملوں گی تو تم

دوزخ کی شکایت کروں گی۔

یہ سُن کر حضرت ابوبکر رونے لگ گئے اور سخت روئے اور بی بی آخر تک یہی فرماتی رہیں کہ :-

وَاللّٰهِ لَاَدْعُوَنَّ اللّٰهَ عَلَيْكَ فِيْ كُلِّ صَلَاةٍ اُصَلِّيْهَا ثُمَّ خَرَجَ بَاكِيًا (الخبر)

خدا کی قسم میں ہر نماز کے بعد تیرے اُوپر بد دعا کرتی رہوں گی اور وُہ روتا ہوا باہر چلا گیا۔

آخر میں مَیں اپنے عقیدہ کو پھر دہراتا ہوں کہ شیعوں پر یہ الزام لگانا کہ شیعہ صحابۂ رسولؐ کو نہیں مانتے اتہام عظیم اور بہتان صریح ہے بلکہ شیعہ مذہب کی رُو سے صحابۂ رسول کی عزت کرنا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا واجب ہے جس کے دل میں صحابہ کی عزت نہیں گویا اس کے دل میں رسول کی عزت نہیں لیکن بشرطیکہ صحابی ایسے ہوں جو رسولؐ کی زندگی میں رسولؐ کے وفادار رہے ہوں اور ان کے بعد ان کی فرمان کے قدردان اور ان کی آل کے تابع فرمان رہے ہوں۔ ہم صرف ان لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جنہوں نے طوطے کی طرح صحابیت کا لباس اوڑھ کر شجرۂ نبوت و رسالت کو کاٹا اور آلِ محمدؐ کو ستایا گویا ہم صحابہ سے بیزار نہیں ہیں۔ بلکہ دشمنانِ رسولؐ و آلِ رسولؐ سے بیزار ہیں خواہ کفر و شرک کے لباس میں انہوں نے دشمنی کی ہو یا طوطے کی طرح صحابیت کے رنگ میں دشمنیٔ آلِ رسولؐ کا بیج بویا ہو۔

خدا کی قسم ہمارے دلوں میں سلمانؓ کی عزت صرف صحابیت کی وجہ سے ہے عمارؓ، ابوذرؓ، مقدادؓ اور ان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں ہم صحابہ کے غلام ہیں حضرت اویس قرنیؓ جس نے اپنی آنکھوں سے رسولؐ کو دیکھا بھی نہیں تھا لیکن ہم ان کے بھی غلام ہیں رسولؐ تو بجائے خود ہم تو علیؑ و اولادِ علیؑ جو آئمہ ہیں ہم ان کے صحابہ کے بھی غلام ہیں۔ ہمارا تو دین ہی صحابہ کا ہے بس ہم اصول کے پابند ہیں جو صحابی اصول کا پکا۔ ہم اس کے پکے دوست بلکہ غلام اور جس صحابی کا کوئی اصول نہ ہو۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ ہم اس پر صرف صحابیت کے نام سے دھوکا کھانے کو تیار نہیں ہیں۔ ہم پرکھیں گے، کھرے سے محبت کریں گے اور کھوٹے سے علیٰحدگی اختیار کر لیں گے، مذہب کا ہمارا مذہب اور نہ کوئی دینا ہمارا دین ہے جو لوگ ہم کو سب کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ

بھی سب کرتے ہیں۔ ہم آج تک امام حسین علیہ السلام کے صحابہ کی سالانہ یادگار مناتے ہیں کیونکہ جس طرح ہمارے دلوں میں قرآن کی قدر ہے اس کے برابر ہم آلِ رسولؐ کی قدر کرتے ہیں کیونکہ رسولؐ نے ہم کو دو چیزیں بطور امانت دی تھیں اور یہ دونو چیزیں کسی کی اچھائی و برائی کے پرکھنے کے لئے ہمارے پاس مضبوط کسوٹی ہیں یعنی قرآن واہلبیت ہم دونو کے دشمن کو دشمن سمجھتے ہیں۔ اور ان دونو کے دوست کو دوست سمجھتے ہیں

صحابہ امام حسین علیہ السّلام کے متعلق عقیدہ

ہم ویسے تو حضرت رسالتمآبؐ کے تمام وفادار صحابہ کے غلام ہیں اسی طرح حضرت علیؑ و امام حسنؑ و دیگر آئمہ طاہرینؑ کے صحابہ کو بھی ہم احترام واکرام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی خدمات کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں نیز انہیں جزائے شکر کا مستحق سمجھتے ہیں لیکن ان تمام میں سے جو حق وفاداری کا کربلا والوں نے ادا کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا چنانچہ امام مظلوم نے بھی اپنے صحابہ کے متعلق فرمایا تھا کہ میرے صحابہ جیسے کسی کو صحابی نہیں ملے حتاکہ میرے نانا کو بھی ایسے ساتھی نہیں مل سکے خدا جانتا ہے کہ انتہائی نامساعد حالات میں تن من دھن اولاد عزت بلکہ اپنا سب کچھ قربان کر کے آلِ رسولؐ کی نصرت میں انجام سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھتے جانا ان کا ہی کام تھا خدا کے نزدیک ان کے مراتب عالیہ انبیاء کے صحابہ سے بھی بڑھے ہوئے ہوں گے۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ

سادات کے متعلق عقیدہ

میرے اس لفظ میں وہ سب افراد داخل ہیں۔ جن کو اولادِ رسول کہا جاتا ہے اور حضرت امیر علیہ السلام کی وہ اولاد جو جناب بتول معظمہ کے شکم اطہر سے نہیں ہے وہ بھی داخل ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی عزت واحترام واجب ہے اور جو ان کو توہین آمیز نگاہوں سے دیکھے وہ درحقیقت محمدؐ و آل محمدؐ کی قدر و منزلت سے بیگانہ ہے اس مقام پر مقصد کو ثابت کرنے کے لئے آیات واحادیث کا سہارا لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کی ایک محسنِ اعظم کی طرف نسبت ہی ان کے وجوب احترام کے لئے کافی ہے جب ہمارے ہاں بہت کافی چیزیں ایسی ہیں جن کا احترام صرف نسبت کی بناء پہ ہے مثلاً کوہ صفا و مروہ حضرت اسمٰعیل و ہاجرہ کی نسبت سے شعائر اللہ بن گئے۔ چاہ زمزم

حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت سے آب شفا بن گیا۔ قرآن مجید میں کاغذ جلد اور اوپر کا غلاف صرف نسبت کی وجہ سے لائق احترام ہوا اور مسجد کی چٹائی مصلّیٰ و دیگر اسباب نسبت کی وجہ سے محترم ہوئے اور بالخصوص شیعوں میں تو اس نسبت کو اور زیادہ احترام حاصل ہے تعزیہ کی شبیہہ ذوالجناح کی شبیہہ امام باڑہ اور علم وغیرہ ان سب کا احترام صرف نسبت کی وجہ سے ہی کیا جاتا ہے تو پھر اولاد علیؑ و بتولؑ کے احترام کیلئے کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے؟ ان میں تو فقط عارضی نسبت نہیں بلکہ خونی رشتہ ہے جو عارضی نسبت سے قوی تر ہے۔ پس ان کے احترام کے وجوب میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

پس جو شخص سادات کی توہین کرے یا ان کی توہین پر لوگوں کو آمادہ کرے یا ایسی حرکات کرے جن سے ان کی توہین لازم آتی ہو تو گویا وہ شخص محمدؐ و آل محمدؐ کی توہین کا مرتکب ہے کیونکہ نسبت کا احترام اصل کا احترام اور نسبت کی توہین اصل کی توہین ہوا کرتی ہے پس جن لوگوں پر نسبت کی وجہ سے صدقہ حرام ہے ان لوگوں کا احترام بھی واجب ہے اور نیک و بد کے متعلق جناب رسالتمآبؐ کی ایک حدیث اس مقام پر نقل کی جاتی ہے فرمایا اَکْرِمُوْا اَوْلَادِیْ الصَّالِحِیْنَ لِلّٰہِ وَالطَّالِحِیْنَ لِیْ کہ میری اولاد کی عزت کرو نیکوں کی اللہ کے لئے اور بروں کی میری نسبت کی وجہ سے بہر کیف قیامت کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے نیکوں کو مناسب جزا دے گا اور غلط کاروں کو سزا بھی وہی دے گا۔ لئالی الاخبار ص ۳۱۵

عَنِ الرِّضَا اَلنَّظْرُ اِلٰی ذُرِّیَّتِنَا عِبَادَةٌ فَقِیْلَ لَهٗ یَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَلنَّظْرُ اِلَی الْاَئِمَّةِ مِنْكُمْ عِبَادَةٌ اَمِ النَّظْرُ اِلٰی جَمِیْعِ ذُرِّیَّةِ النَّبِیِّ؟ فَقَالَ بَلِ النَّظْرُ اِلَی الْجَمِیْعِ۔ ترجمہ امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ ہماری ذریت کی طرف نظر کرنا بھی عبادت ہے تو پوچھا گیا کہ اے فرزند رسولؐ صرف تم میں سے آئمہ کی طرف نظر کرنا عبادت ہے؟ تو فرمایا نہیں بلکہ تمام ذریت رسولؐ کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔

عقائد شیخ صدوق رحمہ سے مزید وضاحت

شیخ صدوق رحمہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اولاد علیؑ کے متعلق

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ آلِ رسولؐ ہیں اور تحقیق ان کی محبت واجب ہے کیونکہ اجر رسالت ہے۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی اور صدقہ ان پر حرام ہے کیونکہ یہ لوگوں کے ہاتھ کی میل ہے کہ اپنے غلاموں اور کنیزوں پر صدقہ کرکے وہ گناہوں کی نجاست سے پاک ہوتے ہیں البتہ سادات میں سے بعض کا بعض پر صدقہ جائز ہے اور زکوٰۃ کے بدلہ میں ان کو خمس عطا ہوا ہے اور صدقہ سے مراد صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ و فطرہ ہے لہٰذا ان کے علاوہ باقی صدقات و خیرات سادات کرام کو دیئے جا سکتے ہیں بلکہ اگر خمس کسی کے پاس نہ ہو تو مستحب صدقہ سے یا دیگر خیراتی رقوم سے بہ نسبت غیر سید کے سید کی دستگیری اور اس کی امداد کرنا زیادہ ثواب کا موجب ہوگا اور خمس مال سادات مستحق سادات کو تقسیم کرنے کے لئے مجتہد جامع الشرائط سے اجازت لینا ضروری نہیں البتہ خمس سہم امام علیہ السلام کی تقسیم مجتہد جامع الشرائط کی اجازت سے ہونی چاہیئے) اور ان میں سے جو گنہگار ہیں ان کا عذاب دگنا ہوگا۔ جس طرح کہ نیکی کی صورت میں ان کا ثواب بھی دگنا ہوگا۔

- اور سادات ایک دوسرے کے کفو ہیں۔ کیونکہ حضورؐ نے حضرت ابو طالبؑ کے دو فرزندوں علیؑ و جعفر طیارؑ کی طرف دیکھ کر فرمایا تھا ہماری بیٹیاں ہمارے بیٹوں کے لئے اور ہمارے بیٹے ہماری بیٹیوں کے لئے ہیں۔
- حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا جو شخص اللہ کے دین کی مخالفت کرے اللہ کے دشمنوں سے محبت کرے اور اس کے دوستوں سے نفرت کرے تو اس سے بیزاری واجب ہے خواہ وہ کسی قبیلہ سے ہی کیوں نہ ہو۔
- اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے لختِ جگر محمد بن حنفیہ سے فرمایا تھا کہ تواضع فروتنی و انکساری) سے حاصل شدہ شرف دادا کی طرف منسوب ہونے کے شرف سے بہتر ہے۔
- اور حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت اپنے اولاد علیؑ ہونے سے زیادہ محبوب ہے۔
- آپ سے آلِ محمدؐ کا معنی پوچھا گیا تو فرمایا آلِ محمدؐ وہ ہیں۔ جن میں جناب رسالتمآبؐ نکاح نہ کر سکیں۔ خدا فرماتا ہے۔ ہم نے نوحؑ و ابراہیمؑ کو نبی بنا کر بھیجا

اور ان کی اولاد میں نبوت و کتاب دی بعض ان میں سے ہدایت پر ہیں ۔ اور اکثر فاسق ہیں۔

- حضرت صادق علیہ السلام سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا گیا ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الآیۃ آپ نے فرمایا ظالم وہ ہے جو اپنے امام کی معرفت نہ رکھتا ہو مقتصد وہ ہے جو امام کو پہچان لے اور سابق بالخیرات خود امام ہے۔
- حضرت اسماعیل نے اپنے والد بزرگوار حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ ہم میں سے جو گنہگار ہوں گے ان کا کیا حشر ہوگا تو آپ نے قرآن مجید کی آیت پڑھی جس کا مقصد یہ ہے کہ تمہاری اور اہل کتاب کی آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتیں جو بھی برے کام کرے گا اس کی جزا پائے گا اس کا اللہ کے علاوہ کوئی ناصر و مددگار نہ ہو سکے گا ۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا خدا اور بندے کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ۔ پس اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو زیادہ متقی ہو اور اللہ کی اطاعت کرنے والا ہو خدا کی قسم اللہ کا قرب اس کی اطاعت سے ہی ہو سکتا ہے نہ ہمارے پاس دوزخ سے بچنے کا کوئی پروانہ ہے اور نہ اللہ پر کسی کی کوئی حجت ہے جو اس کا اطاعت گزار ہوگا وہ ہمارا دوست ہے اور جو اس کا نافرمان ہوگا وہ ہمارا دشمن ہے اور ہماری ولایت بغیر تقویٰ کے حاصل نہیں ہو سکتی ۔ الخ

عبارت شیخ اور اقوال آئمہ سے حسب ذیل مطالب اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

① تمام سادات کو جو علیؑ و بتولؑ کی طرف نسب میں منتہی ہوتے ہیں آل رسولؐ کہا جا سکتا ہے۔

② تمام سادات سے محبت رکھنا اور ان کا احترام کرنا اجر رسالت میں داخل ہے۔

③ تمام سادات پر صدقہ لینا حرام ہے خواہ نیک ہوں یا بد (اور صدقہ سے مراد صدقہ واجبہ زکوٰۃ و فطرہ ہے جو غیر سادات کی طرف سے ان کو پہنچے)

④ سید کو نیکی کی جزا دگنی اور برائی کی سزا بھی دگنی ملے گی۔

⑤ سادات سب کے سب ایک دوسرے کے رشتہ و ناطہ میں کفو ہیں

⑥ دشمنان خدا و رسولؐ سے محبت کرنے والے اور دین کی حفاظت کرنے والے کا احترام

واجب نہیں یعنی جس کا عقیدہ درست نہ ہو۔

(۷) تقویٰ و ولایتِ آلِ محمدؐ کا شرف صرف اولادِ علیؑ ہونے کے شرف سے بالا ہے جس میں تقویٰ یا ولایت موجود نہ ہو۔

(۸) گنہگار ہونے کی وجہ سے کوئی سیّد شرفِ سیادت سے محروم نہیں ہو سکتا۔

(۹) صرف اولادِ علیؑ ہونے سے نجات نہیں ملے گی بلکہ نیک اعمال کی بجا آوری اور گناہوں سے اجتناب ضروری ہے جبکہ عقیدہ بھی درست ہو۔

(۱۰) آلِ محمدؐ کی ولایت تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اور ان کی شفاعت ان کو ہی نصیب ہوگی جو دل میں خوفِ خدا رکھتے ہوں۔

حضرت ابوالفضل العباسؑ

ویسے تو سب اولادِ علیؑ کا احترام واجب ہے لیکن مراتب میں بعض کو بعض پر فضیلت ہے پس نیک کو بد سے فضیلت ہے اور نیکوں میں سے درجات میں بلندی و پستی کا فرق ہے لیکن جہاں تک میری نظرِ قاصر اور عقلِ فاتر کا تعلق ہے میں تمام اولادِ علیؑ سے حضرت ابوالفضل عباس علمدارِ حسینیؑ کو افضل سمجھتا ہوں۔ پس آئمہ طاہرین علیہم السلام کے بعد شرف و کمال میں ان کی ذات لاثانی ہے۔ ان کا چہرہ مظہرِ جمالِ الٰہی اور ان کا رعب مظہرِ جلالِ خداوندی تھا اور اولادِ شاہِ ولایت میں حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے بعد شجاعت و شہامت میں بے مثال آپ تھے نیز حسنین شریفین کے بعد علم و فضل و یقین و معرفت زہد و تقویٰ اور دیگر کمالاتِ نفسیہ میں نظیر نہ رکھتے تھے زیارت ناحیۂ مقدسہ میں ان کی پرخلوص خدمات و وفاداری اور جانبازی کا جن وقیع الفاظ میں تذکرہ ہوا ہے وہ انہی کا حصہ ہے امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ جنت میں حضرت ابوالفضل عباس کو دو پر عطا ہوئے ہیں کہ وہ فرشتوں کے ہمراہ پرواز کرتے ہیں جس طرح کہ جعفر طیار کو عطا ہوئے ہیں نیز فرمایا حضرت عباس کی اللہ کے نزدیک جو منزلت ہے قیامت کے روز تمام شہداء اس پر رشک کریں گے۔ کبریتِ احمر ج ۲ حصہ ۳ سے منقول ہے کہ حضرت عباس اکابر فقہاء اور افاضلِ اہلبیتؑ سے تھے بلکہ وہ عالم غیر متعلم تھے بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ معصومؑ سے منقول ہے اِنَّ العَبَّاسَ بْنَ عَلِیٍّ زُقَّ العِلْمَ زَقًّا حضرت عباس نے عالمِ طفولیت میں گہوارۂ علم و حکمت میں تربیت پائی اور فضل و دانش کی گود میں ان کی

نشو و نما ہوئی تو کیوں نہ وہ ایسے مراتب جلیلۂ علمیہ اور منازل رفیعۂ عرفانیہ پر فائز ہوتے۔

حضرت علی اکبر

آئمہ طاہرین علیہم السلام کی جلالت شان کے بعد یہ شہزادہ بھی اپنی مثال آپ تھا اور ان کی عظمت و شرف کے لئے تو امام حسین علیہ السلام کا آخری فقرہ ہی کافی ہے جب شہزادہ نے اذن جہاد طلب کیا تھا اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ عَلٰی ھٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ اِنَّہٗ قَدْ بَرَزَ اِلَیْھِمْ غُلَامٌ اَشْبَہُ النَّاسِ خُلْقًا وَ خَلْقًا وَمَنْطِقًا بِرَسُوْلِکَ وَکُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا اِلٰی لِقَاءِ نَبِیِّکَ نَظَرْنَا اِلَیْہِ اے اللہ تو اس قوم پر گواہ رہ تحقیق ان کی طرف اب وہ جوان جا رہا ہے جو تمام لوگوں کی بہ نسبت شکل و صورت عادات و اطوار اور لہجہ و گفتار میں تیرے رسولؐ سے زیادہ مشابہ تھا اور ہم جب بھی تیرے نبی کے دیدار کا شوق کرتے تھے تو اس کو دیکھ لیا کرتے تھے۔

امام مظلوم کے بیان حق ترجمان میں شہزادہ علی اکبر حسن و جمال اور جلال و کمال میں صفات محمدی کا آئینہ تھا۔ زیارت رجبیہ میں شہزادہ علی اکبر کو ان افراد سے شمار کیا گیا ہے جو آیت تطہیر کے مصداق ہیں اور اس لحاظ سے ان کی عصمت ثابت ہوتی ہے نیز امام حسینؑ کا اپنے لخت جگر کو حضرت رسالتمآبؐ سے صورت و سیرت میں تشبیہ دینا صرف جذبات کی بنا پر نہ تھا بلکہ حقیقت کی ترجمانی تھی تو یہ تشبیہ بھی عصمت کو ہی ثابت کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے بعض علماء شہزادہ علی اکبر کی عصمت کے قائل بھی ہیں ان کے حسن کا اس سے اندازہ لگتا ہے کہ جب حضرت عباسؑ ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے دونو چچا بھتیجا مدینہ کی گلیوں سے گزرتے تھے تو مدینہ کے زن و مرد ان دونو جوانوں کے جمال کے دیدار کے لئے بے تابانہ ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرتے تھے

بہرکیف میں تاریخ کے بیان کرنے کے درپے نہیں ہوں سادات علویہ میں سے چونکہ میرے نزدیک یہ دونو شہزادے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں لہٰذا ان دونو کی بارگاہ میں اپنی عقیدت کو پیش کرنا میرے لئے باعث فخر ہے اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو یقیناً میرے دل میں ایک حسرت باقی رہ جاتی جس کا تدارک نہ ہو سکتا۔ پس اپنی عقیدتمندی پیش کرنے کے بعد حضرت علیؑ کے دونو مایۂ ناز سپوتوں بیشۂ شجاعت و شہامت کے شیروں اور اپنے دونو آقاؤں کی خدمت میں نیازمندانہ غلامانہ فقیرانہ ہدیہ سلام پیش کر کے خدا سے ان دونو فلک شہادت کے ابھرے ہوئے ستاروں کے وسیلہ سے اپنی

اور اپنے والدین و اساتذہ کی مغفرت چاہتا ہوں اور یہ کہ خداوند کریم میری اس ناچیز خدمت کو شرف قبولیت عطا فرما کر مومنین کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع عطا فرمائے اور دینی و دنیاوی کامیابی و کامرانی کرامت فرمائے پس سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتا ہوں۔

مسئلہ بداء

بعض لوگ دیدہ دانستہ یا نادانستہ طور پر مسئلہ بداء کے متعلق فرقہ شیعہ کو بدنام کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اس لئے اس مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ خدا نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکا ہے۔ اب اس کے بس میں کچھ نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کی اس قسم کی بعض بیہودہ باتوں کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ قَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ یہودیوں نے کہا کہ خدا کے ہاتھ بند ہیں جو کچھ اس نے کرنا تھا وہ کر چکا ہے جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ گویا اب قلم خشک ہو چکی ہے لیکن خداوند کریم نے قرآن مجید میں اس کی تردید فرمائی ہے بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ اس کے ہاتھ بند نہیں بلکہ کھلے ہیں یعنی وہ مجبور نہیں بلکہ اس کے تصرفات اب بھی بدستور ہیں اور ایسے ہی وہ تصرف کرتا رہے گا يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ۔ خدا جسے چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب موجود ہے اور خدا کے اختیار میں ہے جس کو چاہے مقدم کرے یا موخر کرے اور فسخ کرے یا بدل سکتے وہ صاحب اختیار ہے یعنی محو و اثبات تقدیم و تاخیر اور فسخ و بقاء میں اس کے اختیارات کا باقی رہنا بداء کہلاتا ہے یہاں بداء کے دو مفہوم ہیں ایک ہے خفا کے بعد ظہور یعنی ایک شئے مخفی ہو اور پھر ظاہر ہو جائے تو یہ معنی خدا کے حق میں ناجائز ہے اور اس کا قائل کافر ہے اور دوسرا معنی ہے ابقاء کے بعد انتہاء یعنی خدا نے پہلے تو بنایا ہو اور پھر مٹا دے تو یہ معنی اللہ کے لئے جائز ہے اور یہ اس کی کبریائی و عظمت کی دلیل ہے

علم و حساب کے مطابق نظام کائنات جاری و ساری ہے اور ظاہراً ہر شخص جانتا ہے کہ بعض دفتر کے مطابق یہ سلسلہ اسی رفتار سے جاری رہے گا اور حقیقی علم خدا کو ہے کہ یہ جاری و ساری دستور کسی میعاد کے لئے ہے یا بلا میعاد ہے اگر کسی میعاد کے لئے ہے تو پھر اس کو اختیار ہے کہ کسی شئے کو ختم کر دے یا دوسری کو

اس کی حدود بتا دیتے کہ یہ دستور فلاں میعاد تک رہے گا یا فلاں سبب فلاں مدت تک مؤثر ہوگا۔ اس کے بعد وہ دستور یا سبب بے کار اور لغو ہو جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کو بھی اس کا علم نہ ہو سکے اگر وہ سبب کی میعاد بتا دیتے تو وقت گذرنے پر کسی کو بھی تعجب نہ ہوگا بلکہ یہی سمجھا جائے گا کہ سبب کی میعاد اسی قدر تھی لیکن دونوں صورت میں تعجب کا ہونا ضروری ہے اور اسی کا نام بدا ہے۔

قضائے محتوم و غیر محتوم

خداوند کریم نے ہر انسان کے لئے دو طرح کی اجل مقرر کر دی ہے ایک اجل محتوم اور اس کو اجل مقضی بھی کہا جاتا ہے اور دوسری اجل غیر محتوم جس کو اجل مسمّی بھی کہا جاتا ہے یعنی ہر پیدا ہونے والے انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک گارٹی رکھ دی ہے کہ اس کی عمر مثلاً پچاس سال ہے پس یہ ہے اس کی اجل مقضی و محتوم و مبرم لیکن اس نے اپنی حکمت شاملہ و قدرت کاملہ سے یہ بات مقرر کر دی ہے کہ فلاں نیک کام سے اس کی عمر میں مثلاً دس برس کا اضافہ کیا جائے گا یا فلاں بد کام کی بدولت اس کے دس برس کم کر دیئے جائیں گے پس اسی کمی بیشی کا نام قضائے غیر محتوم اور اجل مسمّی ہے اور لوح محو و اثبات کا تعلق اسی سے ہے یعنی اس میں اجل محتوم بھی موجود ہے اور اس پر کمی و بیشی کا اسباب خارجیہ کے ذریعہ سے بھی امکان موجود ہے پس جب مصلحت یا تو اس میں کمی ہوگی یا زیادتی ہوگی یا محتوم ہی باقی رہے گی اور اس کا اندراج لوح محفوظ میں ہے یعنی مقام علم میں نافذ ہونے والی اجل لوح محفوظ میں درج ہوتی ہے کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ اجلیں دو قسم کی ہیں ایک اجل محتوم اور دوسری اجل موقوف اور بروایت قمی امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اجل مقضی قضائے محتوم کا نام ہے اور اجل مسمّی وہ ہے جس میں بدا واقع ہوتا ہے کہ خدا جس قدر چاہے مقدم یا موخر کر سکتا ہے لیکن محتوم میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

تفسیر ابو سعود میں ابن عباس سے منقول ہے کہ ہر انسان کی دو اجلیں مقرر ہیں ایک ولادت سے موت تک اور دوسری موت سے حشر تک یعنی ایک اجل زندگی اور دوسری اجل برزخ۔ پس بعض اوقات زندگی کی اجل کو کم کر کے برزخ کی اجل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور بعض اوقات برزخ کی اجل میں کمی کر کے زندگی کی اجل میں اضافہ

کیا جاتا ہے اور خدا جسے چاہے مقدم یا مؤخر کر سکتا ہے۔

تفسیر کبیر رازی میں ہے کہ حکماء اسلام نے اجل کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک اجل طبعی دوسری اختراعی پس اجل طبعی سے مراد یہ ہے کہ مثلاً اگر فلاں انسان عوارض خارجیہ سے محفوظ رہا تو وہ اس قدر عمر پا سکے گا اور اجل اختراعی سے یہ مراد ہے کہ عوارض خارجیہ کے اثرات اس کی طبعی عمر کو کم کر دیں گے مثلاً ڈوب کر مرنے سے یا قتل ہو جانے سے وغیرہ

واضح مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح صانع اپنے مصنوع کی ایک گارنٹی مقرر کرتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ بے احتیاطی کی وجہ سے وہ چیز گارنٹی سے پہلے ختم ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مزید احتیاط کی وجہ سے وہ چیز گارنٹی سے بھی زیادہ دیر تک باقی رہ جائے یا حکومت وقت میں ایک مقررہ مدت تک کی کوئی ملازمت ہے تو ممکن ہے کہ اس کی حسن کارکردگی کے پیش نظر اس کی مدت میں مزید توسیع کر دی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بے احتیاطی کی بدولت اسے قبل از مدت فارغ کر دیا جائے اور اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ یعنی کسی کی عمر نہیں بڑھائی جاتی اور نہ کم کی جاتی ہے۔ مگر یہ کہ اس کا ذکر کتاب میں موجود ہے۔

پس اجل محتوم جس میں کوئی کمی یا بیشی نہیں یعنی اصلی طبعی اجل اس کا علم خداوند کریم حسب مصلحت نبی یا امام کو عطا فرماتا ہے لیکن اجل مسمیٰ کا علم اس کے اپنے پاس محفوظ ہے وہ کسی کو عطا نہیں فرماتا اور اسی کے متعلق فرمایا وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ یعنی اجل مسمیٰ اس کے اپنے پاس ہے اور اجل محتوم کے ساتھ جس علم کا تعلق ہے وہ علم مکشوف ہے جو لوح محو و اثبات میں ہے یعنی جس میں اسباب خارجیہ کی بدولت کمی یا بیشی کا امکان ہے اور اجل مسمیٰ کے ساتھ جس علم کا تعلق ہے وہ علم مکنون ہے جو لوح محفوظ میں موجود ہے یعنی یہ وہ اجل ہے جو کمی یا بیشی ہو چکنے کے بعد بچتی ہے اور اس کا علم سوائے پروردگار کے کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

پس انبیاء یا ائمہ کو وہ علم دیا جاتا ہے جس کا تعلق اجل محتوم سے ہوتا ہے یعنی اصل گارنٹی اور طبعی زندگی چنانچہ مروی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اسی طبعی زندگی اور اجل محتوم کے علم کی بدولت کسی موت کی خبر دی تھی جب وہ اس وقت نہ مرا، تو

آپ نے اس سے وجہ پوچھی اس نے بتایا کہ میں نے فلاں صدقہ دیا تھا تو آپ نے فرمایا بس اسی صدقہ کی وجہ سے تیری عمر میں یہ اضافہ ہوا ہے۔ گویا اس کو علم مکشوف تھا جس کا تعلق اجلِ مقتضی و مبرم سے تھا اور اسبابِ خارجیہ کی وجہ سے اضافہ کے بعد جو اجلِ مسمّٰی مقرر ہوئی تھی جس کا علم مکنون لوحِ محفوظ میں ہے اس کا عیسٰیؑ کو پتہ نہ تھا۔

بہرکیف بدا کا قائل ہر ایک ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو گھٹانے کا ہر وقت اختیار کلی حاصل ہے اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ شئی کو نہ جاننے کے بعد نہیں ہے کیونکہ ایسا عقیدہ رکھنا کفر ہے اور اس کا قائل کافر ہے بلکہ یہ عقیدہ صرف یہودیوں کا تھا لہٰذا بدا کا معنی سابق فیصلہ میں ترمیم کرنا نہیں بلکہ بدا کا معنی ہے ایک مخفی امر کا ظاہر کرنا جس کا نبی یا امام یا عام انسان کو پتہ نہیں ہوتا۔

شرعی احکام میں نسخ بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح تکوینی امور میں بدا ہے کہ خدا کے نزدیک ایک حکم شرعی کی حد مقرر ہے جو نبی کو نہیں بتائی گئی جس طرح مثلاً بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا علم خداوندی میں اس کی ایک مدت مقرر تھی جس کا علم نبی علیہ السلام کو نہ دیا گیا تھا ورنہ وہ قبل از وقت دعائیں نہ مانگتے پس علمِ خداوندی میں جب وہ وقت آگیا تو قبلہ تبدیل ہو کر کعبہ بن گیا اللہ کے نزدیک کعبہ کے قبلہ ہونے کا وقت معلوم تھا لیکن بر وقت نبی علیہ السلام سے مخفی رکھا گیا تھا پس اس مخفی کو ظاہر کیا گیا تو اس کا نام نسخ بن گیا حضرت عیسٰی کی سابقہ روایت میں خدا کو پتہ تھا کہ اس سے فلاں کارِ خیر صادر ہو گا اور طبعی عمر پر اس کی عمر بڑھا دی جائے گی لیکن حضرت عیسٰیؑ کو صرف اسی کی طبعی عمر جو اجلِ محتوم تھی وہی معلوم تھی پس جب ایک اچھے کام کی بدولت اس کی عمر بڑھا دی گئی۔ تو حضرت عیسٰی کے لیے وہ بدا بن گیا۔ اسی طرح حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند کے متعلق بھی یہی صورت ہے کہ خداوند کریم کے علم میں جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے وہ یہ تھا کہ حضرت امام موسٰی کاظم علیہ السلام ساتویں امام ہوں گے لیکن حضرت صادق علیہ السلام کے بڑے فرزند حضرت اسمٰعیل میں ظاہری اعتبار سے تمام وہ اوصاف موجود تھے جو امام کے لیے ہونے چاہئیں تو لوگوں کو ظاہری طور پر یہ اندازہ تھا کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد امامت اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو گی کیونکہ ظاہری آثار کا تقاضا یہی تھا اور خداوند کریم کے علم محتوم میں ایسا نہیں تھا کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ اسمٰعیل کی موت جعفر صادق علیہ السلام کی

کی موت سے قبل ہے پس جب حضرت اسمٰعیل کی وفات ہوئی تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے صحابہ کو بدا کا مفہوم سمجھایا کہ بدا اس کو کہتے ہیں کہ جو چیز اللہ کے علم میں مخفی تھی اب اس کو ظاہر کر دیا بہر کیف بدا کا غلط سلط معنی جو شیعوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے شیعہ مذہب اس سے قطعاً بے زار ہے اور شیعہ کے نزدیک بدا کا معنی یہی ہے جو مذکور ہو چکا ہے قضائے محتوم کے بدلنے کا نام ہی بدا ہے اور اس کو سب مانتے ہیں مثلاً دعاؤں کا مانگنا نذر و منت کا سلسلہ اور بیماروں کا علاج معالجہ وغیرہ سب اسی بدا کے عقیدہ کی مثالیں ہیں کیونکہ اگر اجل محتوم ہی ہو اور اجل مسمّٰی کی طرف تبدیلی ناممکن ہو تو پھر ہر شخص کو دعاؤں وغیرہ اور علاج معالجے سے دست بردار ہو جانا چاہیئے کیونکہ ہوگا تو وہی جو قضائے محتوم میں ہے لہٰذا تبدیلی کی کوشش اور دعاؤں و منتوں کا سلسلہ بےکار ہے پس معلوم ہوا کہ قضائے محتوم کے بدلنے کا امکان ہوتا ہے اور اسی لئے خدا سے اپنی تقدیر کے بدلنے کا سوال کیا جاتا ہے اور بے شک وہ قادر مطلق ہے یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ۔

تقیہ کے متعلق عقیدہ

یہ مسئلہ کوئی اس قسم کا پیچیدہ مسئلہ نہیں کہ خواہ مخواہ اس کو ثابت کرنے کے لئے لمبے چوڑے دلائل دیئے جائیں بلکہ بالکل فطری اور بدیہی بات ہے ہر انسان سمجھتا ہے کہ جب ظالم کے ظلم کا اندیشہ ہو تو اپنی جان، مال، ناموس وغیرہ کی حفاظت کرتے ہوئے انسان خلاف واقع بات کہہ دے جس کا کسی دوسرے انسان پر بُرا اثر نہ پڑتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں لہٰذا تقیہ کرنا جائز کہنا صرف شیعہ پر حملہ نہیں بلکہ فطرتِ انسانی کا کھلا ہوا مقابلہ ہے اور جب مسئلہ بدیہی اور واضح ہو تو قرآنی آیات اس کے اثبات کے لئے نہیں بلکہ تائید مطلب کے لئے پیش کی جاتی ہے اور اس مطلب پر متعدد آیات سے تائید حاصل کی جا سکتی ہے لیکن میں صرف ایک آیت پیش کر کے فیصلہ عدل و انصاف کی عدالت پر چھوڑتا ہوں۔ ارشاد قدرت ہے لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً الآیۃ سورہ آل عمران مومن کافروں کو دوست نہ بنائیں بجز مومنوں کے اور جو ایسا کرے گا تو اس کا اللہ سے کوئی رابطہ نہ رہے گا مگر یہ کہ تم ان لوگوں سے ڈر رکھتے ہو پس ڈر اور خوف کی صورت میں بطور تقیہ کے ان کو دوست بنانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس

آیتِ مجیدہ کی تفسیر میں تمام مفسرین سنی و شیعہ یہی لکھتے ہیں کہ آیتِ مجیدہ تقیہ کے جواز پر دلالت کرتی ہے چنانچہ بیضاوی و کشاف وغیرہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ کفار نے حضرت عمار اور ان کے والدین یاسر اور سمیہ کو گرفتار کرلیا اور ان سے کلمات کفر کہلانے چاہے چنانچہ یاسر اور اس کی بیوی سمیہ نے انکار کردیا تو کفار نے ان کو بے دردی سے قتل کردیا لیکن حضرت عمار نے تقیہ کرلیا اور دل میں ایمان کو رکھ کر زبان سے کلماتِ کفر اپنی جانی حفاظت کے لئے جاری کردیئے جب حضورؐ کی خدمت میں شکایت پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ عمار کے ایمان میں کوئی شک نہیں پس جب عمار آیا تو اس نے اپنا دردبھرا واقعہ سنایا حضورؐ نے فرمایا کوئی بات نہیں اگر پھر بھی اس قسم کا اتفاق ہوجائے تو کہہ دینا چنانچہ یہی آیت اتری اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ تفسیر انوار النجف سورہ نحل پارہ ۱۴ رکوع ۲۰ اور یہ آیت جوازِ تقیہ پر نص ہے۔ بہرکیف تقیہ کے جواز پر دلائل توضیح الواضحات کے مترادف ہیں لیکن جو دوپہر کے وقت سورج کا انکار کرے اس اندھے کا کیا علاج ہے؟

عہدِ میثاق کی حقیقت

اس مقام پر عام علمائے اسلام کی طرح علمائے امامیہ میں بھی اختلاف ہے اور منظریئے صرف دو ہیں اگرچہ ان کی تعبیریں جُدا جُدا ہیں۔

① ایک جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ خداوندکریم نے صلبِ آدم سے یک وقت اس کی تمام ذریت کو نکال کر حضرت آدم کے سامنے تمام سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا پھر دوبارہ صلبِ آدم میں پلٹا کر دنیا میں آنے کے لئے ہر ایک کا الگ الگ وقت مقرر فرمایا اور اس قول کی تائید میں انہوں نے احادیث بھی پیش کیں۔

② دوسری جماعت ظواہرِ احادیث و روایات کو کنایہ و اشارہ پر محمول کرتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک اس عہد کا مقصد یہ ہے کہ آفاق و نفوس کے اندر آثارِ قدرت و عظمتِ الٰہیہ و نشاناتِ صنعت و حکمتِ ربانیہ اپنی تدبیرِ محکم و تکوینِ متقن کے ساتھ ربوبیت پروردگار کی بولتی ہوئی زبان ہے اور عالم موجودات کے اندر اشرف المخلوقات کے لباس میں قوتِ فکر و فہم و ملکۂ ذکر کی روشن قندیلوں کی ضیا میں عرشِ ذہن و خرد پر متمکن جوہرِ قدسی یعنی عقلِ انسانی سے سوال ہو رہا ہے۔ اَلَسْتُ

بِرَبِّکُمْ تو ادھر فطرت سلیمہ و طبیعت مستقیمہ کے گوش ہوش میں صدائے حق پہنچتی ہے اور تقاضائے انسانیت و مقتضائے شرافت و کرامت اس پتلائے خاکی کی جانب سے زبانِ حال بن کر جواب دیتا ہے بَلیٰ اور محققین علمائے امامیہ کا مسلک یہی ہے اور عہدِ میثاق کے متعلق جس قدر روایات وارد ہیں ان سب کی یہی تاویل ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہونی چاہیئے اور قرآن مجید کی آیت کا ظاہر قول اول کے خلاف ہے چنانچہ ارشاد قدرت ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی ذرّیت (اولاد کو) وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْؕ قَالُوْا بَلٰى اور ان کو اپنے نفسوں پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں (تو ہمارا رب ہے) آیت میں آدم کی پشت سے ذرّیت کا نکالنا نہیں بلکہ اولادِ آدم کی پشتوں سے قرناً بعد قرنٍ آنے والی نسلوں کے متعلق خطاب اور اس کا جواب مذکور ہے اور یہ دوسرے قول سے ہی موافقت رکھتا ہے جس طرح کہ ظاہر ہے۔ نیز پہلا قول عقلِ سلیم کے لئے قابلِ قبول اس لئے بھی نہیں کہ صرف رُوح سے اقرار لینا جب کہ عقل موجود نہ ہو یا ہو لیکن کامل نہ ہو معقول نہیں مثلاً قبل از زمانِ بلوغ کسی سے کوئی عہد و پیمان لیا جائے تو اس کی کوئی قیمت نہیں نہ اہلِ دنیا کے نزدیک اور نہ اہلِ دین کے نزدیک بلکہ قبل از کمالِ عقل کے عہد کو بالکل باطل و عاطل سمجھا جاتا ہے تو جب بدن میں داخل ہونے کے بعد بلوغ سے قبل اس کا کوئی عہد نہ قابلِ قبول ہے نہ قابلِ پرسش ہے نہ وہ حجت بن سکتا ہے اور نہ اس کی مخالفت قابلِ سرزنش و گرفت ہو سکتی ہے خواہ وہ اپنے ہاتھوں تحریر کر دے اور خواہ ملک و امام و نبی بھی اس پر گواہ موجود ہوں تو جسم و بدن میں داخل ہونے سے ہزاروں برس پہلے جبکہ نہ شرعی نظام تھا نہ تکلیف کا دَور تھا تو اس وقت کا عہد کیونکر قابلِ پرسش ہو گا اور کیونکر کوئی جواب دہ ہو گا پس اس قول کا بطلان بالکل واضح بلکہ بدیہی ہے اور جملہ روایات وارِدہ کو دوسرے قول پر محمول کرنا ضروری و لازم ہے۔

ہاں یہاں پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیتِ مجیدہ میں تعبیر صیغہ ماضی سے ہے جو گذشتہ پر دلالت کرتا ہے حالانکہ بنی آدم کی ذرّیت کا ظہور تدریجی ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقینی واقع ہونے والی چیز کو ماضی سے تعبیر کر لیا جاتا ہے اور قرآن میں قیامت کی آمد کو بھی بہت سے مقامات پر صیغہ

ماضی سے بیان کیا گیا ہے۔

یا یوں سمجھئے کہ میثاق سے مراد میثاقِ معنوی عالمِ مثال کی صورت میں ہے کیونکہ قیامت تک کے حوادث و واقعات اگرچہ مقامِ ظہور میں تدریجی ہیں لیکن مقامِ علمِ الٰہی میں وہ سب کے سب باوجود ترتیب معہود کے بیک وقت اس کے سامنے حاضر و موجود ہیں۔ بنابریں سب ہونے والی مخلوق کو وہ جس طرح ہونے کے بعد جانتا ہے ہونے سے پہلے بھی مفصل طور پر جانتا ہے پس اس عالمِ دہر یا عالمِ واقع یا عالمِ تمثیل میں تمام قیامت تک کے ہونے والے بنی آدم جو اجسام مثالیہ کے ساتھ بیک وقت قبل از ایجاد اپنے خالقِ یکتا کے علمِ واقعی کے سامنے صف بہ صف قرن بہ قرن محو تسبیح ہیں ان کو خطاب کر کے زبان قدرت و حکمت سے یہ سوال ہوا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ تو بنی آدم کی ہیئت اجتماعیہ کذائیہ نے اعترافِ عجز و انکساری کے ساتھ اپنی زبان بے زبانی سے کہہ دیا بَلٰی جہاں تک تکوین کا تعلق ہے تو صرف وجود انسانی نہیں بلکہ پورا کائناتی وجود اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے تکوینی سوال کے بعد اپنے عجز و نیاز کی زبان تکوینی سے بَلٰی کہتا نظر آتا ہے جس طرح فرماتا ہے کہ ہم نے آسمان و زمین کو حکم دیا اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ یعنی طوعاً و کرہاً آ جاؤ تو انہوں نے کہا ہم طوعاً حاضر ہیں اور یہ سوال و جواب تکوینی ہیں۔ علامہ محسن فیض کاشانی تفسیر صافی میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ممکن ہے عالمِ مثال میں مثالی اجسام نے اپنی ملکوتی زبانوں سے جواب دیا ہو کیونکہ مخلوق عالم کے ہر ذرہ میں زبان ملکوتی موجود ہے جو اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید اور تمجید و توحید کا ورد کرتی ہے اور یہی لسانِ ملکوتی تھی جس کی بدولت حضرت رسالتمآب کے دستِ حق پرست پر سنگریزے کلمہ پڑھتے تھے اور اسی ملکوتی زبان سے بروز محشر زمین بولے گی يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا اور اسی ملکوتی زبان سے انسانی اعضاء کو جواب دینا ہو گا انتہی جہاں تک تکوین کا تعلق ہے تو اس کی قدرتِ کاملہ و حکمتِ شاملہ و نظامِ اتم اور تدبیر محکم پورے عالم میں اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کا اعلان ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ آسمان و زمین کا چپہ چپہ بلکہ کتاب ہستی کا ورق ورق اور اس کی تحریر تکوینی کا نقطہ نقطہ اپنی عین خاموشی میں جواب بلیٰ بلیٰ کا مرقع و آئینہ ہے لیکن انسان کو جوہر عقل عطا ہونے کے بعد اس کی تکوینی اطاعت کوئی مقام نہیں رکھتی بلکہ اس کے ارادی و اختیاری افعال کا اطاعت کے سانچے میں ڈھلنا ضروری ہے

پس صنعت عالم کی ملکوتی زبان نے عقول کو خطاب کر کے پوچھا تو ارواح انسانیہ سماعِ ملکوتی سے یہ خطاب سُن کر زبانِ عقل یا لسان ملکوتی یا زبان حال یا لہجۂ فطرت سے پکار اُٹھے۔ بلی۔

میثاق نبوّت وامامت

اب اس میثاق میں جب ربوبیّت کا اعتراف واقرار ہو چکا تو اطاعت پروردگار کے ذرائع واسباب کی تلاش میں عقل کی جستجو ضروری تھی کیونکہ یہ تکوینی اطاعت نہیں کہ اس میں صرف زبانِ حال کی جی ہاں کافی ہو سکے بلکہ اختیار وارادہ سے اطاعتِ پروردگار کے لئے کسی قانون کی پابندی ضروری ہے تو چونکہ مخلوق وخالق کے درمیان کوئی ایسا رابطہ موجود نہیں جس کی بدولت یہ ظلمانی مخلوق ذاتِ اقدس الہیہ سے فیض حاصل کر کے اس کی خوشنودی کا راستہ خود تلاش کرے تاکہ کئے ہوئے عہد کی ایفاء ہو جائے تو گویا عقولِ بشریہ ونفوس انسانیہ اقرار ربوبیت کے بعد اطاعت پروردگار کا صحیح طریقہ معلوم کرنے کے لئے جستجو میں تھے کہ ایک ایسا وسیلہ ہو جو وہاں سے حکم لے کر ہم تک پہنچائے تو ادھر ازراہِ لطف زبانِ تکوین بول اٹھی اَلَیْسَ مُحَمَّدٌ نَبِیَّکُمْ کیا محمدؐ کی نبوت کا تمہیں وسیلہ وواسطہ منظور نہیں ہے؟ تو فطرت کی جستجو بار آور ہوئی اور زبان عقل نے لبیک کرلی اس کے بعد فطری طور پر ان کی رحلت کے بعد ان کے صحیح قائمقام کی تلاش میں فطرت کو اضطراب لاحق ہوا تو زبانِ لطفِ پروردگار سے آواز پہنچی اَنَّ عَلِیًّا اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی علیؑ مومنوں کا امیر ہے تو فوراً فطرت وعقل کی زبانیں کھلیں اور لسانِ ملکوتی لبیک پکار اٹھی اور اس طرح میثاق ازلی میں اقرارِ توحید ونبوّت وامامت کا عہد نامہ ہوا جس پر ایک دوسرے کی اور ملائکہ کی گواہی درج ہوئی اور یہی دین فطرت کہلایا اور اس کے ماتحت احادیث بکثرت وارد ہیں۔

پہلے پہل جب اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کی صدا آئی تو تمام مخلوق سے سبقت کرتے ہوئے نورِ محمدی نے جواب دیا بلی پس اس کو تمام کائنات کا سرتاج وشہنشاہ قرار دیا گیا اس کے بعد حضرت علیؑ سے حضرت مہدی تک تمام ارواح آئمہ نے بلی کہا تو ان کو باقی سب کائنات پر فضیلت دی گئی۔ پھر تیسرے نمبر پر تمام انبیاء نے مراتب کے لحاظ سے بالترتیب اقرار کیا تو ان کو اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے عہدۂ نبوت عطا کیا گیا اور

باقی تمام انبیاء سے حضرت سیدالانبیاء کی نبوت اور ان کے اوصیائے طاہرین علیہم السلام کی ولایت کا اقرار بھی لیا گیا جو عقل و نقل کے عین مطابق ہے اور باقی مخلوق سے انبیاء کی اطاعت کا عہد بھی لیا گیا۔ ہم نے اس بحث کو بہت کافی تفصیل سے تفسیر انوار النجف کی چھٹی جلد آیت مذکورہ کے ذیل میں مدلل و مبرہن طور پر درج کیا ہے۔ اور عقل و تدبر کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کیا ہے اس مقام پر اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے

اقرار ازلی کے متعلق روایات بکثرت وارد ہیں بلکہ شاید معنوی طور پر تواتر تک پہنچ جائیں یہاں چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

① تفسیر برہان میں بروایت امام جعفر صادق علیہ السلام حضرت رسالتمآبؐ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو تمام انبیاء پر فوقیت کیوں حاصل ہے؟ تو آپ نے فرمایا روز میثاق جب اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کی صدا آئی تو تمام انبیاء سے سبقت کر کے پہلے پہل میں نے بلیٰ کہا تھا۔

② حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ حضرت علی علیہ السلام کو امیر المومنین کیوں کہا گیا ہے تو فرمایا روز میثاق خدا نے اقرار بنی آدم سے اس طرح لیا تھا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلِیْ وَاَنَّ عَلِیًّا اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ

③ نیز آپ سے ہی منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا بروز میثاق تمام امت میرے پیش ہوئی تو میری نبوت کا سب سے پہلا اقرار کرنے والا شخص علیؑ ہے اور وہی پہلے پہل میری تصدیق کرنے والا ہے۔ جب میں مبعوث ہوا ہوں اور وہی صدیق اکبر اور وہی فاروق ہے کہ حق و باطل میں فرق کرے گا۔

④ بروایت حمران آپ سے مروی ہے پہلے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کا عام خطاب ہوا تو سب نے کہا۔ بلیٰ پھر بالخصوص نبیوں سے پوچھا گیا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ وَاَنَّ هٰذَا مُحَمَّدًا رَسُوْلِیْ وَاَنَّ هٰذَا عَلِیًّا اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی توحید پروردگار و نبوت محمدؐ ولایت کا سوال کیا گیا اور سب نے اقرار کیا بس ان کو عہدۂ نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ اس روایت کی تائید میں چار روایتیں اور بھی سن لیجئے۔

⑤ اصول کافی باب النکت فی الولایۃ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ وِلَایَتُنَا وِلَایَةُ اللّٰهِ الَّتِیْ لَمْ یُبْعَثْ نَبِیٌّ قَطُّ اِلَّا بِهَا ہماری ولایت اللہ کی ولایت ہے

کہ اس کے بغیر کوئی نبی مبعوث نہ ہو سکا۔

⑥ آپ نے فرمایا مَا مِنْ نَبِیٍّ جَاءَ قَطُّ اِلَّا بِمَعْرِفَةِ حَقِّنَا وَ تَفْضِیْلِنَا عَلٰی مَنْ سِوَانَا کبھی کوئی نبی نہیں آیا۔ مگر یہ کہ وہ ہماری معرفت رکھتا تھا اور ہماری دوسروں پر فضیلت کا قائل تھا۔

⑦ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا۔ وِلَایَةُ عَلِیٍّ مَکْتُوْبَةٌ فِیْ جَمِیْعِ صُحُفِ الْاَنْبِیَاءِ وَلَمْ یَبْعَثِ اللّٰهُ رَسُوْلًا اِلَّا بِنُبُوَّةِ مُحَمَّدٍ وَ وَصِیَّةِ عَلِیٍّ۔ حضرت علیؑ کی ولایت تمام صحفِ انبیاء میں فرض کی گئی ہے اور خدا نے کوئی نبی نہیں بھیجا۔ مگر حضرت محمدؐ کی نبوت اور علیؑ کی وصایت کے ساتھ۔

⑧ اہلِ سنت کی مشہور و معروف کتاب ینابیع المودۃ مصنفہ ملا سلیمان حنفی نقشبندی سے مروی ہے لَمْ یُبْعَثْ نَبِیٌّ قَطُّ اِلَّا بِوِلَایَةِ عَلِیٍّ کوئی نبی نہیں مبعوث ہو سکا، مگر ولایتِ علیؑ کے ساتھ۔ ان سب روایات میں عہدِ میثاق کی تفصیل ہے۔ بہر کیف اس عہد کی نوعیت جو بھی ہو۔ توحید خداوندی اور نبوت محمد مصطفےٰؐ اور ولایت آلِ محمدؐ اس عہد کا موضوع خاص تھا اور ہمارا یہی عقیدہ ہے۔

عام انسانوں کے عہد الست کے متعلق جو ہم نے تاویل کی ہے ممکن ہے۔ بعض روایات اس تاویل کو قبول نہ کریں۔ اصبغ بن نباتہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ابن کوا خدمتِ شاہِ ولایت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے بھی خدا نے کسی آدم زادہ سے بات کی ہے تو آپ نے فرمایا ہاں۔ اس نے اپنے تمام بندوں کے ساتھ بلا امتیاز نیک و بد کلام کیا ہے اور سوال و جواب ہوا ہے یہ سن کر ابن کوا حیران رہ گیا اور اس کو حقیقت معلوم نہ ہو سکی اور پوچھا کہ کیسے؟ آپ نے آیت الست پڑھ دی۔ اس کے بعد سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا جب بندوں نے اس کی ربوبیت کا اقرار کر لیا تو رسولوں نبیوں وصیّوں کو علیحدہ کر کے لوگوں سے ان کی اطاعت کا عہد لیا پھر فرشتوں نے شہادت دی تاکہ بعد میں عذر نہ کر سکیں۔ (برہان)

بہر کیف اس موضوع پر روایات بکثرت وارد ہیں اور چونکہ مشکلات میں سے ہیں لہٰذا سرِ تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہیں۔ عہدِ میثاق پر ایمان ہے خواہ اس کی کیفیت جو بھی ہو۔ ہم اپنی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے آگے جانا ہمارے بس سے باہر ہے واللہ عالم بالحقائق۔

سلسلہ اولادِ آدمؑ

مجوسی لوگ چونکہ ماں بہن کے نکاح کو جائز سمجھتے ہیں لہٰذا وہ اس کے جواز میں حضرت آدم علیہ السّلام کے بیٹوں اور بیٹیوں کے باہمی نکاح کو بطور سند کے پیش کرتے ہیں اور وہ مسلمان جنہوں نے خانوادۂ عصمت و دُودمانِ رسالت سے علوم حاصل نہ کئے انہوں نے عقائد میں ایسی چیزیں داخل کر لیں جو تعلیماتِ اسلامیہ کی سراسر منافی ہیں۔ پس اس مقام پر بھی ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بھائیوں بہنوں کی اولاد ہیں سارے بنی آدمؑ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے جب اس صورتِ حال کا ذکر ہُوا تو آپ نے فرمایا کہ سب نااہل لوگوں سے علم حاصل کرنے کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے مجوسی گروہ کے مسائل اپنے مسلّمات میں داخل کر لئے اگر ایسی بات ہو تو مقصد یہ ہُوا کہ تمام انسان جن میں نبی رسول اور اولیاء سب داخل ہیں گویا بھائی بہنوں کے نکاح کی پیداوار ہیں۔ حاشا و کلّا بلکہ جس خدا نے حرام کو حرام کیا اس خدا نے حلال کا بندوبست بھی خود فرمایا۔ چنانچہ اس نے اولادِ آدمؑ کے لئے حوروں کا انتظام فرمایا یا بعض روایات میں ہے قوم جنّات کی مسلمان لڑکیوں کا انتظام کیا اور اس طرح سے آدم کی اولاد اور اس کی نسل کا سلسلہ قائم ہُوا۔ معصومین سے اس بارے میں احادیث بکثرت وارد ہیں۔

مضمون سب کا یہی ہے کہ بھائی بہنوں کا نکاح ہمیشہ سے باطل رہا ہے اور کسی نبی کی شریعت میں اس کی اجازت نہیں دی گئی اور تمام شیعہ علماء اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ سلسلہ اولادِ آدم بھائی بہنوں کے نکاح سے نہیں بلکہ حوروں یا جنّوں کی لڑکیوں کے نکاح سے شروع ہُوا اور قرآن مجید میں جو یہ لفظ ہے کہ خدا نے تم کو نفسِ واحد سے پیدا کیا وہ اس لئے درست ہے کہ عرف میں اولاد صرف باپ کی طرف ہی منسوب ہوا کرتی ہے اور باپ سب کا ایک ہے لہٰذا زوجہ یا بہوؤں کا شمار غیر ضروری ہے۔ ہم نے تفسیر کی چوتھی جلد میں اس کی مزید وضاحت کی ہے۔

سجدہ تعظیمی

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے خدا کے کسی کا سجدہ جائز نہیں نہ عبادتی نہ تعظیمی نہ کسی امام کے لئے اور نہ نبی و ولی کے لئے سرکارِ رسالتمآب کی حدیث ہے کہ اگر کسی کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے مردوں کو سجدہ کریں تو ظاہر ہے کہ آپ عبادتی سجدہ کے لئے نہیں فرما رہے بلکہ تعظیمی سجدہ

کے متعلق ہی ارشاد ہے بعض لوگوں نے اپنی غلط روش پر ڈٹے رہنے کے لئے حضرت آدمؑ کے سامنے فرشتوں کے سجدہ کو یا حضرت یوسفؑ کے سامنے اس کے بھائیوں کے سجدہ کو دلیل بنالیا۔ حالانکہ ان کا استدلال صرف باطل کی طبع سازی ہے کیونکہ احادیث میں صراحت موجود ہے کہ سجدہ اللہ کا تھا اور آدمؑ کو بحیثیت قبلہ کے سمجھا گیا تھا اور اس میں آدمؑ کا احترام ملحوظ تھا اسی طرح حضرت یوسفؑ کا احترام کرتے ہوئے اس کے بھائیوں نے سجدہ شکر اللہ کا کیا۔ جیسے ہم لوگ مسلمان سجدہ اللہ کا کعبہ کو قبلہ سمجھ کر کرتے ہیں اور کعبہ کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ہم ہرگز ہرگز کعبہ کا سجدہ تعظیمی نہیں کرتے اور جو ایسا کرے وہ یقیناً کافر ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ گذشتہ شریعتوں میں سجدہ تعظیم کو جائز قرار دیا گیا ہو لیکن ہمارا قرآن گذشتہ شرائع کا ناسخ ہے۔ لہذا گذشتہ امتوں کے افعال کا قرآن میں مذکور ہونا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ ہماری شریعت میں جائز ہو جس طرح حضرت یحییٰؑ کے بغیر شادی کے رہنے کی قرآن نے تعریف کی ہے حالانکہ شریعت اسلامیہ میں بغیر شادی کے رہنا قابل تعریف نہیں بلکہ شادی کرنا سنت مؤکدہ ہے اور تفسیر لوامع التنزیل سے منقول ہے کہ گذشتہ امتوں میں تعظیمی سجدہ جائز تھا لیکن اسلام نے اسے منسوخ کر کے اس کی جگہ سلام کو مقرر کیا چنانچہ ارشاد قدرت ہے وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا یعنی جب تم کو سلام دیا جائے تو اس جیسا سلام رد کرو یا اس سے اچھا کر کے رد کرو اور شیعہ و سنی تفاسیر اس امر میں متفق ہیں۔ بنابریں شیعہ پر یہ اعتراض کرنا کہ یہ لوگ آئمہ کی ضرائح مقدسہ کا سجدہ کرتے ہیں اتہام عظیم اور بہتان جسیم ہے شیعہ مذہب شرک کی جملہ آلائشوں سے بالکل پاک و پاکیزہ ہے البتہ جو لوگ بے علمی اور غفلت سے ایسا کرتے ہیں ان کا فعل شیعہ مذہب پر نہیں تھونپا جا سکتا بلکہ شیعہ مذہب تو اس قدر محتاط ہے کہ اگر آئمہ معصومینؑ کی ضرائح میں انسان نماز پڑھے تو حکم ہے کہ سر کی جانب کھڑے ہو کر پڑھے تاکہ یہ وہم تک نہ گزرے کہ اس کا سجدہ یا نماز صاحب ضریح کی عبادت ہے اور نماز ہدیہ معصوم پڑھنے کے بعد جو آئمہ سے دعا منقول ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اے اللہ میرا سجدہ رکوع نماز صرف تیرے لئے ہی ہے۔ اور تیرا اس میں کوئی شریک نہیں کیونکہ نماز رکوع و سجود تیرے بغیر کسی کے لئے جائز نہیں ہے اور سوائے تیرے کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ صَلَّيْتُ وَلَكَ رَكَعْتُ وَلَكَ سَجَدْتُ وَحْدَكَ

لَوْ فَقَدْنَاكَ لَكَ فَإِنَّهُ لَا تَجُوْزُ الصَّلٰوةُ وَالرُّكُوْعُ وَالسُّجُوْدُ اِلَّا لَكَ الخ

رجعت کا عقیدہ

رجعت پر بہت کافی آیات دلالت کرتی ہیں۔ جن میں سے بعض اثباتِ مہدی کے بیان میں ذکر کی جا چکی ہیں۔ اور موت کے بعد دوبارہ زندگی کی امم سابقہ میں روایات موجود ہیں حضرت عزیرؑ مرکر دوبارہ زندہ ہوئے اور زندہ رہے اور حضرت عیسیٰؑ نے باذنِ خدا جن مردوں کو زندہ کیا وہ ایک وقت تک دنیا میں زندہ رہے اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ جانے والے جب تجلی سے مرے تھے تو موسیٰؑ کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوکر دنیا میں آباد ہوئے تھے۔ اور اس کی مثالیں کافی ہیں پس اس قدر عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام ضرور تشریف لائیں گے اور بفرمانِ رسولؐ ظلم و جور کے بعد دنیا کو امن و سکون کا گہوارہ بنا دیں گے حضرت عیسیٰ ان کی آمد پر چرخ چہارم سے اتر کر ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے خالص مومنین دوبارہ زندہ ہوکر ان کی خدمت کی سعادت حاصل کریں گے اور دشمنانِ آلِ محمدؐ سے وہ انتقام بھی لیں گے چنانچہ بڑے بڑے دشمن زندہ ہوکر ان کے سامنے پیش ہوں گے اور ان پر ان کے جرم کی نوعیت کے ماتحت حدود شرعیہ کا اجرا ہوگا۔ بس اس باب میں اجمالی عقیدہ ہی کافی ہے اور روایات میں ہے کہ اصحابِ بدر کے برابر مومنین ان کے اصحاب خاص ہوں گے۔ پہلے پہل بیت اللہ میں ظہور ہوگا حجرِ اسود کے ساتھ پشت لگا کر اعلان کریں گے اور جبرئیل ندا کرے گا جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا پس ہر جگہ کے مومنین کھچ کر وہاں پہنچ جائیں گے۔ بعض بادل پر سوار ہوکر بعض طے ارض کرکے اور بعض گھر میں سوئیں گے اور صبح کو بارگاہِ امام میں اٹھیں گے۔ دستورِ الٰہی کے مطابق دنیا والے ترقی کی جس قدر منازل کو عبور کر چکے ہوں گے ان کا معجزہ ان کی طاقتوں سے بالاتر ہوگا وہ حق کا پیغام پہنچائیں گے اور نہ ماننے والوں سے درگذر نہیں ہوگا بلکہ اتمام حجت کے بعد ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ بہر صورت وہ تلوار لے کر آئیں گے اور حکمران بن کر آئیں گے اور یہ تحدید کرنا کہ فلاں سال یا فلاں وقت ان کی تشریف آوری ہوگی کسی کے بس میں نہیں ہے امام وقت خود بھی منتظر ہے کہ حکم خدا کے اور میں ظہور کروں جس طرح ہم منتظر ہیں کہ وہ جلد تشریف لائیں اور روایات میں ملتا ہے کہ ایسے زمانہ میں اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنے والے مومن گذشتہ مومنوں سے افضل ہوں گے

اَللّٰهُمَّ عَجِّلْ فَرَجَ مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ

تناسخ

شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہ نے رسالہ اعتقادیہ میں فرمایا کہ اَلْقَوْلُ بِالتَّنَاسُخِ بَاطِلٌ وَّمَنْ دَانَ بِالتَّنَاسُخِ فَهُوَ كَافِرٌ لِاَنَّ فِي التَّنَاسُخِ اِبْطَالَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ **ترجمہ:** تناسخ کا قول کرنا غلط ہے اور جو شخص تناسخ کا عقیدہ رکھتا ہے وہ ہمارے نزدیک کافر ہے کیونکہ تناسخ کے عقیدہ کو جنت و دوزخ کا بطلان لازم ہے کیونکہ عقیدہ تناسخ کا دارو مدار اسی تصور پر ہے کہ نیک کو جزاء اور بد کو سزا ضرور ملنی چاہیئے اور چونکہ دنیاوی زندگی میں تو یہ نوبت آتی نہیں۔ لہذا تناسخ کے قول کو مذہب بنایا گیا تاکہ لوگ آئندہ کے برے جنم سے خوفزدہ ہو کر جملہ غلط کاریوں سے بچ سکیں اور اچھے جنم کی خاطر نیک کام بجالائیں پس تناسخ کا عقیدہ دوزخ و جنت کے انکار پر ہی مبنی ہے۔ اور چونکہ جنت و جہنم کا انکار نبی و قرآن کا انکار ہے لہذا تناسخ کا عقیدہ کفر ہے اور علماء امامیہ کا بلااختلاف یہی عقیدہ ہے۔

نیز تناسخ کے عقیدہ کی بناء روحوں کے قدیم ہونے پر ہے اور ان کے قِدَم کے بطلان کو ہم واضح کر چکے ہیں۔ نیز تناسخ کی صورت میں ضروری ہے کہ انسانوں کی تعداد ہر دَور میں برابر رہے لیکن ہر روز کی ترقی بتلاتی ہے کہ روحیں الگ الگ ہیں نیز ایک جسم سے منتقل ہونے کے بعد دوسرے جنم میں پہنچ کر انسان کو پہلے جنم میں پوری نہیں تو ادھوری ہی سہی کچھ نہ کچھ سرگذشت یاد ہونی چاہیئے تھی حالانکہ کسی کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا تو معلوم ہوتا ہے کہ روحیں جنم نہیں بدلتیں بلکہ ہر روح ایک ہی دفعہ ایک جسم میں قیام کرتی ہے۔ اور اس سے الگ ہونے کے بعد وہ اپنے مقام جزا و سزا کی طرف چلی جاتی ہے اور وہ عالم [illegible] ہے ہم [illegible] تعل ہونا پہلے جنم کی جزا یا سزا کے لئے ناکافی ہے [illegible] خداوند کریم نے اپنی قدرت کاملہ سے جس طرح پہلی دفعہ تمام انسانوں کو پیدا کیا اسی طرح ہر انسان کی جزا یا سزا کے لئے ایک دوسرا عالم اس نے مقرر کیا ہے کہ اس میں سب کو دوبارہ زندہ کرے گا جزا والوں کو بطور انعام جنت دے گا اور سزا والوں کو بطور عقوبت کے جہنم میں بھیجے گا۔

مرتد فطری و مرتد ملی

مرتد فطری وہ ہے جو اپنی فطرت اصلیہ سے پیچھے ہٹ جائے کیونکہ ہر بچے کی فطرت تو ہے اسلام لیکن اگر کسی

کی تربیت اسی فطری دین پر ہوئی لیکن جوانی کے بعد وہ اس دینِ فطرت کو چھوڑ کر اسلام کے علاوہ کوئی اور دین قبول کرے تو وہ مرتد فطری کہلاتا ہے اور اگر وہ کافر سے مسلمان ہو کر پھر کافر ہوا ہو تو اس کو مرتد ملی کہتے ہیں ۔ علمائے امامیہ کے نزدیک مرتد ملی کی توبہ اتفاقاً مقبول ہے دنیاوی معاملات میں بھی اور اخروی لحاظ سے بھی لیکن مرتد فطری کے متعلق اختلاف ہے بعض علماء اس کو بھی مرتد ملی کی طرح مقبول التوبہ جانتے ہیں اور بعض کے نزدیک قطعاً اس کی توبہ مقبول نہیں اور بعض کے نزدیک دنیاوی معاملات میں مقبول نہیں یعنی اس پر کفر کے احکام طاری رہیں گے اور وہ واجب القتل ہوگا ۔ لیکن آخر میں اس کی توبہ کا اثر یہ ہوگا کہ اس کی لغزش قابلِ عفو ہوگی لیکن خدا کی رحمت واسعہ اور توبہ کی مقبولیت کی ادلہ کی عمومیت کے پیشِ نظر آخری قول صحیح ہے ۔

نواں باب

عالم برزخ کا بیان

موت کا بیان

شیخ صدوق نے اعتقادیہ میں موت کے متعلق فرامین آئمہ و اقوالِ علماء جو نقل کیے ہیں ان کا ترجمہ بیان نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ایک دفعہ حضرت امیر علیہ السلام کی خدمت میں کسی نے عرض کی مولا! موت کو بیان کیجیے آپ نے فرمایا تم نے ایسے شخص سے پوچھا ہے۔ جو اس سے آگاہ ہے۔ سنئیے موت کے نتائج تین طرح کے ہوتے ہیں یا تو دائمی نعمات کی بشارت ہوگی یا دائمی عذاب کی اطلاع ہوگی یا خوف و ہراس لاحق رہے گا اور اس کا نتیجہ مبہم ہوگا اسے نہ پتہ چل سکے گا کہ میرا حشر کیا ہوگا۔ بہرکیف جو ہمارا دوست اور فرمانبردار ہے وہ تو دائمی نعمات کی خوشخبری حاصل کرے گا اور جو ہمارا دشمن و مخالف ہوگا اس کو دائمی عذاب کا پیغام ملے گا اور جس کا نتیجہ مبہم ہوگا وہ وہ ہوگا جو مومن ہونے کے باوجود اپنے نفس پر نافرمانی کی وجہ سے ظلم کرنے والا ہوگا تو اسے پتہ نہ ہوگا کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ ایسے شخص کو خدا ہمارے دشمنوں کے ساتھ نہ ملائے گا۔ بلکہ آخرکار اس کو ہماری شفاعت کی وجہ سے جہنم سے نکال دے گا پس عمل کرو اطاعت کرو سستی نہ کرو اور اللہ کے عذاب کو معمولی نہ سمجھو کیونکہ کوتاہی کرنے والوں میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جن کو ہماری شفاعت خدائی عذاب میں تین لاکھ سال رہنے کے بعد پہنچے گی۔

امام حسن علیہ السلام سے موت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا موت مومنوں کے لئے سب سے بڑی خوشی ہے جب کہ تکلیفوں کے گھر سے نکل کر دائمی نعمات میں جائیں گے اور کافروں کے لئے سخت عذاب کی باعث ہے جب کہ وہ اپنی جنت سے نکل کر دائمی عذاب کی طرف منتقل ہوں گے۔

حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا معاملہ کربلا میں جب سخت ہوا تو آپ کے ساتھیوں نے آپ کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھا تو آپ کے اطمینان بھرے چہرہ کو دیکھ کر محو حیرت ہو گئے کیونکہ جب مصیبت بڑھتی تھی تو ان کے رنگ بدل جاتے تھے جوڑ لرزتے تھے دل دھڑکتے تھے اور جگر کانپتے تھے لیکن حسین بمعہ چند خواص کے ان کی حالت یہ تھی کہ رنگ نکھرتا تھا اعضاء مطمئن تھے اور طبائع میں سکون تھا تو وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ دیکھو آپ کیسے اطمینان سے ہیں کہ انہیں موت کی پرواہ ہی نہیں ہے تو امام نے ان سے فرمایا۔ اے شریف زادو! موت تو ایک پُل ہے جس کی بدولت سختی و تکلیف سے نکل کر وسیع باغات اور نعماتِ ابدیہ کی طرف عبور کر جانا ہے پس قید خانہ سے عمدہ محلات کی طرف جانا کون نہیں چاہتا؟ البتہ وہ لوگ جو تمہارے دشمن ہیں وہ اس طرح ہیں جیسے محل چھوڑ کر دردناک عذاب اور دائمی قید کی طرف جا رہے ہوں مجھے اپنے باپ نے میرے نانا سے نقل کر کے فرمایا ہے کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے اور موت پُل ہے مومن اس سے گزر کر جنت میں جائے گا۔ اور کافر اس سے گزر کر دوزخ میں جائے گا نہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے اور نہ میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ موت کیا چیز ہے تو آپ نے فرمایا کہ مومن کے لئے تو اس طرح ہے جس طرح میلے کپڑے اور جوؤں بھرے چیتھڑے اتار دے اور زنجیروں و بیڑیوں کی مصیبت سے چھوٹ جائے۔ اور اس کے بدلہ میں عمدہ خوشبودار لباس بہترین سواریاں اور دلکش مکانات اس کو مل جائیں اور کافر کے لئے اس طرح ہے جیسے عمدہ لباس اور عالی شان محلات اس سے چھن جائیں اور اس کے بعد میں میلے اور درشت کپڑے اجاڑ مکان اور سخت ترین عذاب اس کو نصیب ہو۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے موت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا روزمرہ کے آنے والی نیند ہے اور یہ کہ اس کی مدت لمبی ہو گی اور قیامت سے پہلے جاگنا نہ ہو گا بعض لوگ نیند میں خوشی دیکھتے ہیں جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور بعض غمی دیکھتے ہیں جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا تو موت کے بعد دائمی خوشیوں اور غمیوں کا خود ہی اندازہ کرو

کہ ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ موت کا معنی سمجھائیے تو آپ نے فرمایا مومن کے لئے اس طرح ہے جس طرح عمدہ خوشبو سونگھنے کے بعد اس کی طبیعت میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے جس سے اس کے بدن سے ہر قسم کی تھکاوٹ وکوفت دُور ہوجاتی ہے اور کافر کے لئے سانپ اور بچھو کے ڈسنے کے برابر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے کسی نے کہا کہ حضورؑ! بعض لوگ کہتے ہیں کہ موت آرے سے چیرے جانے قینچی سے کترے جانے پتھر سے پسے جانے اور آنکھوں پر چکی کا کیل گھمانے سے بھی سخت تر ہے پھر پوچھا گیا کہ بعض اوقات ہم کافر کی موت آسان دیکھتے ہیں کہ وہ ہنستا باتیں کرتا اور بولتا ہوا خاموش ہوجاتا ہے اور مومنوں میں بھی بعض ایسے ہوا کرتے ہیں لیکن مومنوں اور کافروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو سکرات الموت کے وقت سختیاں دیکھتے ہیں آپ نے فرمایا مومن کو موت کے وقت جو راحت پہنچتی ہے وہ اس کا فوری ثواب شروع ہوجاتا ہے اور جو اس کو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں سے چھٹکارے کا باعث ہوتی ہے تاکہ آخرت کی طرف پاک اور صاف ہو کر جائے اور اللہ کے ثواب سے اس کے لئے روکاوٹ کوئی نہ ہو اور کافر کو جو سہولت پہنچتی ہے وہ دنیا میں اس کی نیکیوں کا بدلہ ہوتی ہے تاکہ آخرت کے لئے اس کے پاس سوائے عذاب کے استحقاق کے اور کچھ نہ ہو اور وہ جو اس پر سختی ہوتی ہے وہ نیکیوں کے اختتام کے بعد اس کے عذاب کی پہلی منزل ہوا کرتی ہے کیونکہ خدا عادل ہے ظلم نہیں کرتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک مریض پر پہنچے جب کہ اس کو سکرات کا پسینہ آیا ہوا تھا اس کا بولنا بند ہوچکا تھا۔ لوگوں نے عرض کی حضورؑ! ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارا یہ ساتھی اب کس حالت میں ہے اور موت کس طرح ہے؟ تو آپ نے فرمایا موت ایک صاف کرنے والی چیز ہے مومن کو گناہ سے دھو دیتی ہے کہ یہ آخری تکلیف ہے۔ جو اسے پہنچ رہی ہے اور آخری گناہ کا کفارہ ہے جو وہ ادا کر رہا ہے اور کافروں کو نیکی سے دھو دیتی ہے پس یہ ان کی آخری لذت و نعمت ہوا کرتی ہے اور آخری راحت ہے جو ان کو پہنچتی ہے بہرحال۔ تمہارا یہ ساتھی گناہوں سے دھل چکا ہے

اور ایسا صاف ہوا ہے جیسے کپڑا میل کچیل سے صاف ہو جایا کرتا ہے اور جنت میں ہم اہلبیتؑ کی ہمسائیگی کے قابل ہو گیا ہے۔

امام علیؑ رضا علیہ السلام کے صحابہ میں سے ایک شخص بیمار ہُوا۔ آپ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے فرمایا کیا حال ہے؟ تو اس نے عرض کی حضورؑ! آپ کے چلے جانے کے بعد میں تو مر چکا تھا یعنی سخت تکلیف میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ کیسے؟ تو اس نے جواب دیا کہ بے حد تکلیف دیکھی ہے آپ نے فرمایا تو نے موت نہیں دیکھی بلکہ تو نے ایسی حالت دیکھی ہے جس نے تجھے ڈرایا ہے اور موت کا کچھ حال سمجایا ہے دیکھو لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو موت کی وجہ سے راحت پاتے ہیں اور دوسرے وہ جن کی موت سے لوگوں کو راحت مل جاتی ہے پس توحید و ولایت و نبوت کے ایمان کو تازہ کر لو کہ راحت پانے والے بنو پس اس نے ایسا ہی کیا۔ لمبی حدیث سے بقدر ضرورت حصّہ لیا گیا ہے۔

امام محمد تقی علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ لوگ موت سے کیوں گھبراتے ہیں تو آپ نے فرمایا اس لئے کہ وہ موت سے جاہل ہیں اگر اس کو جانتے ہوتے۔ اور اللہ کے دوستوں سے ہوتے تو یقیناً اس سے محبت کرتے اور جانتے کہ آخرت اس کے لئے دنیا سے بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا اے بندہ خدا بچہ یا دیوانہ دوا سے کیوں گھبراتے ہیں۔ حالانکہ دوا ان کے بدن کو ہلکا کرتا ہے اور تکلیف کو دُور کرتا ہے تو اس نے جواب دیا اس لئے کہ وہ اس کے نفع سے جاہل ہیں آپ نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس نے حضرت محمدؐ کو برحق مبعوث فرمایا ہے جو شخص موت کے لئے اچھی طرح تیار ہو جائے تو دوا کے نفع سے جو مریض کو حاصل ہوتا ہے اس کا نفع زیادہ ہو گا اگر لوگوں کو پتہ ہو کہ موت کے بعد کیا کیا نعمات ہیں تو موت کو چاہتے اور عقل مند بیمار جس کو دوا کے نفع مند ہونے کا یقین ہو اور وہ دوا سے محبت کرتا ہو۔ اس سے بھی زیادہ لوگ موت سے محبت کرتے۔

امام علیؑ نقی علیہ السلام اپنے اصحاب میں سے ایک پر پہنچے کہ وہ رو رہا تھا اور موت سے گھبرایا ہوا تھا آپ نے فرمایا او اللہ کے بندے تو موت سے اس لئے ڈرتا ہے کہ اس کو جانتا نہیں اگر تیرے جسم پر پھوڑے پھنسیاں اور خارش شروع ہو جائے اور تجھے پتہ ہو کہ حمام میں غسل کرنے کے بعد یہ تکالیف ختم ہو جائیں گی تو کیا پھر بھی تجھے

حمام جانے سے کوئی رکاوٹ ہوگی بلکہ غسل کرے گا اور بیماری چلی جائے گی اور جب تک اس سے گھبراتا رہے گا بیماری باقی رہے گی اس نے عرض کی بے شک ٹھیک ہے آپ نے فرمایا بس موت اسی حمام کی مانند ہے اور تیرے گناہوں کے ختم کرنے کے لئے یہی آخری چیز باقی ہے پس جب تو اس میں گھس جائے گا تو ہر غم اور درد سے بچ جائے گا اور ہر قسم کی خوشی اور سرور کو پالے گا پس اس شخص کو سکون ہوا اور اطمینان سے اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ملک بقا کی طرف راہی ہوا۔

امام حسن عسکری علیہ السّلام سے موت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ کہ موت ان چیزوں کی تصدیق ہے جو ابھی تک واقع نہیں ہوئیں فرمایا مجھے اپنے باپ نے اپنے باپ دادا سے سنا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے روایت کی ہے کہ مومن مرنے کے بعد بھی میّت نہیں ہوتا بلکہ کافر ہی مردہ ہوا کرتا ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ وہ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے یعنی مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے پیدا کرتا ہے اور فرمایا ایک شخص نبی علیہ السّلام کے پاس آیا۔ اور عرض کی حضور نہ معلوم مجھے موت سے محبت کیوں نہیں ہے؟ آپ نے پوچھا کیا تیرے پاس کچھ مال ہے اس نے عرض کی جی ہاں! آپ نے فرمایا کیا اپنے ذخیرہ آخرت کے لئے بھی کچھ بھیج چکا ہے؟ اس نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا اسی لئے تو تجھے موت اچھی نہیں لگتی۔ ایک شخص نے ابوذر سے پوچھا کہ ہم موت کو کیوں نہیں پسند کرتے۔ تو انہوں نے جواب دیا وجہ یہ ہے کہ تم لوگ دنیا کو آباد کر چکے ہو اور آخرت کو برباد کر چکے ہو اسی لئے ناپسند کرتے ہو آباد سے اجاڑ کی طرف جانے کو۔ پوچھا گیا کہ ہمارا اللہ کے پاس جانا کیسے ہوگا؟ تو جواب دیا نیک آدمی تو اس طرح جائے گا جس طرح کوئی بچھڑا ہوا مسافر اپنے گھر جائے اور گنہگار ایسے جائے گا جیسے بھاگا ہوا غلام گرفتار ہو کر آقا کے پیش ہو رہا ہو۔ پوچھا گیا کہ پھر ہمارا کیا حال ہوگا؟ تو فرمایا تم اپنے اعمال کو کتاب خدا کے آئینہ میں دیکھ لو۔ وہ خود فرماتا ہے نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ ایک شخص نے پوچھا اللہ کی رحمت کہاں جائے گی؟ آپ نے فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

رُوح کی حقیقت

اس میں شک نہیں کہ رُوح کی حقیقت کا سمجھنا ناممکن ہے ارشاد پروردگار ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ

حمام جانے سے کوئی روکاوٹ ہوگی بلکہ غسل کرے گا اور بیماری چلی جائے گی اور جب تک اس سے گھبراتا رہے گا بیماری باقی رہے گی اس نے عرض کی بے شک ٹھیک ہے آپ نے فرمایا بس موت اسی حمام کی مانند ہے اور تیرے گناہوں کے ختم کرنے کے لئے یہی آخری چیز باقی ہے پس جب تو اس میں گھس جائے گا تو ہر غم اور درد سے بچ جائے گا اور ہر قسم کی خوشی اور سرور کو پائے گا پس اس شخص کو سکون ہوا اور اطمینان سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ملک بقا کی طرف راہی ہوا۔

امام حسن عسکری علیہ السّلام سے موت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ کہ موت ان چیزوں کی تصدیق ہے جو ابھی تک واقع نہیں ہوئیں فرمایا مجھے اپنے باپ نے اپنے باپ دادا سے حتاکہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے روایت کی ہے کہ مومن مرنے کے بعد بھی میت نہیں ہوتا بلکہ کافر ہی مردہ ہوا کرتا ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ وہ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے یعنی مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے پیدا کرتا ہے اور فرمایا ایک شخص نبی علیہ السّلام کے پاس آیا۔ اور عرض کی حضور نہ معلوم مجھے موت سے محبت کیوں نہیں ہے؟ آپ نے پوچھا کیا تیرے پاس کچھ مال ہے اس نے عرض کی جی ہاں! آپ نے فرمایا کیا اپنے ذخیرہ آخرت کے لئے بھی کچھ بھیج چکا ہے؟ اس نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا اسی لئے تو تجھے موت اچھی نہیں لگتی۔ ایک شخص نے ابوذر سے پوچھا کہ ہم موت کو کیوں نہیں پسند کرتے۔ تو انہوں نے جواب دیا وجہ یہ ہے کہ تم لوگ دنیا کو آباد کر چکے ہو اور آخرت کو برباد کر چکے ہو اسی لئے ناپسند کرتے ہو آباد سے اجاڑ کی طرف جانے کو۔ پوچھا گیا کہ ہمارا اللہ کے پاس جانا کیسے ہوگا؟ تو جواب دیا نیک آدمی تو اس طرح جائے گا۔ جس طرح کوئی بچھڑا ہوا مسافر اپنے گھر جائے اور گنہگار ایسے جائے گا جیسے بھاگا ہوا غلام گرفتار ہو کر آقا کے پیش ہو رہا ہو۔ پوچھا گیا کہ پھر ہمارا کیا حال ہوگا؟ تو فرمایا تم اپنے اعمال کو کتاب خدا کے آئینہ میں دیکھ لو۔ وہ خود فرماتا ہے نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ ایک شخص نے پوچھا اللہ کی رحمت کہاں جائے گی؟ آپ نے فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

رُوح کی حقیقت

اس میں شک نہیں کہ رُوح کی حقیقت کا سمجھنا ناممکن ہے ارشاد پروردگار ہے يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ

الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۔ لوگ آپ سے رُوح کے متعلق پوچھتے ہیں تو ان کو فرما دیجئے کہ روح امر پروردگار سے ہے اور معصوم کا ارشاد ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا اس کا بھی صاف مطلب یہی ہے کہ رُوح کی کنہِ حقیقت کا جاننا ناممکن ہے جس طرح کہ اللہ سبحانہٗ کی حقیقت ذات کا ادراک، محال ہے۔

لیکن اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَا مُنِعَ مِنْهُ کے ماتحت لوگوں نے جہاں عقل وفہم سے بالاتر دیگر مسائل میں خواہ مخواہ ٹانگ پھنسانے کی کوشش کی ہے وہاں رُوح کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس کو بھی کریدنے میں کمی نہیں کی اور اسی میں ہی اپنا علمی تفوق سمجھ لیا ہے کسی نے کہا کہ رُوح مزاج کا نام ہے کسی نے کہا حرارتِ غریزیہ کا نام ہے کسی نے حرکتِ قلب کو نفس کہہ دیا کسی نے جوہرِ مجرد یا مخلوط کا نام رکھ لیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے مسلک پر دلائل و براہین کے انبار لگانے کی کوشش کی ۔ لیکن اس میں سوائے اپنی برتری جتلانے کے اور ذرہ بھر فائدہ نہیں ہے ۔ جب قرآن مجید نے ایک فیصلہ کر دیا پس اسی پر خاموشی اختیار کر کے ان بے فائدہ موشگافیوں کی بجائے ایسا قدم اٹھانا بہتر ہے جو کسی حد تک نتیجہ خیز ہو۔

اس مقام پر رُوح سے مراد قرآن یا وحی یا ایمان یا نور وغیرہ مجازی معانی نہیں ہیں اور نہ ملائکہ یا جبرئیل اور نہ کوئی مخصوص مخلوق جو ملائکہ کے مقابلہ میں ہے بلکہ اس مقام پر رُوح سے مراد وہ جوہرِ فعال ہے جو انسان کے بدن میں اس کی تدبیر کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اسے کسبِ کمال کی طرف تحریک کرتا ہے اس کی معرفت متعدد وجوہ سے معرفت پروردگار کا درس دیتی ہے اس چھوٹی سی کائنات میں اس کی ضرورت بڑی کائنات میں وجودِ خدا کی ضرورت کی برہان ہے اس چھوٹی کائنات میں اس کی وحدت اس بڑی کائنات میں خدا کی وحدانیت کی دلیل ہے ۔ عالمِ اصغر کے لئے اس کی تدبیر عالمِ اکبر میں اس کی تدبیرِ متقن کو واضح کرتی ہے ۔ یہاں اس کی کنہِ حقیقت سے عاجزی وہاں اس کی کنہ حقیقت کے ادراک کے محال ہونے کی دلیل ہے جس طرح جسم کی حرکات اس کے وجود پر دال ہیں اگر وہ نہ ہوتا تو جسم ساکن یعنی مردہ ہو جاتا اسی طرح کائنات اکبر میں تمام کارخانہ جات الٰہیہ کا مصروفِ کار ہونا اس قادرِ حکیم مدبر کے ۔ وجود کا پتہ دیتا ہے کہ اگر

وہ نہ ہوتا تو یہ کچھ نہ ہوتا اور اس سے قبل اس کے متعلق بہت کچھ بیان ہو چکا ہے اور غور و فکر کی پشت پر سوار ہو کر عقل و فہم جس قدر جولان لگائے گا اسی قدر ہی انکشافات میں اضافہ ہوگا اور معرفتِ پروردگار کی راہیں کھلتی جائیں گی اور انسانی عرفانی ترقیاتی منصوبہ سب کا سب اسی جوہرِ قدسی کا ممنون ہے جسے روح کہا جاتا ہے اور اس کی حقیقت سوائے پروردگارِ عالم کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اس مقام پر رُوح و نفس ایک ہی معنی میں ہے اور ارواحِ انسانیہ اور نفوسِ انسانیہ سے ایک ہی مطلب لیا جاتا ہے اگرچہ رُوح اور نفس میں اپنے مقام پر اطلاقاتِ متفرقہ کے لحاظ سے عام و خاص من وجہ کی نسبت ہے۔ وجودِ باری اور اس کی توحید کے اثبات کے بعد جس طرح مادہ، طبیعت وغیرہ کے قدیم ہونے کا بطلان خود بخود ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نفس کے قدیم ہونے کا نظریہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے الگ بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں احادیث میں نفوسِ انسانیہ کی تخلیق کا ابدان سے پہلے ہونا مذکور ہے چنانچہ روزِ ازل کے عہد و میثاق کی حدیثیں بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ حقیقتِ حال کو خدا بہتر جانتا ہے اور وہ جانتے ہیں جن کو خدا نے علم دیا۔ بہرکیف اس کا حادث ہونا اس طرح بدیہی ہے جس طرح خدا کا ثبوت بدیہی ہے۔

رُوح کی بقاء کے متعلق اعتقادیہ میں شیخ صدوقؒ نے فرمایا ہے۔ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ رُوح کو بقا کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ فنا کے لئے اور حضورؐ کا ارشاد ہے مَا خُلِقْتُمْ لِلْفَنَاءِ بَلْ خُلِقْتُمْ لِلْبَقَاءِ یعنی تم فنا کے لئے نہیں بلکہ بقاء کے لئے پیدا کئے گئے ہو اور موت کے بیان میں آئمہ طاہرینؑ سے جس قدر احادیث نقل کی گئی ہیں۔ ان سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ موت کے بعد رُوح کو یا تو سعادتِ دائمی نصیب ہوگی اور یا شقاوتِ ابدی اس کو ملے گی۔ پس موت روح اور بدن کے افتراق کی تعبیر ہے۔ اگر خدا چاہے تو اس کو بھی فنا کر سکتا ہے لیکن وہ اپنے لطف سے اس کو فنا نہیں کرتا پس مومن کی رُوح وادیٔ سلام میں اور کافر و منافق کی رُوح وادیٔ برہوت میں تا قیامت رہے گی۔ پھر حشر و نشر و حساب ہوگا۔

فلسفہ موت و حیات

دنیا کی ہر چیز میں اختلاف ہے اور دینی مسائل میں بھی ہر طرح کا اختلاف موجود ہے لیکن موت ایسی چیز

جس میں کسی فرد کو مجالِ انکار نہیں خواہ وہ کسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہو

انسان اپنے مقام پر زندگی اور موت دونوں میں مجبورِ محض ہے نہ وہ اپنی پیدائش میں مختار نہ زندگی میں اس کو اختیار اور نہ موت میں وہ مختار ہے ان تمام بے بسیوں میں گرفتار ہونے کے بعد رہائشِ دنیاوی کے مختصر وقت میں اسے کچھ اختیار دیا گیا ہے۔ اب ذی ہوش و صاحبِ بصیرت کو سوچنے کا موقعہ دیا گیا ہے کہ جس طرح تیرا آنا تیری مرضی کے بغیر تھا اسی طرح تیرا جانا بھی تیری مرضی پر موقوف نہ ہوگا۔ لہٰذا درمیانی اختیاری منزل کو ایسے اچھے انداز سے نبھایا جائے جو بعد میں آنے والی منزل کے لئے مفید ثابت ہو سکے ورنہ ان دو طرفہ بے اختیاریوں کے درمیان اختیار دیئے جانے کا مقصد ہی کیا ہے حکیمِ مطلق اپنی مبارک و مقدس کتاب میں ارشاد فرماتا ہے هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا اس اللہ نے زندگی و موت کو پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے نیک کام کون کرتا ہے؟ موت کے بعد سعادتِ ابدیہ یا شقاوتِ دائمہ اس زندگی کے لمحاتِ اختیاریہ کی کارکردگی کے نتائج ہیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ پروردگارِ عالم نے اس آیتِ مجیدہ میں مقصدِ زندگی کی نشاندہی فرمائی ہے

آمد و رفت کی غیر اختیاری سرحدوں کے درمیان جس نے ان لمحاتِ اختیاریہ کا مقصد سمجھ لیا کہ میں بھیجا گیا ہوں اور مجھے پھر اس مقام سے کھینچ لیا جائے گا۔ پس درمیان کے حصہ میں آزاد نہیں ہوں بلکہ غلام ہوں بس مجھے اس طرح رہنا چاہیئے جس طرح غلام رہا کرتے ہیں تاکہ اس چند روزہ آزادی میں با اختیار غلامی کے فرائض ادا کرکے اپنے آقا کے حضور میں سرخرو ہو کر پلٹوں اور اسی مصلحت کے ماتحت اس نے موت کا وقت بھی کسی کو نہیں بتایا تاکہ ہر وقت اسے یہ احساس رہے کہ نامعلوم وہ آقا کس وقت واپس بلا لے؟ لہٰذا اپنے جملہ اعضاء کو اسی کی ہی مرضی پر منحصر رکھے اور جس نے مقصدِ زندگی یہی سمجھا اور اسی سانچے میں اپنے اعمال کو ڈھالنے کی کوشش کی تو وہ یقیناً کامیاب ہوا لیکن جس نے غیر اختیاری دو طرفہ حدوں کو نظر انداز کرکے درمیانی چند روزہ اختیاری لمحات کو بغاوتِ مولا کے لئے وقتِ غنیمت سمجھا پس جو چاہا کہا جو چاہا کھایا پیا جو چاہا کر گزرا اور قطعاً خیال نہ کیا کہ آخر مجھے بلایا جانا ہے اور مجھے ان لمحاتِ فرصت کے

اعمال کا جواب دہ ہونا ہے تو وہ یقیناً خسارے میں ہے اور اسے نفس کا دھوکہ ہے
حکیم مطلق نے اپنے لطف و کرم سے تنبیہ فرمایا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ
الْكَرِیْمِ ۔ اے انسان تجھے اپنے رب کریم سے کس نے دھوکا دیا ہے پس درحقیقت
وہ انسان جو ان لمحات فرصت کو آوارگی و بے راہ روی کی آماجگاہ سمجھے۔ ہائے کس قدر
غافل ہے انسان کہ گرفتاری کا یقین ہونے کے باوجود ان اعمال زشت کی پرواہ نہیں
کرتا ہے کہ گرفتاری کے بعد انجام نہایت خطرناک ہوگا اور کس قدر غافل ہے انسان کہ
مولا کے پاس پہنچنے کے بعد مولا کی اطاعت کی حسن بازگشت کا یقین ہونے کے
باوجود اس کے انعامات کے استحقاق کی کوشش نہیں کرتا ہیں نیک بخت ہے وہ
جس نے اوقات فرصت کو اپنے مولا کی عبودیت میں بسر کرنے کا شرف حاصل کیا۔

انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ شرف دائمی کے حصول کو کسی قیمت پر ترک نہ
کیا جائے اور ذلت و پستی میں پڑے رہنے کو کسی صورت میں برداشت نہ کیا جائے
بے شک اپنے نفس کی اصلاح کے فریضہ کو ادا کرنا بہت بڑی کامیابی ہے اور سعادت
کا پیش خیمہ ہے لیکن اپنی ساری ہمت کو صرف اسی نقطہ پر محدود رکھنا کوتاہ اندیشی ہے
بلکہ دانشمند و باہمت ارباب عقل و خرد کی فکر و نظر کی پرواز اس مرحلہ سے بہت
بلند ہے وہ اوج رفعت کو سر کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں لیکن صرف ذاتی اصلاح میں محصور نہیں رہتے
بلکہ اپنی خدمات کے اچھے اثرات دور دور تک پھیلا کر وہ بہت سوں کے لئے سعادت
کے حصول کی راہیں ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواہ وہ مالی ایثار سے ہو یا اپنے
اوقات کی پیشکش سے ہو خواہ وہ علمی انداز سے ہو یا عمل کے راستہ سے ہو اور
خواہ تقریر کے ذریعے سے ہو یا تحریر کی صورت میں ہو بہرکیف ایسی خدمت جو قوم
تک کے لئے دنیاوی یا دینی یا ہر دو لحاظ سے سعادت کی تحصیل میں ممد و معاون ہوسکے
اور یہ شرف بہت کم لوگوں کے حصہ میں ہوتا ہے۔ ہاں وہ لوگ جو لمحات زندگی
کو بہار دائمی کی سعادت کے لئے استعمال کرنے پر موفق ہوں اور وہ سمجھیں کہ کونسا
شرف ہے جس کے لئے انسان نے عرصۂ وجود میں قدم رکھا ہے جس تک رسائی کے
لئے ہر ہوشمند کو جد و جہد اور تگ و دو کرنی چاہیئے جو ہر قسم کی کد و کاوش کا متحمل ہونا چاہیئے
کاش انسانیت اور شرافت بشریہ کے خالق کی قسم ایسے لوگ مرجانے کے بعد بھی زندہ

ہیں۔ جن کے فیوض و برکات آنے والی زندہ قوموں اور نسلوں تک کے لئے سعادت و عزت کی منزل تک جانے میں مشعل راہ کا کام دیں۔ پس ایسے لوگوں کی موت ایک پل اور گزرگاہ ہے جس کی بدولت وہ تکالیف دنیاوی سے رحلت کر کے اسی گزرگاہ کے ذریعہ نعیم ابدی اور سعادت دائمہ سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اس مقصد کو نہ سمجھا اور غفلت میں ان قیمتی ساعات کو ضائع کر بیٹھے۔ ان کے لئے موت ہلاکت ابدی اور عذاب الٰہی کی گزرگاہ ہے پس ظاہری رنگ رلیوں خواہش گھیروں اور داشتوں اور حیا سوزیوں کی محدود خوشیوں سے منتقل ہو کر اسی پل کے ذریعے غضب جبار کے دائمی گرفتار ہو گئے ہیں دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ لمحات زندگی میں مختصر سی تکالیف کو آخرت کی دائمی نعمتوں کے مقابلہ میں ہنس کر قبول کر لیا جائے اور اس میں صبر و شکر پر دوگار کرنے والے ثمرات اخروی سے محرومی کو قطعاً قبول نہ کیا جائے اور ان ظاہری خواہشات کو آخرت کے سرور دائمی پر ہرگز ترجیح نہ دی جائے۔ جن کا نتیجہ عذاب دائمی ہو گا۔ اور سابقہ احادیث جو آل محمد سے منقول ہیں۔ ان میں موت و حیات کا یہی فلسفہ مذکور ہے اگر بصیرت سے واسطہ ہو اور بصیرت میں صفائی ہو تو مقصد میں کامیابی یقینی ہے میں نے اسپ قلم کی لگام اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام رکھی ہے۔ حتی الامکان اس کو راہ حق سے ادھر ادھر جانے سے اور میدان کلام کو منفعت کی بے فائدہ جولانگاہ بننے سے پوری طرح روکتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ چند قیمتی موتی سنگریزوں کے ڈھیر میں اور سر پٹ جاتے ہیں ایسا نہ ہو کہ سنگریزوں کی کثرت موتیوں کا بھی وزن دیں لوگوں میں سے جائے۔ لہذا اپنی طرف سے ہر رطب و یابس کو اکٹھا کرنے سے گریز کرتا ہوں اور مطلب تک ہی محدود رہنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔

کافر کی موت

اس میں شک نہیں کہ موت کافر کے لئے دوزخ کا دروازہ ہے اگرچہ وہ بعض اوقات ظاہری طور پر موت کی سختی نہیں دیکھ رہا ہوتا تو وہ صرف دنیا میں اس کی نیکی کی آخری جزا کے طور پر اس کو یہ آسانی دی جاتی ہے جیسا کہ سابقہ روایات میں مذکور ہو چکا ہے لیکن پھر بھی وہ ایک ایسی شدت میں مبتلا ہوتا ہے کہ تمام دنیاوی ظاہری تکالیف اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوتی ہیں اور وہ یہ کہ موت کا پیغام آتے ہی دوزخ کے دروازے اور برے اعمال کی صورت زشت فوراً اس کے

سامنے آجاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اب میں دوزخ کے قید خانہ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا لہٰذا قبض رُوح کی آسانی اس کو آئندہ کی مصیبت دیکھ کر بھول جاتی ہے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ امام حسن علیہ السلام سے ایک یہودی نے عرض کیا تھا کہ دیکھئے میں بدحال ہوں اور آپ خوش حال ہیں حالانکہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کافر کی جنت اور مومن کا قید خانہ ہے آپ نے فرمایا درست ہے کیونکہ کافر جب موت کو دیکھتا ہے اور اس کے سامنے اپنے اعمالِ بد کی صورت آتی ہے اور عذابِ دائمی کو دیکھتا ہے تو دنیا کی تکالیف کو ان کے مقابلہ میں جنت سمجھتا ہے اور مومن جب موت کے وقت اپنے اعمالِ حسنہ کی جزا اور جنت کے دروازے دیکھتا ہے تو نعیم ابدی کے مقابلہ میں اس کو دنیا کی تمام لذات ہیچ معلوم ہوتی ہیں اور دنیا کو اپنے لئے قید خانہ سمجھتا ہے۔

گذشتہ احادیث بھی اس مضمون پر دلالت کرتی تھیں۔ قرآن مجید میں کافر کی موت جس طریقہ سے بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے:-

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ (پارہ ۷ انعام آیت ۹۳)

اگر تم دیکھتے ہوتے جب ظالم موت کی سختی میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہتے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں آج تم کو رسوا کن عذاب کا بدلہ ملے گا کیونکہ تم اللہ پر ناحق باتیں کہتے تھے اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔ آیت ۵۱ انفال پارہ ۱۰

اور اگر تم دیکھتے ہوتے جب فرشتے کافروں کو لینے آتے ہیں تو ان کے منہ اور پیٹھ پر مارتے ہیں اور (کہتے ہیں) چکھو جلنے کا عذاب یہ تمہارے ہاتھوں کے کئے کا بدلہ ہے اور تحقیق اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

مومن کی موت:- مومن کے لئے موت جنت کا دروازہ ہے جیسے سابقہ احادیث میں بیان ہوچکا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

پ۱۱ یونس آیت ۶۴

وہ لوگ جو مومن ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے خوشخبری ہے دنیا میں اور آخرت میں اللہ کے وعدہ میں کوئی تبدیلی نہیں اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر مجمع البیان اور تفسیر جامع میں عقبہ بن خالد سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا اے عقبہ بروز قیامت خداوند کریم بندوں سے کوئی دین نہ قبول کرے گا۔ سوائے اس دین کے جس پر تم ہو اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک میں صرف اتنی دیر ہے کہ رُوح کے نکلنے کے وقت۔ سرہانے پر حضرت رسولخداؐ اور حضرت علیؑ مرتضیٰ پہنچ جائیں گے۔ رسولخداؐ فرمائیں گے میں تیرا رسولؐ ہوں کہ دنیا میں پیچھے چھوڑے ہوئے ترکہ سے میں تیرے لئے بہتر ہوں اور حضرت امیر علیہ السلام فرمائیں گے میں تیرا وہ امام ہوں جس کی تو ولا و محبت رکھتا تھا آج تجھے میری دوستی فائدہ دے گی پھر آپ نے فرمایا میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ثبوت قرآن مجید میں ہے اور آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی کہ اولیاء اللہ کو دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی جائے گی اور حارث ہمدانی کی روایت میں ہے کہ مَنْ يَمُتْ يَرَنِىْ مُؤْمِنًا اَوْ مُنَافِقًا جو بھی مرے مجھے دیکھتا ہے کیونکہ جو بھی مرتا ہے بوقت موت اسے نتیجہ کی اطلاع مل جاتی ہے۔ مومن کے سامنے جنت کا دروازہ اور منافق کافر کے سامنے جہنم کا دروازہ تو کھل ہی جاتا ہے۔ پس مومن کے سامنے جب جنت کا دروازہ کھلا تو اس نے ولائے علیؑ کا ثمرہ دیکھ لیا۔ پس علیؑ اس کو مل گیا اور کافر و منافق کے سامنے جب دوزخ کا دروازہ کھلا تو اس کے سامنے بغضِ علیؑ اور کفر و عناد کا ثمرہ ظاہر ہو گیا۔ پس اس نے بھی علیؑ کو دیکھ لیا۔ یعنی مومن کو علیؑ بصورتِ ثواب ملتا ہے اور کافر و منافق کے لئے دوزخ کا پیغام ہے اور قبر میں بھی یہی صورت پیش آئے گی بلکہ تا قیامت یہی تقسیم رہے گی۔ نیز خداوند کریم جس قدر مقامات پر چاہے ایک ہی وقت میں ان کو حاضر کرنے پر قادر ہے

قبر میں سوال وجواب :- قبر میں سوال وجواب کا اعتقاد مسلمات مذہب میں سے ہے

قبر کا سوال و جواب :- چنانچہ شیخ صدوقؒ اعتقادیہ فرماتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ قبر کا سوال و جواب حق ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں جس نے درست جواب دیا تو اس کے لئے قبر میں راحت اور آخرت میں جنّت ہو گی اور جس نے درست جواب نہ دیا ہو تو اس کے لئے قبر میں سختی اور آخرت میں دوزخ کی سزا ہو گی۔ عذاب قبر کے زیادہ تر موجبات یہ چیزیں ہیں۔ چغل خوری۔ بداخلاقی اور پیشاب کی نجاست سے نہ بچنا اور مخلص مومن پر زیادہ سے زیادہ عذاب قبر اس قدر ہوگا جتنا پلک جھپکنا یا پچھنا لگوانا اور یہ اس کے ان پسماندہ گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ جو دنیاوی غموم و ہموم و امراض وغیرہ کی تکلیفیں جھیلنے کے بعد بچ گئے ہوں گے۔

جناب فاطمہ بنتِ اسد مادر حضرت امیر المومنین علیہ السّلام کے غسل سے جب عورتیں فارغ ہو چکیں تو جناب رسالتمآبؐ نے ان کو اپنی قمیص کا کفن پہنایا اور ان کے جنازہ کو کندھا دیا اور قبر تک تشریف لے گئے اور ان کی قبر میں پہلے خود لیٹے۔ پھر ان کی میت کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر قبر میں رکھا پھر اوپر جھک گئے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور دو دفعہ فرمایا اِبْنُکِ اِبْنُکِ پھر قبر سے باہر تشریف لائے اور مٹی ڈالدی گئی۔ پھر قبر پر جھک گئے اور لوگوں نے سنا کہ آپ نے کلمہ توحید پڑھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پھر کہا اے میرے اللہ میں نے اس کو تیرے سپرد کیا ہے پس واپس چلے گئے۔

مسلمانوں نے دریافت کیا کہ حضور! آج آپ نے ایسے کام کئے ہیں۔ جو آج سے پہلے کبھی نہیں کئے تھے آپ نے فرمایا آج حضرت ابوطالبؑ کے احسانات کا سلسلہ مجھ سے منقطع ہو گیا ہے کیونکہ ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے پاس جو چیز ہوتی تھی اپنی ذات سے اور اپنے بچوں سے مجھے ترجیح دیا کرتی تھیں میں نے ایک دن قیامت کا ذکر کیا تھا کہ لوگ ننگے محشور ہوں گے تو اس نے گھبرا کر کہا تھا وَاسَوْاَتَاہُ تو میں نے ضمانت دی تھی کہ خدا تجھے لباس میں محشور کرے گا اور میں نے فشار قبر کا ذکر کیا تھا تو اس نے گھبرا کر کہا تھا وَاضُغْطَاہُ تو میں نے اس مرحلہ سے اس کی نجات کی ضمانت دی تھی پس اسی بناء پر میں نے اس کو اپنی قمیص میں کفن دیا ہے (تاکہ بروز محشر اسی میں محشور ہو) اور خود اس کی قبر میں لیٹا ہوں (تاکہ فشارِ قبر نہ ہو سکے) اور اس پر جھک

کر اس کو تلقین کرتا رہا ہوں جو اس سے پوچھا جانے والا تھا۔ چنانچہ جب اس سے رب کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے کہہ دیا اَللّٰہُ رَبِّیْ (اللہ میرا رب ہے) جب نبی کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے کہہ دیا کہ محمدؐ میرا نبی ہے لیکن جب ولی و امام کے متعلق سوال ہوا تو خاموش ہو گئیں پس میں نے کہا اِبْنُکِ اِبْنُکِ تو کہہ دے کہ میرا بیٹا میرا امام ہے پس وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ تم پر ہمارا قابو نہیں ہے اب آرام سے سو جاؤ جس طرح دلہن اپنے حجلۂ عروسی میں سویا کرتی ہے پس اس پر دوبارہ موت آگئی (شیخ صدوق فرماتے ہیں) کہ اس دوبارہ کی موت کا قرآن مجید میں ثبوت موجود ہے چنانچہ فرماتا ہے رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَ اَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَهَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ (اہل دوزخ کہیں گے) اے اللہ تو نے ہم کو دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندہ کیا ہے اب جہنم سے نکلنے کی بھی ہماری کوئی صورت ہے؟ اِنْتَهٰی مَا اَفَادَهٗ اکثر احادیث میں ہے کہ انسان اپنے کفنوں میں محشور ہوں گے۔ اسی لئے اچھے کفن دینے کا استحباب ہے۔ پس شاید اس روایت میں ننگے محشور ہونے کا مطلب ہو کہ انسانوں کی نیکیاں یا برائیاں اس دن چھپ نہ سکیں گی۔ یعنی ہر ایک کا کردار عیاں ہوگا اور جناب فاطمہؑ کے لئے حضورؐ کی قمیص ایک خاص عطیہ ہوگی جو میدانِ محشر میں ان کی خصوصی عظمت کا نشان ہوگا۔ واللہ اعلم

جسم سے علیحدگی کے بعد رُوح کا مقام

قفسِ عنصری کی تاروں کو توڑ کر طائرِ رُوح جب آزادی کی وادی میں قدم رکھ لیتا ہے تو بدن سے اس کا رابطہ قائم رہتا ہے اور کافی دیر تک مصاحبت کے بعد یکبارگی فراق کا اس کو احساس رہتا ہے جیسے کوئی آدمی کسی مکان یا شہر میں کافی وقت گزارنے کے بعد وہاں سے چلے۔ تو انس و محبت کے تقاضے اسے بار بار شہر یا مکان کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں اسی طرح روح بھی اپنے ساتھ مانوس بدن کو بار بار حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے اور احادیث میں ہے کہ غسال جب غسل دیتا ہے۔ تو یہ رُوح اُسے دہائی دیتی ہے کہ اس بدن نازنین کو نہایت نرمی سے ہاتھ لگاؤ۔ کیونکہ میرے فراق کے بعد اس میں اتنی سکت نہیں کہ ذرہ بھر سختی بھی برداشت کر سکے

اور میں چونکہ اس بدن کی تلہ تار کو توڑ توڑ کر نکلی ہوں لہٰذا اس کا بند بند جوڑ جوڑ رستہ ہے اور سختی کے برداشت کرنے کی اس میں تاب نہیں تھا کہ رُوح کی یہ رُوح فرسا آواز اگر غسال سُنتے تو ہمیشہ کے لئے میت کو نہلانا چھوڑ دیتے پھر کفن پہناتے وقت بھی رُوح کی اسی قسم کی آواز آتی ہے پھر جب میت کو قبر کی طرف لے جاتے ہیں تو روح ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور تیز چلنے سے منع کرتی ہے کیونکہ اس میں میت کو تکلیف ہوتی ہے پھر قبر میں داخل کرتے وقت بھی روح ساتھ ہوتی ہے اور تلقین کو میت خوب سُنتا ہے قبر کا تعویذ بند ہونے پر یہ رُوح ایک وقت خاص تک دوبارہ جسم کے اندر داخل کر لی جاتی ہے اور سوال وجواب ہوتے ہیں پس درست جواب دینے والا روح بدن سے دوبارہ الگ ہو کر اس بدن کو چھوڑ کر ایک مثالی جسم کے ساتھ وادیٔ سلام میں آجاتا ہے اور غلط جواب دینے والا بدبخت رُوح اپنے بدن سے مستقل الگ ہو کر اسے چھوڑتا ہُوا ایک مثالی جسم کے ساتھ وادیٔ برہوت میں معذب رہتا ہے اور قبر میں مومن سے سوال کرنے کے لئے جو فرشتے آتے ہیں، ان کو مبشر و بشیر کہتے ہیں جو انتہائی خوب روئی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں اور غیر مومن سے پوچھنے کے لئے جو فرشتے آتے ہیں انہیں منکر و نکیر کہا جاتا ہے جو بدصورت ہونے کے علاوہ سختی و درشتی سے پیش آتے ہیں۔ بعض احادیث میں ہے کہ سوال وجواب خالص مومنوں اور خالص کافروں سے ہوگا اور مذبذب لوگ اس سے مستثنا ہوں گے چنانچہ علامہ مجلسیؒ نے انہی احادیث کے ماتحت اپنا یہ عقیدہ ظاہر فرمایا ہے کہ آیاتِ کثیرہ واحادیث مستفیضہ سے یہ ثابت ہے کہ موت کے بعد نفس باقی رہتا ہے اگر خالص مومن ہوگا تو نعمتوں میں اور اگر خالص کافر ہوگا تو عذاب کی سختیوں میں رہے گا اور اگر مستضعفین سے ہوگا تو اسی کو رہنے دیا جائے گا۔ یعنی نہ عذاب اور نہ انعام میں ہوگا بلکہ نیند کی سی غشی اس پر تاقیامت طاری رہے گی اور قیامت کے دن جب اٹھے گا تو پوچھے گا کہ ہمیں کس نے جگایا ہے۔ مَنۡ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا۔

قبر کی تنگ وتاریک فضا میں انسان پر کیا گزرتی ہے۔ اس کو اللہ ہی جانتا ہے حضرت امیر علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ مرنا بھی سخت ہے لیکن موت کے بعد والا مرحلہ موت سے بھی زیادہ سخت تر ہے۔ فَاحۡذَرُوۡا ضِیۡقَهٗ وَ ضَنۡکَهٗ وَ ظُلۡمَتَهٗ

إِنَّ الْقَبْرَ يَقُوْلُ كُلَّ يَوْمٍ اَنَا بَيْتُ الْعُزْلَةِ اَنَا بَيْتُ التُّرَابِ اَنَا بَيْتُ الْوَحْشَةِ اَنَا بَيْتُ الدُّوْدِ وَالْهَوَامِّ الخ پس اس کی تنگی سختی اور تاریکی سے بچو تحقیق قبر ہر روز آواز دیتی ہے۔ میں تنہائی کا گھر ہوں، میں مٹی کا گھر ہوں، میں وحشت کا گھر ہوں اور میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں (اے مجھ میں دفن ہونے والا میری سکونت آبادی روشنی اور اپنے بچاؤ کے لئے خالی ہاتھ نہ آنا بلکہ ایسے اعمال اپنے ساتھ لانا جو تیری مانوسیت کا موجب ہوں اور تیرے لئے روشنی کا باعث ہوں۔ گویا وہ انسان کو قبل از وقت انتباہ کرتی ہے)

عالم برزخ میں حقوق الناس خاص طور پہ انسان کے لئے باعث عذاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ معمولی سے معمولی حق بھی کسی کا اپنے ذمہ ہو اور مرجائے تو وہ ایک اژدہا بن کر اسے ہمیشہ معذب کرتا رہتا ہے۔ جب تک کہ اس کے وارث وہ حق ادا نہ کریں اسی طرح لوگوں کے ساتھ بداخلاقی ایک ایسا جرم ہے جو قبر میں انسان کے لئے باعثِ عذاب شدید ہوتا ہے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ بدخلقی فشارِ قبر کی موجب بن جاتی ہے جیسا کہ سعد بن معاذ صحابی رسول کا واقعہ مشہور ہے حضورؐ نے بنفسِ نفیس ان کی مشایعت فرمائی اسے قبر میں اُتارا اور بہت خوش خوش ارشاد فرمایا کہ سعد کے جنازہ میں اتنے ہزار ملائکہ شامل تھے اور دفن کر چکنے کے بعد آپ کی شکل غم ناک ہوئی تو پوچھا گیا کہ آپ غمناک کیوں ہیں؟ تو فرمایا اس لئے کہ سعد کو فشارِ قبر ہو رہا ہے لوگوں نے انتہائی تعجب ناک ہو کر دریافت کیا کہ حضورؐ! اس قدر نیک صحابی کو بھی فشارِ قبر ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ واقعی یہ نیک تھا کہ فرشتے بھی اس کے جنازہ میں شامل تھے لیکن اس میں ایک عیب تھا اور وہ یہ کہ اپنے عیال سے حسن سلوک سے پیش نہیں آتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مومن کے لئے قبر میں بھی بخشش کے سہارے کافی ہیں بشرطیکہ انسان گناہانِ کبیرہ سے بچے اور واجبات کو حتی الامکان ترک نہ کرے۔

گناہانِ کبیرہ

خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ اگر تم گناہانِ کبیرہ سے بچو تو ہم تم سے باقی برائیاں دُور کر دیں گے الخ اور معصومین علیہم السلام سے جو گناہانِ کبیرہ

منقول ہیں ان کی ایک طولانی فہرست ہے مثلاً ① شرک یعنی خداوندکریم کی ذات، صفات و افعال میں کسی کو شریک ماننا چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ (ترجمہ) اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مانے تو اس پر خدا نے جنت کو حرام کیا ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

② اللہ کی رحمت سے ناامیدی۔

③ اللہ کے غضب سے بے خوف ہونا۔

④ والدین کی نافرمانی

⑤ نفسِ محترمہ کا قتل

⑥ شادی شدہ عورت کو زنا کی تہمت دینا۔

⑦ یتیم کا مال کھانا۔

⑧ جہاد سے بھاگنا۔

⑨ سود کھانا

⑩ جادو کرنا

⑪ زنا کرنا

⑫ لواطہ کرنا

⑬ جھوٹی قسم کھانا

⑭ دھوکا دینا

⑮ زکوٰۃ ادا نہ کرنا

⑯ جھوٹی گواہی دینا

⑱ شہادتِ حق پر پردہ ڈالنا

⑱ شراب نوشی

⑲ نماز نہ پڑھنا

⑳ ترکِ واجب

(۲۱) عہد شکنی

(۲۲) قطع رحمی

(۲۳) حاکمِ جور کی ملازمت

(۲۴) حاکمِ جور سے محبت

(۲۵) وصیت میں زیادتی

(۲۶) انکارِ واجب

(۲۷) اللہ کی نازل کردہ کسی شے کا انکار

(۲۸) گناہِ صغیرہ کو صغیرہ اور معمولی سمجھنا

(۲۹) گناہِ صغیرہ پر اصرار کرنا

(۳۰) لوگوں کا حق کھانا

(۳۱) غیبت کرنا

(۳۲) بہتان تراشی وغیرہ

علامہ طبرسی کا نظریہ یہ ہے کہ سب گناہ کبیرہ ہیں۔ ان میں سے گناہ صغیرہ کوئی بھی نہیں کیونکہ اللہ کی نافرمانی کو چھوٹا کہنا ہی غلط ہے پس وہ آپس کی باہمی نسبت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے چھوٹے یا بڑے ہیں۔ خدا کی نافرمانی کے اعتبار سے سب کے سب بڑے ہیں خداوندکریم تمام مومنین کو توفیق کرامت فرمائے کہ ان گناہوں سے بچ کر خوشنودئ خدا حاصل کریں۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ نمازِ تہجد پڑھنے والا انسان فشارِ قبر سے محفوظ رہتا ہے

اسی طرح روزِ جمعہ یا شبِ جمعہ مرنے والا انسان اور مشاہدِ مشرفہ میں دفن ہونے والا بھی عذابِ پروردگار کی گرفت سے بچ جاتا ہے اور حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی تربتِ طاہرہ کو خاص طور پر یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں دفن ہونے والا بلا حساب جنت میں جائے گا نیز حضرت امیر علیہ السلام کی بارگاہ قدس میں دفن ہونے والا فشارِ قبر کے عذاب سے مامون و مصون ہوگا اور کتب میں اس قسم کی روایات بکثرت وارد ہیں (بشرطیکہ مومن ہو)

اس میں شک نہیں کہ آلِ محمدؐ کی ولا ہر سختی سے بچانے کی کفیل ہے لیکن آئمہ طاہرین علیہم السلام نے فشارِ قبر سے بہت ڈرایا ہے چنانچہ بعض روایات میں انہوں نے فرمایا ہے کہ ہم اس مقام میں تمہاری کسی قسم کی ضمانت نہیں لیتے۔ البتہ قیامت کے روز تمہاری شفاعت کر کے تمہاری امداد کریں گے۔ بہر صورت گناہوں کی سزا کا بھگتنا ضروری ہے چنانچہ بیان ہو چکا ہے کہ بعض مجرمین تین تین لاکھ سال کی سزا بھگتنے کے بعد شفاعت حاصل کر کے جنت میں جائیں گے۔ مومنین کے لئے بشارت ہو کہ قبر میں بھی ولاءِ آلِ محمدؐ دست گیری ضرور کرے گی چنانچہ محاسن برقی سے بروایت ابو بصیر عن احدہما مروی ہے کہ قبر میں مومن کے پاس چھ نورانی صورتیں آتی ہیں پس ایک دائیں طرف دوسری بائیں جانب ایک آگے ایک پیچھے اور پانچویں پائنتی کی طرف کھڑی ہو جاتی ہیں لیکن چھٹی نورانی شکل جو ان سب میں سے زیادہ تابناک ہوتی ہے۔ اس کے سر کے اوپر والی نورانی شکل باقیوں سے فرداً فرداً سوال کرتی ہے کہ تم کون ہو؟ تو دائیں جانب سے آواز آتی ہے۔ میں اس مومن کی نماز ہوں بائیں طرف والی کہتی ہے میں اس کی زکوٰۃ ہوں، آگے والی کہتی ہے میں روزہ ہوں پیچھے والی کہتی ہے میں حج ہوں اور پائنتی والی حسنِ سلوک وصلہ رحمی اپنا آپ بتلاتی ہے پھر یہ سب اس سے پوچھتی ہیں تم کون ہو تو وہ کہتی ہے میں ولاءِ آلِ محمدؐ ہوں میں نے کسی روایت میں دیکھا ہے کہ جب یہ سب انوار قبر میں مومن کی قبر کو نورانی کریں گے اور اس کے لئے باعثِ تسکین ہوں گے تو قبر کے کنارے پر سر کے اوپر والا نوران کے تعارف کے بعد کمزوری کا سبب پوچھتا ہے تو نماز و روزہ و دیگر اعمال کے انوار اپنی کمزوری کا سبب مومن کی مصروفیات دنیاویہ کی وجہ سے غفلت شعاری وغیرہ بتلاتے ہیں تو وہ نور ان کو خطاب کر کے کہتا ہے تم اپنی اس کمزوری سے گھبراؤ نہیں بروزِ حشر

میں اس سب کمی کو پورا کروں گا پس وہ انوار پوچھتے ہیں کہ تو کون ہے؟ تو جواب دیتا ہے کہ میں ہوں ولاءِ آلِ محمدؐ۔

کتابتِ اعمال اور توبہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کی رحمت اس کے غضب سے وسیع تر اور اس کی بخشش اس کی گرفت سے آسان تر ہے اس بناء پر نیکی کے ارادہ میں بھی نیکی لکھی جاتی ہے اور نیکی کا فعل کم از کم دس گنا جزا کا سزاوار قرار دیا جاتا ہے اور زیادہ کی کوئی حد ہی نہیں اس کے مقابلہ میں برائی کے ارادہ کو لکھا نہیں جاتا اور برائی کے فعل کے بعد بھی سات گھنٹے تک لئے ملتوی رکھا جاتا ہے کہ شاید توبہ کر لے پس اگر توبہ کر لی تو لکھا نہ جائے گا لیکن اگر پھر بھی توبہ نہ کی تو ایک ہی لکھا جائے گا جسے توبہ کے بعد دھویا جا سکتا ہے پس اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے سرے سے گناہ کیا ہی نہ تھا۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ اگر کوئی شخص صحیح عقیدہ رکھنے والا بغیر توبہ کے مر جائے تو اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے بعد وہ یقیناً جنت میں جا سکے گا۔ کیونکہ مومن کے لئے دائمی جہنم کی سزا نہیں ہے۔ نیز شفاعت بھی ایسے ہی شخص کے لئے ہوگی کیونکہ توبہ کرنے والا تو خود اپنے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے پس مومن وہ ہے جو امید بخشش اور خوف گرفت برابر اپنے دل میں رکھتا ہو نہ بخشش کی امید میں رہ کر عذاب سے بے نیاز ہو جائے اور نہ عذاب کے ڈر میں بخشش سے مایوس ہو جائے اور اس پر احادیث بکثرت موجود ہیں اور آلِ محمدؐ کی اتباع کرنے والے یقیناً مرنے کے بعد وادی سلام میں جا قیام کرتے ہیں جو نجف اشرف کا علاقہ ہے۔

خداوند کریم کی جانب سے ہر انسان پر دو دو فرشتے موکل ہیں جو ہر چھوٹے بڑے عمل کو لکھتے ہیں حتاکہ اس کے پھونک مارنے کو بھی لکھ لیتے ہیں۔ شیخ صدوقؒ نے اعتقادیہ میں روایت کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت امیر علیہ السلام ایک شخص کے پاس سے گزرے کہ وہ بیہودہ کلام کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا اے فلاں تو اپنے کراماً کاتبین سے اپنے پروردگار کی طرف ایک تحریر لکھوا رہا ہے۔ لہٰذا ایسی بات کر جو تیرے کام کی ہو اور ایسی بات نہ کر جو تیرے کام کی نہ ہو۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جب تک انسان چپ رہے تو اس کی نیکی لکھی جاتی ہے اور جب بولے تو پھر یا نیکی لکھی جائے گی یا برائی

لکھی جائے گی۔ انسان کے جسم میں دونوں فرشتوں کے مقام دو ہنسلی کی ہڈیاں ہیں۔ دائیں جانب والا نیکیاں لکھتا ہے اور بائیں جانب والا برائیاں درج کرتا ہے اور شب و روز میں فرشتوں کی باریاں تقسیم ہوتی ہیں۔ دن کے دو فرشتے رات کے دو فرشتوں سے الگ ہوتے ہیں اگر کوئی شخص صبح کی نماز اوّل وقت میں پڑھے تو یہ نیکی اس کی دو جگہ درج ہوگی۔ کیونکہ رات کے فرشتے اس کو اپنے دفتر کے آخر میں درج کریں گے اور دن کے فرشتے اس کو اپنے دفتر کے شروع میں درج کرلیں گے پس نیک بخت ہے وہ انسان جو اپنے حساب کو اپنی زندگی میں خود پڑتال کر کے توبہ سے صاف کرلے یا اس کا تدارک کرے اور یہ بھی مروی ہے کہ قبر میں سوال وجواب کے بعد فرشتے کہیں گے لکھو تو انسان پوچھے گا کیا لکھوں تو وہ کہیں گے کہ دنیا میں جو کچھ تو نے کیا ہے وہی لکھو تو انسان عذر کرے گا کہ مجھے یاد نہیں رہا تو وہ کہیں گے ہم تجھے یاد دلائیں گے پھر انسان معذرت کرے گا کہ کاغذ نہیں تو وہ کہیں گے اپنے کفن کو کاغذ سمجھ لو پس انسان زندگی میں اپنے تمام کئے ہوئے اعمال کو اپنے ہاتھوں سے لکھے گا اور یہی کفن بروز محشر اس کے گلے میں لٹکا ہوا اس کا اعمال نامہ ہوگا جس کے متعلق ارشاد ہوگا اِقْرَءْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا پس توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ حقوق الناس کو انسان حتی الامکان واپس کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان سے گلو خلاصی کی کوئی تدبیر پیدا کرلے اور قیامت کے روز علی رؤس الاشہاد سرشار ہونے سے دنیا کی سرشاری کو برداشت کرنا بہتر ہے اور حقوق اللہ کی قضا میں کوتاہی نہ کرے اور زندگی کا ہر لمحہ آخری لمحہ سمجھے۔ اسی لئے منقول ہے کہ دنیا کا کام اس طرح کرو جس طرح تمہیں ہمیشہ رہنا ہو اور آخرت کا کام ایسے خلوص سے کرو جیسے کہ تمہارا یہی آخری سانس ہے اگر آل محمدؐ کے شیعہ آلِ محمدؐ کے بتائے ہوئے طریق پر گامزن ہوں تو خدا کی قسم دنیا و آخرت کی کوئی منزل نہیں جو ان کے لئے آسان نہ ہو۔

مرنے کے بعد نیکی

اکثر اعمال کا دفتر مرتے ہی بند ہو جاتا ہے لیکن بعض ایسے اعمال ہیں جن کا حساب جاری رہتا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے سَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ کہ ہم ان کے اعمال بھی لکھتے ہیں اور ان کے اعمال کے آثار بھی لکھتے ہیں اگر کوئی شخص ایسی برائی کر کے جائے جس کا اثر باقی رہتا ہو تو اس کی برائی لکھی جاتی رہے گی، جب تک اس کے اثرات موجود رہیں گے۔ اسی بناء پر

وارد ہے کہ جن جن لوگوں نے آلِ محمدؐ پر ظلم کی ابتدا کی وہ بعد میں ہونے والے تمام مظالم کے ذمہ دار ہیں بایں معنی کہ ظالم کو ظلم کی سزا ملے گی اور ظلم کی بنا رکھنے والے کو بھی اس کے برابر حصہ ملے گا۔ اسی طرح شریعتِ پیغمبر میں غلط تصرف کرنے والوں کو تا قیامت عمل کرنے والوں کے اعمال کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا جو بھی کسی برائی کی ابتدا کرے اس پر ان تمام لوگوں کی برائیوں کا بوجھ ہوگا۔ جنہوں نے اس کے طریقہ کو اپنایا ہوگا اور اگر کوئی شخص اپنے بعد بری اولاد چھوڑ آئے اور وہ اولاد ناہنجار اپنے باپ کے ترکہ کو ناجائز طریقہ پر خرچ کرے تو وہ بھی باپ کے لئے زیادتی الم کا باعث ہوگی۔ بہر کیف بداعمالی سے بد اثر چھوڑ کر مرنا زیادہ خطرناک ہے کیونکہ صرف بداعمالی کا عرصہ تو محدود ہوتا ہے جس کی سزا بھی محدود ہوگی لیکن بد اثر غیر محدود ہوتا ہے پس وہ جس قدر پھیلتا جائے گا اثر چھوڑنے والے کیلئے عذاب کا اضافہ ہوتا جائے گا۔

اگر کوئی شخص ایسا کام کر جائے جس کا دنیاوی یا دینی فائدہ قوم و ملت کو پہنچنے والا ہو تو اس کے نامہ اعمال میں یہ کام صدقہ جاریہ کی حیثیت سے باقی رہے گا اور اس میں ترقی ہوتی رہے گی۔ اگر کنواں کھدوائے یا پانی کی سبیل لگائے تو جب تک سیرابی تشنگان ہوتی رہے گی اس کی حسنات میں اضافہ ہوتا رہے گا اسی طرح کوئی شخص مسجد بنائے تو جب تک نمازی اس میں نماز پڑھتے رہیں گے اس کی اس نیکی میں زیادتی ہوتی رہے گی۔ مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا جو شخص نیکی کی سنت قائم کر جائے تو اس کو ان تمام لوگوں کے اعمال خیر سے حصہ ملے گا جو اس کی قائم کردہ نیکی پر عامل ہوں گے۔ یعنی عمل کرنے والے کو اپنا اجر پورا ملے گا اور اس کے برابر اس کو بھی ملے گا۔ جس نے اس کار خیر کی سنت جاری کی تھی۔ نیک اولاد ماں باپ کے لئے بہترین صدقہ جاریہ ہے اور صدقہ علم تمام صدقات سے افضل و اکرم ہے اگر کوئی شخص اپنی حلال کمائی سے کسی دینی مدرسہ کا اہتمام کرلے یا اپنی کم و بیش جائیداد اس میں لگائے تو جب تک اس مدرسہ کا فیض علمی قائم رہے گا اس کے نامہ اعمال میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

صدقہ جاریہ علمیہ کی چار صورتیں ہیں۔

[illegible] گاہ قائم کرنا جس میں تشنگانِ علوم کو اپنی مقدور کے مطابق سیرابی

کے مواقع دستیاب ہو سکیں۔ خداوند کریم ان لوگوں کی محنت کو شرفِ قبولیت بخشے جنہوں نے اس طرف اقدام کیا۔ ہمارے مغربی پاکستان میں دو شخص ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اس سنتِ حسنہ کو جاری کیا ایک خان بہادر سید حسن بخش گردیزی ملتانی قدہ دوسرے خان بہادر میاں سلطان علی لنگیانہ قدہ اوّل الذکر نے ملتان جیسے تاریخی شہر میں مدرسہ باب العلوم کی بنیاد رکھی اور اپنی زرخیز اراضی میں سے پانچ مربعہ جات اس پر وقف فرمائے اور ثانی الذکر نے ضلع سرگودہا کے ایک دیہات جلال پور لنگیانہ میں اپنی بساط کے مطابق مدرسہ محمدیہ کی بنیاد رکھی اس وقت اگرچہ دوسرے مدرسے ان دونوں درس گاہوں سے منازل طے کرنے میں بہت آگے چلے گئے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سب انہی دو سرچشموں کی شاخیں ہیں اور انہی سے فیض حاصل کرنے والے ہیں اور یہی دو مدرسے تمام مدارس کے منصۂ شہود پر آنے کے محرک ہیں خداوند کریم مدارس دینیہ کی سنت کو جاری کرنے والے ہر دو مخلص مجاہد اور قومی محسنوں کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے۔ بے شک ان کا قوم پر احسانِ عظیم ہے اور وہ پوری قوم سے جزائے شکر کے سزاوار ہیں۔ خدا ان کی اولاد کو ان کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

(۲) کوئی کتاب لکھنا جس کے ذریعہ سے مذہب کی ٹھوس حقیقت سے قوم کے کم علم افراد کو مطلع کیا جا سکے تاکہ وہ اپنے دل و دماغ پر دین و ایمان کے صحیح نقوش ابھار سکیں اپنی عبادات و اعمال کی درستی کر سکیں، اپنے عقائد کی اصلاح کر سکیں اور اغیار کی طعنہ زنی اور ان کے غلط سلط اعتراضات کے قلع قمع کا علمی مواد حاصل کر کے دل میں اطمینان و سکون کی شمع فروزاں کر سکیں۔ جناب رسالتمآبؐ نے ہمارے لئے دو چیزیں چھوڑی تھیں جن سے تمسک ہماری فلاح کا ضامن ہے پس اہلِ علم طبقہ کے لئے ثقلین کی ترجمانی ان کا بہت بڑا صدقہ ہے اور عوام تک ان دونوں کی صحیح تعلیمات کے پہنچانے کا بدولت تصنیف و تالیف کے ذریعے سے باحسن وجوہ پایۂ کمال کو پہنچ سکتا ہے اور یہ ایسا صدقہ جاریہ ہے کہ جب تک اس سے استفادہ ہوتا رہے گا اور جب تک یہ حروف و سیاہی کاغذات پر ثبت رہیں گے اس کے نامۂ اعمال میں حسنات کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ مَنْ كَتَبَ فَضِيلَةً مِنْ فَضَائِلِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ مُحِيَتْ عَنْهُ الذُّنُوبُ الَّتِي اكْتَسَبَهَا بِيَدِهِ جس نے حضرت علیؑ کے فضائل میں سے کوئی

فضیلت لکھی تو اس کے ہاتھ کے گناہ دُھل جاتے ہیں اور اسی بناء پر معصوم کا ارشاد ہے مِدَادُ الْعُلَمَاءِ اَفْضَلُ مِنْ دِمَاءِ الشُّهَدَاءِ علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے (یہاں شہداء سے مراد عام شہید ہیں) اس فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ شہادت کی موت مرنے والا صرف اپنی نجات کا ضامن ہوتا ہے لیکن علماء کی سیاہی جب بشکل فضائل آلِ محمدؐ یا بشکل قرآن و حدیث صفحۂ کاغذ پر موجود رہے گی۔ آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی رہے گی۔ اور ہزاروں لوگ اس سے استفادہ کر کے دینِ حق پر گامزن ہونے کی سعادت حاصل کر سکیں گے اسی بناء پر ہے کہ اہلِ علم مرتے نہیں ہیں جب تک آثارِ علمیہ کے نقوش زندہ و باقی ہوں۔ چنانچہ اب ہمارے وہ علماء جنہوں نے علومِ آلِ محمدؐ کتب کے ذریعہ سے ہم تک پہنچائے ہیں وہ جسمانی طور پر اگرچہ ہم سے روپوش ہیں لیکن ایمانی و روحانی طور پر اب تک وہ زندہ ہیں اور جب تک ان کی علمی برکات زندہ رہیں گی وہ زندہ و پائندہ رہیں گے اور تمام افرادِ قوم سے خراجِ تحسین و جزائے شکر حاصل کرتے رہیں گے شکر اللہ سعیہم۔

④ درس و تدریس کے ذریعے سے قوم کے نونہالوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا عام نیک اولاد سے علمی نسلِ انسان کے لئے بہترین سرمایۂ آخرت ہے جو لوگ درس و تدریس کے ذریعے سے قوم میں علمی شمعیں روشن کرتے ہیں وہ قوم پر احسانِ عظیم کرتے ہیں لہٰذا جب تک یہ روشنی باقی رہے گی۔ ان کے نامۂ اعمال میں حسنات کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ ہمارے اس علاقہ میں اس مقدس سلسلہ کو جاری کرنے والے استاذ العلماء سید الاتقیاء استاذی علامہ مولانا سید محمد باقر قدس روحہ اور ان کے برادرِ اکبر استاذ العلماء مولانا سید طالب حسین قدس روحہ الشریف تھے اوّل الذکر نے چک نمبر ۳ ضلع ملتان کو علمی گہوارہ بنایا۔ چنانچہ کافی عرصہ تک تشنگانِ علوم وغیرہ وہاں مستفیض ہوتے اور پھر بعد رجبانہ ضلع جھنگ میں آخر عمر تک خدماتِ تدریسیہ میں مشغول رہ کر گزشتہ سال ۱۳۹۶ھ میں راہیِ جنت ہوئے اور ثانی الذکر بزرگوار نے چکڑالہ ضلع میانوالی میں چشمۂ فیضِ علمی کو جاری رکھا اور یہیں سے ہی ان کی آخر عمر تک تشنگانِ علوم کی پیاس بجھتی رہی اور یہی ان کا وطن مالوف تھا اور یہیں دفن ہوئے۔ ان دونوں بزرگواروں کے متعلق مختصراً پہلے لکھا جا چکا ہے۔ خداوندکریم ان کی مساعی کو شرفِ قبولیت بخشے اس وقت ہمارے اس ملک میں جس قدر مدرسین حضرات موجود ہیں سب کم و بیش انہی کے فیضِ علمی کے خوشہ چین ہیں۔ پس ان کی یہ روحانی

نسل جب تک باقی رہے گی ان کے لئے صدقہ جاریہ بن کر ان کے نامۂ اعمال میں حسنات کے اضافہ کا موجب ہوگی۔ شَکَرَ اللّٰہُ سَعْیَھُمَا

④ لسانی خدمات اپنے پاس بیٹھنے والوں میں علوم آل محمد کی نشر و اشاعت یا منبر پہ بذریعہ خطابت مذہب حقہ کی تبلیغ و ترویج نہایت مقدس و موثر ذریعہ نجات ہے۔ اور یہ بھی صدقہ جاریہ ہے۔ فیض حاصل کرنے والوں کا جب تک نسل در نسل سلسلہ باقی رہے گا یا اس کی نصیحت پر عمل کرنے والوں کا جب تک سلسلہ قائم رہے گا۔ نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

میں اپنے پروردگار کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے مجھے اپنی استطاعت کے مطابق دولت علم سے نواز کر اس قابل بنایا ہے کہ میں مذکورہ بالا ہر چہار طریقوں سے قوم کی خدمت کرنے کا اہل ہوں میرے والد بزرگوار ملک اللہ بخش[1] ابن ملک خان محمد جہاں میرے جسمانی مربی ہونے کی حیثیت سے میرے محسن عظیم ہیں۔ وہاں ان کا میرے اُوپر یہ احسان بے حد و پایاں ہے کہ انہوں نے مجھے بچپنے سے ہی علمی چشموں سے سیراب ہونے کی تربیت دی اور انہی صاف و شفاف عرفانی آبشاروں سے استفادہ کے مواقع بہم پہنچائے۔ اگر انہوں نے مجھے اس راہ کی تحریص نہ دلائی ہوتی تو شاید میں بھی اپنے دوسرے ہم قوم و ہم وطن بھائیوں کی طرح ورطۂ جہالت اور حضیض ظلمت میں مضطرب و پریشان زندگی کے لمحات گزارتا ہوتا خداوند کریم میرے والد کا سایہ میرے اُوپر قائم رکھے اور تادیر مجھے ان کے سایہ میں رہ کر ان کی خدمت کا موقعہ عطا فرمائے اور خدا کی قسم اس سلسلہ میں اپنی والدہ گرامی کا بھی بہت بڑا احسان سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی شفقتِ مادری کو میری علم دوستی پر قربان کر دیا اور ایام تحصیل میں کبھی اس راستہ میں حائل ہونے کی کوشش نہ کی خداوند کریم نے ان کو بلند حوصلہ عطا فرمایا اور آخر کار خدا نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کو سرور بخشا کہ مجھے انہوں نے اپنے جیتے مسند علمی پر متمکن دیکھا خداوند کریم مجھے توفیق دے کہ میں اپنے والدین کی زندگی میں ان کی صحیح خدمت کر سکوں اور ان کی وفات[2]

[2] والدہ ماجدہ کی وفات ۲۰ جولائی ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب مطابق ۲۴ / ۲۵ جمادی الاول ۱۳۹۱ھ اور ۲۲ / ۲۳ ... ازبروئے ... اور وہ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی رات تھی ۹ بجے انتقال ہوا اور جمعہ کے دن دفن ہوئیں ... سے فاتحہ کی ...

[1] والد بزرگوار ملک اللہ بخش جاڑا کا انتقال ۱۳ / اگست ۱۹۸۲ء مطابق ۲۵ رمضان ۱۴۰۲ھ بروز ... کو ہوا اور ان کو ... کے قریب جاڑا کے قبرستان میں دفن کر دیئے گئے۔

کے بعد ان کے لئے صدقہ جاریہ ہو سکوں ۔ اس سال ۱۹۶۶ء مطابق ۱۳۸۶ھ میں خدا نے اپنی کمال مہربانی سے میرے والدین کو حج بیت اللہ اور زیارت پیغمبر و آئمہ بقیع کا شرف عطا فرمایا اور مجھے اس سفر میں ان کی غلامی و خدمت کی سعادت عطا فرمائی وَلَہُ الْحَمْدُ

پہلی خدمت جامعہ علمیہ باب النجف

والدین کی دعائیں ثمر آور ہوئیں اور نجف اشرف سے تحصیل

علوم دینیہ کے بعد ۱۹۵۵ء میں اپنے وطن مالوف جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں واپس پہنچا اور بغیر کسی سہارے کے قومی خدمت کو انجام دینے اور اپنے فریضہ علمیہ کو پورا کرنے نیز اپنے اور والدین و اساتذہ کرام کے لئے صدقہ جاریہ کے طور پر ایک ادارۂ علمیہ کی تشکیل کے درپے ہوا اور ظاہری اسباب کے پیش نظر یہ ایک ایسا خواب تھا جس کا شرمندہ تعبیر ہونا قریباً ناممکن تھا نہ پاس دولت تھی نہ دولت مند تھے نہ کوئی انجمن تھی نہ قومی تحریک نہ کوئی نواب و رئیس زیر اثر تھا نہ کسی جاگیردار سے رابطہ تھا اگر کسی کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر بھی کیا تو

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

کہہ کر ہمت شکنی کی گئی ۔

بہرکیف اسی سال ہی مدرسہ علمیہ باب النجف کا سنگ بنیاد رکھا اور طلبہ علوم کی معاونت سے اس کی دیواروں کو خود ہی کھڑا کیا نصرت پروردگار نے ہمت افزائی کی اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی برکات شامل حال ہوئیں اور تائید غیبی آگے بڑھاتی گئی پس حائل شدہ کاوٹیں دور ہوتی چلی گئیں اور ایسے مقامات سے امداد پہنچی جہاں کا خواب و خیال تک نہ تھا اور ایسے ایسے مقامات سراب ظاہر ہوئے جنہیں قبل از وقت ہم نے وسیع و عریض بحر سمجھا ہوا تھا ۔ خدا نے ہمت دی حضرت علیؑ کے نام اور اس کی ولا نے مشکل کشائی فرمائی سالوں سالوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں میں ہوتا ہوا ایک سال کے اندر اندر جامعہ علمیہ باب النجف وہم و خیال اور تصور محض یا طنوں کی حدود کو پھلانگتا ہوا ایک حقیقت حقہ بن کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو گیا جن لوگوں نے اسے وہم سمجھ رکھا تھا اب ناقابل انکار حقیقت دیکھ کر دریائے حیرت میں ڈوب گئے ۔

اس مدرسہ میں پانچ کمروں پر مشتمل چھوٹا سا احاطہ الگ مخدوم شہر گرد ریڈ منتیہ محمد راجو سلمہ

کے اخراجات پر تعمیر ہوا جو انہوں نے اپنے بزرگوں کے ایصالِ ثواب اور صدقہ جاریہ کے طور پر تعمیر کرایا تھا وہ اب منہدم ہو گیا ہے کیونکہ اس کی دوبارہ مرمت کے بڑے مخدوم صاحب نے توجہ نہ کی۔ مدرسہ میں کل ۱۸ کمرے تھے جن میں سے ہر ایک صرف دو دو طالب علموں کے لئے تھا اور تین بڑے کمرے ہیں جو مبلغ اور مہمانوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں ایک وسیع برآمدہ ہے ایک کتب خانہ اور ایک مال خانہ بھی ہے اور کمروں کے درمیان اور مدرسہ کے عین وسط میں ایک وسیع و عریض جامعہ مسجد ہے جو ۴۴ فٹ لمبی اور ۲۸ فٹ چوڑی ہے لیکن افسوس کہ قوم کی بے توجہی کی بدولت اب مدرسہ کی حالت نہایت خستہ ہے اور خدا سے دست بہ دعا ہوں کہ اسے دوبارہ پختہ تعمیر کرانے کی توفیق مرحمت فرمائے

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق مرحمت فرمائی کہ ہمارا مدرسہ اپنی وضع قطع میں تمام باقی مدارس دینیہ سے سبقت لے گیا ہے بے شک دوسرے مدارس امراء و نواب و رؤسا کی سرپرستی کی بدولت عالی شان عمارت رکھتے ہوں گے لیکن دولت خلوص سے تعمیر شدہ جامعہ علمیہ باب النجف اپنی شان میں اپنی نظیر آپ ہے اور اس امر کی وہ لوگ تصدیق کر سکتے ہیں جنہوں نے یہ دل فریب اور پرکشش منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس مدرسہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس مدرسہ کی اکثر و بیشتر تعمیر میں کسی راج یا مزدور کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ سنتِ خلیل و اسماعیل علیہما السلام پر عمل کر کے اپنے ہاتھوں طلبہ کرام کی شرکت سے اس کے تعمیری کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا شرف حاصل کیا ہے مدرسہ کی تعمیر کے بعد تقریباً آٹھ سال تک خود فرائض تدریس انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد دیگر مصروفیات دینیہ کی وجہ سے اس کی تدریس مولانا غلام حسن صاحب فاضل عراق کے سپرد کی ہے جو تا حال نہایت حسن و خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ خداوند کریم ہماری اس خدمت کو منظور فرمائے اور اس کو ہمارے لئے صدقہ جاریہ قرار دے۔ ھُوَ المستعان وَعَلَیْہِ التکلان

دوسری خدمت تصنیف و تالیف کا سلسلہ

جب مدرسہ کی تعمیری صورت سے کسی حد تک مطمئن ہو گیا تو میں نے تصنیف و تالیف کی طرف قدم اٹھایا کیونکہ میں قوم و ملت کی سب سے بڑی خدمت کا راز اسی میں مضمر سمجھتا ہوں اور واقعاً اہلِ علم کی دائمی زندگی اسی سے

ہی وابستہ ہے پس علمائے متقدمین رضوان اللہ علیہم کے بحرِ ذخار سے چُلو لیتے ہوئے اور ان کے روضات عرفانیہ سے خوشہ چینی کرتے ہوئے اپنی انتہائی بے مائیگی اور کم علمی کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کے نقشِ قدم پر چلنے کو بڑی سعادت سمجھ کر قرآن مجید کی تفسیر سے اس سلسلہ کی ابتداء کی چونکہ اس تفسیر کا ارادہ بلکہ ابتداء نجف اشرف کی رہائش کے دوران میں ہو چکی تھی لہٰذا اس کا نام تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف تجویز کیا اور خدا کی قسم جن جن لوگوں کو اس کے مطالعہ کی ہمت ہوئی۔ انہوں نے اس کو اسم بامسمیٰ پایا اس تفسیر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کو موجودہ دور کے ترقی یافتہ اذہان تلاش کر رہے تھے۔ دورِ حاضر کے مسائل کو نہایت سلجھے ہوئے انداز میں حل کیا گیا ہے۔ قرآنی مطالب کو تفسیر آئمہ کی روشنی میں تفسیر بالرائے سے بالکل الگ ہو کر نہایت عمدہ اور دلکش پیرائے میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن آیات میں فقہی مسائل کی طرف اشارہ ہے اس کی وضاحت فقہی شان سے اس طرح کی گئی ہے کہ تفسیر کے مطالعہ کے بعد اس مرحلہ میں کسی دوسرے رسالۂ عملیہ کی احتیاج نہ رہے۔ تاریخی مسئلہ کو تاریخ کی روشنی میں صاف کیا گیا ہے اور اختلافات کو عقلی و نقلی براہین سے اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ فطرتِ سلیمہ کے لئے انصاف و ایمان کے بعد مطلب کا چہرہ ہر قسم کے غبار و دھند لکے سے صاف و مبرا ہو۔ اپنی طرف سے آسان و سلیس لکھنے کی کوشش کی تا کہ تفسیر صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود نہ رہے بلکہ معمولی سے معمولی لکھا پڑھا انسان بھی اس سے کما حقہٗ استفادہ کر سکے میرے اپنے اندازہ سے یہ تفسیر علوم آلِ محمدؐ کا واضح اور کھلا ہوا درس ہے علوم قرآنیہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو آسان و سلیس اردو زبان میں اس سے بہتر دوسری کوئی تفسیر نہ مل سکے گی یہ تفسیر چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

خدا کی قسم اس اہم کام کو شروع کرنے سے پہلے اپنی بے بضاعتی کے پیشِ نظر میں کافی شش و پنج میں تھا لیکن تائید ایزدی نے بڑا لطف فرمایا کہ یہ تفسیر میری اپنی توقعات سے بہت بلند و بالا ہو کر منصۂ شہود پر ظاہر ہو رہی ہے اور خداوند عظیم کا اس کی اس نعمت عظمیٰ پر جس قدر شکر ادا کروں کم ہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ اور سچ ہے کہ میری یہ گرانقدر خدمت اور عظیم پیشکش جہاں قارئین کرام سے خراجِ تحسین حاصل

کرتی ہے وہاں بہت سوں کو حسد کی آگ میں جلانے کی سعادت بھی اسے حاصل ہے جو لوگ خواہ مخواہ فریب شعاری کے مشغلہ کو اپناتے ہوئے جبہ و عبا و قبا میں ملبوس ہو کر قوم کے عوام کو اپنی علمی ٹھاٹھ اور ہمہ دانی کے رُعب سے مسحور کئے ہوئے تھے۔ اَنوَارُ النَّجَف کی خیرہ کن شعاعیں اور دور رس چمک دمک ان پہ بجلی بن کر گری وہ خود تو اس قابل نہیں کہ اس جیسی تو بجائے خود اس کا عشر عشیر بھی قوم کے سامنے پیش کر سکیں ہاں گری ہوئی ذہنیت کا اظہار انہیں خوب آتا ہے وہ اس تفسیر کی خوبیوں کو چھپاتے ہوئے ادھر اُدھر جھانک کر اس کے عیب تلاش کرنے کی ناپاک فکر میں رہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ جملہ عیوب سے پاک و منزہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے بعد محمدؐ و آل محمدؐ کا فرمان بھی جاذیب وبے عیب ہے میں تو خود بھی پر از عیوب ہوں لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خاطی و پر از عیوب انسان کی اپنی سے اچھی پیش کش بھی بالکل خالی از عیوب ہو۔ ہاں اپنی طرف سے کوشش کرتا ہوں کہ عیب نہ رہے اور خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھے وہ توفیق مزید عطا فرمائے تاکہ اس کو حتی الوسع عیوب سے محفوظ رکھ سکوں اور سہواً یا غفلتہً اگر اس میں کمزوریاں رہ گئی ہیں تو اس سے عفو چاہتا ہوں اور وہ غفور رحیم ہے بفضلہ اس وقت تک تفسیر کی ۷ جلدیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں اور تفسیر سورۂ ہود تک پہنچ چکی ہے جلد ۸ انشاء اللہ سورہ یوسف سے شروع ہو گی۔ خداوند کریم اس کو میرے اور میرے والدین اور اساتذہ کرام کیلئے صدقہ جاریہ قرار دے۔

(نوٹ) اب جبکہ کتاب ہٰذا کا دوسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے تفسیر مذکور مکمل چودہ جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ والحمد للہ رب العالمین

تفسیر کے مشاغل سے وقت نکال کر زیر نظر کتاب کو لکھنا شروع کیا تاکہ مذہب امامیہ کے صحیح عقائد سے اہل اسلام کو روشناس کرایا جا سکے اور غالیوں و وہابیوں کی افراط و تفریط سے بچ کر درمیانی صراط حق کی نشاندہی ہو سکے۔ خدا کے فضل و کرم سے میری کوشش انشاء اللہ بار آور ہو گی اور اس کے ذریعہ سے قوم میں سکون و اطمینان کی لہر دوڑ جائے گی اور باہمی اختلافات مٹ جائیں گے اور خدا جانتا ہے میں نے اپنے تفوّق یا کسی نفسی خواہش کی بنا پر یہ اقدام نہیں کیا بلکہ صرف قومی خیر خواہی ہی ملحوظ ہے خداوند کریم اسے مقبول فرمائے اور قوم کو اس سے صحیح استفادہ کا موقعہ بخشے۔ تاکہ میرے لئے یہ پیشکش بھی ایک صدقہ جاریہ بن سکے۔

اس کے علاوہ حضرت سید الشہداؑ کے صحابہ کرام کے حالات پر مشتمل ایک مختصر سی کتاب لکھ چکا ہوں "اصحاب الیمین" جس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

تیسری خدمت درس و تدریس

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اہل علم کے لئے درس و تدریس کی خدمت بھی صدقہ جاریہ ہے اور خدا کے فضل و کرم سے مجھے بجا طور پر فخر حاصل ہے کہ اس علمی فریضہ سے کافی حد تک عہدہ برآ ہو چکا ہوں۔ جب تک جسم و دماغ میں طاقت تھی میرا مشغلہ صرف تدریسی خدمت ہی رہا اور بفضل خدا اس سلسلہ میں میری روحانی اولاد پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے اور میں اس کو اپنے لئے اور اپنے اساتذہ و بزرگوں کے لئے صدقہ جاریہ سمجھتا ہوں۔ حاسدین کی اندھی آنکھیں ہمیشہ علمائے مدرسین کی خدمات کو نیست و نابود سمجھتی ہیں اور آئے دن کے اخبارات میں یہی رونا رویا جاتا ہے کہ علمائے مدرسین نے کوئی کام نہیں کیا اور مدارس دینیہ میں پیداوار ہو رہا ہے یقیناً اس قسم کی خرافات و بے ہودہ باتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خود ای

عـلـہ علم عقائد میں تین کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں (۱) لمعۃ الانوار فی عقائد الابرار جس کو آپ پڑھ رہے ہیں (۲) ابوالاعلیٰ مودودی کی خلافت و ملوکیت کا جواب "امامت و ملوکیت در جواب خلافت و ملوکیت" نہایت مدلل و مبرہن کتاب ہے اور پورے ملک میں مقبول ہے چنانچہ پہلے دو ایڈیشن اس کے چند دنوں میں ختم ہو گئے اور اب تیسرا بھی قریب الاختتام ہے (۳) اسلامی سیاست اس کتاب میں اصول خمسہ کو نہایت مدلل بیان کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تحریک اسلامی کا بنیادی منشور انہی پانچ نکات پر مبنی تھا اور تختہ امامت کو نظر کرنے سے مسلمانوں کو انحطاط کے دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں (۴) المجالس الفاخرہ عبادات کے موضوع پر پندرہ مجالس کا مجموعہ ہے جو واعظ حضرات کیلئے بہت مفید ہے اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے (۵) المجالس المرضیہ استاذ العلماء مولانا سید محمد باقر اعلی اللہ مقامہ کی ۲۵ مجالس کا مجموعہ ہے اس کا بھی پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے (۶) نماز امامیہ طہارت و نماز کے مسائل پر مشتمل ایک کتابچہ جو نہایت مفید ہے (۷) کتاب الدین والاسلام کا اردو ترجمہ بھی پیش کر چکا ہوں اگر اللہ نے توفیق دی تو تا دم زیست مذہب حقہ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ اور اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اپنے دین کی خدمت کے لئے زیادہ سے زیادہ توفیق مرحمت فرمائے۔

اخلاق کے موضوع پر کتاب "معیار شرافت" طبع ہو چکی ہے۔ اور دور حاضر کے نوجوانوں کے مطالعہ کے لئے تاکہ ان کے اذہان اسلامیات کی طرف مائل ہوں ایک رسالہ "اسلامی فکر" سپرد قلم کیا ہے۔ خداوند کریم قارئین کو توفیق مطالعہ کرامت فرمائے۔

خدمت کے اہل نہیں اور سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر قوم میں اپنی اجارہ داری کا مقام پیدا کرنا چاہتے ہیں ان حسد کے مریضوں کو نہیں نظر آتا کہ پاکستانی مدارس میں موجود مدرسین اپنی درسگاہوں کی یا ان جیسے مدرسوں کی پیداوار نہیں تو کہاں سے آئے ہیں ؟ اس وقت جہاں کہیں قوم کی مساجد ہیں اور سلسلہ جماعت قائم ہے کیا وہ اپنی مدارس دینیہ اور اپنی مدرسین کا فیض نہیں ؟ چند سال پہلے پورے ملک کے دیہات میں شیعہ نکاح خوان اور جنازہ خوان نہیں تھے اور یہ سارا کام سُنّی برادری انجام دیا کرتی تھی تو اب کم و بیش ہر جگہ نکاح خوان و جنازہ خوان کا میسر ہو جانا ان ہی مدارس دینیہ اور علمائے مدرسین کی خدمت کا نتیجہ نہیں تو کیا ہے ؟ نیز دورِ حاضر کے بڑے بوڑھے لوگوں کے علاوہ واعظین اور خطیبوں کا نوجوان طبقہ اپنی مدارس دینیہ اور علمائے مدرسین کی خدمت کا نتیجہ نہیں تو کیا ہے ؟ نیز مذہب اہلبیتؑ اور فقہ جعفریہ پر حملہ آور دشمنوں کے منہ میں لگام دینے والا طبقہ اپنی مدارس دینیہ اور علمائے مدرسین کی محنت کا نچوڑ نہیں ؟ نیز ہماری تفسیر انوار النجف یا یہ حاضر پیش کش یا اس کے علاوہ دیگر تصانیف وغیرہ بھی اپنی مدارس دینیہ و مدرسین علمائے اعلام کی محنت کا ثمرہ ہے اور ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لوگوں نے علمائے مدرسین کو تحقیر و تذلیل کے انداز سے اپنے طعن و تشنیع کا ہدف بنائے رکھا ہے جو شخص دوپہر کے وقت زیر آسمان کھڑے ہو کر کہے کہ آسمان پر آفتاب کوئی نہیں تو ایسے احمق کا جواب بھی کوئی نہیں اسی طرح مدارس دینیہ اور علمائے مدرسین کے آسمانِ فیض کے نیچے کھڑے ہو کر ان کی خدمات سے حاصل ہونے والے امید افزا نتائج کے متعلق (جو خورشید فلک سے تابانی میں کم نہیں) اگر کوئی کہے کہ یہ کچھ نہیں تو در حقیقت وہ خود کچھ نہیں اور ایسے کور باطن کا جواب بھی سوائے خاموشی کے کچھ نہیں۔ خداوند کریم علمائے مدرسین کی خدمت کو شرف قبولیت بخشے اور انہیں زیادہ سے زیادہ توفیقات عطا فرمائے کیونکہ یہ چیز ان کے لئے بہترین سرمایہ آخرت ہے اور صدقہ جاریہ۔

چوتھی خدمت تقریر کے ذریعہ سے تبلیغ

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے قوم کی اس عظیم الشان خدمت کا شرف بھی بخشا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک کلمہ نصیحت کسی ایک کان تک بھی پہنچے اور اسے ایک دل ہی قبول کر لے تو اس کے جملہ اچھے نتائج کے ثواب میں نصیحت

کرنے والا بھی شریک ہوگا یعنی عمل کرنے والے کو جو ثواب ملے گا اسی قدر بلکہ زیادہ اس کو ملے گا جو اس کی نیکی کا باعث بنا تھا۔ خدا کرے یہ خدمت جو ہر خلوص سے مرصع ہو خداوندکریم کا احسان پر لطف و کرم ہے کہ وہ ایک قوم پیدا کر دیتا ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں بے شک یہ عہدہ جس قدر عظیم ہے اسی قدر کٹھن اور مشکل بھی ہے اس عہدہ کو نبھانے کے لئے طعن و تشنیع کے تیروں کا ہدف بننا پڑتا ہے۔ گالی گلوچ اور ہر قسم کی بدزبانی کی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں اور خدا کی جانب سے بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ آگے بڑھنا پڑتا ہے لہجہ کلام میں درستی موقع شناسی مزاج اور الفاظ کلام کا جوڑ توڑ سب مشکل مراحل ہیں اور یہ لحاظ کرنا کہ خوفِ خدا کو اس قدر نہ بڑھائے کہ لوگ رحمتِ پروردگار سے مایوس ہو جائیں اور جنت کو اس قدر سستا نہ بنائے کہ لوگ بالکل نڈر ہو جائیں۔ پس اپنے بیان کو رجاء اور تقویٰ کی دونوں حدوں کے اندر اندر رکھے۔ تو وہ صحیح ناصح و واعظ ہو سکتا ہے خداوند کریم ہمیں صحیح واعظ بننے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

قوم کے لئے نااہل صاحب منبر انتہائی خطرناک ہوا کرتے ہیں اور عوام میں ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے نیم حکیم خطرۂ جان و نیم ملا خطرۂ ایمان اور خدا کی قسم کسی قوم و امت پر کسی دور میں اگر تنزلی وارد ہوئی تو اس کے زیادہ تر باعث ایسے غیر ذمہ دار واعظ و مقرر ہی بنے جو قوم کے سامنے صحیح و مفید لائحہ زندگی پیش کرنا نہیں جانتے یا جانتے ہیں لیکن بعض دنیاوی اغراض کے ماتحت اصلی مقصد کو معرضِ التوا میں رکھتے ہیں اور ان کے عیاشانہ اذہان کے مناسب بیان کو ڈھالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا کر درستی کی طرف نہیں لاتے بلکہ ان کے ہمنوا بن کر خود غلط کار بننے کی کوشش کرتے ہیں واعظ بن کر ان کو حق کی طرف نہیں کھینچتے بلکہ فن کار بن کر ان کے رنگ میں نہاتے ہوئے ان سے داد کیر خواہش ہوتے ہیں اور غضب بالائے غضب یہ کہ بایں ہمہ اپنے تئیں واعظ کہلانا فخر سمجھتے ہیں مجھے نامرسِ توحید کی قسم منبر کو کبھی اس قدر نااہل خطیب شاذ و نادر ہی ملے ہوں گے جو اس دورِ پُر فریب میں اسے نصیب ہوئے ہیں کہ اگر کوئی ایک آدھ خطیب کلمۂ حق کہنے کی جرأت بھی کرے۔ تو نااہل فوراً اس پر نکتہ چینی کر کے اس کے وقار کے دشمن بن جاتے ہیں۔

بہر صورت شریعت بے وارث ہے علماء کے منہ میں لگام ہے حق والوں کے ہاتھ آزاد نہیں اور عدل و انصاف کے دفتروں کو قفل لگے ہوئے ہیں۔ آج بے حیا لوگ حیا والوں کا

تمسخر اڑاتے ہیں جن کا ایمان سے دُور کا تعلق بھی نہیں۔ وہ ایمان والوں کو بے ایمان کہنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ دنیا کے جاہ و جلال کے طالب دولت و زر کے پجاری اور روپیہ و پیسہ کے دیوانے مخلص و متدین طبقہ پر آوازے کستے ہیں۔ جہلاء علماء کو سکھانے اور پڑھانے کے لئے بیتاب ہیں جو ضروریات دین کو نہیں سمجھتے وہ عارفین کو معرفت کا درس دینے کے لئے مچل رہے ہیں اور جنہیں صرف عقیدہ کا لفظی ترجمہ نہیں آتا۔ وہ بھی علماء طبقہ کو عقائد کی تعلیم دینے کے لئے بے قرار ہیں۔ اس سے زیادہ اندھیر اور کیا ہوگا اور کب ہوگا؟ = نہیں سمجھتے کہ منبر ایک رسہ کشی کا میدان نہیں بلکہ حاکم عدل کے سامنے جواب دہ بھی ہونا ہے۔ نَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ کے فرمان کے مطابق صاحب منبر کا بیان تنہا ایک بیان نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے آثار و نتائج کا ایک غیر متناہی سلسلہ بھی ہوتا ہے جس طرح کسی تقریر و بیان کا اچھا اثر ہمیشہ کے لئے نیکی کے اضافہ کا موجب ہوگا۔ اور صدقہ جاریہ قرار پائے گا اسی طرح غلط بیانی اور اندھیر گردی کا مہلک نتیجہ ہمیشہ کے لئے نامہ اعمال کی سیاہی و تباہی کا موجب بنتا رہے گا جو لوگ متاثر ہوں گے اور ان کا اثر پھر جہاں جہاں تک پہنچے گا بیان کرنے والا اس میں برابر کا حصہ دار رہے گا۔ خداوند کریم سے دُعا ہے کہ وہ حق بیانی کی توفیق مرحمت فرمائے تاکہ ہم منبر کا حق کر سکیں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے خدمتِ قوم کے چاروں طریقے مرحمت فرمائے ہیں جن کے اثرات و نتائج بطور صدقہ جاریہ کے نامۂ اعمال میں درج ہو سکتے ہیں اور تا حال اس کے فضل و کرم سے ان ہر چہار فرائض کو اپنی حیثیت کے مطابق حسن اسلوبی سے نبھاتا چلا آ رہا ہوں اور خدا سے ہر وقت دُعا ہے کہ مجھے اپنے دین پر قائم رکھے اور صراطِ حق سے بحق محمدؐ و آل محمدؐ قدم ڈگمگانے نہ پائیں آمین۔

اس سال چونکہ بفضلِ خدا زیارت بیت اللہ کے شرف سے فیض یاب ہوا ہوں اس لئے ایک درد دل بیان کرنے کو جی چاہتا ہے حکومت سعودیہ کے اعلان کے مطابق اس دفعہ ایران سے آئے ہوئے حاجیوں کی تعداد ۳۵۲۲۴ تھی اور عراق سے آنے والوں کی تعداد ۲۰۵۱۷ تھی جن میں غالباً نصف سے زائد شیعہ حضرات تھے اور کل تعداد بیرونی لوگوں کی ۳۱۶۲۲۹ تھی ان میں نصف لاکھ کے قریب شیعہ حجاج کا ہونا غنیمت ہے لیکن پاکستانی شیعہ حضرات کے حال پر رونا آتا ہے کہ ملک بھر کی کروڑوں کی آبادی سے

بمشکل پاکستانی شیعہ حاجی دو سو تھے اگر شیعہ واعظین و مبلغین حضرات خود بھی اسی فریضہ کو ادا کرتے اور مومنوں کو بھی متوجہ کرتے تو ہماری تعداد بھی خاطر خواہ ہو سکتی تھی۔ میں مومنین کو اس تحریر کے ذریعہ سے اور حسب موقع تقریر کے ذریعے سے بھی متنبہ کرتا ہوں کہ کعبہ سے جو تعلق ہمیں حاصل ہے اور کسی کو نہیں نیز مدینہ سے جو روحانی قرب ہمیں حاصل ہے اور کسی کو نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام میں سے باقی سب اہل مذاہب ان مقدس مقامات پر اپنی اجارہ داری کا جھنڈا لہرائیں اور مقام عمل میں ہماری آنکھیں نیچی ہوں خدارا اس خوابِ غفلت سے جاگیے اور لوگوں کو کہنے کا موقعہ نہ دیجئے کہ مکہ و مدینہ سے شیعوں کا کوئی رابطہ نہیں ہے اور حدیثِ پیغمبر میں وارد ہے جو باوجود استطاعت کے حج نہ کرے وہ خواہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے میری امت سے خارج ہے

مرنے والے کیلئے اعمال

مرنے والا جب حدودِ قبر میں پہنچتا ہے تو اس کی رُوح اپنے پس ماندگان کے حسنِ سلوک کی منتظر رہتی ہے وہ ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کے بعد وحشت محسوس کرتا ہے لہٰذا اسے ایسی چیز کی احتیاج ہوتی ہے جو اس کی مانوسیت کا سبب بنے اسی بنا پر نمازِ وحشت اور ہدیہ میّت کو مستحب قرار دیا گیا ہے جب یہ نمازِ میّت کی رُوح کو ہدیہ کی جاتی ہے تو فرشتے یہ ہدیہ اس کو پہنچاتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ فلاں مومن نے تجھے یہ تحفہ بھیجا ہے پس اسے خوشی محسوس ہوتی ہے پس کوئی بھی نیک عمل کر کے اس کا ثواب اگر میّت کو بخشا جائے اور اسے ہدیہ کیا جائے۔ تو اسے پہنچ جاتا ہے خصوصاً دفن کی رات نمازِ وحشت کو ترک نہ کیا جائے جس کا طریقہ کتب اعمال میں درج ہے۔

ہر جمعرات کو کچھ پکانا اور لوگوں کو مدعو کرنا اس کے متعلق کوئی شرعی نص ثابت نہیں لہٰذا محض رواج ہی رواج ہے اگر اس کا طریقہ صحیح ہو تو خیرات کا فائدہ میّت کو ضرور پہنچے گا۔ لیکن موجودہ دور میں جہاں تک ہم نے دیکھا ہے۔ سب دیکھا دیکھی کی سنت کو پورا کرتے ہیں بلکہ لوگ ایسی باتوں کو علماء سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز ان کے نزدیک احکام ضروریہ میں سے ہے بہر کیف میّت کے لئے صدقہ یا خیرات کرنے میں اولاً تو جمعہ یا جمعرات کی کوئی قید نہیں بلکہ جب

بھی اس کے لئے کوئی عمل کیا جائے تو اسے اس کا فائدہ پہنچتا ہے اور جمعہ کی خصوصی برکت کے پیش نظر اگر ثواب کی زیادتی مقصود ہو بھی تو خیرات یا صدقہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سو ڈیڑھ سو کھاتے پیتے لوگوں کو بلانے کی بجائے اسی خرچ سے چند مساکین وغرباء و مومنین کی اعانت کر دی جائے جو اپنی چند روزہ ضروریات سے سبکدوش ہو سکیں ان کی طعام قیام یا لباس یا ادائیگی قرضہ وغیرہ میں امداد کر دی جائے اور اس سے بہتر ہے کہ کسی دینی درس گاہ میں بطور صدقہ جاریہ حصہ شامل کر لیا جائے تاکہ مرنے والے کا اجر ترقی کرتا رہے لیکن یہ یاد رہے کہ اس قسم کے صدقات و خیرات کا ثواب میت کو تب ملے گا۔ جب واجبات اس کے ذمہ نہ ہوں۔ ورنہ سب سے پہلے ورثاء پر ضروری ہے کہ میت کے ترکہ سے پہلے اس کے واجبات کو پورا کیا جائے جو اس کے ذمہ واجب الادا ہوں اور واجبات کی ادائیگی سے جو کچھ بچ جائے اس میں سے اس کی ایک تہائی سے اس کی وصیتوں کو جامہ عمل پہنایا جائے اور اگر اس کا مال متروکہ واجبات کی ادائیگی کے لئے کافی نہ ہو سکے۔ تو جو بھی اس کی جانب سے خیرات کی جائے اس کے واجبات کو مقدم رکھا جائے۔ اس کے بعد میت کے لئے جو بھی کار خیر کیا جائے گا اس کے لئے فائدہ مند ہو گا حضرت ابوذر کے پاس ایک مہمان آیا تو انہوں نے اس کے لئے موٹا تازہ اونٹ نحر کر دیا مہمان نے کہا کہ میرے لئے اتنا بڑا اونٹ نحر کرنے کی ضرورت نہ تھی تو ابوذر نے جواب دیا کہ مال کے چار خواہش مند تھے

① وارث جو مورث کی موت کے منتظر ہیں۔
② چور ڈاکو جو مالک کی غفلت کی انتظار اور موقعہ کی تاڑ میں ہیں۔
③ موت جو اجل کے انتظار میں ہے۔
④ خود مالک پس دانا مالک وہ ہے جو اپنے مال کو اپنے کام میں خود لگا لے اور روایات میں وارد ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک دانہ گندم پورے خروار سے اور ایک دانہ کھجور بڑے انبار سے بہتر ہے جو اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں سے خرچ کیا جائے بہ نسبت اس کے جو اس کی موت کے بعد ورثاء کی جانب سے خرچ ہو۔

بالعموم مومنین کی قبور کی زیارت بہت بڑا ثواب رکھتی ہے والدین و دیگر رشتہ دار عزیزوں کی قبروں پر جا کر قرآن پڑھنا، فاتحہ پڑھنا، ثواب کا موجب ہے اور میت کیلئے

جس قدر پڑھا جائے گا۔ اس کو بھی ثواب ملے گا اور گھر میں بیٹھ کر پڑھنے سے قبر پر جا کر پڑھنا ثواب مزید کا باعث ہے۔ پھر دفن ہونے والوں کے مراتب و منازل کے فرق سے زیارت کے درجوں میں بھی فرق ہو گا۔ علماء کی قبر کی زیارت بہت زیادہ ثواب رکھتی ہے۔ قبرستان میں جانے سے جہاں دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ وہاں خوف خدا اور اعمال صالحہ کی طرف رغبت بھی پیدا ہوتی ہے اس لئے سادات و مومنین و علماء کی قبور کی زیارت زائر اور مزور دونوں کے لئے باعث فائدہ ہے۔ زیارت قبور کی دعائیں کتب اعمال میں درج ہیں۔

زیارت قبور آئمہ

آئمہ و انبیاء کی قبور کی زیارت کا درجہ بہت زیادہ اور حضورؐ کا ارشاد ہے مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَمَاتِیْ کَانَ کَمَنْ زَارَنِیْ فِیْ حَیٰوتِیْ اَوْ کَمَا قَالَ۔ یعنی میرے مرنے کے بعد میری زیارت کرنے والا ایسا ہے جیسے میری زندگی میں میری زیارت کرنے والا ہو اور اپنی زیارت کی سرکار نے اس حد تک تاکید فرمائی کہ مَنْ حَجَّ الْبَیْتَ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ یعنی جس نے بیت اللہ کا حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو گویا اس نے میرے اوپر جفا کی۔ اسی طرح آئمہ طاہرین علیہم السلام کی مزارات مقدسہ کی زیارت مستحب ہے اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی زیارت کے لئے مختلف قسم کے آداب مقرر ہیں۔ جو کتب اعمال میں مندرج ہیں۔ ان میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے زائر کے لئے بالخصوص ہدایت ہے کہ وہ سفر زیارت کو جاتے ہوئے ماکولی و مشروبی کے لذائذ سے پرہیز کرے اور اپنے آپ کو غمزدہ صورت سے ظاہر کرتا رہے۔

عزاداری

ہر مرنے والے مومن کے غم میں رونا ثواب ہے اور یہ ثواب بھی مراتب کے لحاظ سے الگ الگ ہوتا ہے جس کے غم میں رویا جاتا ہے اس کی حیثیت عام ہو تو رونے کا ثواب اسی حیثیت سے ہو گا اور اگر وہ صاحب مرتبہ ہو مثلاً ایک عابد مر جائے تو اس پر غم کا ثواب اور زیادہ ہو گا اور اگر عالم مر جائے تو روایت کا مضمون ہے کہ ملائکہ مقربین اور ہر ذی روح مخلوق اس کے غم میں روتی ہے مگر شیطان اور اس کے مریدوں میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ بنا بریں انبیاء و اولیاء و آئمہ کے غم میں رونا بہت زیادہ ثواب و درجات کا موجب ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ حسین علیہ السلام چونکہ انسانیت کے محسن اعظم ہیں۔ لہٰذا ان کا غم

انسانیت کا فریضہ ہے کیونکہ یزید صرف حسین سے بیعت نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ وہ انسانیت سے اپنی درندگی کا راج منوانا چاہتا تھا۔ پس امام نے حمیت وغیرت انسانی کا علم بلند کرتے ہوئے یزیدیت کا مقابلہ کیا اور اسے ایسا ذلیل کیا کہ تا قیام قیامت اسے کھل کر میدان میں آنے کی جرأت نہ رہی۔

پس اس محسن اعظم کی زیارت انسانیت کا بھولا ہوا درس یاد کرنے کی بہترین دعوت ہے اسی طرح ان کی یاد میں عزاداری وسوگواری حمیت وغیرت کا پرچار ہے۔ جو لوگ ان کی زیارت وسوگواری کو بدعت سے تعبیر کرتے ہیں وہ انسانیت کی قدروں سے ناواقف ہیں بلکہ وہ یزید کی سی انسان نما زندگی کے ظاہری دلفریبیوں سے مسحور ہو کر عقل وخرد کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے ہیں۔ ان کا نام لینا یا ان کی یاد میں چند آنسو بہانا جذباتی عقیدہ اور خواہشاتی شغل نہیں بلکہ مظلوم کی صدائے حق چہار دانگ عالم میں گونج کر ہر مکتب فکر کی حساس ذہنیتوں کو ہر سال دعوت فکر دیتے ہوئے اپنی صداقت کا لوہا منواتی ہے اور ان کی مظلومیت کی داستان سن کر جو دل سے بے ساختہ غبار غم اٹھتا ہے اور آسمان دماغ سے ٹکرا کر آنسو کی شکل میں آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے یہ خراج عقیدت کے پھول ہیں جو محسن انسانیت کی بارگاہ عظمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ دیکھئے کسی تحریک کے کچلنے کے لئے سب سے زیادہ مفید اور موثر تین ذرائع ہوتے ہیں ① زور بازو ② سیم وزر ③ پروپیگنڈہ۔ امام مظلوم کی عزاداری اور ان کے نام کو مٹانے کی خاطر یہ ہر سہ ذرائع آزادانہ اور بھرپور انداز سے بروئے کار لائے گئے لیکن مٹنے کی بجائے اس سلسلہ عزاداری کو روز افزوں عروج حاصل ہوتا گیا۔ حتٰی کہ آسمان عظمت اس کے قدموں میں ہے اور عرش رفعت کے کنگرے اس کے زیر پا ہیں۔ حالانکہ ان میں سے ایک کا استعمال بھی ایک بڑی سے بڑی تحریک کو نیست ونابود کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ حسینی غم اور عزاداری کو زور بازو سے دبایا گیا۔ زبانیں ہاتھ پاؤں اور گلے کٹے لیکن واہ رے استقلال کہ عزاداروں کے قدم پیچھے نہ ہٹے۔ اسی طرح سیم وزر کی تھیلیاں تقسیم ہوتی رہیں جاگیروں کے لالچ سامنے آتے رہے مگر بے وجدے مٹتے رہے اور پروپیگنڈوں نے تو حد کر دی کہ زبان سے قلم سے منبر ومسجد سے کوچہ وبازار سے اور ہر لب ولہجہ سے رسالوں میں اخبارات میں اشتہاروں میں اور مستقل کتابوں میں ہر طریقہ سے اس سلسلہ کو مٹانے کی خاطر سب جتن

کئے گئے مذہب کو بدنام کرنے کی ہزارہا فرضی داستانیں تراشی گئیں اور عزاداروں پر ناقابلِ برداشت مظالم کے پہاڑ ڈھائے گئے لیکن نتیجہ کسی سے ڈھکا چھپا ہوا نہیں ہے۔ کہ اس داستانِ غم کا رنگ ہر سال پچھلے سال کی بہ نسبت زیادہ اُبھرتا چلا جا رہا ہے اور اس کی بساطِ عزم دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے اور صدیوں تک جاری رہنے والی جنگیں جن کو سبقاً یاد کرایا جاتا ہے۔ وہ حرفِ غلط کی طرح دل و دماغ سے مٹ جاتی ہیں لیکن حسینؑ اور اس کی تھوڑی سی فوج کی کل چھ گھنٹہ کی لڑائی باوجودیکہ اس کو بھلائے جانے کی ہزار کوششیں ہوئیں لیکن آسمان تاریخ پر اس کا وقار نیّرِ اعظم بن کے رہا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ حسینؑ کی عزاداری چونکہ انسانیت کا درس ہے اس لئے اس کی حفاظت کا ذمہ دار خود خلاقِ عالم ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات کا شرف دیا ہے پس مٹانے والے مٹتے رہیں گے اور یہ سلسلہ اسی طرح قائم و دائم رہے گا اور اس کی بدولت نیک نصیب لوگ جنت الفردوس کے سزاوار بنتے جائیں گے۔ محرم کی دس پہلی تاریخیں حضرت سیّد الشہداء کی ذبحِ عظیم کی یاد میں مخصوص ہیں اہلِ ایمان کا ایمانی فریضہ ہے کہ ان ایام میں خود بھی سوگوار بن کر رہے اور اپنے حلقۂ اثر میں بھی سوگواری کے رسوم کی ترویج کرے۔ جس طرح اپنے عزیز ترین انسان کی موت کے بعد انسان کے لباس و خوراک و وضع قطع و شکل و صورت میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح اس محسنِ انسانیت کی یاد میں اس سے بڑھ کر ہونا چاہیئے تاکہ ہر دیکھنے والا سمجھ لے کہ یہ حسینی عزادار ہے۔ بالخصوص لباس اور کھانے میں انتہائی سادگی کا مظاہرہ ہونا چاہیئے۔

شبِ عاشور رونے عبادت کرنے اور قرآن کی تلاوت یا دیگر اذکار میں بیداری سے گذاری جائے۔ اپنی آنکھ زبان اور کانوں بلکہ جملہ اعضاء پر پوری طرح کنٹرول کر لیا جائے پس ہمہ تن شہدائے کربلا کی یاد میں ماتمی بن کر رہے حتّٰی کہ مصافحۂ باہمی کو بھی ترک کر دیا جائے روزِ عاشور انتہائی غم و اندوہ کا دن ہے اس دن کسبِ معاش ناجائز ہے غم زدہ رہنا مومن کی نشانی ہے کتاب مفاتیح الجنان میں آداب تفصیل کے ساتھ مرقوم ہے۔

جو لوگ سینہ زنی اور ماتم کو بدعت کہتے ہیں وہ صرف اپنی آتشِ حسد کو ایسی بے تکی خرافات سے ٹھنڈا کرنے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں حالانکہ انہیں یہ خبر نہیں کہ حق کی آواز کو دبانا اس کے زیادہ اُبھرنے کا موجب ہوا کرتا ہے اور مظلوم کی مظلومیت پر پردہ ڈالنا

ظالم کے ظلم کو اور زیادہ واضح کرتا ہے نیز کسی رونے والے کو رونے سے روکنا جب کہ وہ حق بجانب بھی ہو اس کے فرطِ غم میں اضافہ کا باعث ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غمِ حسین روز افزوں اضافہ کے ساتھ آفاقِ عالم میں پھیلتا جا رہا ہے اور حق پرست انسان مظلومیت کی داستان سُن کر بنی امیہ سے متنفر ہوتے ہوئے دامنِ اہلِ بیتؑ سے وابستہ ہوتے چلے جا رہے ہیں مظلوم اور اس کے ساتھیوں کو عقلاً و نقلاً رونے پیٹنے ماتم کرنے اور اپنی فریاد کو بلند کرنے کا حق حاصل ہے اور اس انسانیت کے حق کو کبھی طاقت یا شور و غوغا سے دبایا نہیں جا سکتا۔ ہابیل کی شہادت پر حضرت آدم و حوّا کا رونا اور سر پر مٹی ڈالنا ثابت ہے حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ سارہ کا منہ پیٹنا قرآن مجید نے بتایا ہے حضرت یوسف و یعقوب کا غم قرآن و تفسیر میں موجود ہے۔ حضرت حمزہ کے غم میں صحابیات کا گریہ و بکا تاریخ نے پیش کیا ہے حضرت رسالتمآبؐ کی وفات پر حضرت عائشہ کا ماتم کرنا مذکور ہے اور حضرت حسینؑ کے غم میں جناب رسالتمآبؐ کا رونا اور سر میں خاک ڈالنا کتب صحاح میں موجود ہے ان کے باوجود بھی بدعت بدعت کی رٹ لگانا صرف ظالم کی پاسداری اور مظلوم کی حق پوشی کی سازش ہے جس کو کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو گی پس اس سلسلہ میں عَلَم ذوالجناح و جملہ شبیہات جو غم و اندوہ کے مظاہرے ہیں جائز ہیں اور یہی شیعی عقیدہ ہے۔

دسواں باب
قیامت کا بیان

قیامت کا اثبات

یہ عالم چونکہ خود بخود پیدا نہیں ہوا اور نہ یہ مادہ و طبیعت کی کارستانیوں کا نتیجہ ہے جو شعور سے بے بہرہ ہیں اور ثابت ہو چکا ہے کہ اس کا خالق و مدبر خدائے لم یزل ۔ لا یزال ہے جو جمیع صفاتِ کمال کا جامع ہے پس ضروری ہے کہ اس کی تخلیق بے معنی نہ ہو کیونکہ حکیم کا فعل عبث نہیں ہوا کرتا بنا بریں ضروری ہے کہ اس عالم فانی کے بعد ایک عالم جاودانی کا وجود ہو جو اس عالم فانی کے لئے نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہو ورنہ اگر اسی عالم فانی تک ہی سلسلہ موجودات کو منتہی مانا جائے تو یہ سارا انتظام بالکل عبث اور بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔

(۱) ہم دیکھتے ہیں کہ اس عالم میں خیر و شر کے دونو پہلو موجود ہیں اگر یہ سلسلہ اسی دارِ فانی تک ہی محدود ہو تو خیر و شر کے دو مفہوم صرف لفظی نزاع بن کر رہ جائیں گے جبکہ نتیجہ دونو کا ایک جیسا ہو۔ ہاں اگر اس عالم کے بعد ایک دوسرا عالم تسلیم کیا جائے جو اس عالم کے خیر و شر کا حقیقی انجام قرار دیا جا سکے تو ان دونو مفہوموں میں واقعی فرق اظہر من الشمس ہے

(۲) عقل کے نزدیک بعض افعال ایسے ہیں جن کا حسن یا قبح ذاتی ہے جیسے صدق کا حسن اور کذب کا قبح یا احسان کا حسن اور ظلم کا قبح اور یہ حسن و قبح تب مبنی برحقیقت ہو سکتا ہے جب ان کا انجام و نتیجہ الگ الگ ہو ورنہ یہ فرق صرف لقلقۂ لسانی رہ جائیگا

(۳) ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ انسانیت سوز حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کو اس دارِ فانی میں کوئی سزا نہیں ملتی اسی طرح بعض لوگ محسنِ انسانیت ہونے کے باوجود حسنِ جزا سے محروم رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ لیتے ہیں تو ضروری ہے کہ ایک دن مقرر ہو جس میں مجرم کو سزا اور محسن کو جزا دی جائے ورنہ عقل و بے عقلی میں کوئی فرق نہ رہے گا۔

④ خداوندِ قدوس نے اپنے مقدس کلام میں وعدہ فرمایا ہے کہ مطیع کی جزا اور نافرمان کی سزا کے لئے ایک دن مقرر ہے جس کا نام قیامت ہے اس میں نیکیوں کو جزائے خیر اور بدکاروں کو سزا دی جائے گی اور خدا کا وعدہ سچا ہو کر رہے گا۔

⑤ آدم سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں اور تمام صحفِ سماویہ نے باتفاق اعلان کیا ہے کہ خداوندِ کریم نے اپنی مخلوق کے لئے محاسبہ کا ایک دن مقرر فرمایا ہے جس میں اچھے و برے اعمال کی جزا و سزا ہوگی پس قیامت کے قیام کا عقیدہ ضروریاتِ دین میں سے ہے اور ہمارے نزدیک اس کا انکار کفر ہے اور یہ کہنا کہ وہ دن کب آئے گا یا کس طرح ہوگا اس کا علم اللہ ہی جان سکتا ہے جو خدا پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ اٹھانے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہے اور اس کی قدرت کا انکار کفرِ صریح ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ روح اسی جسم کے ساتھ محشور ہوگا اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس امر کو واضح کیا گیا ہے اور احادیث معصومین علیہم السلام اس بارے میں بہت زیادہ مروی ہے اور عقل بھی اسی نظریہ کی تائید کرتی ہے قیامت کا انکار کرنے والے اپنی آوارگی اور بے راہ روی کے برقرار رکھنے کے لئے ہی اپنی عقول کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ورنہ جس طرح وجودِ خالق ایک بدیہی امر ہے اسی طرح اس کا قادر علیم و حکیم بلکہ جامع جمیع صفاتِ کمال ہونا بھی محتاجِ دلیل نہیں اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگر عالم میں واقع ہونے والے خیر و شر کا منتہیٰ اور مآل کچھ نہ ہو تو خلقِ عالم عبث ہوگا۔ تو جب مآل کے طور پر اس عالم کے بعد ایک دوسرے عالم کا وجود ضروری ہے تو وہ خدا لئے قدیر و حکیم جو اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ شاملہ سے جمیع عالم کی ایجاد پر قادر ہے وہ اس کے جمیع اجزاء و جزئیات کے سمیت اعادہ پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے۔

نفخِ صُور

نفخِ صور کی حقیقت کیا ہے؟ یہ تفصیل ہماری عقول سے بالاتر ہے بہر کیف اس عالم نے فنا ہونا ہے پس نہ یہ زمین رہے گی نہ آسمان نہ چاند سورج و ستارے باقی رہیں گے نہ دریا سمندر و پہاڑ۔ قرآن مجید میں قیامت کے وقوع کی تصویر کشی متعدد مقامات پر کی گئی ہے جس کا تصور کر کے انسان کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جسم پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے اور عارف لوگ اس منظر کو یاد کر کے بے تحاشا رویا کرتے ہیں۔ بہر کیف پہلی دفعہ نفخِ صور سے سب ذی روح مر جائیں گے

...ت کا نام اسرافیل ہے (منہ)

اور غالباً اسی مقام کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہے کہ پروردگار عالم کی جانب سے ندا آئے گی۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ گویا زمین پر اپنی اپنی ملکیتوں پر ناز کر کے اکڑنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے پس اس عالم ہو میں موجودات کی فنا کے بعد بے بسی صدائے بازگشت بنے گی کہ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ کہ حقیقی مالک اللہ ہے جو اپنی ملکیت میں یکا و تنہا ہے اور وہی سب پر قاہر و غالب ہے پھر نفخ صور کے بعد دوبارہ تمام مخلوق کو زندہ کیا جائے گا زمین نئی آسمان نیا بلکہ کل انتظام نیا ہوگا۔ بہر کیف اس قدر تسلیم کرنا ضروری ہے کہ قیامت کا دن ضرور آئیگا جس دن انسانوں سے ان کے اعمال کی بازپرس ہوگی اور اچھائی و برائی کے نتائج نکلیں گے پس ذرہ ذرہ کے حساب کے بعد سزا و جزا کے فیصلے سنائے جائیں گے۔ نیک نصیب لوگ جنت کو جائیں گے اور وہ وہی ہوں گے جن کے عقائد درست اور عمل صالح ہوں گے اور بدنصیب لوگ دوزخ کی سزا پائیں گے اور وہ وہی لوگ ہوں گے۔ جنہوں نے دنیا کی ہوس پرستیوں کی خاطر خدا کی دعوت کو ٹھکرایا اور ایمان کے تقاضوں کی مخالفت کر کے انسانیت سوز اعمال و کردار کا مظاہرہ کیا۔

عقبات محشر

اس مقام پر شیخ صدوق قدہ کی فرمائش کافی و وافی ہے چنانچہ رسالہ اعتقادیہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ عقبات محشر کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ فرض یا امر یا نہی کے نام سے ہر عقبہ کا الگ الگ نام ہے پس جب انسان ایک عقبہ پر پہنچے گا اور کسی نیک عمل یا رحمتِ پروردگار کی بدولت وہاں سے پاس ہوگیا تو پھر دوسرے عقبہ پر پھر تیسرے عقبہ پر علیٰ ہذا القیاس سوال و جواب کی یہ منازل طے کرتا ہوا اگر سب عقبات سے گذر جائے گا تو دارالبقاء میں ابدی زندگی پائے گا اور ایسی سعادت سے ہمکنار ہوگا کہ وہاں شقاوت کا گذر تک نہیں ہوگا اور خدا کے جوارِ رحمت میں انبیاء و اوصیاءؑ و صدیقین و شہداء و صالحین کے ساتھ امن سے رہے گا۔ لیکن اگر کسی عقبہ پر روک دیا گیا اور کسی نیک عمل یا رحمتِ پروردگار کی بدولت اس کا چھٹکارا نہ ہو سکا تو اس عقبہ سے اس کا قدم پھسل جائے گا اور وہ دوزخ میں جا گرے گا (نعوذ باللہ منہا) یہ عقبات سب کے سب پل صراط کے اوپر ہیں ان میں سے ایک کا نام ولایت بھی ہے جہاں سب مخلوق کو ٹھہرا کر حضرت امیر علیہ السلام اور باقی آئمہ کی ولایت کا ان سے سوال کیا جائے گا پس جس نے صحیح جواب دیا تو وہ نجات پا کر جنت میں جائے گا اور منکر ولایت دوزخ میں گر جائے گا۔

اور اسی کے متعلق ارشاد پروردگار ہے۔ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ (ان کو ٹھہراؤ کہ ان سے پوچھا جانا ہے) ان میں سے ایک عقبہ کا نام مرصاد ہے جیسے کہ فرماتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ حدیث قدسی میں ارشاد پروردگار ہے کہ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کسی ظالم کا ظلم مجھ سے چھوٹ نہیں سکتا ان میں سے ایک عقبہ کا نام رحم ہے۔ ایک عقبہ کا نام امانت ہے ایک عقبہ کا نام نماز ہے اور ہر ہر فرض و امر و نہی کے نام سے ایک ایک عقبہ موسوم ہے جہاں بندے کو روک کر اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

حساب قیامت

ہمارا اعتقاد ہے کہ حساب حق ہے اور اس کا اقرار ضروریات مذہب سے ہے شیخ صدوق قدہ نے اعتقادیہ میں فرمایا ہے کہ خدا انبیاء و آئمہ کا حساب لے گا ــــــــ اور انبیاء اپنے اولیاء سے حساب لیں گے کیونکہ اللہ انبیاء و رسل پر شہید ہے اور وہ اپنے وصیوں پر شہید ہیں اور آئمہ باقی تمام لوگوں پر شہید ہیں چنانچہ ارشاد قدرت ہے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا اس آیت مجیدہ کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ہم میں سے ایک امام امت کے ایک قرن پر شاہد ہوتا ہے۔ اور حضرت محمد مصطفیٰ ہم پر شاہد ہوں گے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض خلص مومن بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے چنانچہ کربلا کے خواص میں سے ہے کہ اس تربت طاہرہ میں دفن ہونے والے مومنین کا حساب نہ ہوگا بلکہ وہ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے اسی طرح خاص دشمنان اہلبیت و کفار و مشرکین بھی بلا حساب دوزخ میں جائیں گے۔ بارگاہ عدل خداوندی میں کسی پر ذرہ بھر ظلم نہ ہوگا چنانچہ ارشاد فرماتا ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ یعنی جس نے رائی برابر بھی نیکی کی ہوگی تو اس کو اس کی جزا ملے گی اور کسی نے رائی برابر برائی کی ہوگی تو وہ اس کا انجام دیکھے گا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے جب انسان میدان محشر میں کھڑا ہوگا تو اس سے واجب نماز زکوٰۃ مفروضہ روزہ واجب حج واجب اور ہماری ولایت کا سوال ہوگا پس اگر ہماری ولایت کا قائل ہوگا تو نماز زکوٰۃ روزہ اور حج و جملہ عبادات اس کی قبول ہوں گی ورنہ سب کے سب اعمال رد کر دیئے جائیں گے اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول خدا نے فرمایا اللہ کے سامنے انسان سے چار چیزوں کا سوال ہوگا۔

(۱) عمر کے متعلق کہ اس کو کس کام میں فنا کیا۔
(۲) جسم کے متعلق کہ اس کو کہاں کہنہ کیا۔
(۳) مال کے متعلق کہ کہاں سے کمایا اور کہاں لگایا۔
(۴) ہم اہل بیت کی محبت کا سوال ہوگا

ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا حضورؐ! آپ کی محبت کی علامت کیا ہے تو آپ نے علیؑ کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اس کی محبت۔ ہم نے مقدمہ تفسیر باب مقبولیت اعمال میں اس قسم کی کافی احادیث جمع کی ہیں۔

بروز محشر انسان اپنا اعمالنامہ لے کر اُٹھے گا۔ اہل جنت کے اعمال نامے دائیں ہاتھوں میں اور دوزخیوں کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھوں میں ہوں گے اعمالنامہ میں انسان کی ہر نیکی یا بدی درج ہوگی اور ارشاد ہوگا۔ اِقْرَءْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (ترجمہ) یعنی اپنی کتاب کو پڑھ کر تیرا نفس خود ہی اپنے حساب کی جانچ پڑتال کے لئے کافی ہے بعض لوگ اس وقت بھی اپنے کردہ گناہوں سے انکار کریں گے تو زبان پر مہر خاموشی لگا کر اس کے ہاتھ پاؤں اور جملہ اعضاء کو طاقت گویائی دی جائے گی۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے فَاِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (ترجمہ) یعنی کان آنکھ اور دل ان تمام سے پوچھا جائے گا۔ بروایت عیاشی امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کان سے اپنی سُنی ہوئی چیزوں کا آنکھ سے اپنی دیکھی ہوئی چیزوں کا اور دل سے اپنے عقائد کا سوال ہوگا۔ اسی طرح ہاتھ پاؤں اور جملہ اعضاء سے بھی سوال ہوگا۔ اور ہر عضو اپنے کئے ہوئے اعمال کی شہادت دے گا۔

حقوق الناس کی بازپرس بہت سخت ہوگی کیونکہ صاحبان حق فریادی ہوں گے پس اس دن خمس و زکوٰۃ کی ادائیگی سے سستی کرنے والے پشیمان ہوں گے لیکن اس پشیمانی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اس دن ایک ایک کوڑی کے بدلہ میں اپنی قیمتی نیکیاں دے کر صاحب حق کو راضی کرنا ہوگا اور خدائے عادل ان کو اپنا حق دلائے گا۔ چنانچہ انوار نعمانیہ سے مروی ہے۔ وَفِي الْاَخْبَارِ اَنَّهُ يُؤْخَذُ بِدَانِقٍ مِنْ فِضَّةٍ سَبْعُ مِاَةِ صَلٰوةٍ مَقْبُوْلَةٍ کہ چاندی کے ایک ایک ماشہ کے بدلہ میں سات سات سو مقبول نمازیں اس سے وصول کی جائیں گی۔

علل الشرائع سے مروی ہے کہ اگر مقروض کے پاس نیکیاں ہوں گی تو اپنے قرضہ کے

بدلہ میں نیکیاں دیتا جائے گا۔ ورنہ قرض خواہ کے گناہوں کا بوجھ اس پر ڈال کر اس کے عذاب کو بڑھا دیا جائے گا اور اس طرح قرض خواہ کو اپنا بدلہ مل جائے گا۔ بروایت حق الیقین امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ کافر اگر مقروض ہوگا تو مومن کے گناہوں کا بوجھ اس پر ڈال کر اس کے عذاب کو بڑھا دیا جائے گا کیونکہ اس کے پاس نیکیاں تو ہوں گی نہیں۔ اسی طرح ظالم و مظلوم کا فیصلہ ہوگا کہ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دلائی جائیں گی لیکن اگر ظالم کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہوں کا بوجھ اس پر ڈال دیا جائے گا۔ جناب رسالتمآب سے مروی ہے کہ مسکین و مفلس اور قابلِ رحم وہ شخص ہے جس کے نامۂ اعمال میں نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ ہو اور میدانِ محشر میں جب آئے تو اس نے کسی کو گالیاں بھی دی ہوں کسی کا مال بھی کھایا ہو اور کسی کو نقصان بھی پہنچایا ہو گویا اس کے ارد گرد مظلوموں کا ہالہ ہو پس اس روز اس کی نیکیوں میں مظلوموں کا حق ادا کیا جائے گا۔ اگر حقوق کی ادائیگی سے قبل اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو مظلوموں کے گناہوں کا بوجھ بھی اس پر ڈال دیا جائے گا۔ پس وہ حقوق الناس کی بدولت نیکیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور دوزخ میں جائے گا۔ اسی بناء پر حضورؐ سے مروی ہے کہ دنیا میں ایک درہم صاحبِ حق کو واپس کر دینا ہزار سال کی عبادت کرنے اور ہزار غلام آزاد کرنے سے بہتر ہے نیز ہزار حج و عمرہ سے افضل ہے۔

مروی ہے کہ حیوانات کو بھی محشور کیا جائے گا اور تقاضائے عدل بھی یہی ہے کہ ظالم سے مظلوم کا بدلہ لیا جائے چنانچہ کمزور حیوانوں کے ظلم کی طاقتور حیوانوں سے باز پرس ہوگی۔ یعنی ظالم حیوانوں کو سزا دی جائے گی اور اس کے بعد ان کو فنا کر دیا جائے گا۔ اگر انسانوں نے حیوانوں پر ظلم کیا ہوگا تو انسان سے اس کی باز پرس بھی ہوگی۔ اسی بناء پر شرعاً واجب ہے کہ جو حیوان اپنی خدمت کے لئے رکھے جائیں ان پر ظلم نہ کیا جائے۔ ان پر طاقت سے زیادہ بوجھ یا خدمت نہ لی جائے ان کو ضرورت سے کم خوراک نہ دی جائے اور ان کو مارا پیٹا نہ جائے اور حقوق حیوانات میں تو اس قدر سختی ہے کہ انسان گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہا ہو اور راستہ میں کسی سے بات کرنی پڑ جائے تو چلتے ہوئے بات کرے یا اتر کر اپنے مطلب کو پورا کرے ایسا نہ ہو کہ سواری کو کھڑا کر کے اوپر سوار ہو کر باتوں میں مشغول اور حیوان بیچارے پر خواہ مخواہ بوجھ ڈالے رہے۔ اسی طرح اگر حیوانوں کی خوراک کا بندوبست کر سکتا ہو تو ٹھیک ہے ورنہ ان کو بیچ دینا واجب ہے جس طرح انسان پر اپنے عیال کا نفقہ

واجب ہے اسی طرح حیوانوں کا نفقہ بھی واجب ہے۔ پس یہ حیوان دنیا میں تو مظلومیت کا وقت گذار کر مر جائیں گے لیکن آخرت میں ان کی باز پرس بہت سخت ہوگی۔ پس نیک نصیب ہوں گے وہ لوگ جو حقوق اپنی گردن پر نہ رکھتے ہوں گے اور خوشحال ان لوگوں کا جن سے باز پرس نہ ہوگی۔ اسی بناء پر منقول ہے۔ مَنْ اَرْضَى الْخُصَمَاءَ مِنْ نَفْسِهٖ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ بِغَيْرِ حِسَابٍ یعنی جس نے اپنی ذات سے صاحبانِ حق کو راضی کر لیا۔ وہ بلا حساب جنت میں جائے گا اور شیخ صدوق قدہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں كُلُّ مُحَاسَبٍ مُعَذَّبٌ وَلَوْ بِطُوْلِ الْوُقُوْفِ وَلَا يَنْجُوْا مِنَ النَّارِ وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدٌ بِعَمَلِهٖ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ یعنی ہر وہ شخص جس سے حساب لیا جائے گا وہ معذب ہوگا اگرچہ طولِ وقت سے ہی سہی اور دوزخ سے نجات پانا اور جنت میں داخل ہونا کسی کی عمل کی طاقت سے نہ ہوگا۔ بلکہ رحمت پروردگار کی بدولت ہی ہوگا

اور ہمارا عقیدہ یہ ہے جیسا کہ شیخ صدوق ؒ نے فرمایا ہے کہ خدا جملہ اولین و آخرین کو ایک ہی خطاب سے مخاطب کرے گا جس سے ہر شخص اپنے متعلق اپنی باز پرس کو جان لے گا اور خدا بیک وقت ایسا کرنے پر قادر ہے پس وہ بیک وقت سب سے پوچھ بھی سکتا ہے اور سب سے سن بھی سکتا ہے اس کو ایک کا خطاب دوسرے کے خطاب سے روک نہیں سکتا۔ پس دنیا کے اوقات کے مطابق ایک آدھ گھنٹہ میں تمام مخلوق کے حساب سے وہ فارغ ہو جائے گا۔ بہرکیف ہمارا عقیدہ ہے کہ حساب حق ہے اور اس کا منکر کافر ہے اور اس پر اجمالی اعتقاد رکھنا ہی کافی ہے خداوند کریم اس دن کی سختی اور حساب کی تنگی سے ہمیں محفوظ رکھے آمین۔

میزان حق ہے

ہمارا عقیدہ ہے کہ میزان حق ہے اور یہ کہ خداوند کریم ہر نیکی یا برائی کا بدلہ دے گا جس کا نیکی کا پڑا وزنی ہوگی وہ جنت میں جائیں گے اور جن کا برائی کا پڑا جھک جائے گا وہ جہنم میں جائیں گے اور ہمارے نزدیک ان کا منکر کافر ہے شیخ صدوق ؒ نے اعتقادیہ میں فرمایا ہے کہ حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا اَلْمَوَازِيْنُ الْاَنْبِيَاءُ وَالْاَوْصِيَاءُ کہ نبی اور ان کے وصی ہی میزان ہیں مقصد یہ کہ کسی کوئی عمل بغیر ان کی رہبری کے قابل قبول نہیں ہوگا۔ مقدمہ تفسیر مرآۃ الانوار میں حضرت امیر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضورؐ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کیا ہر لا الہ الا اللہ کہنے والا مومن ہو جاتا ہے

تو آپ نے فرمایا کہ ہماری عداوت انسان کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ ملا دیتی ہے اور تم لوگ جنت میں نہیں جا سکتے جب تک میرے ساتھ محبت نہ کرو اور جو شخص علیؑ سے بغض رکھ کر میری محبت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔

جامع الاخبار (باب النوادر) ایک مرتبہ حضرت امیر علیہ السلام قنبر کو ساتھ لئے مسجد کوفہ سے عبور فرما رہے تھے کہ قنبر نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھ کر عرض کی کہ حضور اس سے بہتر نماز پڑھتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا اے قنبر خدا کی قسم ہم اہلبیتؑ کی ولا پر کسی کا یقین رکھنا ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے اگر کوئی شخص ہزار سال خدا کی عبادت کرے لیکن ہماری ولا نہ رکھتا ہو تو خدا اس کی عبادت کو قبول نہ کرے گا پس اگر کوئی شخص ہزار سال عبادت کرے اور بہتر نبیوں کے عمل کے برابر عمل کرے تو جب تک ہم اہلبیتؑ کی ولا نہ رکھتا ہوگا اس کا کوئی عمل قبول نہ ہوگا اور خدا اس کو اوندھے منہ دوزخ میں ڈالے گا۔

بہرکیف میزان کا عقیدہ ضروریاتِ دین سے ہے لیکن اس کی کیفیت کو تفصیلاً جاننا ضروری نہیں ہے خدا اپنے بندوں سے جس طرح چاہے حساب لے سکتا ہے اس سے کسی کی نیکی یا برائی قطعاً مخفی نہیں ہے۔

وعدہ و وعید اور عدلِ خداوندی

شیخ صدوقؒ نے فرمایا ہے وعدہ و وعید کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے جس عمل پر جس قدر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ ضرور پورا ہوگا اور جس عمل پر عذاب کی وعید (دھمکی) دی ہے اس میں وہ مختار ہے اگر اس کو عذاب کرے تو عدل ہے اور اگر معاف کر دے تو اس کا فضل ہے خداوند کریم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا اور ارشاد خداوندی ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (ترجمہ) یعنی خدا شرک کو معاف نہیں کرے گا اس کے علاوہ جو چاہے اور جس کے لئے چاہے وہ بخش سکتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جس کی موت شرک میں ہو وہ نہیں بخشا جائے گا ورنہ اگر اپنی زندگی میں شرک سے توبہ کرے تو وہ بخشا جا سکتا ہے۔

آیت مجیدہ میں جو عام بخشش کی پیشکش ہے وہ توبہ کے ماتحت نہیں کیونکہ توبہ کے بعد تو کوئی گناہ رہ سکتا ہی نہیں اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا مثل اس کے ہے جس نے سرے سے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ پس آیت مجیدہ

اُن لوگوں کو سہارا ضرور رہی ہے جو کسی وجہ سے توبہ کرنے پر موفق نہ ہو سکے ہوں لیکن عقائد کے لحاظ سے وہ راہِ غلط پر گامزن نہ ہوں۔ پس ایسے گناہ گار مومنوں کے لئے بخشش کی امید ہے اور وہ وہی لوگ ہوں گے۔ جن کے متعلق محمدؐ و آلِ محمدؐ شفاعت فرمائیں گے اور یہ خیال رہے کہ نیکی کی جزا کو سلب کر لینا عدل کے خلاف ہے لیکن کسی کے گناہ اور غلطی کو معاف کر دینا خلافِ عدل نہیں بلکہ عین تفضل ہے اور اگر اس کا رحم و کرم اور فضل شاملِ حال نہ ہو تو کوئی شخص حساب کی منزل سے پُورا اتر سکتا ہی نہیں کیونکہ اس کی کسی نعمت کا شکر ادا نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ آئندہ کسی انعام کا استحقاق پیدا ہو۔ پس خدا اپنے رحم و کرم سے ہی مومن گنہگاروں کو بخشے گا اور وہ ارحم الراحمین ہے اور عدل کا مقصد یہ ہے کہ نیکی یا برائی کا بدلہ پُورا پُورا دیا جائے۔ لیکن خدائے مہربان اپنے بندوں کے ساتھ عدل سے بڑھ کر تفضل کا معاملہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ ہر نیکی کا بدلہ کم از کم دس گنا عطا فرماتا ہے اور برائی کو توبہ سے معاف کر دیتا ہے اور توبہ نہ بھی کرے تو ایک کا بدلہ صرف ایک ہی ہوا کرتا ہے

حبطِ اعمال عدل کے منافی نہیں

ہم نے اس مقصد کی وضاحت تفسیر انوار النجف کے مقدمہ میں اچھی طرح کر دی ہے اس مقام پر زیادہ تفصیل سے بحث کرنا موجبِ تطویل ہے لیکن مقصد کے چہرہ سے غبار کو ہٹانا بھی ضروری ہے تاکہ شکوک و شبہات قبولِ حق میں سدِ راہ نہ بن سکیں۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حبط کا تذکرہ موجود ہے اور ان سب کا مآل سمجھ لیجئے کہ تھوڑی نیکی کے بعد بڑا جرم اس نیکی کی اہمیت کو گرا دیا کرتا ہے۔ مثلاً کسی یتیم کو ایک دمڑی انعام یا بطورِ رحم دے کر اسے تھپڑ مارنا اس کے سابق رحم کی ناؤ کو ڈبو دیا کرتا ہے اور چونکہ نیکیوں میں بعض کو اصولی حیثیت حاصل ہے اور بعض فروعی مقام رکھتی ہیں اور اسی طرح برائیاں بھی بعض اصولی اور بعض فروعی ہوا کرتی ہیں۔ بنابریں فروعی نیکی کے مقابلہ میں اسی وزن کی فروعی برائی ہیچ ہو جاتی ہے کیونکہ نیکی کی جزا ایک کے مقابلہ میں دس اور برائی کی سزا ایک کے مقابلہ میں ایک ہی ہوا کرتی ہے اور اصولی نیکی سے مراد عقائد کی درستی ہے۔ جیسے کہ کتاب ہذا کا موضوع ہے اور اصولی برائی سے مراد عقائد کی خرابی ہے پس اگر کسی شخص کا عقیدہ درست ہو لیکن اعمال فرعیہ میں اس سے کوتاہی سرزد ہو تو وہ قابلِ عفو ہو جایا کرتی ہے جب کہ حقوق الناس سے اس کا تعلق نہ ہو اور اسی کے متعلق ہے کہ خدا شرک کے علاوہ تمام گناہ بخش دیتا ہے جس کے لئے چاہے

اور اگر کسی شخص کے عقائد خراب ہوں تو اس کی بڑی سے بڑی نیکی بھی بے کار ہو جاتی ہے کیونکہ جس طرح اصولی نیکی یعنی عقائد کی درستی فروعی برائیوں پر غالب ہے اسی طرح اصولی برائی یعنی عقائد کی خرابی فروعی نیکیوں پر غالب ہے کیونکہ نیکی ایک کے بدلہ میں دس اس وقت شمار ہوتی ہے جب عقائد بھی صحیح ہوں۔ ورنہ نیکی نیکی ہی نہیں رہتی اور اسی کا نام حبط عمل ہوا کرتا ہے اور یہ ظلم نہیں بلکہ ضبط ظلم ہوا کرتا ہے یعنی کسی کی نیکی کو جزا سے محروم کر دینا جبکہ نیکی صحیح معنوں میں نیکی بھی ہو اور خداوند کریم اس ظلم سے بلند و بالا اور پاک و منزہ ہے عقائد حقہ، شجرۂ اسلام کے اصول اور جڑیں ہیں جنہیں اصولِ دین سے تعبیر کیا جاتا ہے اور نیک اعمال اسی شجرہ کے فروع اور شاخیں ہیں جن کو فروعِ دین کہا جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں عقائد باطلہ شجرۂ کفر کے اصول اور جڑیں ہیں جو اصولِ کفر بنتے ہیں اور اعمال بد اسی کی شاخیں ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر درخت پر اسی نوعیت کی ہی شاخیں زیب دیتی ہیں لہذا جس شخص کے عقائد درست ہوں اس سے بعید ہے کہ وہ اعمال ناشائستہ کا مرتکب ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک درخت کی شاخ دوسرے درخت کی اصل سے نہیں جڑ سکتی جب تک کہ درختوں میں مناسبت نہ ہو بنا بریں اعمال بد جو شجرۂ کفر کی شاخیں ہیں وہ شجرۂ اسلام پر قرار نہیں پکڑ سکتیں اور ان کا شجرۂ اسلام سے قطعاً جوڑ باقی نہیں رہ سکتا آخر مرجھا اور کملا کر خشک ہو جائیں گی جیسا کہ ارشاد ہے حُبُّ عَلِيٍّ يَأكُلُ الذُّنُوبَ كَمَا تَأكُلُ النَّارُ الحَطَب۔ یعنی علیؑ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح خشک لکڑی کو آگ کھا جاتی ہے۔ یعنی جس دل میں ولاء علیؑ کی اصل قائم ہو وہاں فروعی برائیاں اپنا ٹھکانا نہیں بنا سکتیں جیسے آگ میں لکڑی کا ٹھکانا نہیں ہوتا۔ پس علیؑ کے محب کی طرف جو گناہ رخ کرے گا، محبت علیؑ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو قریب نہ آنے دے اور اگر آ بھی گیا تو محبت علیؑ اس شخص کو توبہ پر مجبور کر کے اس گناہ کو راکھ بنا دے گی۔ پس اس پاکیزہ اصل پر کوئی گناہ برقرار نہیں رہ سکتا اور اسی بناء پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا يَا عَلِيُّ أَنْتَ وَشِيعَتُكَ هُمُ الفَائِزُونَ اے علیؑ تو اور تیرے شیعہ کامیاب ہوں گے پس جس طرح فروعِ بد کو اصولِ طیبہ پر بقا نہیں ملتی اسی طرح اعمال صالحہ جو شجرۂ اسلام کی صحیح شاخیں ہیں یہ اصولِ کفر پر پائیدار نہیں رہتے لہذا اگر غلط عقیدہ رکھنے والا انسان نیک اعمال کرے تو اس کے اعمال رائیگاں اور بے ثمر ہوں گے اسی بناء پر ارشاد ہے کہ حُبُّ عَلِيٍّ حَسَنَةٌ لَا يَضُرُّ مَعَهُ سَيِّئَةٌ وَبُغضُ عَلِيٍّ سَيِّئَةٌ

لَا يَنْفَعُ مَعَهُ حَسَنَةٌ" علیؑ کی محبت ایسی نیکی ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا اور علیؑ کا بغض ایسی برائی ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ کیونکہ علیؑ کی محبت اصولی نیکی ہے جس کے سامنے فروعی برائیوں کو قرار حاصل نہیں ہوتا اور علیؑ کا بغض اصولی برائی ہے۔ جس کے سامنے کسی فروعی نیکی کو فروغ نہیں ملتا۔

ہاں اگر علیؑ کا محب کہلاتے ہوئے کوئی انسان افعالِ ناشائستہ اور اعمالِ خبیثہ کا دلدادہ ہو نہ ان کے کرنے سے گھبراتا ہو اور نہ کر کے پچھتاتا ہو تو ایسی صورت میں اسے اپنے قلب کا جائزہ لینا چاہیے اور اسے محبت علیؑ کی تجدید کرنی چاہیے کیونکہ محبت علیؑ کے ساتھ گناہ پر جرأت بہت مشکل ہے کیونکہ پاکیزہ درخت پاکیزہ پھل کا مقام ہے نہ کہ خبیث چیزوں کا۔ پس ولائے علیؑ کے ساتھ پاکیزہ اعمال اس درخت کی زینت ہیں لہٰذا چوری بدکاری عیاشی فحاشی اور ناخدا ترسی وغیرہ سب بغض علیؑ اور شجرِ خبیث کے ثمرات ہیں۔ ہم نے تاویل قرآن اور عبادت ظاہریہ کے موضوع پر مقدمہ تفسیر میں ایک مفصل بیان سپرد قرطاس کیا ہے اور مفضل بن عمر کی روایت میں حضرت صادق علیہ السّلام کا مفصل فرمان اختصار سے وہاں درج کیا ہے جس میں آخری جملہ یہ ہے کہ معصوم نے فرمایا کہ دشمن نبی اور دشمن امام تمام برائیوں کی اصل ہیں اور تمام برائیاں اس کی فرع ہیں پس جو شخص اصل سے نفرت کرتا ہو اور ان برائیوں سے نفرت نہ کرے جو اسی اصل کی فروعات اور پیداوار ہیں تو وہ جھوٹا ہے کیونکہ دشمن امام سے بیزاری اصل ہے اور برائیوں سے نفرت اس کی فرع ہے اور ہر اصل اپنی فرع سے پہچانی جاتی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ معرفت حاصل کرلو پھر جو جی چاہے کرو لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ امام کی معرفت حاصل کرنے کے بعد جس قدر نیکی کرو گے وہ قبول ہوگی خواہ کم ہو یا زیادہ اور بجز معرفت کے کوئی نیکی نیکی ہی نہیں الخبر

مختصر لفظوں میں اس کی واضح مثال یوں سمجھئے کہ ظاہری حکومتوں میں تین قسم کے لوگ ہوا کرتے ہیں ① حکومت کو تسلیم کرنے والے اور حکومت کے ہر قانون کا احترام کرنے والے ② حکومت کو تسلیم کرنے والے لیکن قانون شکنی کرنے والے (معاشرہ کے مجرم) ③ حکومت کو نہ ماننے والے خواہ معاشرہ کے مجرم ہوں یا نہ ہوں اور یہ امر واضح ہے کہ حکومت کو تسلیم کرنا حکومت کے نزدیک اصولی نیکی ہے اور حکومت کی جانب سے عائد کردہ معاشرتی قوانین کا احترام حکومت کے نزدیک ثانوی اور فرعی نیکی ہے۔ پس پہلی قسم کے لوگ تو یقیناً مقربین میں سے ہوں گے جو حکومت اور معاشرہ

دونو کے خیر خواہ اور وفادار ہوں اور باقی دونو قسم کے لوگ مجرم ہیں لیکن آخری قسم سخت مجرم ہے جو سرے سے حکومت کو تسلیم ہی نہیں کرتی لہٰذا اگر وہ معاشرتی طور پر قوانین کا احترام بھی کرے تاہم ان کی اصولی غلطی قطعاً نظر انداز کرنے کے قابل نہیں بلکہ ہر وقت ان کا وجود حکومت کی نظروں میں خار کی طرح چبھتا رہے گا جب تک کہ ان کو سنگین سے سنگین تر سزا نہ دی جائے پس ان کی کسی معاشرتی خوبی کو اہمیت حاصل نہ ہوگی۔ جب تک کہ وہ اصولاً حکومتِ وقت کو دل وجان سے تسلیم نہ کریں اور اس کی وفاداری کا عہد نہ کریں بخلاف اس کے جو لوگ حکومت کے وفادار ہو کر فروعی جرم کریں تو وہ اگرچہ مجرم ہیں لیکن ان کی سزائیں محدود ہوں گی اور ان میں تخفیف حکومت کا رحم وکرم ہوگا۔ ہاں بے شک اصولی مجرموں کو ڈھیل دینا یا ان کی کسی نیکی کے ماتحت ان سے رواداری کرنا خلافِ عقل اور حکومت کی ناعاقبت اندیشی متصور ہوگی۔

بہرکیف مطلب واضح ہے اگرچہ مثال ہر حیثیت سے مطابق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عدلِ خداوندی کو ظاہری حکومتوں پر قیاس کرنا فضول ہے پس حبط اور ضبط میں فرق ظاہر ہے۔ حبط عین عدل ہے یعنی کسی مجرم کی اصولی غلطی کے ماتحت اس کے کسی نیک کام کو مہمل اور رائیگاں قرار دینا اور ضبط ظلم ہے یعنی عمل کو تسلیم کرنے کے بعد بطور سزا کے اس کی جزا کو معطل کرنا اور خدا اس سے پاک ومنزہ ہے۔ ہم نے اصولِ حقہ اور عقائد صحیحہ کو اسی کتاب میں نہایت مدلل طریقہ سے بیان کر دیا ہے پس ان عقائد کے بغیر کوئی عمل عمل نہیں رہتا اور اسی کا نام حبط ہے۔

شفاعت

شیخ صدوق قدہٗ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں شفاعت ان لوگوں کی ہوگی جن کا دین خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوگا یعنی عقائد صحیح ہوں گے اور وہ گناہانِ صغیرہ وکبیرہ کے مرتکب ہوں گے اور توبہ کر کے مرنے والے تو شفاعت کے محتاج ہی نہیں ہیں۔ (شفاعت اس کی ہوگی جو بلا توبہ کے مرے ہوں) حضورؐ نے فرمایا جو میری شفاعت پر ایمان نہ رکھتا ہو خدا اسے میری شفاعت نصیب نہ کرے اور یہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ توبہ سے بڑھ کر کوئی بہتر شفیع نہیں ہے اور شفاعت کا حق نبیوں اور وصیوں کو حاصل ہوگا مومنوں میں سے بعض شفاعت کرنے والے قبیلہ مُضر وربیعہ کے برابر لوگوں کی شفاعت کریں گے اور کم از کم مومن کی شفاعت تیس ہزار تک کے لئے ہوگی۔ اہل شک مشرک کافر اور منکر کی کوئی شفاعت نہ ہوگی بلکہ صرف موحد گناہ گار لوگوں کی شفاعت ہو سکے گی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف شفاعت حق ہے اور دوسری طرف بعض

گناہ اس قسم کے ہیں جن کے متعلق دائمی عذاب کی وعید قرآن مجید و احادیث میں موجود ہے۔
پھر ایسی صورت میں گنہگار مومن کا انجام کیا ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم وعید کے متعلق ابھی بیان کر چکے ہیں کہ خدا کو اختیار ہے کہ مجرم کو سزا دے تو یہ اس کا عدل ہے اور اگر چاہے تو اس کو معاف بھی کر دے اور یہ اس کا فضل ہوگا، پس عین ممکن ہے کہ خدا اس کی دائمی سزا کو محدود کر دے گویا آیات و احادیث میں گنہگار مومن کی دائمی سزا سے مراد طولانی سزا ہوگی اور غیر مومن کے لئے اپنے حقیقی مفہوم کے ماتحت ان کی سزا دائمی ہوگی۔ اس سے قبل بھی بیان ہو چکا ہے کہ اصولی نیکی کے مقابلہ میں فروعی برائی کو قرار حاصل نہیں تو گناہ کس قدر بڑا ہو آخر وہ فروعی حیثیت سے ہی ہوگا اور اس کے مقابلہ میں مومن کا ایمان اور عقیدہ صحیحہ اس کی اصولی نیکی ہے پس اگر گناہ کی سزا دائمی ہو جائے تو اس کی اصولی نیکی کا اجر ضائع ہو جائے گا اور نیکی کے اجر کا ضائع کرنا عدل کے منافی ہے پس اس کا حل یہی ہے کہ گناہ کی سزا محدود ہو اور اس کے بعد شفاعت کی بدولت اسے جنت الفردوس دائمی عطا ہو اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کی شفاعت سے یقیناً گنہگاروں کی سزا میں تخفیف ہوگی اور احادیث میں یہ مضمون بکثرت موجود ہے لیکن یہ یاد رہے کہ حقوق العباد کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ صاحب حق خود اپنا حق معاف کر دے۔

علیؑ قسیم جنّت و نار ہے

اس میں شک نہیں کہ توحید کے اقرار کے باوجود اگر کوئی نبوت کا انکار کرے تو وہ جنت میں نہیں جا سکتا اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں سے اگر ایک نبیؑ کا انکار کرے گا تو گویا اس نے سب نبیوں کی نبوت کا انکار کیا اور جناب رسالتمآبؐ تمام انبیاء کے سلطان ہیں ان کا انکار تمام نبیوں کا انکار بلکہ توحید کے انکار کے برابر ہے اور حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص علیؑ کی ولایت کا انکار کر کے میری نبوت کا اقرار کرے وہ جھوٹا ہے اور کتب صحاح ستہ اہل سنّت میں علیؑ کا بغض نفاق بنایا گیا ہے چنانچہ صحیح ترمذی میں ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ ہمارے نزدیک منافق کی پہچان حضرت علیؑ کے بغض سے ہوا کرتی تھی اور صواعق محرقہ میں بھی اس حدیث کو مختلف الفاظ سے نقل کیا گیا ہے کہ علیؑ کی محبت کا نام ایمان اور علیؑ کا بغض نفاق ہے بہرکیف یہ روایت معنوی طور پر تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے پس علیؑ کی ولا نبی کی ولا ہے اور نبی کی ولا تمام انبیاء کی ولا ہے اور یہی دخول جنّت کا معیار ہے اور علیؑ سے بغض نبی سے بغض اور تمام خاصان خدا سے بلکہ خدا سے بغض کے مترادف ہے لہٰذا بغض علیؑ دوزخ کے داخلہ کا معیار ہے۔ بنا بریں

حضرت علیؑ کا قسیم الجنۃ والنار ہونا ثابت ہو گیا۔ یہ تھا مقام عقیدہ۔ اگر مقام عمل کو دیکھا جائے۔ تو ہم بیان کر چکے ہیں کہ مقبولیتِ اعمال کا معیار بھی ولائے علیؑ ہے۔ پس اعمال کے لحاظ سے بھی جنت و نار علیؑ کی ولا سے ہی وابستہ ہے۔

مقدمہ تفسیر مرآۃ الانوار میں بروایت علل صدوق مفضل بن عمرو سے مروی ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا حضرت علیؑ قسیم الجنۃ والنار کس طرح ہیں؟ تو آپ نے فرمایا علیؑ کی محبت ایمان اور علیؑ کا بغض کفر ہے اور جنت ایمان والوں کے لئے ہے اور جہنم کافروں کے لئے ہے پس علی قسیم الجنۃ والنار ہو گئے یعنی جنت میں صرف علیؑ والے جائیں گے اور دوزخ میں علیؑ کے دشمن جائیں گے مفضل کہتا ہے میں نے عرض کی کیا گزشتہ انبیاء و اوصیاء بھی علیؑ کے محب تھے اور ان کے دشمن علیؑ کے دشمن تھے آپ نے فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کی حضور! ذرا وضاحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا کیا تجھے بروز خیبر جناب رسالتمآبؐ کا علیؑ کے حق میں یہ فرمان معلوم نہیں کہ میں کل علم اس شخص کو دوں گا جو خدا و رسول کا محب ہو گا الخ میں نے عرض کی ہاں مجھے معلوم ہے تو آپ نے فرمایا جب حضورؐ کے پاس بھونا ہوا پرندہ لایا گیا تو آپ نے دعا مانگی تھی کہ اے اللہ ایسے آدمی کو بھیج جو تمام مخلوق میں سے تجھے محبوب تر ہو کہ میرے ہمراہ اس پرندہ کے کھانے میں شریک ہو اور اس سے مراد بھی حضرت علیؑ تھے۔ میں نے عرض کی ہاں! بے شک ایسا ہی ہے پس آپ نے فرمایا کہ جب حضرت علیؑ کا محبوب خدا و رسول ہونا ثابت ہو گیا تو کیا یہ ممکن ہے کہ جس کو خدا اور اس کا حبیب محبوب رکھتے ہوں گزشتہ انبیاء و اوصیاء اس کو محبوب نہ رکھتے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا پس ثابت ہوا کہ حضرت علیؑ گزشتہ تمام انبیاء و اوصیاء کے محبوب تھے اور ان کے دشمن ان کے بھی دشمن تھے میں نے عرض کی بے شک یہ بات درست ہے تو آپ نے فرمایا نتیجہ یہی نکلا کہ جنت میں صرف علیؑ کے دوست ہی جائیں گے خواہ اولین سے ہوں یا آخرین سے ہوں پس علیؑ قسیم الجنۃ والنار ہوئے۔ میں نے عرض کی آپ نے میرا عقدہ حل کر دیا ہے۔ خدا آپ کی جملہ مشکلات کو حل فرمائے مجھے اپنے علم خاص سے کچھ اور بھی عنایت فرمائیے آپ نے فرمایا اے مفضل تم خود پوچھو تو میں بتاؤں پس میں نے عرض کی! اے فرزندِ رسولؐ اگر علیؑ اپنے محبوں کو جنت اور دشمنوں کو دوزخ میں بھیجیں گے۔ تو رضوان اور مالک کیا کریں گے؟! آپ نے فرمایا اے مفضل کیا تو جانتا ہے کہ خدا نے خلق سے دو ہزار سال پہلے عالم ارواح میں جناب رسالتمآبؐ کو ارواح انبیاء پر مبعوث فرمایا اور آپ نے ارواح انبیاء کو توحید کی دعوت دی اور اپنی اطاعت کا حکم دیا اور بصورت اطاعت جنت اور بصورت معصیت جہنم کا ان سے وعدہ وعید کیا۔ مفضل نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کیا رسولِ خدا پروردگار

کی جانب سے وعدہ وعید کے ضامن نہیں تھے؟ اس نے کہا ہاں وہ تھے آپ نے فرمایا کیا علیؑ ان کے صحیح جانشین نہیں تھے؟ اس نے کہا بے شک وہ ان کے جانشین تھے آپ نے فرمایا کیا رضوان و مالک شیعانِ علیؑ سے نہیں ہیں؟ مفضل نے کہا کہ وہ ان کے شیعوں میں سے ہیں آپ نے فرمایا پس علیؑ جنابِ رسولِ خداؐ کی طرف سے قسیم الجنۃ والنار ہوں گے اور رضوان و مالک (باذنِ خدا) حضرت علیؑ کے حکم کے ماتحت اس کام کو انجام دیں گے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اے مفضل! یہ مخزون و مکنون علم میں سے ہے اس کو محفوظ رکھ اور نا اہل کے حوالہ نہ کر مفضل نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہا کہ یہ علم کا وہ دروازہ ہے جس سے ہزار دروازے کھلتے ہیں۔

حدیث وسیلہ

جنابِ رسالتمآبؐ سے مروی ہے جب میں اور علیؑ اپنی منازل قربِ خدا پر فائز ہوں گے تو جانبِ خدا سے ندا آئے گی جس کو انبیاء و مومنین سب سنیں گے کہ یہ میرا حبیب محمد مصطفیٰؐ ہے اور میرا ولی علیؑ ہے اس کے محب کے لئے طوبیٰ ہے اور اس کے دشمن کذاب کے لئے ویل ہے پس (یا علیؑ) تیرے محب سن کر خوش ہوں گے ان کے چہرے نورانی اور دل مسرور ہوں گے اور تیرے دشمنوں باغیوں اور منکروں کے منہ کالے ہوں گے ان کے قدموں میں لرزہ ہوگا۔ دو فرشتے رضوان اور مالک میرے پاس پہنچیں گے رضوان سلام کہے گا میں اس کا جواب دوں گا میرے پوچھنے پر وہ کہے گا میں رضوان خازنِ جنت ہوں اور جنت کی کنجیاں لے کر حاضر ہوا ہوں لے لیجئے پس میں قبول کر کے حمد پروردگار بجا لاؤں گا اور علیؑ کے حوالہ کر دوں گا پھر مالک حاضر ہو کر سلام کہے گا میں جوابِ سلام دے کر پوچھوں گا۔ تو کون ہے؟ جو اس قدر کریہہ المنظر ہے؟ تو جواب دے گا کہ میں مالکِ خازنِ جہنم ہوں۔ خدا کی جانب سے دوزخ کی کنجیاں آپ کے حوالہ کرنے کو آیا ہوں میں ان کو قبول کر کے حمد خدا بجا لاؤں گا اور وہ بھی علیؑ کے حوالہ کر دوں گا پس علیؑ جنت و دوزخ کی کنجیاں لے کر آگے بڑھیں گے حتاکہ جہنم کے دروازہ پر کھڑے ہوں گے جبکہ اس کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے اس کی آواز انتہائی بلند اور گرمی بڑی تیز ہوگی اور وہ حضرت علیؑ کے تابع فرمان ہوگی اور عرض کرے گی حضورؑ! آپ ذرا ہٹ جائیں کیونکہ آپ کا نور میرے شعلوں کو بجھا رہا ہے تو آپ فرمائیں گے خاموش۔ اے جہنم۔ خُذِیْ هٰذَا وَاتْرُکِیْ هٰذَا (اس کو لے لے کہ وہ تیرا ہے) اور اس کو چھوڑ دے (کہ میرا ہے) خُذِیْ هٰذَا عَدُوِّیْ وَاتْرُکِیْ هٰذَا وَلِیِّ الخبر۔ اس کو لے لے کہ وہ میرا دشمن ہے اور اس کو چھوڑ دے کہ یہ میرا دوست ہے یہ حدیث تفسیر برہان میں موجود ہے اور اس سے تو صاف ظاہر ہے

کہ حضرت علیؑ عملی طور پر جنت و دوزخ کی تقسیم فرمائیں گے چنانچہ اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث جو بحارالانوار ج ۲ صفحہ ۲۱۶ پر جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ بروز محشر جب خلق سے ایمان کا سوال ہوگا تو پہلے پہل منادی کلمۂ توحید کی صدا بلند کرے گا پس تمام موحد یہ کلمہ زبان سے جاری کریں گے اس کے بعد منادی شہادت نبوت اشھد اَنَّ مُحَمَّدًا رسول اللّٰہ کی صدا بلند کریگا پس تمام مسلمان یہ کلمہ زبان پر جاری کریں گے اور عرصہ محشر میں کوئی کہنے والا کہے گا کہ ان کو جنت کی طرف لے چلو کہ یہ لوگ نبوت کا اقرار کر چکے ہیں تو اللہ کی جانب سے فوراً ندا پہنچے گی قِفُوْهُمْ یعنی ان کو ٹھہراؤ۔ پس حیران ہوں گے تو آواز آئے گی اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ یعنی ابھی ان سے کچھ اور بھی پوچھا جانا ہے پس کوئی کہنے والا کہے گا کہ انہوں نے نبوت کی شہادت دے دی ہے اب مزید کیا پوچھنا ہے؟ تو ارشاد ہوگا قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ عَنْ وِلَايَةِ عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِب یعنی ان کو روکو کہ ان سے ولاء علیؑ کا سوال باقی ہے اے میرے ملائکہ میں نے ان کو اقرار نبوت کے ساتھ ایک اور چیز کی شہادت کا حکم بھی دیا تھا (ولایت علیؑ) اگر وہ بجا لائے ہیں تو اکرام و اعزاز کے سزاوار ہیں ورنہ صرف نبوت کی شہادت سودمند نہیں ہے اور نہ میری ربوبیت کا اقرار ان کو فائدہ دے سکتا ہے۔ پس ولایت کا اقرار کرنے والے کامیاب ہوں گے اور انکار کرنے والے ہلاک ہوں گے اور بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو کہہ دیں گے کہ ہم بھی ولاء علیؑ کے قائل اور اس کے محب تھے حالانکہ وہ جھوٹے ہوں گے اور ان کا خیال ہوگا کہ جھوٹ سے کام چل جائے گا لیکن حضرت علیؑ فرمائیں گے کہ اب جنت میرے دوستوں کی خود ہی گواہی دے گی۔ اور دوزخ میرے دشمنوں کو خود پہچان لے گا پس جنت سے ایک ہوا نکلے گی اور وہی نسیم جنت علیؑ کے دوستوں کو اٹھا کر جنت الفردوس میں لے جائے گی اور جہنم کے شعلے بلند ہو کر دشمن علیؑ کو خود اپنی لپیٹ میں لے لیں گے پس حضورؐ نے فرمایا تو اسی طرح قسیم الجنۃ والنار ہے اور تو دوزخ سے کہے گا۔ هٰذَا لَكَ وَهٰذَا لِيْ وہ تیرا ہے اور یہ میرا ہے۔

مقام محمود اور لواء الحمد

بحوالہ تفسیر فرات بن ابراہیم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ نے ایک طویل حدیث میں فرمایا خداوند کریم نے مجھ سے مقام محمود کا وعدہ فرمایا ہے جسے وہ پورا کرے گا پس قیامت کے روز جب تمام لوگوں کو محشور فرمائے گا میرے لئے ایک منبر نصب کرے گا جس کی ایک ہزار سیڑھیاں ہوں گی پس ان سیڑھیوں کو عبور کر کے میں آخری مقام بلندی پر پہنچوں گا تو جبرئیل مجھے لواء الحمد دے گا۔

اور کہے گا حضورؐ یہ وہی مقام محمود ہے جس کا وعدہ آپ سے پروردگار نے کیا تھا تو میں علیؑ کو اپنی طرف بلاؤں گا پس وہ میرے پاس آئیں گے اور مجھ سے ایک درجہ نیچے تشریف رکھیں گے۔ میں لواء الحمد ان کے حوالہ کردوں گا پس رضوان جنت کلید ہائے جنت میرے حوالے کرے گا میں وہ بھی علیؑ کے سپرد کردوں گا۔ شوہر کی فرماں بردار دلہن سے بھی بہشت و دوزخ میرے اور علیؑ کے زیادہ فرمانبردار ہوں گے اور ارشاد خداوندی ہے۔ اَلْقِیَا فِیْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ یعنی تم دونو جہنم میں ہر کافر و سرکش کو پھینک دو پس میں خداوند کریم کی حمد و ثنا بجالاؤں گا۔ بحوالہ تفسیر قمی سماعہ سے منقول ہے کسی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ بروز قیامت جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کیسے ہوگی؟ آپ نے فرمایا جب لوگ اپنے اپنے پسینہ میں شرابور محو حیرت و اضطراب ہوں گے تو یوم محشر کی سختی گرمی کی شدت اور ہولناک منظر سے گھبرا کر حضرت آدمؑ سے شفاعت کی خواہش کریں گے اور وہ اپنے ترک اولیٰ کی بنا پر شفاعت کا ذمہ نہ اٹھائیں گے پس حضرت نوحؑ کے پاس آئیں گے وہ بھی وہی جواب دیں گے اسی طرح یکے بعد دیگرے تمام نبیوں سے گزر کر حضورؐ کے پاس جمع ہوں گے۔ آپ جنت کے دروازہ تک ان کے ہمراہ جائیں گے اور سجدۂ پروردگار بجالائیں گے پس ارشاد رب العزت ہوگا اے میرے حبیب سجدہ سے سر اٹھاؤ اور شفاعت کرو بے شک تمہاری شفاعت قبول ہے تم مجھ سے جو کچھ طلب کرو میں دینے کو تیار ہوں اور اسی کے متعلق ارشاد ہے۔ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

بہرکیف عقائد صحیحہ اور محمدؐ و آل محمدؐ کے دامن سے تمسک روز قیامت کی سختیوں سے بچانے کا بہترین وسیلہ ہے اور انہی کی بدولت دنیا میں مومن پر آنے والی سختی مصیبت گرمی و سردی وغیرہ اس کے گناہوں کا کفارہ و سزا شمار ہوتے ہیں اور اگر کوئی گناہ بچ جائے گا تو موت کی تلخی اور سکرات کی شدت اس کا بدلہ ہو جائے گی اور پھر بھی کوئی گناہ باقی رہے گا تو فشار قبر سے ختم ہو جائے گا بہت کم مومن ہوں گے جن کو سختی محشر کی نوبت آئے گی اور آخر کار وہ بھی اپنے کردہ گناہوں کی سزا گذار کر داخل جنت ہو جائیں گے اور گناہوں کو دھونے اور انعامات خداوندی حاصل کرنے کے لئے توبہ سب سے بہترین شافع ہے اور حقوق الناس سے نجات پالینا بہت بڑی کامیابی ہے اور مومن سب کے سب لواء الحمد کے نیچے ہوں گے جس کا سایہ مشرق و مغرب تک پھیلا ہوا ہوگا اور اولین و آخرین کے لئے قیامت کی سخت گرمی سے بچنے کے لئے اس

کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور یہ لوا الحمد حضرت علیؑ کے ہاتھ میں ہوگا۔

پُل صراط کے متعلق عقیدہ

شیخ صدوق قدہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ صراط حق ہے اور وہ دوزخ کے اوپر ایک پل ہے جس سے تمام مخلوق کو گزرنا ہوگا اور اسی کے متعلق پروردگار کا ارشاد ہے اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا یعنی تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو جہنم پر سے وارد نہ ہو اور یہ تیرے پروردگار کا حتمی فیصلہ ہے اور صراط دوسرے لحاظ سے حضرات آئمہ طاہرین علیہم السلام کو بھی کہا جاتا ہے پس جو لوگ دنیا میں ان کی معرفت رکھتے ہوں گے اور ان کے فرمانبردار ہوں گے ان کو بروز محشر پُل صراط سے گذرنے کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا پس وہ آسانی سے اس کو عبور کرلیں گے قیامت کے روز پُل صراط جہنم سے گذرنے کا راستہ ہوگا۔ اور حضورؐ نے فرمایا اے علیؑ قیامت کے روز میں اور تو اور جبرئیل صراط پر ہوں گے۔ پس کوئی بھی وہاں سے نہ گذرنے پائے گا۔ جب تک اس کے پاس تیری ولایت کی سند نہ ہوگی۔ بروایت امالی صدوق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے صراط سے گذرنے والے لوگ کئی ایک طبقوں میں منقسم ہوں گے صراط بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر ہے۔ بعض لوگ تو بجلی کی سرعت سے اس کنارہ سے اس کنارہ تک پہنچیں گے بعض تیز رفتار گھوڑے کی طرح عبور کریں گے بعض پیدل چل کر بعض گھٹنے ٹیک کر اور بعض لٹکتے گرتے پڑتے آہستہ آہستہ عبور کریں گے اور آگ ان کو جلاتی رہے گی اور آخر پار ہو جائیں گے یعنی اپنے اپنے اعمال کی مناسبت سے گذرنے کی صورت ہوگی۔ اجمالی عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ صراط جہنم پر ایک پل ہے۔ جس سے ہر ایک نے گذرنا ہے جس طرح قیامت کے دیگر امور کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں اس کی تفصیل بھی اللہ بہتر جانتا ہے یا وہ جان سکتے ہیں جن کو اللہ نے خصوصی علم عطا فرمایا ہے یہ پل کیسے ہوگا کیونکر ہوگا اور کس جگہ نصب ہوگا و اس قسم کے شکوک و شبہات بالکل بیہودہ خیالات ہیں۔ خداوند کریم ہر شئی پر قادر ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے البتہ اس قدر بات یقینی ہے جس کو شیعہ و سنی تمام کتب میں درج کیا گیا ہے کہ لَا یَجُوْزُ اَحَدٌ الصِّرَاطَ اِلَّا مَنْ کَتَبَ لَہٗ عَلِیٌّ الْجَوَازَ۔ یعنی پل صراط سے کوئی بھی نہ گذر سکے گا۔ سوائے اس کے جس کو حضرت علیؑ گذرنے کا اجازت نامہ تحریر فرما دیں۔ بہرکیف ولائے علیؑ قیامت کی مشکل منزل کی آسانی کا بہترین بلکہ واحد وسیلہ ہے روایت مذکورہ کو صواعق محرقہ میں علامہ ابن حجر مکی نے بھی تحریر کیا ہے اور حضرت ابوبکر سے اس

کو روایت کیا ہے اور یہاں تک کہ علیؑ کا پروانہ لے کر جب مخلص مومن بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر پل صراط کو عبور کرے گا تو آتش جہنم کے شعلے خاموش ہو جائیں گے اور آواز آئے گی جُزْ یَا مُؤْمِنُ فَاِنَّ نُوْرَكَ اَطْفَاَ نَارِیْ جلدی گذر و کہ تمہارے نور نے میری حرارت کو ماند کر دیا ہے (تفسیر انوار النجف فضائل بسم اللہ) پس مومن برق خاطف کی طرح گذر جائے گا اور دشمنانِ علیؑ وہاں سے گر گر کر دوزخ کا ایندھن بنتے جائیں گے۔

اعراف کے متعلق عقیدہ

اعراف عرف کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے بلندی پس جنت اور دوزخ کے درمیان حدِ فاصل جو شور ہے۔ اس کی بلندی کا نام اعراف ہے اور اس مقام پر آلِ محمدؑ موجود ہوں گے جو اپنے دوستوں کو پہچان کر جنت میں داخل کریں گے اور دشمنوں کو دوزخ کی طرف روانہ کریں گے چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے۔ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ یعنی اعراف پر وہ لوگ ہوں گے جو سب کو علامتوں کے ذریعے سے پہچانتے ہوں گے۔ بروایت قمی امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ كُلُّ اُمَّةٍ يُحَاسِبُهَا اِمَامُ زَمَانِهَا یعنی ہر امت کا حساب اس زمانہ کے امام کے ہاتھ میں ہوگا اور امام زمانہ اپنے دوستوں اور دشمنوں کو علامات سے پہچانیں گے جس طرح قرآنی ارشاد ہے پس اپنے دوستوں کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیں گے اور وہ بلا حساب جنت میں جائیں گے اور دشمنوں کو ان کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں دیں گے اور وہ بلا حساب جہنم میں جائیں گے۔

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان ایک بلند مقام ہے کہ اس پر ہر زمانہ کا نبی اور اس کا صحیح جانشین اپنے گنہگار امتیوں اور دوستوں کے ساتھ موجود ہوں گے جس طرح لشکر کا سالار اپنے کمزور سپاہیوں کو اپنے پاس کھڑا کر لیا کرتا ہے نیک لوگ جنت میں جائیں گے تو وہ گنہگاروں سے کہیں گے کہ دیکھو تمہارے نیک بھائی کیسے جنت میں خراماں جا رہے ہیں پس یہ گنہگار ان کو سلام کہیں گے (سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ) لیکن خود داخل نہ ہوں گے البتہ امیدوار ہوں گے جیسے کہ فرماتا ہے لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ یعنی ان گنہگاروں کو نبی و امام کی شفاعت کے بعد دخولِ جنت کا طمع و خواہش ہوگی پھر جب اہلِ دوزخ کو دیکھیں گے تو کہیں گے اے پروردگار ہم کو ان ظالموں میں سے نہ کرنا اس کے بعد اصحابِ اعراف یعنی انبیاء و آئمہ دوزخیوں سے خطاب کر کے کہیں گے کہ آج تم کو اپنی کثرت و تکبر نے کوئی فائدہ نہ دیا اور جنت میں داخل ہونے والے لوگوں کی طرف دیکھ کر اشارہ کر کے فرمائیں گے کیا تم لوگ انہی کے متعلق قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ جنت خدا سے دور ہیں

اور تم ان کو فقر و فاقہ کی وجہ سے حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔ پس اپنے پاس ٹھہرے ہوئے گنہگار مومنوں سے کہہ دیں گے کہ اب تم بھی جنت میں چلے جاؤ گویا اتنی مقدار میں گنہگاروں کا جنت اور دوزخ کے درمیان ٹھہرا رہنا اور بیم و امید کی دو حصاروں میں پابند رہ کر نتیجہ کی انتظار کرنا ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا پس ان کا بخت یاوری کرے گا۔ رحمت پروردگار ان کو اپنے سایہ میں لے لے گی۔ نبی و امام کی شفاعت ان کا سہارا بنے گی اور سب سے آخر میں یہ بھی جنت کی بشارت پاکر شکر خدا زبان پر جاری کرتے ہوئے روانۂ جنت ہوں گے ہم نے اس سلسلہ میں ہونے والے اختلافات کسی قدر تفسیر انوار النجف ج ۶ صٓ۲۷ تا صٓ۲۹ بیان کئے ہیں اس مقام پر اسقدر کافی ہے

حوض کوثر کے متعلق اعتقاد

کوثر پر اعتقاد رکھنا ضروریات مذہب سے ہے حضورؐ سے مروی ہے جو میرے کوثر پر ایمان نہ لائے اسے خدا کوثر نصیب نہ کرے شیخ صدوقؒ نے اعتقادیہ میں فرمایا ہے کہ حوض کوثر حق ہے اور اس کی چوڑائی ایلہ سے صنعا تک ہے (ایلہ مصر کا ایک شہر ہے اور صنعا یمن میں ہے) اس کے کنارے پر آسمانی ستاروں کے برابر پیالے رکھے ہوئے ہیں اور بروز محشر اس پر ساقی حضرت علی علیہ السلام ہوں گے۔ مجالس شیخ مفید سے مروی ہے کہ جب سورۂ کوثر نازل ہوا تو حضرت علیؑ علیہ السلام نے عرض کی حضورؐ! اس کی تشریح فرمائیں تو آپ نے فرمایا یا علیؑ کوثر ایک نہر ہے جو عرش اعظم کے نیچے جاری ہے اس کا پانی دودھ سے سفید تر شہد سے شیریں تر اور گھی سے رطب تر ہوگا اس کے کنگرے زبرجد یاقوت اور مرجان ہوں گے اس کا گھاس زعفران اور اس کی مٹی کستوری ہوگی۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ علیؑ کے پہلو پر رکھ کر فرمایا یا علیؑ یہ نہر ہمارے لئے اور ہمارے محبوں کے لئے ہے۔

امالی صدوق سے مروی ہے حضورؐ نے علیؑ سے فرمایا یا علیؑ اَنْتَ اَخِیْ وَ وَزِیْرِیْ وَصَاحِبُ لِوَائِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَنْتَ صَاحِبُ حَوْضِیْ الخ اے علیؑ تو میرا بھائی وزیر دنیا و آخرت میں علمبردار اور صاحب حوض کوثر ہے۔ نیز آپ نے فرمایا جو ہول محشر سے چھٹکارا چاہتا ہو وہ میرے ولی سے محبت کرے اور میرے وصی کی اتباع کرے جو میرے بعد میرا خلیفہ ہے (علی بن ابی طالب) یہ میرے حوض کا مالک ہوگا اپنے دشمنوں کو وہاں سے دور کرے گا۔ اور اپنے دوستوں کو سیراب کرے گا جو اس سے سیراب نہ ہوگا وہ ہمیشہ پیاسا رہے گا اور کبھی سیراب نہ ہو سکے گا اور جو اس سے سیراب ہوگا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا اور اسے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ بہر کیف فریقین میں حضرت امیر علیہ السلام کا ساقی کوثر ہونا ثابت ہے اور یہی عقیدہ ہونا ثابت ہے اور یہی عقیدہ ہمارا ایمان ہے اعتقادیہ صدوق میں

جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گے تو ان کو فوراً بائیں طرف گرفتار کر لیا جائے گا میں کہوں گا کہ اے پروردگار یہ تو میرے صحابہ ہیں تو ارشاد ہو گا تمہیں خبر نہیں انہوں نے تیرے بعد کیا بدعتیں کی ہیں۔ اسی مضمون کی احادیث کتب صحاح اہل سنت میں موجود ہیں ہم صحابہ نبی کے متعلق عقیدہ کے بیان میں بخاری سے ایک حدیث نقل کر چکے ہیں اس کے متعلق زیادہ طول کی ضرورت نہیں ہے۔

جنّت و دوزخ کے متعلق عقیدہ

جنّت اور دوزخ کا اعتقاد رکھنا ضروریات دین سے ہے اور ان کا انکار کرنا کفر ہے خداوند کریم نے انسانوں کیلئے آخرت میں دو مقام بنائے ہیں نیکوں کو بطور جزا کے جنت عطا فرمائے گا اور بدکرداروں کافروں مشرکوں اور منافقوں کو دوزخ میں ڈالے گا بعض سر پھرے لوگ دشمنانِ دین کی چکنی چپڑی باتوں اور ان کے آوارہ اذہان کے فریب خوردہ افکار کے دام تزویر میں پھنس کر جنت و دوزخ کو فرضی افسانہ یا اصلاحی بہانہ قرار دیتے ہوئے ان کی حقیقت کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں یا ان کی دور از حق تاویلات کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس قسم کی خرافات کو اپنی روشن خیالی یا جدت مزاجی کا ثمرہ قرار دیکر خوش ہوتے ہیں ایسے لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہو کر کفر کے تاریک گڑھے میں جا پڑتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جنت و دوزخ موجود ہیں اگرچہ ہمیں نظر نہیں آتے اور متواتر روایات سے جناب رسالتمآبؐ کا شب معراج جنت و دوزخ کا معائنہ کرنا ثابت ہے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جو چار چیزوں کا انکار کرے وہ ہمارا شیعہ نہیں ہے۔

① معراج ② قبر کا سوال و جواب ③ بہشت و دوزخ کا مخلوق ہونا ④ شفاعت

بہر کیف جنت و دوزخ دونو علم خداوندی میں ہیں۔ ہماری یہ تکلیف نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ البتہ ان کے وجود پر ایمان رکھنا واجب و لازم ہے اور چونکہ یہ دونوں انسانوں کے لئے جزا و سزا کے گھر ہیں پس حضرت آدم علیہ السلام جس جنت میں تھے اور اس سے نکالے گئے وہ دنیاوی باغات میں سے ایک باغ تھا جیسا کہ روایات میں موجود ہے اور ہم نے مقدمہ تفسیر اور تفسیر کی دوسری جلد میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ہر مرنے والا موت سے پہلے اپنا گھر جنت یا دوزخ میں دیکھ لیتا ہے پس مومن کو جب جنت کا گھر دکھایا جاتا ہے تو پھر اس کو اختیار دیا جاتا ہے نیز ہر شخص کے لئے دو مکان ہیں ایک جنت میں دوسرا دوزخ میں پس جنتی کو دوزخ کا مکان بھی دکھایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر تو بدعمل ہوتا تو تجھے یہ مکان دیا جاتا اور دوزخی کو اپنا جنت کا مکان بھی دکھایا جاتا ہے

اور کہا جاتا ہے کہ اگر تو نیک ہوتا تو تجھے یہ مکان دیا جاتا پس مومن نعمت ایمان اور کرامت جنّت پر شکر کرے گا اور دوزخی اپنی ندامت حسرت و پشیمانی کی آگ میں اور زیادہ جلے گا۔

جنّت کی تعریف

ہماری مجال نہیں کہ ہم معمولی سے معمولی انعام پروردگار کی تعریف جامع و مانع کر سکیں۔ چہ جائیکہ اس کے بہت بڑے اکرام و انعام کی کما حقہٗ وصف و ثنا کا احاطہ کریں۔ بس تعارف کے رنگ میں شیخ صدوق قدس سرہٗ کی فرمائش کو نقل کر کے اسی پر اکتفا کریں گے۔ انہوں نے رسالہ اعتقادیہ میں فرمایا ہے ہمارا اعتقاد جنّت کے متعلق یہ ہے کہ وہ بقا اور سلامتی کا گھر ہے وہاں نہ موت نہ بیماری نہ بڑھاپا اور نہ کوئی دوسرا سُقم ہوگا نہ زوال نعمت نہ زمین گیری نہ غم نہ ہم نہ فقر و فاقہ ہوگا بلکہ وہ پر سکون سعادت کا گھر اور باعزت رہائش کا مقام ہے اس کے ساکنین کو نہ تکلیف نہ کسی قسم کی تھکاوٹ ہوگی وہاں ہر وہ چیز ملے گی جو دل چاہے گا اور آنکھ لذت محسوس کرے گی اور رہنے والے اس میں ہمیشہ رہیں گے وہ ایسا گھر ہے کہ اس کے ساکن اللہ کے جوارِ رحمت میں ہوں گے اور اس کے دوست محبوب اور مکرم ہوں گے ہاں مراتب کے لحاظ سے ان میں بھی فرق ہوگا بعض تو فرشتوں کی طرح اللہ کی تسبیح و تقدیس و تکبیر میں شاد و نہال ہوں گے بعض قسم قسم کے خورد و نوش و میوہ جات سے لذت اندوز ہوں گے اور عمدہ بستر بچھونے حوریں غلمان بہترین تکیے اور سندس و استبرق کے لباس وغیرہ ان کے عیش و عشرت کے لئے تیار موجود ہوں گے ہر شخص اپنی پسندیدگی و مناسبت کی بنا پر لذتوں سے بہرہ ور ہوگا اور جو اس کا دل چاہے گا اسے خدا کی جانب سے عطا ہوگا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا لوگ اللہ کی عبادت تین طریقوں سے کرتے ہیں۔

① بعض جنّت کی شوق میں اور جزا کی امید میں اس کی عبادت کرتے ہیں تو یہ عبادت خدام کی ہے

② ایک قسم صرف جہنم کے ڈر سے اس کی عبادت کرتی ہے اور یہ عبادت غلاموں کی ہے۔

③ ایک قسم وہ ہے جو اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ اس کو پسند ہے یا یہ کہ اس کی محبت میں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور یہ عبادت کرام کی ہے اور یہ لوگ امین ہیں اور انہی کے متعلق ارشاد ہے وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ اور کم از کم بہشتی کا گھر جنّت میں اس دنیا سے دس گنا ہوگا۔

دوزخ کا تعارف

صدوق فرماتے ہیں جہنّم کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ذلّت و خواری اور کافروں و نافرمانوں سے انتقام لینے کا گھر ہے اس

ہیں کافر و مشرک ہمیشہ رہیں گے۔ اہلِ توحید میں سے گنہگار لوگ اہلِ شفاعت کی شفاعت اور اللہ کی رحمت کی بدولت ایک وقت کے بعد وہاں سے نکل جائیں گے اور مروی ہے کہ اہلِ توحید کو دوزخ میں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی البتہ وہاں سے نکلتے ہوئے ان کو اذیت ہو گی جو ان کے گناہوں کا بدلہ ہو گی کیونکہ خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ دوزخی لوگ ہی سچ مچ مساکین ہیں نہ تو ان کی موت کا فیصلہ ہو گا۔ نہ ان کے عذاب میں کمی ہو گی نہ ٹھنڈک پائیں گے اور نہ عمدہ پانی ان کو نصیب ہو گا۔ ہاں کھولتا ہوا پانی اور دوزخ میں اُبلی ہوئی پیپ ان کو اپنے بداعمال کی وجہ سے ملے گی اگر وہ کھانا طلب کریں گے تو زقوم (تھوہر) سے غذا دی جائے گی اور اگر فریاد کریں گے تو ان کو ایسا پانی دیا جائے گا۔ جو پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہو گا کہ منہ کو جلا دے گا۔ بے شک وہ بہت برا پانی اور ناقابلِ بیان تکلیف جگہ ہو گی۔ وہ دور سے پکاریں گے۔ اے پروردگار ہمیں اس سے نکال دے اگر ہم دوبارہ ایسے اعمال کریں تو بے شک ہم ظالم ہونگے لیکن بڑی لمبی مدت تک ان کو جواب تک نہ ملے گا پھر کہا جائے گا کہ اسی طرح ذلیل و رسوا ہو اور ہم سے بات نہ کرو پھر مالک سے کہیں گے کہ اللہ سے ہماری درخواست کرو کہ ہمیں موت دیدے تو جواب دے گا تم نے اسی طرح ٹھہرنا ہے۔

بعض روایات میں بسندِ صحیح منقول ہے کہ کئی لوگوں کو جہنم میں بھیجا جائے گا تو مالک داروغۂ جہنم کو خاص طور پر ہدایت کی جائے گی کہ دوزخ کو حکم دو کہ ان کے پاؤں کو نہ جلائے کیونکہ یہ مساجد کو جاتے تھے ان کے ہاتھوں کو نہ جلائے کہ وہ دعا کے لئے بلند ہوتے تھے ان کی زبانوں کو نہ جلائے کہ وہ تلاوتِ قرآن کرتی تھیں اور ان کے چہروں کو نہ جلائے کہ وہ وضو مکمل کیا کرتے تھے پس یہ خطاب سن کر ان دوزخیوں سے مخاطب ہو گا کہ اے بدبختو! تم کس پاداش میں اس جگہ بھیجے گئے ہو تو وہ کہیں گے کہ ہم غیر اللہ کے لئے (یعنی ریاکارانہ طور پر دکھلاوے کیلئے) عبادت کیا کرتے تھے۔ پس کہا جائے گا کہ اس عبادت کا بدلہ ان سے مانگو جن کے لئے تم نے عبادت کی تھی۔

جنّت کے دروازے

بحار الانوار ج ۳ ص ۲۹۴ عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا میں نے شبِ معراج آسمانوں کی سیر کی۔ تو جنت کی نعمتوں کو دیکھا اور دوزخ کے عذاب کو بھی دیکھا ہے جنت کے آٹھ دروازے تھے اور ہر دروازہ پر جلی قلم سے تحریر تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رسول اللّٰہِ علیٌ ولی اللّٰہ اور اس کلمہ کے نیچے ہر دروازہ پر نصیحت کے چار چار کلمات مرقوم تھے چنانچہ پہلے دروازہ پر مرقوم تھا ہر شے کے لئے حیلہ یعنی سبب ہوا کرتا ہے اور آرام و سکون کی زندگی کے اسباب چار ہیں ① قناعت ②

ترک حسد ③ ترک کینہ ④ نیک صحبت ۔ دوسرے دروازہ پر کلمہ مذکورہ کے بعد تحریر تھا ہر شئی کیلئے اسباب ہیں اور آخرت کی خوشی کے لئے چار سبب ہیں ① یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرنا ② بیواؤں پر رحم کرنا ③ مومنین کی حاجت روائی میں کوشش ④ فقراء و مساکین کی خبر گیری کرنا۔ تیسرے دروازہ پر مرقوم تھا ہر شئے کے لئے حیلہ ہے اور تندرستی کے چار حیلے ہیں۔ ① کم بولنا ② کم سونا ③ کم چلنا ④ کم کھانا۔ چوتھے دروازہ پر تحریر تھا ① اللہ اور قیامت پر یقین رکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ مہمان کی عزت کرے ② ہمسایہ کی حرمت کا خیال کرے ③ والدین کا احترام کرے۔ ④ نیکی کی بات کرے ورنہ چپ رہے۔ پانچویں دروازہ پر مکتوب تھا ① جو اپنے پر ظلم پسند نہ کرے اس کو دوسروں پر ظلم کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ② جو اپنے لئے گالی پسند نہ کرے وہ دوسروں کو گالی نہ دے۔ ③ جو خود ذلت کو پسند نہ کرے وہ دوسروں کو ذلیل نہ کرے ④ جو دنیا و آخرت کی کامیابی چاہے وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ حُجَّۃ پڑھے۔ چھٹے دروازہ پر درج تھا ① جو قبر میں وسعت کو چاہے وہ مساجد کی بنا کرے۔ ② جو قبر میں بوسیدگی سے بچنا چاہے وہ مساجد میں (عبادت کے لئے) ٹھہرے ③ جو قبر میں کیڑوں مکوڑوں سے بچنا چاہے (یاد خدا کے لئے) مساجد میں بسیرا کرے ④ جو جنت میں اپنا گھر دیکھنا چاہے (ذکر خدا کیلئے) مساجد میں سکونت رکھے۔ ساتویں دروازہ پر لکھا تھا دل کی نورانیت چار چیزوں سے ہے ① بیمار پرسی ② تشییع جنازہ ③ کفن خرید کر رکھنا ④ قرض ادا کرنا۔ آٹھویں دروازہ پر موجود تھا جو ان دروازہ ہائے جنت سے گزرنا چاہے وہ اپنے اندر چار صفتیں پیدا کرے ① سخاوت ② خوش خلقی ③ صدقہ ④ اللہ کے بندوں کی ایذا رسانی سے پرہیز۔

جنت کے درجات کو طبقات جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان کی تعداد بندوں کے مراتب کے لحاظ سے ہے پس ہر شخص اپنے عمل و معرفت کی مقدار پر جنت میں بلند مقام حاصل کرے گا اور سب سے بلند مقام حضرت محمدؐ و آل محمدؐ کا ہو گا۔ اور اس کے بعد انبیاء و اولیاء و شہداء و مومنین اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے ہوں گے جنت کے مکانات اس کی زمین اس کے باغات فرش بچھونے بستر مسندیں آرام گاہیں بہتی ہوئی نہریں۔ پھل پھول اور میوہ جات پھر خدمت کے لئے حوریں اور غلمان لباس اور خوراک کا انتظام اور پھر کیفیات سرور و عیش یہ سب کچھ حد تعریف سے باہر ہے ان کے متعلق جس قدر بیان کرنے والا بیان کرے حق ثنائے نعمات پروردگار ادا نہ ہو سکے گا۔ بہر کیف وہاں وہ کچھ ہو گا جو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھا ہو گا اور نہ کانوں نے سنا ہو گا بلکہ کسی فرد بشر کے وہم و گمان میں بھی

اس کا خطور نہ ہوگا اور خداوند کریم کی خوشنودی سے بڑھ کر اور کونسی نعمت ہو سکتی ہے۔ فرماتا ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ جنتی لوگ ایک دوسرے سے باتیں کریں گے۔ اپنے آئمہ انبیاء کی صحبت سے سرشار ہوں گے وہاں حسد کینہ بغض اور ہر قسم کی گندی بیماریوں اور نفسانی آلائشوں سے پاک وصاف ہو کر جائیں گے۔ خدایا بحقِ محمدؐ وآلِ محمدؐ ہمیں جنت الفردوس کرامت فرما، میرے اور میرے والدین اعزا و اقرباء و جملہ مومنین کرام بالخصوص اساتذہ و تلامذہ کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کے قرب میں مقامِ جنت عطا فرما تو ارحم الراحمین ہے۔ علامہ صدر الدین شیرازی نے اپنی تفسیر میں جنت کے آٹھ دروازوں کے نام اس طرح شمار کئے ہیں (۱) باب المعرفۃ (۲) باب الذکر (۳) باب الشکر (۴) باب الرجا (۵) باب الخوف (۶) باب الاخلاص (۷) باب الدعا (۸) باب الانذار

ابوابِ جہنم اور اس کے درکات

جس طرح اختلاف مراتب و مدارج کے لحاظ سے جنت والوں کے لئے درجات بعض بعض سے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ ہیں اسی طرح سرکشی کفر نفاق اور بداعمالیوں کے مراتب کے تفاوت کے لحاظ سے اہل دوزخ کی سزاؤں اور عقوبتوں میں بھی معتد بہ فرق ہوگا اور چونکہ گناہوں کے تفاوت کی حد سات تک محدود نہیں کی جاسکتی بلکہ ان درجات کے فرق کی تعداد علی حسب النفوس ہی ہوگی جس کو صرف اللہ ہی جان سکتا ہے لہٰذا درکات جہنم کو سات میں محدود کرنا دلیل سے خالی ہے اور طبقاتِ جنت کا بھی یہی حال ہے اور جن روایات میں سات کی تعداد بتائی گئی ہے وہ ممکن ہے کلی طور پر سات طبقے بنائے ہوں ورنہ ہر درجہ میں جانے والے نوعیت اعمال و کردار میں کافی فرق رکھنے والے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ دو آدمی جو ایک جگہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہوں تکلیف و عذاب میں ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہو۔ جیسے کہ پاس بیٹھنے والوں کی خوشی و سرور میں بھی نمایاں فرق ہوا کرتا ہے۔ بہر کیف اس کی تفصیل کو خدا خود بہتر جانتا ہے اور وہ مجرموں کو جس طرح چاہے عذاب دے سکتا ہے۔ جہنم کے سات درکات جو عام طور پر بیان ہوتے ہیں ان کو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ عذاب کی نوعیت ان سات میں محدود ہو، اس کی ہولناکی اور شدت کو خدا ہی بہتر جانتا ہے کم از کم کے جاننے سے بھی انسان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور حضرت امیر علیہ السلام نے جب ہمام کے سامنے متقین کی تفصیل بیان کی تھی تو اس میں تاب برداشت نہ رہی تھا کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی پروردگار! بحقِ محمدؐ وآلِ محمدؐ مجھے میرے والدین اعزا و اقربا، اساتذہ و طلبۂ تلامذہ و جملہ مومنین کو اس کی سختی سے محفوظ رکھ۔ کم از کم ان کی شدت میں جو فرق ہے وہ یہ کہ پہلے طبقہ میں اگر حرارت ذرہ بھر کم ہو

زیادہ گرمی
تو دوسرے طبقہ سے سوراخ سوزن کے برابر شگاف کیا جاتا ہے تو پہلا طبقہ حد سے زیادہ گرمی
پکڑ لیتا ہے اسی طرح دوسرے طبقہ کے لئے تیسرے طبقہ سے سوراخ سوزن کی مقدار کی گرمی اس
کی حرارت کو تیز کرتی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ساتویں طبقہ سے سوراخ سوزن کے برابر شگاف
اوپر کے چھ طبقوں کو سنگین تر کر دیتا ہے بلکہ نچلے طبقہ سے اگر سوراخ ہو جائے تو ہر اوپر کا طبقہ
اپنے مقام پر اس کی شدت سے پناہ مانگتا ہے تو اندازہ کیجئے اس میں جلنے والوں کی کیا کیفیت
ہو گی۔ جہنم کے ہلکے طبقہ سے سوراخ سوزن کے برابر اگر سوراخ ہو جائے تو آسمان وزمین کو اس
کی گرمی جھلسا دے اور ایک جہنمی کی قمیص اگر آسمان وزمین کے درمیان لٹکا دی جائے تو اس کی بدبو
سے تمام ذی روح موت کے آغوش میں جا پڑیں گے۔

ھٰکَذَا رُوِیَ - اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْھَا

چونکہ عوام کی بہ نسبت علماء کی ذمہ داری زیادہ ہے لہٰذا عوام کی بہ نسبت ان کی جزا وسزا میں
بھی فرق ہے چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ تمام خلق سے آئمہ ہدیٰ کے بعد
کون افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا علمائے صالحین پھر پوچھا گیا کہ تمام خلق میں ابلیس فرعون اور تمہارے
اعداء کے بعد کون بدتر ہے تو آپ نے فرمایا علماء فاسدین جو باطل کو ظاہر کریں اور حق پر پردہ ڈالیں
بنا بریں وہ علماء جو تبلیغ دین میں اپنا فرض منصبی ادا نہ کریں اور اس میں کوتاہی برتیں ان کو حضرت
امام جعفر صادق علیہ السلام نے یوں تہدید فرمائی ہے۔ فرمایا جہنم میں علماء سو کے لئے الگ الگ
طبقات ہیں۔

① جو عالم اپنے علم سے بخل کرے اور دوسروں تک نہ پہنچائے وہ جہنم کے پہلے طبقہ میں ہوگا۔
② جو عالم اپنی نصیحت پر ناک چڑھائے اور دوسروں کو نصیحت کرنے میں سختی کرے جہنم کے
دوسرے طبقہ میں ہوگا۔
③ جو عالم اپنے علم کو صاحبانِ دولت وثروت کے سامنے پیش کرے اور غریبوں کو محروم کرے وہ
جہنم کے تیسرے طبقہ میں ہوگا۔
④ جس عالم کی بات نہ مانی جائے یا اس سے کوتاہی برتی جائے تو جابر سلطانوں کا سا سلوک
کرنے لگے وہ جہنم کے چوتھے طبقہ میں ہوگا۔
⑤ جو عالم اپنی برتری اور رعب بڑھانے کے لئے یہود ونصاریٰ کے اقوال تلاش کر کے پیش
کرے وہ جہنم کے پانچویں طبقہ میں ہوگا۔

⑥ جو خود نا اہل ہو اور اپنے لئے فتویٰ کے مقام کا دعویٰ کرے وہ جہنم کے چھٹے طبقہ میں ہوگا۔

⑦ جو علم کو خود غرضی اور بڑائی کا آلہ سمجھے وہ جہنم کے ساتویں طبقہ میں ہوگا۔

جن روایات میں جہنم کے دروازوں میں تعداد سات بتائی گئی ہے ممکن ہے ہر دروازہ الگ الگ طبقہ والوں کے لئے مخصوص ہو جس طرح جنت کے دروازوں کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہر دروازہ الگ الگ مرتبہ والوں کے لئے ہو۔ واللہ اعلم۔ جہاں جناب رسالتمآبؐ نے جنت کے دروازوں کی تعداد آٹھ بتائی ہے اسی حدیث میں آگے چل کر آپ نے جہنم کے دروازوں کی تعداد سات بیان کی اور ہر دروازہ پر تین تین کلمات نصیحت کا مکتوب ہونا بتایا پہلے دروازہ پر تحریر تھا

① اللہ سے امید رکھنے والا نیک بخت ہے ② اللہ سے ڈرنے والا بے خوف ہے۔
③ جو اللہ کے غیر سے امید رکھے اور اس کے غیر سے خوف زدہ ہو وہ ہلاک ہونے والا اور فریب خوردہ ہے۔

دوسرے دروازہ پر درج تھا ① جو قیامت کی بھوک سے بچنا چاہے وہ دنیا میں بھوکوں کو کھانا کھلائے ② جو قیامت کی برہنگی سے بچنا چاہے وہ دنیا میں برہنہ جسم لوگوں کو لباس دے
③ جو قیامت کی پیاس سے بچنا چاہے وہ دنیا میں پیاسوں کو سیراب کرے۔

تیسرے دروازہ پر مرقوم تھا ① جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ② بخیلوں پر اللہ کی لعنت ③ ظالموں پر اللہ کی لعنت

چوتھے دروازہ پر مکتوب تھا ① اسلام کو ذلیل کرنے والا اللہ کے نزدیک ذلیل ہے ② اہل بیت کی توہین کرنے والا اللہ کے نزدیک ذلیل ہے ③ ظالموں کی امداد کرنے والا اللہ کے نزدیک ذلیل ہے۔

پانچویں دروازہ پر لکھا ہوا تھا ① خواہش نفس کی اتباع نہ کرو کیونکہ ایمان کی دشمن ہے۔
② بے عمل بات نہ کرو کہ رحمت پروردگار سے دوری کا موجب ہے ③ ظالموں کی امداد نہ کرو

چھٹے دروازہ پر درج تھا ① میں مجتہدین پر حرام ہوں ② میں صدقہ دینے والوں پر حرام ہوں ③ میں روزہ داروں پر حرام ہوں۔

ساتویں دروازہ پر مرقوم تھا ① حساب سے قبل اپنا حساب کرلو ② تنبیہ سے قبل اپنے نفس کو تنبیہ کرو ③ بارگاہ ربوبیت میں پیشی سے قبل دعا کرلو۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۲)

اَللّٰھُمَّ وفقنا للخیرات وجبنا عن السیّئات واحشرنا

مع محمّد و آلہ الطاھرین واجعلنا ممن یذکر

فتنفعہ الذکری واغفرلنا ولآبائنا وتب علینا

انّک انت التوّاب الرّحیم۔ اللّٰھم تقبل منّی ھٰذہٖ العجالۃ

وانفع بھا اخواننا المؤمنین و آخر دعوانا ان الحمد

لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِیْنَ ہ

آج مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو لمعۃ الانوار فی عقائد الابرار کے دوسرے ایڈیشن معہ پہلا اور دوسرا حصہ محمد شفیق کاتب سرگودھا مکمل ہوگیا۔

ختم شد

الاجازات

اجازۂ عالیہ من آیۃ اللہ العظمیٰ آقا السید محسن الحکیم الطباطبائی قدس سرہ

اجازۂ عالیہ من آیۃ اللہ العظمیٰ آیۃ اللہ آقا محمد باقر الزنجانی طاب ثراہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین وافضل صلواتہ وازکی تحیاتہ
علی من اصطفاہ من الاولین والآخرین محمد وآلہ الطیبین الطاہرین
واللعنۃ الدائمۃ علی اعدائہم اعداء الدین وبعد فان جناب العالم العامل
والفاضل الکامل والمہذب الصفی عماد الاعلام ثقۃ الاسلام المؤید المسدد
الآقا شیخ حسین بخش الصحاف ادام اللہ توفیقاتہ وتائیداتہ
ممن صرف برہۃ من عمرہ وشطرا طائلا من دہرہ فی تحصیل العلوم الشرعیۃ و
تکمیل المعارف الالہیۃ متمسکا بجوار سید المتقین وامام الموحدین امیر المؤمنین
صلوات اللہ وسلامہ علیہ وآلہ الطاہرین مستفیضا من الاعلام ومستفیدا
من الاساتذۃ الکرام وقد حضر شطرا من ابحاثی الفقہیۃ حضور تحقیق وتفہم
وتعمق وتأمل وتدقیق واتقان وہو بحمد اللہ من الافاضل الاعیان ممن
یشار الیہ بالبنان وممن یرجی منہ نشر الدین المقدس الاسلامی وترویج
احکام الشریعۃ المقدسۃ اسأل اللہ تعالی شانہ ان یوفقہ ویؤیدہ ویبلغہ
ولقد اذنت لہ فی ان یتصدی لما یجوز التصدی لہ للمجتہدین العظام
والماذونین من قبلہم واجزت لہ ان یروی عنی جمیع ما صحت لی روایتہ
من مصنفات اصحابنا قدس اللہ اسرارہم بحق اجازتی عن مشایخی العظام
باسانیدہم المفصلۃ فی الفہارست وطرقہم المنتہیۃ الی ارباب الجوامع ومنہ
الی اہل بیت الوحی صلوات اللہ علیہم اجمعین واوصیہ بملازمۃ التقوی وان
لا ینسانی من صالح دعواتہ ان شاء اللہ تعالی کتبہ المحتاج الی عفو ربہ الکریم
محمد باقر الزنجانی ۱۳۷۳

اجازہ روایت من آیۃ اللہ العظمیٰ آقا محمد محسن المعروف آقائے طہرانی قدس سرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

اجازہ اجتہاد من آیۃ اللہ العظمیٰ الآقا السید حسین الموسوی الحمامی قدس سرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی جعل العلماء ورثة الأنبیاء وفضل مدادهم علی دماء الشهداء والصلوة والسلام علی سیدنا محمد وآله الامناء النجباء واللعن الدائم علی اعدائهم ومخالفیهم من الآن الی یوم اللقاء وبعد فنظرا الی سمو مقام العلم وعلاء قدر العالم وتلاحظ الکتاب والسنة النبویة حتی فی الأحزاب والتشاد علی العلماء فتری ان الله تعالی جعلهم فی صف الملائکة وقرنهم بنفسه فقال عز اسمه شهد الله انه لا اله الا هو والملائکة واولوا العلم وفی الحدیث ان الملائکة لتضع اجنحتها تحت اقدام اهل العلم ولا یلیق هذا المختصر بتوفیة حق العلم وحیث ان جناب العالم الفاضل ثقة الإسلام الشیخ حسین بخش دام علاه لعلو همته وشموخ بشأنه ابی الا ان یکون فی صفهم فجد واجتهد وشمر عن ساعد الجد خصوصا فی النجف الأشرف فی سبیل تحصیل العلوم الدینیة والمعارف الربانیة حتی حاز قصب السبق وفاز بالقدح المعلی وترقی من بین قومه وابناء بلدته فبلغ من علوم الأدب ولا سیما علم المعانی والأصول والفقه الدرجة القصوی والرتبة العلیا وتلمذ عندی فلذا اجزت له التصدی فی الأمور الحسبیة التی لا یجوز تصدیها الا للمجتهدین العظام او المأذونین من قبلهم من حفظ الاوقاف التی لا متولی لها واموال القصر والغیب الذین لا ولی لهم وغیرها واجزت له ایضا اخذ الوجوه الشرعیة من قبل الزکوات والمظالم المردودة ومجهول المالک والنذورات المطلقة وسهم الامام علیه وعلی آبائه افضل الصلاة والسلام واجزت له ایضا ان یروی عنی جمیع ما صحت لی روایته وجازت لی اجازته من الاخبار المودعة فی الکتب المعتبرة من الکافی والتهذیب والفقیه ومن الاستبصار والبحار والوسائل ان لا یدع الاحتیاط فانه سبیل الاصابة وطریق النجاة ۱۲۹[illegible] الحسین الموسوی الحمامی

[illegible]

بسم الله الرحمن الرحیم

اجازه اجتهاد من آیة الله العظمی الآقا السید حسن الموسوی البجنوردی اعلی الله مقامه

الحمد لله الذی فضّل مداد العلماء علی دماء الشهداء وجعلهم
ورثة الانبیاء والصلوة والسلام علی اشرف خلقه وخیر بریته
محمد سید الاصفیاء وآله البررة الاتقیاء واللعن الدائم علی اعدائهم ما بقیت
الارض والسماء وبعد فان جناب العالم العامل والمهذب الکامل ذا القوة القدسیة
والملکة المستنبطة بالفکر الثاقب والرأی الصائب العلامة الفاضل علم الاعلام
ورکن الاسلام ناصر الملة والدین غوث المسلمین الشیخ الجلیل والمحقق الذی
لیس له بدیل الشیخ حسین بخش ساکن دیرة اسماعیل خان ایده الله تعالی
ممن سعی وبذل جهده فی تحصیل العلوم الشرعیة وجد واجتهد فی تشییدها
الشرعیة وحضر علی سائر الاساطین حضور تفهم وتعمق وتحقیق وتدقیق
حتی بلغ مناه فقد دام علیه تعالی اجره وقد اجزت له ان یتصدی فی
ما لا یجوز التصدی فیه فی عصر غیبة الامام علیه السلام الا للمجتهدین
والمأذونین من قبلهم واجزت له ایضاً ان یروی عنی جمیع ما صحت لی
روایته من الجوامع العظام الحدیثیة الثلاثة وسائر الکتب المعتبرة المعتمدة
للطائفة الحقة الاثنا عشریة وذلک بحق اجازتی من مشایخی العظام
واساتیدی الکرام الذین هم عظماء الدین وعلماء الاعلام
وحملة شریعة خیر الانام واوصیه بملازمة التقوی و
سلوک طریقة الاحتیاط فانه المنجی من المهلکات والله
تعالی خیر رفیق وهو ولی التوفیق والسلام علیه ورحمة الله
وبرکاته حرر فی عاشر جمادی الثانی سنة الف وثلثمائة واربع وسبعین
من الهجرة النبویة علی مهاجرها الالف الصلوات والتحیات الاحقر
حسن الموسوی البجنوردی

اجازه اجتهاد من آية الله العظمى الآقا السيد محمود الحسيني الشاهرودي قدس سره

بسم الله تعالى شأنه

الحمد لله رب العالمين وصلى الله على محمد وآله الطاهرين المعصومين.

وبعد فان جناب الفاضل الكامل عماد العلماء مروج الاحكام الشيخ
بخش دامت تأييداته وتوفيقاته قد صرف شطراً من عمره الشريف
في تحصيل العلوم الدينية وقد حضر المجالس العلمية والاساطين
وكد وجد حتى نال مرتبة من الفضل والكمال فلله الحمد تعالى
على ما اولاه وانعم وحباه وقد اجزت له نقل الاحاديث
بطرقي المنتهية الى اصحاب الجوامع ومنهم رضوان الله عليهم الى
اصحاب الائمة المعصومين صلوات الله عليهم اجمعين واجزته ايضا
في الامور الحسبية من قبيل حفظ اموال الغائبين والقاصرين
وتولي الاوقاف بلا متولي وغير ذلك من الامور التي
يتوقف جواز التصدي لها على الاذن ممن له الاذن وله نقل الفتاوى
من الرسائل العملية الصحيحة واصلاح بين الناس واصلاح القرائة
وتعليم آداب الشرع وله ايضا اخذ الحقوق الشرعية من قبيل الزكاة
والكفارات واشباهها واجزته ايضا في اخذ حق الامام عليه السلام
لدى الحاجة بمقدار الحاجة والسلام عليه وعلى اخواننا
المؤمنين ورحمة الله وبركاته ٢٣ جمادى الثانية [illegible]

محمود الحسيني الشاهرودي

اجازہ روایت آیۃ اللہ العظمیٰ محمد رضا الطبسی ثم النجفی قدس سرہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي امرنا بالتحدث بنعمائه وتحديث آلائه والصلاة والسلام على اول انبيائه وآخرهم
المبعوث باصدق انبائه وعلى خاتم الرسل واوصيائه هداة السبل لاسيما ابن عمه خاتم اوصيائه
وبعد فان من اجل ما اهتم به السلف واقتفى صالح الخلف الاعتناء بشأن الرواية والاستحفاظ
الحديث والدراية حفظا من سلف الاوان وصلتا لنورثها وعن احب الدخلاء ادراج
المرغبة في تلك الصنعة الشريفة الشيخ الجليل والعالم النبيل روح الاحكام [illegible]
المفضال الذي فاق اقرانه وامثاله بتتبع المباني العلمية من الفقهية والاصولية الشيخ [illegible]
باكتناه البهاء [illegible] عن هذا العبد العاصي الفاني المستغرق في بحر الاماني
والاماني ما سريت له حام فضعه ان يروي عني ما صحت لي روايته وساغت لي اجازته
هنا بريقا بذلك ما تحققت بالحقيقة من تحصيل المحقيقة طرق كثيرة [illegible] على سنتي
ما تيسر تحصيلها منها واحبها واحسنها الي ما ارويه عن شيخي وسندي ومن عليه في
الشرعية عليها اعتمادي استاذ الفقهاء والمجتهدين آية الحق واليقين السيد [illegible]
المرحوم السيد ابو الحسن الاصفهاني نضر الله وجهه [illegible] واسكنه اعلى درجات
عن استاذه الاعظم الاعلم سلطان المحققين آية الله في العالمين المولى الكبير
الجليل المولى محمد كاظم الخراساني وعن سيد الطائفة في الفقه والحديث السيد حسن
بن السيد هادي الكاظمي عن الامام الشيخ الانصاري عن المولى احمد النراقي عن السيد
العلامة المعروف ببحر العلوم الطباطبائي عن السيد حسين القزويني عن [illegible]
الشهيد السيد نصر الله الحائري عن مولانا المجلسي باسناده على ما في كتاب الاجازات
الى الشيخ الثقة محمد بن يعقوب الرازي الكليني عن علي بن محمد عن احمد بن اسماعيل

بن موسى بن جعفر عن احمد بن قاسم العجلي عن احمد بن يحيى عن محمد بن خداهي عن عبد الله بن الربيع عن عبد الله بن هاشم عن عبد الكريم بن عمرو الخثعمي عن حبابة الوالبية احدى المعمرات فانها عاشت مائتين وستة وعشرين سنة قالت رايت امير المؤمنين عليه السلام في شرطة الخميس ومعه درة لها سبابتان يضرب بها بياعي الجري والمارماهي والزمار ويقول لهم يا بياعي مسوخ بني اسرائيل وجند بني مروان فقام فرات بن احنف فقال يا امير المؤمنين وما جند بني مروان قال له عليه السلام قوم حلقوا اللحى وفتلوا الشوارب فمسخوا الحديث وعن سيدنا الاعظم ومولانا الافخم آية الله العظمى السيد ابو الحسن ابراهيم الاصفهاني انه قال الشيخ بمعروف ارقام بن ظلم العلماء عن استاذه استاذ الفقهاء وحجة الفقهاء والمحققين وصل من خاتم المحدثين الشيخ محمد كاظم المتقدم ذكره عن شيخه واستاده الشيخ الاجل المرتضى عن شيخه النراقي عن السيد العلامة بحر العلوم عن الفقيه المحدث يوسف البحراني عن المولى محمد رفيع عن العلامة المجلسي الثاني عن والده الاكمل المجلسي الاول عن العلامة بهاء الملة والدين عن والده الاجل عن زين الملة والدين الشهيد عن الشيخ محمد بن محمد بن داود المؤذني عن فخر المحققين عن والده آية الله المحقق العلامة الحلي عن شمال الفقهاء صاحب الشرائع عن علي بن زهرة عن ابن شهر آشوب عن ابي الحسن بن محمد الطوسي عن والده المأمون على الدنيا والدين شيخ الطائفة المحقة عن الشيخ الاجل ابي عبد الله المفيد عن الشيخ الامام الصدوق عن الشيخ الفقيه جعفر بن قولويه عن الشيخ المحدث ثقة الاسلام محمد بن يعقوب الكليني باسناده عن ابي بصير عن مولينا الصادق عليه السلام

انه قال من عمل سيئة اجل فيها سبع ساعات من النهار فان قال استغفر الله
الذي لا اله الا هو الحي القيوم واتوب اليه ثلث مرات لم يكتب عليه فلم دام فضله
ان يروي عني بهذه الاسناد وغيرها من اسنادنا وطرقنا المذكورة في كتابنا الذريعة
في تحقيق حكم المذاهب والحجة وكتابنا الاجازات اللائق الناطق بما شاء واطلب منه رعاية
الاحتياط في النقل والاعراض عن نقل المتشابه من الاخبار واوصيه دام توفيقه
بان لا ينساني في مظان الاستجابة الصالحين والسعي في قضاء حوائج اخواننا المؤمنين
فان فيه صلاح الدارين وفلاح النشأتين كتبه العبد الفاني المحسن محمد محسن
الطهراني عفى عنه ولوالديه بحق محمد وآله الطاهرين في ۲ ج ۸ ۱۳۷۲

اجازہ عالیہ آیۃ اللہ العظمیٰ الشیخ محمد تقی الراضی طاب ثراہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي رفع بالعلم درجة العلماء العاملين وجعلهم خلفاء لسيد المرسلين
وسائر المهتدين والصلوة والسلام على مؤسس قواعد الدين واولاده الطيبين
وخلفائه المعصومين الأئمة الهادين المهديين واللعنة الدائمة على اعدائهم
اجمعين ابد الآبدين .

وبعد فان جناب العالم العلامة نخبة العلماء العاملين كهف الانام
وركن الاسلام مولانا حسين بخش زيد توفيقه وعلمه بمن صرف
مدة من عمره في تحصيل العلوم الدينية والمعارف الالهية باحثا فاحصا
مجدا وقد حضر ابحاثنا واستجازني لحسن ظنه بي وحيث انه اهل لذلك
فاجزت له تدريس العلوم الدينية والاحاديث المروية وكافة كتب
الفقه والاصول وما يتوقفان عليه كما اجزت لجنابه القيام بالامور
المعروفة والامور الحسبية وهو مأذون لاخذ سهم صاحب الامر مولانا و
مولى الكونين عجل الله تعالى فرجه وسهل مخرجه بالمقدار الذي يراه
احتياجه اليه وهو اعرف بذلك مع مراعاة جانب الاحتياط
واوصيه بملازمة ما عليه من التقوى وترك الهوى والاعراض عن
الدنيا كما ارجوان لا ينساني من الدعاء في مظان الاجابة انشاء الله
تعالى وعلى اخواننا المؤمنين القيام بخدمته واطاعة اوامره و
السلام عليه ورحمة الله وبركاته

حرره بيمناه الداثرة محمد تقي
آل الشيخ راضي طاب ثراه

النجف الاشرف بتاريخ ١٥ شهر شوال المكرم
سنة ١٣٧٥ هـ